قرآن کے نظریۂ خلافت اور اس کے فلسفۂ تمدّن و اجتماع
پر اپنی نوعیّت کی پہلی کتاب

اِسلام کی نشاۃِ ثانیہ
قرآن کی نظر میں

مولانا محمّد شہابُ الدّین ندوی
ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور، انڈیا

پیش لفظ
مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ

مجلس نشریات اسلام ۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد، کراچی ۱۸

قرآن کے نظریۂ خلافت اور اس کے فلسفۂ تمدن و
اجتماع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب

اسلام کی نشأۃ ثانیہ

قرآن کی نظر میں

از

مولانا محمد شہاب الدین ندوی،
ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور، انڈیا

پیش لفظ:-

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

مجلس نشریات اسلام
۱- کے-۳ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

نام کتاب ـــــــــ اسلام کی نشأۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں
مصنف ـــــــــ محمد شہاب الدین ندوی بنگلوری
سالِ اشاعت ـــــــــ ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء
تعداد ـــــــــ ایک ہزار (۱۰۰۰)
کتابت ـــــــــ محبوب کریم صدیقی و
ـــــــــ احسان کاتب
مطبوعہ ـــــــــ تشکیل پرنٹنگ پریس کراچی

طابع و ناشر
فضلِ ربّی ندوی

مجلسِ نشریاتِ اسلام
۱۔ کے ۔ ۳ ناظم آباد ۱ ، کراچی ۱۸

(بہ تعاون و اشتراک : فرقانیہ اکیڈمی بنگلور انڈیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ

ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

سیّدالمرسلین وخاتم النبیین صلّی اللہ علیہ وسلّم جس طرح دورِ آخر کے لئے معیاری ومثالی شخصیت بن کر آئے اسی طرح اُن پر نازل ہونے والی کتاب نوعِ انسانی کی ہمہ گیر ہدایت و رہنمائی اور ہمہ جہتی صلاح وفلاح کا صحیفہ اور انسانیت کی سعادت ونجات کے لئے حرفِ آخر اور ابدی ودائمی کتاب بن کر آئی، جس کا ہر حرف صداقت وحقانیت کا سرچشمہ اور رشد وہدایت کا ذخیرہ ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (حٰم سجدہ : ۴۱-۴۲)

اور یہ (قرآن) بڑی باوقعت کتاب ہے، جس میں غیر واقعی بات نہ اُس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ پیچھے کی طرف سے۔ یہ خدائے حکیم ومحمود کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

اسلام جو ایک مکمل دین اور دائمی وعالمگیر مذہب ہے اس کی تعلیمات کا سرچشمہ یہی لازوال، بے نظیر اور زندگی آمیز وزندگی آموز کتاب ہے جس سے اب تاقیام قیامت نوعِ انسانی کی قسمت وابستہ ہے اور اسی پر اس کی کامیابی ونجات موقوف ومنحصر ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ ابدی کتاب جو چودہ سو سال سے انسانیت کی تعمیر وتشکیل اور ایک صالح وصحت مند معاشرے اور تہذیب وثقافت کے قیام کے سلسلے میں اپنا مؤثر کردار ادا کرتی رہی ہے اور اس نے بین الاقوامی طور پر انسانوں کو جس طرح اور جس قدر متاثر کیا ہے اس کا دنیا کی کوئی کتاب بلکہ

کتب خانۂ عالم بھی مقابلہ نہیں کرسکتا ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست　　　کتب خانۂ چند ملّت بشست

قرآن حکیم کے مطالب و مفاہیم کی وسعت، اس کے موضوعات کا تنوع اور اس کے دائرۂ بحث کی ہمہ گیری و جامعیت کے پیشِ نظر مفسرین کرام اور علمائے اسلام ہر دور میں اس کے مذاق و مزاج اور ذہنی و فکری سطح کو سامنے رکھ کر اور علمی و کلامی تقاضوں کے پیشِ نظر تفسیری خدمات انجام دیتے رہے ہیں اور تعلیم و تبیین کتاب کا حق ادا کرتے رہے ہیں، جس کے نتیجے میں علوم قرآنی کا وہ عظیم الشان ذخیرہ وجود میں آیا جو بجائے خود ایک کتب خانہ کہلانے کا مستحق ہے اور جس کا اندازہ علّامہ سیوطیؒ اور علّامہ زرکشیؒ وغیرہ کی کتابوں سے کیا جاسکتا ہے۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ قرآن مجید اصلاً صحیفۂ رشد و ہدایت اور کتاب نجات و سعادت ہے جس میں علوم و فنون، فکر و فلسفہ، تاریخی حقائق، معاشرتی و تمدنی اصول اور تہذیبی و ثقافتی اقدار کے اصول و مبادی بھی مل جاتے ہیں۔ مگر ان سب کی حیثیت اس کے نظامِ فکر و نظر میں ذیلی و ضمنی ہی ہے اور ان سب کا رُخ اُس کے اصلی و حقیقی موضوع فلاح آخرت اور انسان کی ہدایت و نجات کی طرف ہے۔ اور ایسا ہونا فطری بھی تھا کہ انسانی علوم و فنون کی بنیاد انسان کے ذہن و فکر اور تجربات و مشاہدات پر ہے اور قوت اختراع و ایجاد انسانی فطرت میں ودیعت کردی گئی ہے اور وہ اپنی ذہانت و لیاقت سے اس سلسلے میں ہر طرح کام لے سکتا ہے۔ مگر اُخروی نجات اور حیات بعد الممات کی تعلیمات و تفصیلات وحی و الہام اور انبیائے کرام کی واضح تعلیمات کے بغیر نہیں حاصل کی جاسکتیں۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر قرآن حکیم نے علوم و فنون کے بارے میں اجمال و اشارے سے اور علوم معاد و آخرت کے سلسلے میں بسط و تفصیل سے کام لیا تاکہ انسان کی ہدایت و سعادت کا سامان کیا جاسکے اور اس کے لئے شاہراہ یقین و ایمان کھل سکے۔

قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَّكِتَابٌ　　تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی

مُّبِيْنٌ يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (المائدہ: ۱۵-۱۶)

ہے اور ایک کتاب واضح، کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں اور ان کو راہ راست پر قائم رکھتے ہیں۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (الزمر ۲۷-۲۸)

اور ہم نے لوگوں کو (ہدایت) کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کے (ضروری) عمدہ مضامین بیان کئے ہیں تاکہ یہ لوگ نصیحت پکڑیں۔ جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ عربی قرآن ہے جس میں ذرا کجی نہیں (اور) تاکہ یہ لوگ ڈریں۔

قرآن کے تعارف میں قرآن میں اسے جگہ جگہ تبصرہ، تذکرہ اور ہدایت ہی کہا گیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ دنیاوی معاملات و مسائل، سیاست و حکومت، تہذیب و معاشرت اور علوم و فنون کے متعلق بھی ایسے بنیادی نکات و تعلیمات پر مشتمل ہے جو ایک صالح انسانی تہذیب کے لئے رہنما خطوط کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن حکیم نے انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی آیات میں تدبّر و تفکّر، بامقصد اور بصیرت افروز سیر و سیاحت، تخلیق کائنات میں غور و تامل اور تجربہ و مشاہدہ پر جو زور دیا ہے اور علم و عقل سلیم کی جس طرح ہمت افزائی کی ہے، اس کے نتیجے میں اگلے مسلمانوں نے علوم و فنون کی یادگار اور تاریخ ساز خدمات انجام دیں اور انہوں نے عالمی تہذیب و ثقافت اور سائنس کی پیش رفت میں گراں قدر اضافہ کیا اور اس کی عملی نظیر قائم کی کہ ایمان و یقین، علم صحیح اور عمل صالح ہی علوم و فنون، تہذیب و تمدن اور حکومت و سیادت کا سرچشمہ ہیں ؎

ولایت، پادشاہی علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

قرآن مجید کے قدیم و جدید مفسروں میں امام رازیؒ اور علامہ جوہری طنطاوی اپنی عقلی و عملی تفسیر کے لئے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جو عصر حاضر کے ان مفسرین کو متاثر کرتے رہے ہیں جو عصری مذاق کے مطابق قرآن کی علمی و سائنسی تشریح اور اس کی متکلمانہ انداز پر خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ راستہ ایسا دشوار اور یہ معاملہ ایسا نازک ہے جس میں غلطیوں اور غلط فہمیوں کا خطرہ اور تفسیر بالرائے کا اندیشہ موجود رہتا ہے۔ اس وجہ سے متعدد اہل قلم لغزشوں اور تاویلوں سے اپنے کو نہیں بچا سکے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ عربی زبان اور قدیم و جدید علوم سے جس واقفیت اور جس جامعیت کی ضرورت تھی وہ ان کے یہاں مفقود تھی۔ مقامِ مسرت ہے کہ اس جادہ دشوار میں ندوۃ العلماء کے ایک جواں سال و جواں ہمت اور باتوفیق فاضل عزیزی مولوی محمد شہاب الدین ندوی سلمہ نے قدم رکھا اور وہ بڑی حد تک اس سے سلامت روی اور ثابت قدمی کے ساتھ گزرے۔ اور انہوں نے قدیم مفسرین اور سلف صالحین کی تفسیری روایات کے پہلو بہ پہلو جدید سائنسی تحقیقات اس طرح پیش کیں جس میں مرعوبیت بے احتیاطی اور عدم توازن کے بجائے قرآن کی ابدیت و جامعیت پر یقین، اس کی تمدن آفریں تعلیمات پر ایمان اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے فکرمندی اور تدبیر و تدبر نمایاں ہے۔

خلافت ارضی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے انہوں نے جو شرائط و لوازم پیش کی ہیں اور جس وسیع علم و خبر اور فکر و نظر کی ضرورت ظاہر کی ہے اس سے انکار مشکل ہے۔ علوم جدیدہ کی قرآنی بنیادوں، تسخیر آفاق اور علم اشیاء سے متعلق آیتوں پر جس بسط و تفصیل سے انہوں نے قلم اٹھایا ہے وہ ان کے اپنے موضوع سے شغف اور قرآن سے تعلق خاطر کا مظہر ہے۔ قرآن اور سائنس کے باہمی تعلق کو ایک عرصے سے وہ اپنا موضوع بنائے ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں متعدد قابل قدر کتابیں لکھ چکے ہیں۔ پیشِ نظر کتاب اس موضوع پر تفصیلی کتاب ہے جس کا تعارف کراتے ہوئے

انہوں نے صحیح لکھا ہے :

" اس کتاب کا موضوع قرآنی نظریۂ خلافت اور اس کا فلسفۂ تمدن و اجتماع ہے۔ عصرِ جدید میں عالم انسانی کو جن مسائل و مشکلات کا سامنا ہے ان کا حل قرآن حکیم کی روشنی میں نکالنے کی خاطر خلافت ارضی پر بالکل ایک نئے نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے اور قطعی و محکم دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خلافت ارض کی تکمیل یا اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلمان اپنے دین پر ثابت قدم رہتے ہوئے جدید علوم و فنون یا سائنس اور ٹیکنالوجی میں بھی کمال حاصل کر کے دین ابدی کی ہر حیثیت سے بقاء و استحکام کا سامان پیدا نہ کر لیں۔"

ہماری دعا ہے کہ مصنّف عزیز نے قرآن فہمی کے جن نئے گوشوں کو اجاگر کیا ہے اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے جس فکر و نظر کی ضرورت ظاہر کی ہے اُسے ہماری ملّت کے خواص اور اہل علم بھی محسوس کر سکیں اور انہیں اس کارِ عظیم میں حصّہ لینے کی سعادت حاصل ہو۔ اور مصنّف کو قرآن مجید کی مزید خدمت کی توفیق مزید ارزاں ہو اور وہ دین و ملّت کی بہتر سے بہتر خدمت کر سکیں۔

ابوالحسن علی ندوی

تہدیہ

پیمبر آخرالزماں، سرکار دو عالم، رسولِ عربی و امّی کی بارگاہِ قدسی میں جس کی امیّت تاریخ کی سب سے بڑی صداقت ہے۔ اور جس کے لائے ہوئے کلام کا سب سے بڑا اعجاز، ابدی سچائیوں سے بھرپور اس کی حیرت انگیز معجز نمائیاں ہیں، جس کے سامنے تمام انسانی کلام اور تمام غیر خدائی کارنامے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اُس کے ایک ایک حرف اور ایک ایک فقرے سے علم و حکمت کے سوتے پھوٹتے ہیں اور حقائق و معارف کے بحرِ زخار موجزن ہو جاتے ہیں، جن کی گہرائیوں کو ناپنے سے دنیا کے سارے انسان عاجز و درماندہ نظر آتے ہیں۔ اور ہدایت و رہنمائی کے اتنے گوشے اور اتنے پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں جو فکر و نظر کے تمام گوشوں اور غلط نظریات کی تمام اندھیری وادیوں کو روشن و منور کر دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں صراطِ مستقیم ایک مجسّم شکل اور درخشاں روپ میں دکھائی دینے لگتی ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ: وہی ہے جس نے ناخواندہ قوم میں ایک ایسا رسول بھیجا جو انہیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

تقریب

قرآن حکیم ہی وہ عظیم صحیفۂ ہدایت ہے جو ہماری تمام فکری و تہذیبی اور تمدنی و اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرتا اور ہماری ملی و بین الاقوامی مسائل و مشکلات اور کل عُقدہ ہائے لاینحل کو حل کر کے ایک عظیم منارۂ نور کی طرح ہمارے قلب و دماغ کو روشن کرتا ہے۔ وہ ایک زندہ اور ابدی کتاب ہے اور زندہ اور ابدی مسائل حیات سے بحث کرتا ہے۔ اس پر کہنگی کی پرچھائیاں کبھی نہیں پڑ سکتیں اور اس کی چمک دمک میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ اس کا پیغام سدا بہار ہے اور اس کی سچائیاں لازوال اور ناقابل تنسیخ ہیں۔ وہ فکر انسانی کے لئے ایک مہمیز اور ایک چیلنج ہے۔ وہ ایسا ناقابل فراموش کارنامہ ہے جس کا انسانی کلام میں کوئی جواب اور کوئی مثیل نہیں۔ اس کی زبان اور اس کا اُسلوب جس طرح معجزنما اور انسانی کلام سے میل نہیں کھاتا، اسی طرح وہ ابدی حقائق اور سچائیوں سے لبریز اور اپنے معجزنما معانی و مطالب کے لحاظ سے بھی منفرد و یکتا اور اپنی نوعیت کا تمام صُحف سماوی اور پورے انسانی لٹریچر میں واحد کلام ہے۔

یہ کوئی شاعری یا مبالغہ آرائی یا محض خوش عقیدگی نہیں بلکہ میری اس کتاب کا ایک ایک صفحہ اس دعوے اور اس کی سچائی کا جواب پیش کرے گا۔

شہاب ندوی

۱۸/۵/۱۴۰۰ھ

۶/۳/۱۹۸۰ھ

موضوع کتاب

اس کتاب کا موضوع قرآنی نظریۂ خلافت اور اُس کا فلسفۂ تمدن و اجتماع ہے، عصرِ جدید میں عالم انسانی کو جن مسائل و مشکلات کا سامنا ہے ان کا حل قرآن حکیم کی روشنی میں نکالنے کی خاطر خلافت ارض پر بالکل ایک نئے نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے اور قطعی و محکم دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خلافت ارض کی تکمیل یا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلمان اپنے دین پر ثابت قدم رہتے ہوئے جدید علوم و فنون یا سائنس اور ٹکنالوجی میں بھی کمال حاصل کر کے دین ابدی کی ہر حیثیت سے بقا و استحکام کا سامان پیدا نہ کر لیں۔ اسی میں ہمارے تمام فکری و تہذیبی اور تمدنی و اجتماعی مسائل و مشکلات کا حل پوشیدہ ہے۔

اور دوسری حیثیت سے دورِ جدید میں قرآنِ حکیم کے معجزہ ہونے کی صحیح نوعیت، جدید تہذیبی مسائل میں اس کی رہنمائی، تہذیب و تمدن کے صحیح تصورات اور ان کی یکجائی، قرآن اور سائنس کے باہمی روابط، سائنسی علوم کے بھرپور جائزے اور ان کے رموز و نکات، جدید صنعتوں کے اسرار اور دین ابدی کے ساتھ ان کے تعلقات کی صحیح نوعیت، نوعِ انسانی پر اسلام کا احسان اور اُس کا کارنامہ وغیرہ بہت سے حقائق پر تفصیلی بحث کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ قرآنِ حکیم ہی تمام فکری و عملی تحریکوں کا سرچشمہ اور نامۂ ہدایت ہے جس کی کامل اتباع پر ہماری نجات موقوف ہے۔

مصنف ایک نظر میں

مصنف کتاب ہذا یکم رجب ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۲ر نومبر ۱۹۳۱ء میں شہر بنگلور کے مضافات میں بمقام چک بانا ور پیدا ہوئے۔ گھریلو حالات کی بنا پر متوسط تعلیم کے بعد تجارت کو اپنا پیشہ بنایا۔ مگر علمی ذوق کے غلبے کی بنا پر بالآخر ۱۹۵۶ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کی راہ لی۔ اور بڑی محنت و انہماک کے ساتھ تعلیم حاصل کر کے ۱۹۶۲ء میں امتیازی طور پر کامیاب ہوئے۔ سائنس اور قرآن شروع ہی سے محبوب موضوع رہا۔ اس لئے بعد فراغت اس موضوع پر تحقیقی مطالعے میں لگ گئے۔ موصوف کے فکری نتائج نے کئی علمی و تحقیقی کتابوں کی شکل اختیار کر لی۔ ان میں سے "چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں" اور ایک مجموعہ مقالات "اسلام اور عصر حاضر" کے علاوہ کئی کتابچے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اور اب یہ نئی معرکۃ الآراء کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔

موصوف نے خصوصیت کے ساتھ خلائی عہد اور اس کے پیدا کردہ علمی و فکری اور کلامی مسائل پر خوب لکھا جس کی بنا پر مولانا عبد الماجد دریا بادی نے موصوف کو مستقبل کا شہاب ثاقب قرار دیا تھا۔ موصوف نے ۱۹۷۰ء میں پورے عزم و حوصلے کے ساتھ بنگلور میں فرقانیہ اکیڈمی کے نام سے ایک علمی و تحقیقی ادارے کی تاسیس کر کے اس تحریک کو پروان چڑھانے میں اپنی ساری بہترین صلاحیتیں صرف کر ڈالیں اور اس راہ میں "تعمیر فکر" کے نام سے ایک نیم علمی و نیم اصلاحی ماہنامہ اور "ندائے فرقان" کے نام سے ایک خالص علمی رسالہ سہ ماہی کے طور پر جاری کیا۔

ان کی مسلسل جد و جہد اور کوششوں کے نتیجے میں آج فرقانیہ اکیڈمی ایک شاندار عمارت، ایک شاندار لائبریری اور ایک بلند پایہ تحقیقی مرکز کی شکل میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔

موصوف کی چند اہم تصنیفات عنقریب منظر عام پر آنے والی ہیں جو عصر جدید کے مادہ پرستانہ چیلنج کے جواب میں بڑے معرکے کی ہوں گی۔ ادارے کا پتہ یہ ہے:

The Secretary, Furqania Academy,

89, T. R. Dasarahalli, Bangalore- 560057 (India).

مصنّف کی وہ کتابیں جو منظر عام پر آچکی ہیں

۱۔ چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں
۲۔ اسلام اور عصر حاضر
۳۔ اسرار نبوت: سائنٹفک نقطہ نظر سے۔
۴۔ اسلام اور جدید سائنس
۵۔ قرآن کا پیغام، ہندی مسلمانوں کے نام
۶۔ نظریۂ اشتراکیت، ایک قرآنی تمثیل کا جائزہ
۷۔ ہماری تعلیم کا مسئلہ
۸۔ آسان عربی زبان (دو حصے)
۹۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں

مصنف کی وہ کتابیں جو آئندہ منظر عام پر آنے والی ہیں

۱۔ وجود باری اور قیامت کے شواہد: دنیائے نباتات میں
۲۔ چاند اور قیامت
۳۔ خلائی دور اور قرآنی فلسفۂ تاریخ
۴۔ نباتات سے انسانیت تک
۵۔ ایٹم اور توحید باری
۶۔ قرآن حکیم اور نظریۂ ارتقاء
۷۔ سائنس اور مسلمان (چند تاریخی حقائق)
۸۔ قرآن اور سائنس کے بنیادی اصول و کلیات
۹۔ حدیث: قرآن اور سائنس کی میزان میں
۱۰۔ قرآن اور عصر جدید
۱۱۔ قرآن اور بائبل
۱۲۔ آسان عربی زبان (بقیہ حصے)

اعترافِ حقیقت

میری خواہش اور تمنا تھی کہ یہ کتاب سب سے پہلے پاکستان سے شائع ہو جائے۔ کیونکہ آج عالم اسلام جن مسائل سے دوچار ہے اس کا حل یہی ہے کہ اس تحریک کی صدا کسی اسلامی ملک سے برپا ہو، تاکہ اُس کے مثبت نتائج نکل سکیں اور اس کی آواز صدا بصحرا ثابت نہ ہو سکے۔ الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے اس کا فوری اور غیبی انتظام کر دیا کہ جیسے ہی یہ کتاب مکمل ہوئی پاکستان میں اس کی اشاعت کا عملی آغاز شروع ہو گیا۔ چنانچہ پاکستان کے مشہور ناشر مولانا فضل ربی ندوی، ناظم مجلس نشریات اسلام، کراچی نے کتاب کے مسودے کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جو اپنے عزیز دوست اور ندوے کے معاصر بھی ہیں۔ موصوف نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور دیگر علماء کی بلند پایہ کتابیں شائع کر کے پاکستان میں صحیح اسلامی افکار کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں بہت بڑی اور ناقابل فراموش علمی و دینی خدمت انجام دی ہے۔ وہ ہر ایسی کتاب کی تاک میں رہتے ہیں جو ہمارے افراد ملت کے صحیح ذہنی نشو و نما کی راہ میں ممد و معاون بن سکے اور ان کو متحرک و فعال بنانے کے سلسلے میں نمایاں رول ادا کر سکے۔ آج عالم اسلام کی تعمیر نو کے لئے اسی قسم کے لٹریچر کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ مجلس نشریات اسلام خوب ترقی کرے اور پھولے پھلے اور علم و دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر کے ملت کے تنِ مردہ میں زندگی کی نئی روح پیدا کر سکے۔ آمین۔

محمد شہاب الدین ندوی

کراچی

۳۰ / ۵ / ۱۴۰۱ھ

۶ / ۴ / ۱۹۸۱ء

فہرست ابواب

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

مقدمہ از مصنف

اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے دو اہم پہلو ہیں۔ ایک فکری و نظریاتی اور دوسرا مادی دسیاسی اور دینِ اسلام کی سربلندی اور حقیقی معنی میں اُس کے غلبے و اقتدار کے لئے یہ دونوں ہی پہلو بہت اہم اور دوررس نتائج کے حامل ہیں۔ فکری و نظریاتی اعتبار سے ہمیں مختلف میدانوں میں جدید تقاضوں کے مطابق اور جدید اسلوب میں علمی و تحقیقی لٹریچر تیار کرنا ہے، تاکہ موجودہ نظریاتی کش مکش کے دور میں فکری معرکہ جیتا جاسکے۔ اس حیثیت سے ہمیں عقائد یا دین کے بنیادی تصورات کی نئے سرے سے تنقیح کرنا ہے یعنی جدید علوم و فنون کی روشنی میں ان کی حقانیت ثابت کرنی ہے۔ عصرِ جدید کی ضرورت کے مطابق نئے فقہی مسائل میں اجتہاد کرکے موجودہ معاشرتی و اجتماعی مشکلات کا حل نکالنا ہے۔ اور جدید تمدنی مسائل میں غور و خوض کرکے اسلامی نقطۂ نظر سے ان کا حل پیش کرنا ہے تاکہ اسلام کی ابدیت ثابت ہوسکے۔

اسی طرح اسلامی عقائد و احکام اور اس کی تعلیمات پر وارد ہونے والے اعتراضات اور شکوک و شبہات کا کافی وشافی جواب دے کر انھیں بیرونی حملوں سے بچانا اور ہر حیثیت سے اسلامی تعلیمات کی حقانیت و برتری کو ثابت کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے جدید علمِ کلام کی تدوین ضروری ہے، جس کا پورا خاکہ اور نقشہ قرآنِ حکیم میں مذکور و موجود ہے۔ اور یہی نیا علم کلام موجودہ دور کے لئے قابلِ حجت بن سکتا ہے۔ جو تمام تر قرآنی علمِ کلام ہوگا۔

مختصر یہ کہ اسلام کو ہر حیثیت سے ایک کامل اور برتر نظام زندگی کے روپ میں عالم انسانی کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر فکر و نظر کی دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی اور کوئی مکمل اور ہمہ گیر ذہنی و فکری انقلاب برپا نہیں ہوسکتا۔

یہ صرف اس کا علمی و فکری پہلو ہوا جو اپنی جگہ پر بہت ہی اہم ہے۔ اور اس کا مادی و سیاسی پہلو یہ ہے کہ علمی و فکری حیثیت سے جو نظام حیات اُس نے مہیا کیا ہے اور جو ضوابط زندگی اُس نے ترتیب دئے ہیں انھیں عملاً برپا کرتے اور اس کائنات گیتی میں انھیں نافذ کرنے کے لئے اسباب و وسائل یا قوت نافذہ کی بھی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوانین و ضوابط ہوا میں تو نہیں نافذ ہوں گے۔ بلکہ اِنہی خطہ ہائے آب وخاک میں جلوہ گر ہوں گے اور انہیں اشخاص و افراد پر نافذ ہوں گے جو گوشت پوست کا وجود رکھتے ہوں۔ ان قوانین کے نفاذ، داخلی استحکام اور خارجی دفاع وغیرہ کے لئے مادی قوت و طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نہ کوئی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے اور نہ کسی ملک کا دفاع ہوسکتا ہے۔

تاریخ کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ آفرینش آدم سے لے کر موجودہ دور تک ہر عہد اور ہر زمانے میں دین الٰہی کے علمبرداروں اور دین حق کے منکروں کے درمیان برابر کشمکش چلی آرہی ہے۔ ہمیشہ سے خدائی اور غیر خدائی نظام میں نبرد آزمائی ہوتی رہتی ہے، جیسا کہ قرآن حکیم اور دیگر صحیفوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنّت اور عجیب و غریب حکمت و مصلحت ہے کہ ہر دور میں حق و باطل کی معرکہ آرائی اور دینیت اور لادینیت کے درمیان چشمک و کشیدگی ہمیشہ سے برپا رہی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ حاملینِ حق ہمیشہ تجربات اور معرکہ آرائیوں کی بھٹیوں میں تپ کر کندن بن کر نکلیں اور ان میں دین و ایمان کی حرارت کے ساتھ ساتھ ملک و ملت کے دفاع اور علمی میدان میں جدو جہد کا جذبہ

بھی اُبلتا رہے اور ان کا لہو کبھی سرد نہ ہونے پائے۔ ورنہ وہ اپنے اذہان و جذبات کی تسکین کے لئے کوئی دوسرا راستہ ـــــ فنونِ لطیفہ وغیرہ کا ـــــ ڈھونڈھ لیں گے اور ملک و ملت کے دفاع و استحکام کو نظر انداز کر دیں گے۔ جس کا نتیجہ سوائے زوال و ادبار کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ فلسفۂ تاریخ کا خلاصہ ہے۔

اس لحاظ سے کسی معاشرے کو جنم دینے اور اُس کی حفاظت کرنے کے لئے قوت و طاقت ایک بنیادی عامل ہے، جس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جیسے ہی نقشۂ عالم پر کوئی مسلم معاشرہ اُبھرتا ہے اُسے اپنوں[1] اور غیروں کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور نزاع و کش مکش کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے۔ چنانچہ عصر حاضر بھی شاہد ہے کہ آج جہاں کہیں بھی نظامِ اسلام یا خدائی قانون کے نفاذ کی باتیں ہو رہی ہیں وہاں پر طرح طرح کے فتنے اور شورشیں برپا ہو رہی ہیں۔ خصوصاً دنیا کی بڑی طاقتیں احیائے اسلام کے نام ہی سے وحشت زدہ اور رعشہ براندام نظر آتی ہیں اور اس تحریک کو کچلنے اور اس آواز کو دبانے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کر رہی ہیں اور دنیا کے نقشے سے مسلم حکومتوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کیلئے اندر ہی اندر سازشیں کر رہی ہیں۔ ایشیا اور افریقہ کے مسلم ممالک چونکہ قدرتی وسائل سے مالا مال اور جغرافیائی اعتبار سے بہت ہی اہم پوزیشن کے مالک ہیں اس لئے وہ دنیا کی تمام قوموں کی نگاہوں اور توجہات کا مرکز بن گئی ہیں۔ ہر قوم اور ہر بڑی طاقت ان ممالک کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب کیا ہو جائے۔ افغانستان کی تازہ مثال ہمارے سامنے ہے جو ایک بڑی طاقت کی جارحیت کا نشانہ بن کر خاک و خون میں تڑپ رہا ہے۔

---

[1] کبھی منافقین اور معتزلہ وغیرہ کی شکل میں۔ کبھی متجددین، منکرین حدیث اور قادیانیوں وغیرہ کے روپ میں۔

اس وقت دنیا میں کہنے کو تو چالیس پینتالیس مسلم ممالک ہیں مگر کسی میں بھی اتنا دم خم نہیں ہے کہ وہ کسی بڑی طاقت کا لقمۂ تر بننے سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ مدافعت کی کسی میں صلاحیت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ممالک سب کے سب اسلحہ اور دیگر تمام تمدنی ضروریات میں ان ہی ترقی یافتہ قوموں کے محتاج اور اُن کے دست نگر ہیں۔ اس وقت عالمی نقشے پر بہت سے ایسے مسلم ممالک ہیں جہاں پر ایک معمولی سی سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک باہر سے آتے ہیں، بلکہ بعض ممالک کے لئے غذائی اشیا، حتیٰ کہ پانی تک درآمد کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہی ممالک تیل وغیرہ کی دولت سے اتنے مالامال ہیں کہ اگر چاہیں تو ہر قسم کی صنعتیں قائم کر سکتے ہیں، اور ہر قسم کی چیزیں اور اسلحہ وغیرہ تیار کر کے خود کفیل بن سکتے ہیں۔ امکانات تو بہر حال موجود ہیں مگر نہ جانے کیوں وہ ان اقدامات کو ایک کارِ عبث سمجھ کر نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔ اگرچہ صنعتی صلاحیت کی کمی بھی اس پس ماندگی کا ایک بڑا سبب ہو سکتی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال کو بدلنے کے لئے مثبت اور ٹھوس اقدامات کیوں نہیں کئے جاتے، منصوبہ اور پروگرام کیوں نہیں بنایا جاتا، جبکہ دینی و شرعی حیثیت سے بھی ملک و ملت کا دفاع نہایت اہم اور ضروری ہے۔

یہ صورت حال ہے جس سے اس وقت پورا عالم اسلام دوچار ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے دو پہلو ہیں، ایک علمی اور دوسرا مادی۔ ان دونوں پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم کو دونوں ہی میدانوں میں کام کرنا ہے۔ علمی حیثیت سے عصرِ جدید کی عقلیت و ذہنیت کے مطابق نیا لٹریچر تیار کر کے علمی معرکہ سر کرنا ہے۔ اور مادی و سیاسی حیثیت سے صنعت و حرفت کے تمام شعبوں میں ترقی کر کے خود کو ہر حیثیت سے خود کفیل بنانا اور موجودہ عالمی دوڑ اور مسابقت میں بازی جیتنا ہے۔ یہ دونوں امور دینی، ملی، معاشی، دفاعی، ملکی، عسکری، سیاسی اور بین الاقوامی ہر حیثیت سے اہم اور لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ایک دوسرے کے تعاون کے بغیر دین کی بقاء

استحکام ممکن ہے۔ ملک و ملّت کا دفاع وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے، جو مادی شعبے میں خود کفیل بنے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ دوسروں کی "امداد" "وعدوں" کے سہارے کوئی قوم یا ملّت اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اور اس میدان میں پیچھے رہ جانا اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لینے کے مترادف ہوگا۔

اس موقع پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہمیں سب سے پہلے فکری معرکہ سر کر لینا چاہیئے، پھر دوسرے معرکے کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ ایسا سوچنا حقائق سے منہ موڑنا ہے۔ کیونکہ یہ معرکے اچانک سر نہیں کئے جاسکتے اور راتوں رات کایا پلٹی نہیں جاسکتی۔ ہر ایک کے لئے ایک طویل مدّت تک جد و جہد کرنی پڑے گی اور بہت سے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ تب کہیں جاکر کوئی منصوبہ کامیاب ہوتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں دس بیس یا پچیس پچاس سال کوئی اہمیّت نہیں رکھتے۔ ایک قوم کو بنانے اور اس کو پوری طرح سرگرم عمل کرنے کے لئے بہت سے بہترین "دماغوں" کو مسلسل کام کرنا پڑتا ہے تب کہیں جاکر کوئی ٹھوس اور پائیدار نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

آپ قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے اور موجودہ تحریکوں کا جائزہ لیجئے تو آپ پر اس قول کی صداقت پوری طرح واضح ہوجائے گی۔ مثلاً کمیونزم کی تحریک کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ بالشیوک تحریک کو کامیاب ہونے اور ایک خطۂ ارض حاصل کرنے کے لئے نظریاتی اور عملی جد و جہد کے دونوں میدانوں میں پورے پچاس سال تک سرگرم رہنا پڑا۔ نظریاتی اعتبار سے کارل مارکس اور انجلز نے اور عملی اعتبار سے لینن اور مارشل اسٹالن وغیرہ نے اس وقت تک مسلسل جد و جہد کی جب تک کہ وہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوگئے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اس بات کی کیا گارنٹی کہ فکری معرکہ سر کرتے ہی مادی میدان بھی ہمارے لئے مضبوط و مستحکم طور پر پوری طرح تیار ملے گا، جب کہ ہم پہلے ہی سے اس راہ میں منصوبہ بند طریقے سے پیش قدمی نہ کرچکے ہوں؟

یوں کہنے کو ہمارے پاس زمینی و ارضی خطوں کی کوئی کمی نہیں ہے، بلکہ اللہ کے فضل و کرم سے اس وقت پورے چالیس، بلکہ کچھ زیادہ ہی، جغرافیائی خطہائے ارض ہمارے قبضے میں موجود ہیں۔ مگر وہ طاقتور اور خود کفیل کہاں ہیں؟ اور ان کی دفاعی حیثیت مستحکم کہاں ہے؟ وہ تو "بادِ مخالف" کا ایک جھونکا بھی برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مسلمان کیا کریں اور کونسا طریقہ اختیار کریں جس سے یہ دونوں عظیم اور بنیادی مقاصد حاصل ہوں اور جس کے نتیجے میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ عمل میں آسکے؟ یہ ہیں وہ بنیادی اور اہم سوالات جن کے حل پر ہماری کامیابی کا دارومدار ہے۔ اس وقت اگرچہ میرے پیشِ نظر اصلاً صرف دوسرا پہلو ہے یعنی مادی و سیاسی حیثیت سے خلافت ارض کی تکمیل یا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کس طرح برپا ہوسکتی ہے؟ مگر ضمناً پہلوئے اول ــــ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا علمی و فکری پہلو ــــ اور اس کے اکثر مباحث بھی زیرِ بحث آگئے ہیں کیونکہ فکری و نظریاتی اعتبار سے ان دونوں پہلوؤں میں بہت گہرا ربط و تعلق پایا جاتا ہے اور ان دونوں کو جدا کرنا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ بعض اوقات ان کی جدائی کے باعث غلط نتائج اور غلط فیصلے بھی برآمد ہوسکتے ہیں۔ لہذا میں نے ان دونوں کے ربط و تعلق پر بیک وقت بحث کرنے کی کوشش کی ہے۔

بہر حال پہلوئے ثانی کے مطابق اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ اس وقت مادی میدان میں امت مسلمہ کو کیا کرنا چاہیئے؟ اور اس سلسلے میں اُمت کے مختلف طبقات کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ تو اسلام کی نظر میں اس مسئلے کا واحد اور بہترین حل یہ ہے کہ مسلمان ان تمام طاغوتی طاقتوں کے خلاف جہاد کریں جو شمع اسلام کو بجھانے کے درپے ہوں۔ مگر موجودہ دور میں صحیح معنی میں جہاد کرنے اور صحیح معنی میں اقوام عالم سے نبرد آزمائی کرنے کے لئے چونکہ جدید اسلحہ اور جدید ہتھیاروں سے مسلح ہونا ضروری ہے، لہذا اسلام حکم دیتا ہے کہ دین و

ملت کے دفاع اور سربلندی کے لئے مقدور بھر اسلحہ اور قوت تیار کی جائے (وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ الخ) اس میں ہر دور کے تقاضوں کے مطابق جدید ترین اسلحہ مراد ہو سکتا ہے۔ اور آج جدید ہتھیاروں کی تیاری کے لئے سائنسی اور صنعتی علوم و فنون سے واقفیت اور فوجی و عسکری صنعتوں کا قیام ضروری ہے۔ اس کے بغیر موجودہ دور کے تقاضے کے مطابق جدید اسلحہ تیار نہیں ہو سکتا۔ اور یہ مقصد عظیم اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک پورا عالم اسلام متحد ہو کر اور اپنے تمام وسائل کا جائزہ لے کر سائنسی اور صنعتی اعتبار سے ترقی نہ کر لے اور جہاں تک ممکن ہو سکے جلد از جلد خود کفیل بن کر بڑی طاقتوں کے جال اور ان کے پھندے سے باہر نہ نکل جائے۔ اسی میں ہمارے دینی و دنیوی ــــ ملی، دفاعی، فوجی، معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی ــــ تمام مسائل کا حل پوشیدہ ہے۔

مگر اس مقصد عظیم کو حاصل کرنے کے لئے جب تک اُمت کے دو "بااثر طبقات" یا "اولوالامر" کے درمیان اپنی اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں مکمل تال میل نہیں ہوتا کوئی صحیح اور پائیدار نتیجہ بر آمد نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ایک طبقہ علماء ہے جس کی ذمہ داریاں یہ ہیں کہ وہ فکری و نظریاتی اعتبار سے امت اسلامیہ کی صحیح قیادت کرے اور پوری ملت کو صحیح راہ پر لگائے، کیونکہ وہی ملت کا اصل "دماغ" اور اُس کا جوہر ہے۔ اور دوسرا طبقہ مسلم حکومتوں کے ارباب اقتدار کا ہے، جن کی ذمہ داریاں یہ ہیں کہ دین و ملت کے تقاضوں کے مطابق اُمت مسلمہ کو صحیح راہ اور صحیح خطوط پر چلائیں۔ طبقۂ اول کی حیثیت وزیر و مشیر کی طرح ہے اور طبقۂ ثانی کی حیثیت خلیفہ اور امیر کی سی۔ یہ دونوں طبقے جب تک اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح ادا نہیں کرتے خلافت ارض کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا اور امت مسلمہ موجودہ خطرے سے باہر نہیں نکل سکتی۔

مگر بد قسمتی سے اس وقت ہمارے علماء کو مسلم معاشرے میں یہ مقام عملاً حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ جو خود ان کی اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ مگر نظریاتی اعتبار سے علماء کا اصل مقام و منصب یہی ہے اور یہی ہونا چاہیئے۔ جب تک یہ مقام و منصب ان کو حاصل نہیں ہوگا صحیح معنی میں کوئی صالح فکری انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ لہذا علماء کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اپنا یہ کھویا ہوا مقام و منصب پھر دوبارہ حاصل کر لیں۔

اس کتاب میں اگرچہ بہت سے دینی و شرعی، فقہی و کلامی، علمی و سائنسی، تاریخی و تمدنی اور تفسیری، غرض مختلف اور گوناگوں مسائل سے بحث کی گئی ہے اور خاص کر سائنسی امور و مسائل کو ایک خاص مقصد کی خاطر بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں قرآن حکیم کی حیرت انگیز دعوت اور قرون وسطیٰ میں اس کے مثبت اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ان علوم و فنون کے اسلام سے ربط و تعلق کو واضح کرتے نیز یونانی عقلیات سے مسلمانوں کے شغف اور مسلم معاشرہ پر اس کے منفی اثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے، مگر اس کتاب کا بنیادی موضوع "خلافت ارض" ہے، جس کے گرد یہ سارے مسائل و مباحث گھوم رہے ہیں۔ میں نے "خلافت ارض" کو بنیاد بنا کر اور اس کو اصل قرار دیکر ان تمام مسائل پر خلافت ارض اور اس کے مقتضیات کے تحت بحث کی ہے اور ان کا تعلق مثبت یا منفی اعتبار سے خلافت ارض سے دکھانے کی کوشش کی ہے۔

اس لحاظ سے جہاد بھی خلافت ارض اور اس کے مقاصد کی تکمیل کی خاطر فرض کیا گیا ہے۔ جس کا دوسرا نام " امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج اگر مسلمان جہاد اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صحیح حقیقت اور اس کی روح کو پالیں تو ملت اسلامیہ کی کایا پلٹ سکتی ہے اور موجودہ غیر یقینی اور مایوس کن فضا ختم ہو سکتی ہے۔

خلافت ارض کے تعلق سے کتاب کا ایک اور مرکزی نکتہ اور مرکزی بحث وہ علم ہے جو حضرت آدم کو عطا کیا گیا تھا۔ یہ علم قرآن کی تصریح اور مفسرین کی مدلل

وضاحت کے مطابق "علم اسماء" (تمام مظاہر کائنات اور ان کے آثار و خواص کا علم) ہے۔ یہ علم حضرت آدمؑ کو کیوں اور کس لئے عطا کیا گیا تھا اور اس میں کیا حکمت و مصلحت تھی؟ نیز خلافت ارض سے اس علم کا کیا تعلق ہے اور موجودہ دور میں اس علم کی قدر و قیمت کیا ہے؟ کیا یہ علم عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق جہاد کی تیاری کے لئے ضروری ہے؟ اور کیا یہ علم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ضروری ہے؟ اگر ہے تو کیوں اور کس طرح؟ اور اس کی تفصیلات اور اس کا طریقۂ کار کیا ہے؟ انہی سب مسائل و مباحث کی تنقیح و تحقیق کے گرد کتاب کے تمام ابواب اور اُس کے کل مباحث گھوم رہے ہیں۔ اس علم کا تعلق تین طبقوں سے ہے:

(۱) عوام سے (۲) علماء سے (۳) اور حکومت وقت سے۔ اور پھر اس تعلق و تقاضے کی بنا پر ان پر کچھ دینی و شرعی، اجتماعی و سیاسی اور بین الاقوامی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

انسان اس زمین پر خلیفہ ہے۔ اور خلیفہ کے بہت سے فرائض ہیں، جن میں سے ایک نہایت اہم فریضہ روئے زمین پر عدل و انصاف کا قیام اور ظلم و عدوان کا استیصال ہے۔ اور انسان کو "علم اسماء" (موجودات عالم اور ان کے نظاموں کا علم) اس لئے عطا کیا گیا ہے کہ وہ اس علم سے معرفت الٰہی کے ساتھ ساتھ مادی قوت و شوکت بھی حاصل کر کے دنیا کو عدل سے بھر دے اور جور و ستم کا خاتمہ کر دے۔ چنانچہ جب کبھی دنیا میں فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے تو اُس کو ختم کرنا شرعاً ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی شرعی فریضے کی ادائیگی کا نام اصطلاح شریعت میں جہاد ہے۔ چنانچہ جب تک مسلمان جہاد کی غرض و غایت اور اُس کی صحیح و حقیقی اسپرٹ کو سمجھ نہیں لیتے اور اس کے تقاضوں کے مطابق کارزار حیات میں جدوجہد نہیں کرتے وہ دنیا میں صحیح معنی میں خلیفہ نہیں بن سکتے۔ لہٰذا آج خلافت ارض کا تقاضہ ہے کہ طاغوتی قوتوں کے خلاف پوری طاقت کے ساتھ جہاد کیا جائے اور ان تمام فتنوں کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکا جائے۔

اس لحاظ سے ہمارے تمام مسائل کا حل جہاد میں پوشیدہ ہے۔ خواہ نظامِ شریعت اور عدلِ الٰہی کو کامل طور پر قائم کرنے کی حیثیت سے ہو یا ہمارے ممالک کے داخلی وخارجی استحکام اور ان کے دفاع کے لحاظ سے، خواہ جدید تمدنی واجتماعی مسائل ومشکلات کو حل کرنے کی حیثیت سے ہو یا معاشی وعسکری معاملات کو سلجھانے کی حیثیت سے۔ ملت اسلامیہ میں بیداری پیدا کرنے اور عوامی ذہن بنانے کے لئے ضروری ہے کہ جہاد کے بنیادی مقاصد اور اس کی حکمتوں نیز اس سے حاصل ہونے والے ممکنہ جدید تمدنی واجتماعی فوائد کو پوری طرح کھول کر بیان کیا جائے۔ ہمارے ذہنوں میں جہاد کا جو مفہوم بیٹھا ہوا ہے وہ بہت ہی محدود بلکہ بہت بڑی حد تک ڈراؤنا ہے۔ اور لوگ جہاد کا نام ہی سن کر یا تو گھبرا جاتے ہیں یا پھر مخالفین اسلام کی غلط تشریح وتوجیہہ کی بنا پر جو تصور ہمارے ذہن میں جاگزیں ہو چکا ہے اس کی وجہ سے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ گویا کہ جہاد بھی کوئی بے جا، بھیانک، غیر انسانی اور جارحانہ فعل ہے۔ حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے جہاد فتنہ وفساد کی روک تھام، ظلم وزیادتی کے خاتمے اور زیادہ تر دفاعی ضروریات کا نام ہے۔ اور دنیا کا ہر ملک اپنے ملک وقوم کا دفاع ضروری بلکہ اس کو اپنا ایک ناگزیر بنیادی حق سمجھتا ہے۔ اور اس وقت دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں میں بہت ہی زوردار مقابلہ چل رہا ہے۔ جیسا کہ مختلف ممالک کے سالانہ بجٹوں کے ملاحظے سے پتہ چلتا ہے۔

اس لحاظ سے ضروری ہے کہ آج ہماری پوری اجتماعی زندگی جہاد کے نقطۂ نظر سے، جہاد کے تقاضے کے مطابق اور جہاد کی بنیادی اسپرٹ کے تحت گزرے اور ہماری تمام تمدنی واجتماعی سرگرمیوں کا بنیادی محور جہاد ہو۔ اور پورے عالمِ اسلام کو ایک یونٹ بنا کر مختلف سائنسی، صنعتی اور ٹکنیکل میدانوں میں آگے بڑھنا چاہیئے۔ تب کہیں جا کر ہم موجودہ چیلنج کا صحیح جواب پیش کر سکتے ہیں۔

اور اپنے دین و ملت کا صحیح معنی میں دفاع کر سکتے ہیں۔

مادی غلبہ حاصل کرنے کے لئے ظاہر ہے کہ مادی اسباب و وسائل کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ دنیا اسباب و وسائل کی دنیا ہے۔ اور یہ چیز نہ توکل کے خلاف ہے اور نہ خدا پر ایمان اور بھروسے کے منافی۔ بلکہ یہ خداوند کریم ہی کا حکم ہے کہ ہم اسباب و وسائل کو نظر انداز نہ کریں۔ بلکہ اپنی قوت و استطاعت کے مطابق مادی اسباب و وسائل فراہم کریں (واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ) ورنہ دشمنان اسلام کے حوصلے بلند ہو جائیں گے اور وہ ایک دن بھی ہمیں چین سے بیٹھنے نہیں دیں گے۔

یہ وقت باتوں میں، تقریروں اور لکچروں میں، شاعری اور لطیفہ گوئی میں یا بیکار قسم کے تفریحی مشاغل میں گزارنے اور برباد کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ ہماری قومی اور ملی زندگی کا ایک ایک لمحہ بہت ہی قیمتی اور گراں مایہ ہے، جس پر ہمارے نونہالوں اور آنے والی نسلوں کے بقا و استحکام کا دارومدار ہے۔ اس معاملے میں ہمارے ارباب ملت کو پوری سنجیدگی اور پوری ذمہ داری کے ساتھ سوچنا اور اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرنا ہے۔ اس وقت ہماری ملت کی تعمیر نو اور تشکیل نو کا کام بہت ہی اہم ہے۔ اور اس اہم کام کے لئے چند مخلص افراد اور چند بہترین "دماغوں" کو وقف ہو جانا چاہیئے۔ تب کہیں جا کر کوئی ٹھوس، مثبت اور پائیدار نتیجہ نکل سکتا ہے۔ ہماری ملی زندگی کی کایا پلٹنے کے لئے ہمیں حقائق کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور ہر چیز کا حقیقی اور واقعاتی نقطہ نظر سے جائزہ لینا چاہیئے محض جذباتی بن کر جذبات کے سہارے دنیا کی کایا پلٹی نہیں جا سکتی۔

مادی میدان میں ترقی کرنے اور مادی قوت و شوکت حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ مسلم معاشرے کو سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھایا جائے۔ اور اس کو نیا عزم اور نیا حوصلہ عطا کرنے کے لئے ضروری

ہے کہ اس کے سامنے قرآنِ حکیم کی وہ تمام آیات پیش کی جائیں جن میں خداوند کریم کی نعمتوں سے استفادہ کرنے یعنی مظاہر کائنات کی تسخیر کرکے ان میں ودیعت شدہ فوائد سے مستفید ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ بر و بحر کی اس تسخیر کا خلافت ارض کی تکمیل کے ساتھ چولی دامن کا سا ساتھ ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اور اسی پر اسلام کی نشأۃ ثانیہ موقوف ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے معاشرے کو احساس کمتری سے بچانے اور اس کے اندر ایک نئی روح پھونکنے کے لئے قرون وسطیٰ کے مسلم سائنس دانوں کے کارناموں کی یاد تازہ کی جائے۔ جنھوں نے قرآنِ حکیم کی انقلابی دعوت کے نتیجے میں اپنے دور میں برق رفتار سائنسی ترقیاں کرکے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا جبکہ یورپ اُس دور میں وحشت و بربریت کے تاریک دور سے گزر رہا تھا۔ یہ آٹھویں صدی سے تیرہویں صدی عیسوی تک کی بات ہے۔ یورپ کی موجودہ ترقی اور اس کی نشأۃ ثانیہ چودھویں اور پندرھویں صدی سے شروع ہوتی ہے، جس کی بنیاد مسلمانوں کے علوم و فنون اور اُن کے تحقیقات و اکتشافات پر ہے۔

آج مسلم معاشرے کے سوچنے سمجھنے کے انداز اور اُس کے ذہنی و نفسیاتی احوال و کوائف میں تبدیلی لانے بلکہ اس کا "اندرون" بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ عصر جدید کے تمام علوم و فنون کو اسلامی بنا کر اور اسلامی اصطلاحوں میں پیش کیا جائے۔ ورنہ صدیوں کی دوری اور اجنبیت ـــــ جو ان علوم سے ربط ٹوٹ جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے ـــــ ختم نہیں ہو سکتی اور کوئی ہمہ گیر انقلاب نہیں آسکتا۔ اور اس معاملہ میں عوام سے زیادہ ہمارے علماء کی ذہن سازی کی ضرورت ہے۔

لہذا میں نے کوشش کی ہے کہ قرآنی حقائق و معارف سے جن علوم و مسائل کا

استنباط ہو سکتا ہے انھیں اصولی انداز میں اور حتی الامکان قرآن ہی کی اصطلاح بنا کر پیش کروں اور موجودہ علوم و فنون کی اصطلاحوں کے نام محض مترادفات کے طور پر لے آؤں۔ مثلاً "وعلم آدم الاسماء کلھا" سے میں نے ایک نئی اصطلاح "علم اسماء" کی اختیار کی ہے۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں اکثر و بیشتر مفسرین متفق ہیں کہ اس سے مراد تمام موجودات عالم اور اُن کے خواص و تاثیرات ہیں۔ اور اسی کا نام موجودہ دور میں سائنس ہے۔ مگر میں نے بجائے سائنس کہنے کے "علم اسماء" کی اصطلاح اختیار کی ہے تاکہ ہماری موجودہ ملّی روش کو دیکھتے ہوئے اجنبیت کی ان خلیجوں کو پاٹا جا سکے۔ اور ہماری ملت ان علوم کو اپنی کھوئی ہوئی متاع اور اپنی آبائی میراث سمجھ کر اُسے پھر سے اپنے سینے سے لگا سکے۔ اسی طرح ٹکنالوجی کی جگہ "تسخیر اشیاء" یا "علم تسخیر" کی قرآنی اصطلاح اختیار کی گئی ہے جو زیادہ قابل فہم بھی ہے اور موثر و حکیمانہ بھی۔ اسی طرح علم کیمیا کے لئے "علم مقادیر" کی اصطلاح لائی گئی ہے۔ غرض ہماری ملت کو، جو صدیوں سے پچھڑی ہوئی ہے، پھر سے آمادۂ عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تمام اصطلاحوں کو بدل دیا جائے، اور تمام چیزوں کو اسلامی علوم و فنون بنا کر پیش کیا جائے۔ کیونکہ قوموں کی روش کو بدلنے کے لئے دین و مذہب سے بہتر کوئی عامل نہیں ہے جو ان کے لئے ایک ہنٹر کا سا کام کرتا ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ قرآن حکیم اس سلسلے میں بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے اور چند بنیادی خطوط متعین کرتا ہے۔ ان خطوط اور نقشوں کے مطابق ہم اس کے خاکوں میں رنگ بھر سکتے ہیں۔ قرآن حکیم محض دینی و شرعی اعتبار سے ہی ہمارے لئے نامۂ ہدایت نہیں بلکہ وہ تمدنی و اجتماعی ہر حیثیت سے بھی ہمارے لئے ایک بہترین رہبر اور ناقابل فراموش ہدایت نامہ ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے ــــ اور دینی و دنیوی ہر نقطۂ نظر سے موجودہ حالات اس بات کے متقاضی ہیں ــــ کہ ہم سائنسی اور صنعتی علوم اور

ٹکنالوجی میں بتدریج ترقی کرکے اس میدان میں آگے بڑھیں۔ ہم صنعت و حرفت اور ٹکنالوجی میں برتری حاصل کئے بغیر عصر جدید میں امت مسلمہ کے دوبارہ غلبے یا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس میدان میں آگے بڑھنے سے نہ صرف ہماری پس ماندگی اور جہالت دور ہوگی اور ہمارے اذہان صیقل ہوں گے (جو ہماری پس ماندگی کی وجہ سے کند ہوچکے ہیں) بلکہ بہت سے دینی، ملی، معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی فوائد بھی حاصل ہوں گے۔ یہ ہمارے موجودہ بہت سے قومی و ملی امراض کا واحد علاج ہے۔ دین و دانش اور عقل و نقل سب کا تقاضہ اور مطالبہ یہی ہے کہ اس میدان کو سر کرکے عزت و سربلندی کا مقام حاصل کیا جائے۔

اردو زبان میں سائنسی کتابوں اور لٹریچر کی بہت بڑی کمی پائی جاتی ہے۔ اس کے اسباب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں مگر ہمارے معاشرے میں سائنسی مسائل اور سائنسی طرز فکر سے ناواقفیت کی یہ بھی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ لہٰذا اس کتاب میں قرآن حکیم کے نظریات و انکشافات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ جدید علوم اور ان کے مسائل و مباحث کا بھی ایک حد تک بنیادی تعارف کرا دیا جائے تاکہ وہ لوگ جو ان علوم کو نہیں جانتے وہ بھی ان سے بخوبی واقف ہو جائیں اور ان کے سامنے ان علوم کا ایک واضح خاکہ آجائے، جو ان علوم کی تحصیل مزید کا شوق اور جذبہ پیدا کرنے میں مدد دے سکے۔ اس مقصد کے پیش نظر سرسری بحث کے بجائے بعض مواقع پر ان علوم و مسائل کا فنی نقطۂ نظر سے تعارف کرایا گیا ہے اور ان کی اہمیت و افادیت پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ خصوصاً علم کیمیا اور طبیعیات کے تعارف اور سائنسی و صنعتی علوم میں ان کی بنیادی اہمیت کے پیش نظر (جو خلافت ارض کے نقطۂ نظر سے بھی اہم ہیں) ایک مستقل باب بعض قرآنی نظریات و انکشافات کی روشنی میں پیش

کیا گیا ہے۔

غرض اس کتاب میں میں نے دین و شریعت اور تمدن و اجتماع وغیرہ سے متعلق جن جدید مسائل و معاملات سے بحث کی ہے اور ان کا جو حل نکالنے کی کوشش کی ہے وہ قرآنِ حکیم کے ابدی حقائق اور محکم دلائل کی روشنی میں ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی بخوبی ظاہر ہو جائے گی کہ قرآن مجید ہر دور کے تقاضے کے مطابق عالم انسانی کی عموماً اور اُمت مسلمہ کی خصوصاً دینی و دنیوی، علمی و فکری، تمدنی و اجتماعی اور ملّی و بین المللی ہر حیثیت سے رہنمائی کر سکتا ہے۔ یہ محض ایک نِرا دعویٰ نہیں ہے بلکہ اس کا ثبوت اس وقت میری یہ کتاب اور اس کے مباحث ہیں۔ یہ ہماری کوتاہ بینی اور کم نگاہی ہے جس کی بنا پر ہم اس صحیفۂ ربانی اور اس کتابِ حکمت کو عملاً وہ درجہ اور مرتبہ نہیں دے رہے ہیں جس کی وہ صحیح طور پر مستحق ہے۔ اس بحرِ زخار میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جن کی موجودہ دنیائے انسانیت کو ضرورت ہے۔ اور ایسے گوہر آبدار پائے جاتے ہیں جن کے ملاحظے سے اقوامِ عالم کے "تاریک گوشے" منور ہو سکتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کا سب سے بڑا وصف اُس کی ہدایت و رہنمائی کا پہلو ہے۔ مگر عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں اس کا بہت ہی محدود تصوّر ہے۔ یعنی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہدایت و رہنمائی محض چند شرعی و فقہی مسائل تک محدود ہے۔ اس سے آگے اُسے کوئی سروکار نہیں ہو سکتا۔ جب لوگوں کا نقطۂ نظر یہ بن جائے تو ظاہر ہے کہ وہ جدید مسائل اور خصوصاً فکری، تہذیبی اور تمدنی امور میں قرآن سے رہنمائی حاصل کرنا ایک کارِ عبث سمجھیں گے اور اس طرح ان مسائل میں قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کوتاہ بینی کی بدولت ہم بہت بڑے خسارے میں رہیں گے اور قرآن فہمی سے دور ہو جائیں گے۔

لہٰذا ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ قرآن کا اصل موضوع کیا ہے اور اس کے مباحث و مقاصد کیا ہیں؟ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ قرآن کا اصل موضوع اس کی ہدایت و رہنمائی اور اس کا بنیادی مقصد انسان کی اصلاح ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ

ہدایت و رہنمائی کن امور میں ہے؟ تو اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ اس نے جن جن باتوں سے تعرض کیا ہے اور جو مباحث چھیڑے ہیں اُن سب میں ہے۔

اس حیثیت سے وہ شرعی احکام و اوامر میں بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے اور مختلف گمراہ قوموں ــــ یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین ــــ کے ساتھ مناظرہ و مجادلہ کرنے میں بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ جس طرح وہ نظام کائنات سے متعلق (گمراہ قوموں کی اصلاح کے لئے) دلیل و استدلال اور حجت و برہان قائم کرنے میں ہماری رہبری کرتا ہے اسی طرح وہ دنیا کی گزشتہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل کا کھوج لگانے اور صحیفۂ تاریخ سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے میں بھی ہماری رہبری کرتا ہے۔ اسی طرح وہ ہمارے اعمال کی جزا و سزا کے لحاظ سے آخرت کے عذاب و ثواب سے متعلق مختلف امور کی تفصیل بیان کر کے ہمیں صحیح رویہ اور صحیح طرزِ عمل اختیار کرنے کی راہ دکھاتا ہے[۵۲]۔

غرض جن جن اُمور اور جن جن مسائل و مباحث کو قرآن حکیم نے چھیڑا ہے ان تمام میں وہ ہماری پوری پوری ہدایت و رہنمائی کرتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور کسی موضوع و مبحث کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت گھٹائی نہیں جا سکتی۔ ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم بلاوجہ اور بلا کسی عقلی یا شرعی دلیل کے ایک چیز کو محدود کر رہے ہیں۔

ان علوم خمسہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں جدید سے جدید تر تمام فکری و نظریاتی، تہذیبی و تمدنی، معاشرتی و اجتماعی اور ملی و بین المللی تمام مسائل و مباحث آ سکتے ہیں۔ قرآنِ حکیم اصل میں مختلف علمی نظریات و تصورات کی ایک مختصر ترین انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس میں ایک عجیب و غریب اور

---

۵۲ یہ پانچ علوم بتصریح حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح قرآن کے علوم خمسہ ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "الفوز الکبیر"۔ شاہ صاحب کے مفہوم کو میں نے اپنے الفاظ اور اپنے اسلوب میں بیان کیا ہے۔

اعجازی انداز میں ہر دور کے علوم و فنون کے بنیادی نکات اور بنیادی مسائل اصولی انداز میں ودیعت کر دئیے گئے ہیں۔ جن کو بنیاد بنا کر ہر دور کے علوم و فنون کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے اور دفتروں کے دفتر سیاہ کئے جا سکتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کے ان لازوال اُصول و کلیات کی حیثیت ـــــ جو ہر دور میں مُحکم اور نا قابلِ تنسیخ ہوتے ہیں ـــــ مختلف علوم و فنون کے ابواب یا اُن کی چابیوں کی طرح ہے۔ ان اُصول و کلیات کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ قرآن اور جدید علوم میں گہری نظر رکھنے والے اور صاحبِ ذوق اصحاب ہی کر سکتے ہیں۔ یہ کوئی شاعری نہیں ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں میں نے اس کی مثالیں پیش کی ہیں اور بعض جدید ترین فکری و تمدنی مسائل کا قرآن حکیم کے ابدی نصوص سے استنباط کر کے اس کی صداقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان حقائق کے ملاحظے سے قرآنِ حکیم کے زبردست اعجاز اور اُس کی حیرت انگیز ہدایت و رہنمائی کا پتہ چلے گا کہ وہ کس کس انداز سے اور کیسے کیسے مشکل حالات میں ہماری رہنمائی کرتا ہے!

ہر دور کے کچھ مخصوص تقاضے اور مخصوص حالات ہوتے ہیں، جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب حکمت ہے کہ وہ ہر دور کے تقاضے اور ذہنیت کے مطابق منکرین حق سے مقابلہ آرائی کے لئے اپنے پیغمبروں کو معجزے بھی اُسی قسم کے عطا فرمایا کرتا ہے، جو اس دور کی ذہنیت کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جب سحر اور جادوگری کا زور تھا تو آپ کو بھی اسی سے ملتا جلتا معجزہ دیا گیا جس کی وجہ سے اس دور کے "فنِ خاص" کا زور ٹوٹ گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں طب کا بہت چرچا اور بہت زور تھا تو آپ کو بھی اسی قسم کا معجزہ عنایت کیا گیا۔ پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کے دور میں زباندانی اور فصاحت و بلاغت کا بڑا چرچا تھا تو آپ کو بھی ایسا معجزہ دیا گیا جس کے آگے اُن کے تمام کارنامے

ماند پڑ گئے۔ غرض یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ ہر زمانے کا توڑ اسی قسم کے ہتھیاروں سے کرتا ہے۔

مگر قرآنِ عظیم کے معجزے کا یہی ایک واحد اور تنہا روپ نہیں ہے جو ماضی میں ظاہر ہو چکا ہو بلکہ وہ ایک ایسا دائمی اور ابدی معجزہ ہے جس کے مطابق ہر دور میں اس کے تقاضے کے مطابق ایک بالکل نیا روپ ظاہر ہوتا رہتا ہے، جو نوعِ انسانی کو مبہوت و ششدر کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ آج بھی ایک زندہ اور لازوال معجزہ نظر آتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آج سائنس اور ٹکنالوجی کا دور دورہ ہے اور اس دور میں ان علوم و فنون کے دو پہلو ہیں۔

۱۔ ذہنی و فکری اعتبار سے ان علوم کی ترقی کا آج ایک سحر سا چھایا ہوا ہے اور عصرِ جدید اپنے آپ کو پچھلے تمام ادوار سے ممتاز اور برتر تصور کرنے لگا ہے۔

۲۔ تمدنی و اجتماعی حیثیت سے ان علوم کی اہمیت مسلّم ہو چکی ہے۔ جو قوم ان علوم و فنون سے متصف ہے وہ گویا کہ زمین پر برتر اور مادی اعتبار سے دیگر قوموں سے فائق تر ہے۔ اور جو قوم ان علوم سے تہی مایہ ہے وہ مادیات و اجتماعیات کے باب میں دیگر قوموں کی دست نگر اور محتاج ہے۔

لہٰذا ان علوم و فنون کا زور توڑنے اور ان کی برتری کے شیش محل کو چکنا چور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان بھی دو حیثیتوں سے کام کریں۔ ایک تو ان علوم و فنون میں کمال حاصل کر کے ان کی روشنی میں قرآن حکیم کے اصل معجزے کو ظاہر کریں جس کے ملاحظے سے موجودہ دور کی ذہنیت و عقلیت اور اُس کی برتری کا سحر ٹوٹ سکتا ہے (ملاحظہ ہو پانچواں باب) اور دوسری حیثیت سے وہ ان علوم و فنون میں دیگر اقوامِ عالم کی برابری کر کے قوت و طاقت کے اُس درجے تک پہنچ جائیں کہ پھر انہیں للکارنے اور چیلنج کرنے کی کسی میں ہمت ہی نہ رہے۔

عقل و منطق اور دین و شریعت سب کا تقاضہ یہی ہے کہ موجودہ عالمی

مسابقت کی یہ سب سے بڑی بازی جیتی جائے اور دین حق کو ہر حال میں غالب کیا جائے۔ ورنہ دوسری صورت میں سوائے ذلت و خواری، گداگری و پسماندگی اور اغیار کی محتاجی و غلامی کے اور کچھ نہیں مل سکتا۔ لوہے کا مقابلہ لوہا ہی کر سکتا ہے، لکڑی یا کوئی اور چیز نہیں کر سکتی۔ اور تلوار ہی تلوار کو کاٹتی ہے۔ لہٰذا علوم و فنون کا مقابلہ بھی علوم و فنون ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ یہی اللہ کی سنت اور یہی عہد آفرینش سے دستور الٰہی ہے کہ جس دور میں جس علم و فن کا دور دورہ ہو، اس کی کاٹ بھی اسی کے ہتھیاروں سے کی جائے۔ لہٰذا موجودہ علوم و فنون کا زور توڑنے اور موجودہ سحر سامری کی فضا سے باہر نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ان علوم میں برتری اور کمال حاصل کر کے ان علوم پر غیروں کی گرفت، اُن کی سیادت اور اُن کی اجارہ داری کو ختم کر دیا جائے اور مسلم معاشرے کو زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھا کر اس معجزے کو ظہور میں لایا جائے جس سے موجودہ غیر یقینی اور مایوسی کی فضا ختم ہو سکے اور اس کی جگہ ایمان و یقین کی مضبوطی، طمانیت قلب اور ملی احساس برتری کے جذبات بحال ہو سکیں۔

ہمیں اسباب و علل کی کارفرمائی کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت بھی عمومی اعتبار سے اسباب و علل ہی کے روپ میں اور کارزار عمل میں جد و جہد ہی کے باعث ظہور پذیر ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر مسلمانوں کے ذہن و دماغ میں آج کسی بھی حیثیت سے یہ تصور جاگزیں ہو کہ مہدئ موعود کا ظہور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ نزول ہوگا تو مسلمان خود بخود کامیاب ہو جائیں گے اور انھیں حرکت کرنے یا ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت نہیں ہوگی تو یہ نظریہ اور تصور (جہدِ مسلسل کو مہمل قرار دینے کا) بالکل غلط اور گمراہ کن ہے۔ اول تو ان کے دور کا کوئی تعین نہیں ہے اور پھر دوسرے یہ کہ قرآن اور حدیث میں کہیں بھی یہ مذکور نہیں ہے کہ مسلمان اپنے نجات دہندوں کا تصور کیے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جائیں۔ بلکہ انھیں تو زندگی کے

میدان میں ہر ممکن طریقے سے جد و جہد کرنے اور ملک و ملت کا دفاع کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ خلافت ارض کا بنیادی تصور اور اس کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ قوموں کی کامیابی و کامرانی کا راز جہاد زندگانی میں پوشیدہ ہے۔ دنیا میں قوموں کا عروج و زوال ہمیشہ سے متعین اور اسی ایک اصول پر قائم ہے، جس میں کبھی ردّ و بدل نہیں ہوا۔

قرآنِ حکیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود کفار مکہ کی فرمائش کے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیائے سابقین کی طرح معجزے عطا کیے جانے سے بار بار انکار کیا گیا۔[۵۳] کیونکہ آپ کو حسی معجزات کی بہ نسبت عقلی اور سب سے بڑا دائمی معجزہ دیا گیا۔ اس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ اب زمانہ بدل گیا ہے اور حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ لہذا اب اس قسم کے معجزات کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب جو کچھ بھی ظہور میں آئے گا وہ اسباب و علل کے روپ میں اور وسائل ہی کی حیثیت سے ہوگا۔ اور نصرت الٰہی بھی اسی روپ میں اور انہی اسباب و علل کے پردوں میں ظاہر ہوگی۔ لہذا ہمیں اسباب و علل کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اسباب و علل بھی خدا ہی کے بنائے ہوئے اور اس کے قوانین ربوبیت ہی کے ماتحت ہیں۔ نظامِ ربوبیت سے الگ ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔

غرض یہ وہ پیامِ عمل اور نوائے حق ہے جو آج ہمیں خدا کے آخری صحیفہ حکمت کے ذریعے سنائی جا رہی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس صوت سرمدی پر کان دھرا جائے اور پوری توجہ مبذول کرتے ہوئے ملت کی تعمیر نو کے لئے ایک جامع، حقیقت پسندانہ اور صحیح منصوبہ بنایا جائے اور پھر پوری نیک نیتی کے ساتھ اس پر عمل کیا جائے۔

اس کتاب میں میں نے مختلف موضوعات پر مشتمل بہت سی منتشر آیات کو

---

[۵۳] ملاحظہ ہو سیرت النبی۔ جلد سوم، از علامہ سید سلیمان ندوی۔

اکھٹا کرنے اور ان سب کو خلافت ارض کے نقطۂ نظر سے ایک لڑی میں پرونے اور اُن کا ایک مربوط فلسفہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح اس کتاب کے تمام مباحث خواہ وہ دینی و شرعی ہوں یا فقہی و کلامی، علمی و سائنسی ہوں یا تمدنی و اجتماعی سب کے سب ایک مرتب و مربوط انداز میں ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ قرآن کے فلسفۂ تمدن و اجتماع پر بھی شاید اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ میں نے اس کو مختلف پھولوں کا ایک گلدستہ بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے مگر میں نہیں جانتا کہ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں۔

کسی نئے مسئلے پر گفتگو کرتے وقت یا قرآن کی کسی آیت کا نیا مفہوم بیان کرتے وقت سب سے بڑا مسئلہ جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ سلف سے اپنا علمی و فکری رشتہ استوار کرنے کا ہے۔ یعنی ہم کو کوئی "نئی بات" کہنے کی کہاں تک اجازت ہے، اس کے حدود و ضوابط کیا ہیں اور پچھلے مفسرین اور ائمہ کرام کے اقوال اور ان کی تشریحات کو ہم کہاں تک اختیار کر سکتے ہیں اور کہاں تک انہیں نظر انداز کر سکتے ہیں؟ تو اس سلسلے میں میرے نزدیک یہ طریقہ نہایت درجہ غلط اور گھٹیا بلکہ خطرناک ہے کہ کوئی شخص جدید تحقیقات کا رعب جما کر یا محض اپنی بڑائی کے اظہار کی خاطر خواہ مخواہ متقدمین پر کیچڑ اُچھالے اور لوگوں کو پورے اسلامی ذخیرے سے بدظن اور برگشتہ کرنے کی کوشش کر بیٹھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید مسائل کے حل کے لئے خود سلف اور متقدمین کی روش اور ان کے طریقۂ کار ہی میں وہ بنیادی اصول مل جاتے ہیں جن کی بنیاد پر ہم قرآن حکیم میں غور و فکر کر کے نئے نقش و نگار بنا سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں سلف سے رشتہ توڑنے اور عام روش سے ہٹنے کی ضرورت نہیں۔ اس راہ میں اخلاص نیت اور صحیح نقطۂ نظر شرط ہے۔

اس سلسلے میں تفسیر کبیر [illegible] بطور ایک مثال اور رہنما موجود ہے [illegible] تحقیقی کام کرنے اور ہر قسم کے علمی و کلامی مسائل پر [illegible] کرنے

والوں کے لئے ایک مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ امام رازی رحؒ نے جس وسعت فکری اور صحیح اصولوں کے تحت اپنے دور کے سارے علوم و مسائل کو اپنی تفسیر میں سمیٹ لیا ہے، وہ بجائے خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اسی طرح دیگر ائمہ کرام خصوصاً امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ وغیرہ کی تحریروں اور تصنیفات میں بھی ہمیں بہت سے ایسے علمی، کلامی اور تفسیری اصول مل جاتے ہیں جن کی بنیاد پر —— اور ان کی روح کو مدنظر رکھتے ہوئے —— موجودہ دور میں امت کی ذہن سازی اور اس کی نشأۃ ثانیہ کا کام بخوبی کر سکتے ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مختلف مفسرین اور ائمہ کرام کے کلام اور اُن کی تشریحات میں ہمیں ایسے اجمالی اشارات اور اصول و کلیات مل جاتے ہیں جن میں ہم موجودہ دور کی معلومات کے مطابق تفصیلی رنگ بھر سکتے ہیں۔ اس صورت میں صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہو گا۔ اس کی بعض مثالیں آپ کو اس کتاب میں ملیں گی، خصوصاً "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا" کی تفسیر میں۔

لیکن پھر بھی یہ اصول یاد رکھنا چاہیئے کہ دینی و شرعی امور کے برعکس تکوینی یا نیچرل احوال و کوائف میں اختلاف رائے کی اگرچہ بڑی حد تک گنجائش موجود ہے، مگر تلاش کرنے پر خود متقدمین کے یہاں بعض اصول و نظائر اور اشارات و کنایات مل جاتے ہیں، جس کے باعث اصولاً انحراف کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مگر اس راہ میں بڑی دقت نظر، دماغ سوزی اور معاملہ فہمی کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے استاذ تفسیر مولانا محمد اویس ندوی نگرامی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ تفسیر طبری مختلف تفسیری اقوال کا ایک انسائیکلو پیڈیا ہے، جو تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے ایک بہترین تحفہ ہے۔ اس میں کسی لفظ یا آیت کے مختلف پہلوؤں سے متعلق اتنے اقوال مل جاتے ہیں کہ کسی کے لئے انحراف کی گنجائش نہ نکل سکے۔

مگر ان تمام معروضات کے باوجود یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ہر دور کا

ایک خاص فکر اور اس کے خاص معلومات ہوتے ہیں اور اس کا ایک خاص ذہنی و عقلی مزاج ہوتا ہے۔ اور ہر مفسر اپنے ہی دور کے احوال و کوائف کو بنیاد بنا کر گفتگو کرتا ہے۔ لہذا ایسے موقعوں پر ہمیں سابق مفسرین کے ادب و احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھنا چاہیئے اور ایسی کوئی بات نہ کہنی چاہیئے جس سے اُن کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہو۔ بلکہ ان کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے صحیح عقل و فکر سے کام لے کر اور ایک "نئے مسئلے" پر گفتگو کر کے ہمارے لئے ایک رہنما اصول قائم کر دیا ہے۔ ورنہ آج ہم بڑے حیران و سرگرداں ہوتے کہ جدید مسائل کے تعلق سے ہم کیا بات کہیں اور کس طرح کہیں!

بہر حال آج جو بھی "نئی بات" کہنی ہو وہ لغت، نحو، ادب، قرآن کی بنیادی روح، اُس کے اغراض و مقاصد اور دیگر صحیح تفسیری اصولوں کے تحت اور ان کے دائرے میں ہونی چاہیئے۔ اس دائرے سے باہر قدم نکالنا ذہنی انتشار اور پراگندگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ آج مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کرنے کی نہیں بلکہ انھیں دین پر مضبوطی کے ساتھ جمانے کی ضرورت ہے۔

اس کتاب میں میرا طریقۂ کار یہ ہے کہ اختصار پسندی کے پیشِ نظر (سوائے چند خاص مقامات کے جہاں پر میں نے ضرورت سمجھی) ہر ہر بات میں مفسّرین کے اقوال سے سند لانے کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے تمام مسائل کو قرآن کے بنیادی فکر اور اُس کے بنیادی اغراض سے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس بات کی بھی امکان بھر سعی کی ہے کہ میری تشریحات و تفہیمات مفسرین کی تشریحات و تفہیمات کے دائرے کے اندر ہی رہیں۔ مگر اس کی ہر ہر حیثیت سے مکمل تطبیق ایک سعی لاحاصل ہوگی جو کسی طرح ممکن نہیں۔ جیسا کہ خود ہمارے ذخیرۂ تفسیر پر تاریخی اعتبار سے نظر ڈالنے پر ظاہر ہوگا کہ ہر متاخر نے ذخیرۂ تفسیر میں کچھ نہ کچھ اضافہ کیا ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ صحیح اصولوں سے انحراف بھی کیا ہو۔

بہر حال راقم سطور جدید علمی و فکری اور کلامی مسائل میں ـــــ خاص کر

سائنس اور قرآن کی روشنی میں ـــــ گزشتہ بیس پچیس سال سے غور و فکر اور تحقیقی مطالعے میں لگا ہوا ہے اور پچھلے ۱۳ سالوں سے علمی و تحقیقی کام (عملی میدان میں) کر رہا ہے۔ اس بنا پر راقم کی بعض خاص تحقیقات اور خصوصی نتائج فکریہ ہیں، جو قرآن حکیم میں مسلسل غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ مگر میں نے انہیں مفسرین اور ائمہ کرام کے اقوال اور ان کے اصولوں سے مطابقت پیدا کرنے کی راہ میں بہت بڑی حد تک توازن قائم رکھنے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے۔

میری زندگی کے حالات بھی بڑے عجیب ہیں۔ جن کو اگر قلم بند کر دیا جائے تو وہ ایک دلچسپ داستان بن جائیں۔ مگر اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب اپنے ہی ہاتھوں قائم کردہ علمی ادارے (فرقانیہ اکیڈمی) کی داستان ہے جو مسلسل ہمت شکنیوں اور تلخیوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر راقم سطور عزم و حوصلہ ہارے بغیر "مایوس ماحول" میں بھی برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ جس کا نتیجہ اور ثمرہ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جو میرے ربع صدی کے مطالعۂ قرآن کا حاصل اور اس کا نچوڑ ہے۔

فرقانیہ اکیڈمی کو قائم ہوئے قریب قریب گیارہ سال ہو چکے ہیں۔ اور یہ عرصہ زیادہ تر در بدر کی ٹھوکریں کھانے میں گزر گیا۔ اگر ملت کا صحیح اور بر وقت تعاون ملا ہوتا تو پوری یکسوئی کے ساتھ علمی کام کرنے اور ملت کے سامنے بہتر سے بہتر نتائج فکریہ پیش کرنے کا زیادہ موقع ملتا۔ میری سب سے بڑی آرزو اور خواہش یہ ہے کہ قرآن حکیم کے تمام علوم و فنون کو موجودہ دور کے ذہن و مزاج کے مطابق نئے سرے سے مدوّن کر دیا جائے، جس کی وجہ سے قرآن حکیم کا رشتہ عصر جدید سے قائم ہو جائے، تاکہ وہ سب کے لئے ہر ہر اعتبار سے عبرت و بصیرت کا سرمایہ بن سکے۔ مگر اس کے لئے بہت زیادہ وسائل، قرآنیات سے متعلق پورے لٹریچر کی فراہمی اور کام کرنے والوں کی ایک ٹیم درکار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا بڑا اور ہمہ گیر کام ایک دو افراد کے بس کی بات نہیں ہے۔ لہٰذا

میں اپنی ملت کے موجودہ رویے کو دیکھتے ہوئے اکثر سوچتا ہوں کہ کیسا میری یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے اور مجھے اپنے اس محبوب موضوع پر ــــ چند رفقاء و معاونین کے ساتھ ــــ کام کرنے کا پوری طرح موقع مل سکتا ہے؟

یہ سطریں ختم کرنے سے پہلے میں اپنے عزیز دوست جناب خالد عرفان صاحب ایم ایس سی (کیمسٹری) کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تیاری میں بعض مقامات پر مفید مشورے دیئے۔ اور کچھ سائنسی معلومات کے حصول کے سلسلے میں میری مدد کی۔

چونکہ اس کتاب کے مباحث علمی ہیں اور وہ کافی ضخیم بھی ہو گئی ہے، اس لئے ارادہ ہے کہ عوامی استفادے کی غرض سے کتاب کے اہم اہم مباحث کی تلخیص کر دی جائے۔ اہلِ علم سے گزارش ہے کہ اس کتاب میں جو بھی فروگزاشت ہوئی ہو اُس پر راقم کو متنبہ کیا جائے تاکہ میں اپنی اصلاح کر سکوں۔

یہ کتاب پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کے موقع پر بطور ایک فالِ نیک پیش کی جا رہی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اس کو مقبول و نافع بنائے اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کی تشکیلِ نو اور تعمیرِ نو عمل میں آئے۔

محمد شہاب الدین ندوی

۱۹/ربیع الاول/۱۴۰۱ھ

۲۶/جنوری/۱۹۸۱ء

پہلا باب

خلافتِ ارض اور علمِ اسماء

- دنیا کا سب سے پہلا علم جو انسان کو دیا گیا
- علمِ اسماء کیا ہے؟
- علمِ اسماء اور علومِ سائنس
- علمِ اسماء اور خلافتِ ارض
- علمِ تکوین کی اہمیت
- علمِ اسماء اور علوم و فنون
- شرک اور مظاہر پرستی کا سدِ باب
- نظریۂ ارتقاء کی تردید
- خلیفہ ہونے کا صحیح مطلب
- عالمِ ارض میں انسان کی اہمیت
- علمِ اسماء اور نظامِ ربوبیت
- علمِ اسماء اور معرفتِ الٰہی
- قوانینِ فطرت ناقابلِ تغیر
- فطرت و شریعت کی ہم آہنگی
- اسباب و علل کا سلسلہ
- صرف اسماء حقائق نہیں
- نظریۂ میکانیت کی ناکامی
- وارثینِ علمِ آدم کا فریضہ
- کیا حضرت آدمؑ سائنٹسٹ تھے؟

خلافت ارض اور علم اسماء

خلافت ارض کے لئے سائنسی علوم کی اہمیّت

دنیا کا پہلا علم جو اِنسان کو دیا گیا

قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بارگاہ ایزدی سے انسان کو سب سے پہلا جو علم دیا گیا وہ "علم اسمار" (علم اشیار عالم) تھا۔ انسان کو اس علم سے سرفراز کئے جانے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انسان مظاہر کائنات اور اُن کے خواص سے بخوبی آگاہ ہو کر اُن سے فائدہ اٹھائے اور "خلافت ارض" کے تقاضوں کو پورا کرے۔ نیز دنیا سے ظلم و عدوان اور فتنہ و فساد کا خاتمہ کر کے عدل و انصاف قائم کرے تاکہ اللہ کی یہ سرزمین ہر اعتبار سے امن و امان کا گہوارہ بن جائے۔

علم اشیار عالم یعنی مظاہر فطرت کا علم" اور خلافت ارض" بظاہر دو الگ چیزیں معلوم ہوتی ہیں اور ان میں باہم کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ مگر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں بہت گہرا ربط و تعلق ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں "خلافت" اور "تعلیم اسمار" کا بیان ساتھ ساتھ آیا ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً ط قَالُوْٓا أَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ط قَالَ إِنِّيْٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ —

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو انھوں نے کہا کہ کیا تو ایسی ہستی کو بنائے گا جو زمین میں فساد اور خوں ریزی برپا کرے، حالانکہ ہم برابر تیری تسبیح و تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ میں وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اُس نے آدم کو تمام اسمار (موجودات عالم) کا علم دے دیا۔ پھر ان تمام موجودات کو فرشتوں کے سامنے (مجسم شکل میں) پیش کر کے کہا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو (کہ ہمارے علاوہ کسی دوسرے کو خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت ہے) تو ذرا مجھے ان چیزوں (موجودات) کے نام تو بتا دو (کیونکہ خلیفہ بننے کے لئے موجودات عالم سے واقفیت ضروری ہے)۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ تو پاک ہے، ہم کو (ان چیزوں کا) کوئی علم نہیں، سوائے اس کے جتنا کہ تو نے ہم کو سکھا دیا ہے۔ یقیناً تو ہی ہمہ دان اور دانش مند ہے۔ (تب) ارشاد ہوا اے آدم! ان کو اُن چیزوں کے نام بتا دو۔ تو آدم نے اُن کو تمام چیزوں کے نام (اسمار، اور خواص فرفر) بتا دئے۔ اللہ نے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں ہی زمین اور آسمانوں کی تمام پوشیدگیوں سے واقف ہوں اور ان باتوں کو بھی جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم (اپنے دلوں میں) چھپاتے ہو۔ (بقرہ : ۳۰ - ۳۳)

ان آیاتِ کریمہ میں سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" (اور اس نے آدم کو تمام اسمار کا علم دے دیا یا تمام نام بتا دئے)

سے کون سے علم مراد ہے اور اس کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے ؟ اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس علم کا خلافت ارض سے کیا تعلق ہے اور موجودہ دور میں اس کی کیا اہمیت ہے ؟ ان ہی دو بنیادی مسائل کی تنقیح اس وقت مطلوب ہے۔ باقی مسائل ضمناً آگئے ہیں۔

علم اسماء کیا ہے۔

"اَلْاَسْمَاءَ کُلَّهَا" (تمام ناموں) سے مراد مفسرین کی تصریحات کے مطابق تمام موجودات عالم اور تمام مظاہر فطرت کے نام اور اُن کے آثار و خواص کا علم ہے۔ یہ ایک وسیع علم ہے جس کو ہم مختصر طور پر بطور ایک اصطلاح "علم اسماء" (علم مظاہر فطرت) کہہ سکتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

اَلْاَسْمَاءُ: (واحد اسم) اسم کا مفہوم عربی زبان میں اردو کے "نام" سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اسم وہ ہے جس کے ذریعہ کوئی چیز جانی پہچانی جائے۔[1]

کسی چیز کا اسم اُس کی علامت ہوتی ہے۔ اسم الشیء علامتہ[2]

اسم کے اصل معنی ہیں جس سے کسی شے کی ذات معلوم کی جاسکے۔ الاسم مایعرف بہ ذات الشیء[3]

"اور یہ شناخت ممکن نہیں جب تک کہ اعراض، خواص، آثار کا علم بھی ساتھ ساتھ نہ ہو۔ یہ تو لفظی معنی ہوئے۔ آیت کی تفسیر میں محققین نے مراد معلومات اشیاء سے لی ہیں اور اسماء کے ساتھ مسمّیات اور ذوات وخواص اشیاء کو

---

[1] تفسیر ماجدی، ج ۱ ص ۷۰، طبع ثانی لکھنؤ۔

[2] القاموس المحیط، مجد الدین فیروز آبادی۔

[3] المفردات فی غریب القرآن، راغب اصفہانی، ص ۲۴۴، دار المعرفۃ، بیروت۔

شامل کیا ہے۔ اور اشیار کے اسمار سے مراد ان کے آثار و خواص کا علم لیا ہے گویا سارے علوم تکوینی آدم و بنی آدم کو ودیعت کر دئے گئے"[۵۹]

مفسرین کے دلائل

یہ گویا تمام تفاسیر کا حاصل اور خلاصۂ مطالب ہے، مگر اس بیان کو مزید مدلل کرنے کی غرض سے اس سلسلے میں چند تفسیروں سے کچھ مزید تفصیلات پیش کی جاتی ہیں۔ چنانچہ علامہ شہاب الدین آلوسی بغدادی (۱۲۱۷ــ۱۲۷۰ھ) اپنی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ اس سے علوی و سفلی اور جوہری و عرضی ہر اعتبار سے تمام موجودات عالم مراد ہیں۔

وقیل المراد بها أسماء ما کان وما یکون الی یوم القیامة، و عُزي الی ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنهما۔ وقیل اللغات، وقیل اسماء الملائکة، وقیل اسماء النجوم۔ وقال الحکیم الترمذی: أسماؤه تعالیٰ۔ وقیل وقیل وقیل۔ والحق عندی ما علیه اهل الله تعالیٰ۔ وهو الذی یقتضیه منصب الخلافة الذی علمت، وهو أنها اسماء الاشیاء علویة أو سفلیة جوهریة أو عرضیة۔ ویقال بها أسماء الله تعالیٰ عندهم باعتبار دلالتها علیه، وظهوره فیها غیر متقید بها، ولهذا قالوا ان اسماء الله تعالیٰ غیر متناهیة۔

ترجمہ: اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان تمام چیزوں کے نام ہیں جو واقع ہو چکی ہیں اور جو قیامت تک واقع ہونے والی ہیں۔ اور اس قول کی نسبت حضرت ابن عباسؓ کی طرف کی گئی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد زبانیں ہیں

---

[۵۹] تفسیر ماجدی، ۱/۷۰

ایک قول ہے مراد فرشتوں کے نام ہیں۔ ایک قول ہے مراد ستاروں کے نام ہیں۔ اور حکیم ترمذی نے کہا ہے کہ اس سے مراد اسمار الٰہی ہیں۔ اسی طرح کے اور اقوال بھی مروی ہیں۔ اور میرے نزدیک حق بات وہی ہے جس پر اہل اللہ قائم ہیں۔ اور وہ وہی چیز ہے جو منصبِ خلافت کی مقتضی ہے، اور وہ ہے: تمام چیزوں کے نام خواہ وہ علوی ہوں یا سفلی، جوہری ہوں یا عرضی۔ اور انہی چیزوں کو دیگر اقوال کے مطابق اسمار اللہ بھی کہا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ چیزیں اُس (کے وجود و صفات) پر دلالت کر رہی ہیں، اور یہ اسمار و صفات ان میں ظاہر ہو رہے ہیں، مگر انہی میں مقید نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اسمائے الٰہی بے پایاں ہیں۔[۵]

علامہ ابنِ کثیر (۷۰۰ — ۷۷۴ھ) اپنی تفسیر میں حضرت ابنِ عباسؓ اور مجاہد کے اقوال سے استدلال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

قال ھی ھذہ الاسماء التی یتعارف بھا الناس: انسان ودواب وسماء وأرض وسھل وبحر وخیل وحمار وأشباہ ذلک من الأمم وغیرھا۔ یعنی فرمایا (ابنِ عباسؓ نے) کہ یہ وہ نام ہیں جن سے لوگ متعارف ہیں، جیسے انسان، چوپائے، آسمان، زمین، میدان، سمندر، گھوڑا، گدھا اور انہی جیسے دیگر انواع و اقسام۔[۶]

وقال مجاھد: اسم کل دابۃ وکل طیر وکل شیٔ: مجاہد نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر چوپایہ، ہر پرندہ اور ہر چیز ہے۔[۷]

والصحیح انہ علمہ أسماء الاشیاء کلھا ذواتھا وصفاتھا

---

۵ ؎ تفسیر روح المعانی، ۱/۲۲۴، مطبوعہ دیوبند۔

۶ ؎ تفسیر ابن کثیر، ۱/۳، دار الاحیاء الکتب العربیۃ، مصر۔

۷ ؎ ایضاً، ۱/۷۳:

وافعالہا کما قال ابن عباس حتی الفسوۃ والفسیۃ : اور صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام، ان کے ذوات، ان کی صفات اور اُن کے افعال کا علم دے دیا تھا، جیساکہ ابن عباسؓ نے فرمایا ہے، یہاں تک کہ گوز اور پھسکی تک کا علم[۵۸]

اس کے بعد مفسر موصوف نے اس قول کی مزید تائید کے طور پر بخاری شریف کی ایک حدیث سے بھی استدلال کیا ہے (جو ایک طویل حدیث ہے اور اس کا وہ ٹکڑا ذیل میں نقل کیا جارہا ہے جس پر مدار استدلال ہے) اس حدیث کے مطابق لوگ قیامت کے دن کی ہولناکیوں سے پریشان ہو کر سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور اُن سے اس طرح مخاطب ہوں گے:

...... انت ابوالناس، خلقك الله بيده، واسجد لك ملائكته وعلمك اسماء كل شئ، فاشفع لنا عند ربك ...... آپ تمام لوگوں کے باپ ہیں، اللہ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور آپ کو تمام فرشتوں سے سجدہ کرایا، اور آپ کو تمام چیزوں کے نام بتا دیئے۔ لہٰذا آپ اپنے رب کے پاس ہماری سفارش کیجیے[۵۹]

اس حدیث کی تائید میں ابن کثیر نے مُسلم، نسائی اور ابن ماجہ کی روایت بھی پیش کی ہے۔ پھر اس کے بعد فرماتے ہیں:

فدل هذا على أنه علمه أسماء جميع المخلوقات : یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام مخلوقات کے اسماء سکھا دیئے تھے[۶۰]

---

۵۸ حوالۂ مذکور، ۱/۷۳

۵۹ بخاری کتاب التفسیر، ۵/۱۴۷، نیز بخاری کتاب التوحید، ۸/۲۰۳، مطبوعہ استانبول، ترکی، ۱۹۷۹ء

۶۰ تفسیر ابن کثیر، ۱/۷۳

علامہ ابن کثیرؒ نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ بہت مدلل ہے اور حدیث شریف کی تصریح کے بعد تو اس میں مزید کلام کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی بنا پر اکثر مفسرین نے آیت کریمہ کا یہی مفہوم مراد لیا ہے اور اس کے متعدد پہلوؤں پر بحث کی ہے۔

چنانچہ علامہ زمخشری (۴۶۷ ـ ۵۳۸ھ) اس آیت کی تحقیق میں فرماتے ہیں کہ یہاں پر مضاف الیہ کو حذف کر کے مضاف کو اس کا قائم مقام بنا دیا گیا ہے:

(وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا) أی أسماء المسميات، فحذف المضاف اليه لكونه معلوماً مدلولاً عليه بذكر الاسماء، لأن الاسم لابد له من مسمى: ناموں سے مراد چیزوں کے نام ہیں۔ یہاں پر مضاف الیہ (مسمیات) کو اسماء کے ذکر کی وجہ سے معلوم و مدلول ہونے کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسم کے لئے اس کا مسمی ہونا ضروری ہے[1]۔

پھر فرماتے ہیں:

فان قلت فما معنى تعليمه أسماء المسميات؟ قلت: أراه الاجناس التي خلقها، وعلمه أن هذا اسمه فرس، وهذا اسمه بعير، وهذا اسمه كذا وهذا اسمه كذا۔ وعلّمه أحوالها وما يتعلق بها من المنافع الدينية والدنيوية۔

اگر تم کہو کہ آدمؑ کو چیزوں کے نام سکھانے کے کیا معنی ہیں؟ تو میں کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تخلیق کردہ تمام اجناس آدم کو دکھا دیں اور انھیں بتایا کہ یہ گھوڑا ہے، یہ اونٹ ہے اور یہ فلاں چیز ہے اور یہ فلاں۔ اور پھر اس نے ان تمام چیزوں کے حالات، ان کے متعلقات اور دینی و دنیوی تمام منافع

---

[1] تفسیر کشاف، ۱/۲۷۲، مطبوعہ انتشارات آفتاب، ایران۔

بھی بتا دیئے۔[۱۲]

علامہ جصاص رازیؒ (المتوفی ۳۷۰ھ) فرماتے ہیں کہ اس لفظ (الاسمار) کے عموم میں اس کے تمام معانی داخل سمجھے جائیں گے (اصول فقہ کی رو سے):

یدل علی انہ علم الاسماء کلھا لآدم، اعنی الاجناس بمعانیھا لعموم اللفظ فی ذکر الاسماء: یہ بیان اس حقیقت پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو تمام اسمار سکھا دیئے تھے۔ یعنی اس لفظ کے عموم کی بنا پر اپنے تمام معانی و مفہومات سمیت جنسیں (موجودات عالم کی) مراد ہیں۔[۱۳]

پھر اس کے بعد بطور دلیل تحریر فرماتے ہیں:

وانہ علمہ ایاھا بمعانیھا اذلا فضیلۃ فی معرفۃ الاسماء دون المعانی، وھی دلالۃ علی شرف العلم وفضیلتہ: اور اس نے یہ تمام اسمار اپنے معانی و مفہومات کے ساتھ سکھا دیئے ہیں۔ کیونکہ بغیر معانی کے محض اسمار کی پہچان فضیلت کی کوئی بات نہیں ہے۔ اور یہ چیز علم کے شرف اور اس کی فضیلت پر دلالت کر رہی ہے۔[۱۴]

امام رازی (۵۴۴ھ — ۶۰۶ھ) اس لفظ (الاسماء) کے اشتقاق اور اس کے لغوی مفہوم پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

من الناس من قال قولہ وعلم آدم الاسماء کلھا، أی علمہ صفات الاشیاء ونعوتھا وخواصھا۔ والدلیل علیہ ای الاسم اشتقاقہ اما من السمۃ أو من السمو۔ فان کان من السمۃ کان الاسم ھو العلامۃ، وصفات الاشیاء ونعوتھا وخواصھا دالۃ علی ماھیاتھا۔ فصحّ ان یکون المراد من الاسماء الصفات۔ و

---

[۱۲] تفسیر کشاف، ۱/۲۷۲

[۱۳] احکام القرآن، ۱/۳۱، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۳۳۵ھ

[۱۴] حوالہ مذکورہ، ۱/۳۱

ان كان من السمو فكذلك لان دليل الشئ كالمرتفع على ذلك الشئ. فان العلم بالدليل حاصل قبل العلم بالمدلول. فكان الدليل اسمى فى الحقيقة. فثبت أنه لا امتناع فى اللغة أن يكون المراد من الاسم الصفة.

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ارشاد باری "وعلم آدم الاسماء کلھا" سے مراد چیزوں کی صفات، ان کی تعریفیں اور ان کے خواص ہیں۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ لفظ اسم یا تو "سمۃ" سے مشتق ہوگا ہو "سمو" سے۔ اگر اس کو سمۃ سے مشتق قرار دیا جائے تو وہ "علامت" کے معنی میں ہوگا۔ چونکہ چیزوں کی صفات، ان کی تعریفیں اور ان کے خواص ان کی ماہیات پر دلالت کرتی ہیں اس لئے اشیاء سے مراد ان کی صفتیں لینا درست ہوگا۔ اور اگر اس کو سمو سے مشتق قرار دیا جائے تب بھی اس سے یہی مراد ہوگا۔ کیونکہ کسی چیز کی دلیل اُس چیز سے بلند ہوتی ہے۔ اس لئے کہ دلیل کا علم مدلول سے پہلے حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا دلیل حقیقتاً زیادہ بلند ٹھہری۔ اس طرح ثابت ہوا کہ لغت کی رو سے اسم سے مراد (اُس کی) صفت لینا ممنوع نہیں ہے۔[۵۱]

علامہ رشید رضا (۱۲۸۲ھ – ۱۳۵۴ھ) نے اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے اس کا فلسفہ اس طرح سمجھایا ہے۔

(وعلم آدم الاسماء كلها) اى اودع فى نفسه علم جميع الاشياء من غير تحديد ولا تعيين. فالمراد بالأسماء المسميات، عبر عن المدلول بالدليل، لشدة الصلة بين المعنى واللفظ الموضوع له، وسرعة الانتقال من احدهما الى الآخر، والعلم الحقيقى انما هو ادراك المعلومات انفسها، والألفاظ الدالة عليها تختلف

---

۵۱ تفسیر کبیر، ۱/۲۵۰، مطبع حسینیہ، مصر۔

باختلاف اللغات، التی تجری بالمواضعة والاصطلاح فھی تتغیر وتختلف والمعنی لاتغیر فیہ ولا اختلاف

اللہ تعالیٰ نے آدم کی ذات میں تمام چیزوں کا علم بے حد و بلا تعین ودیعت کردیا۔ لہٰذا اسماء سے مراد مسمیات ہیں۔ مدلول کو دلیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایک تو لفظ موضوع لہٗ اور معنی کے درمیان قوی تعلق پایا جاتا ہے اور دوسرے ایک کے ذکر کے ساتھ ہی ذہن فوراً دوسرے کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ علم حقیقی دراصل بجائے خود معلومات کا ادراک کرنا ہے۔ اور وہ الفاظ جو ان معلومات پر دلالت کرنے والے ہوتے ہیں وہ موقع و محل اور اصطلاح کے اعتبار سے مختلف زبانوں میں مختلف و متغیر ہوتے ہیں، مگر نفس معنی میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔[۱۲]

حاصل یہ کہ "اسماء" سے مراد اُن کے مسمیات (اس عالم آب و گل کی تمام ہستیاں اور کُل موجودات) اور ان کے تمام آثار و خواص، اپنے تمام معانی و مفہومات کے ساتھ ہیں۔ بعض مفسرین نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر تمام علوم و فنون کو بھی اس لفظ کے عموم میں داخل کردیا ہے۔ مثلاً قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی[۱۴] تحریر فرماتے ہیں:

الھمہ معرفة ذوات الأشیاء وخواصھا واسماءھا وأصول العلم وقوانین الصناعات وکیفیة آلاتھا: آدم کو اُس نے چیزوں کی ہستیاں، اُن کے خواص، اُن کے نام، علم کے اصول صنعتوں کے قوانین اور صنعتوں میں استعمال ہونے والے آلات کی کیفیات (غرض سب کچھ الہام کردیا۔[۱۵]

۱۲؎ تفسیر المنار، ۱/۲۶۲، دارالمعرفة، بیروت (لبنان)

۱۴؎ بقول امام سُبکی ۶۹۱ھ میں اور ابن کثیر کے نزدیک ۶۸۵ھ میں وفات پائی۔ ملاحظہ ہو تاریخ تفسیر و مفسرین، ص ۲۶۹

۱۵؎ تفسیر بیضاوی۔ ۱/۶۱، مطبوعہ دیوبند

شیخ طنطاوی جوہری (۱۲۸۷ — ۱۳۵۸ھ، ۱۸۷۰ — ۱۹۴۰ء) تحریر فرماتے ہیں:

والھمہ المعرفۃ والاختراع وسائر الصناعات: اور اس (اشیاء کی) معرفت۔ ایجاد و اختراع اور تمام صنعتیں الہام کر دیں[۹۵]

پھر موصوف دوسری جگہ اس کی حکمت اور اس کا فلسفہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

سخرت لہ السموٰت والأرضون والبر والبحر والروض والقفر والجبل والسھل، فعلم الأسماء والصفات وخواص المخلوقات لیعرفھا وتنفعہ، ولذلک یقول (وعلم آدم الاسماء کلھا) وحتی بمن سخرت لہ الافلاک وقامت بنظامھا الأملاک ومن سجدت لہ العوالم سجود تسخیر وقامت لہ تعظیمًا بالتدبیر أن یتحلی بالعرفان لیفھمھا وینطق باللغات وینظمھا، دعت حاجتہ الی العوالم تعرفھا لہ مبدعہ۔

آدم علیہ السلام کے لئے ارض و سماء، بر و بحر، چٹیل میدان و مرغزار، بیابان و کہسار سب مسخر کر دیئے گئے۔ پس اُس نے مخلوقات کے تمام اسماء اور خواص و صفات کا علم (آدم کو) دے دیا، تاکہ وہ ان اشیاء کو اچھی طرح پہچان لے اور ان سے فائدہ اٹھائے اسی لئے ارشاد ہوا (اور اُس نے آدم کو تمام اسماء کا علم دے دیا) اور اُس ہستی کے لئے جس کی خاطر تمام افلاک و اجرام مسخر کر دئیے گئے ہوں۔ تمام خطوں کو اپنے نظاموں کے ساتھ آراستہ کر دیا گیا ہو اور تمام عوالم اس کو تسخیری سجدہ کر کے اس کی تعظیم و تکریم پر کمربستہ ہو چکے ہوں، بہتر و مناسب تھا کہ وہ ان سب چیزوں کا عرفان حاصل کر لے، تاکہ وہ ان کو اچھی طرح سمجھ کر اپنی زبان میں ان کا نطق کرے اور

---

۹۵ تفسیر الجواھر، ۱/ ۵۲ طبع ثانی، مصر، ۱۳۵۰ھ

انھیں منظم کرنے (اسی وجہ سے اس کو ان عوالم کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت پڑی۔ لہذا خلّاق عالم نے ان تمام چیزوں کا تعارف آدم سے بخوبی کرا دیا[۲۰]۔

چند حیرت انگیز حقائق

یوں تو سورہ بقرہ کی ان آیات میں ہمارے لئے بہت سے اسباق و بصائر ودیعت کر دئے گئے ہیں مگر اس موقع پر "خلافت ارض" کے تعلق سے صرف چند حقائق و معارف کے بیان و استنباط پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱ــ مہمان سرائے ارض کی آراستگی

"الاسماء کلھا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیقِ آدمؑ سے پہلے تمام اشیائے عالم اور کل انواعِ حیات کی تخلیق مکمل ہو گئی تھی۔ بالفاظ دیگر خلافت ارض کے مقاصد کی تکمیل کے لئے کرۂ ارض ہر قسم کے سامان حیات اور متاع زندگی سے پوری طرح آراستہ و پیراستہ کر دیا گیا تھا، تاکہ مہمان سرائے عالم میں کسی بھی چیز کی کمی محسوس نہ ہو اور اس میں کوئی نقص یا عیب نہ رہ جائے۔ بلکہ وہ ہر حیثیت سے انسانی فطرت اور اس کی ضروریات سے مکمل طور پر ہم آہنگ رہے۔ آیت کریمہ "وَاٰتٰکُمْ مِنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْہُ" (اور اس نے وہ سب کچھ تم کو دیدیا جو تم نے یعنی تمہاری فطرت نے مانگا) کا بھی یہی مطلب ہے۔

---

۲۰ تفسیر الجواھر، ۱/۵۳

۲۔ علم اسمار اور علوم سائنس

انسان کو سب سے پہلا جو علم دیا گیا وہ علم اشیار ہے یعنی تمام موجوداتِ عالم اور اُن کی خصوصیات و امتیازات کا علم۔ اس کو ہم مختصر طور پر "علم اسمار" یا "علم مظاہر کائنات" کہہ سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں سائنس جن چیزوں سے بحث کرتی ہے وہ یہی موجودات عالم ہیں، اور جو باتیں بیان کرتی ہے وہ یہی "اشیار کے آثار و خواص" ہیں۔ طبیعیات (physics) کیمیا (chemistry) حیاتیات (biology) ارضیات (geology) اور فلکیات (astronomy) وغیرہ تمام سائنسی علوم کا دائرہ مادی چیزوں (مسمیات) اور ان کے امتیازات و خصوصیات یا "آثار و خواص" (اسمار) ہی کے گرد گھومتا ہے۔ لہٰذا "الاسماء" کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھنا سائنسی علوم کے وقوف پر موقوف ہے۔ سائنس نام ہے دنیا میں پائی جانے والی مادی چیزوں اور اُن کی ساخت و پرداخت کے مطالعے کا۔

۳۔ علم اسمار اور خلافت ارض

"تعلیم اسمار" کا تعلق خلافت ارض سے ہے۔ ان دونوں کا بیان زیر بحث آیات میں ساتھ ساتھ آیا ہے اور ان دونوں کا آپس میں بہت گہرا ربط و تعلق ہے، جیسا کہ علامہ طنطاوی جوہری کے اوپر نقل کردہ اقتباس سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان جب تک اشیائے عالم کی حقیقت، اُن کی ساخت و پرداخت، اُن کے اعمال و وظائف اور ان کی طبعی و نوعی خصوصیات سے بخوبی واقف نہ ہو جائے اُن سے مستفید نہیں ہو سکتا اور انھیں مسخر کر کے ان میں ودیعت شدہ قوتوں کو کام

میں نہیں لاسکتا۔ جب وہ موجوات عالم سے مستفید نہیں ہوگا اور اُن کی قوتوں کو زیر نہیں کرے گا تو اس کا خلیفہ ہونا ایک بے معنی بات ہوگی اور خلافت کے دیگر تمام مقاصد فوت ہوجائیں گے (تفصیل آگے آرہی ہے) چنانچہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

"پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقام علم میں آدمؑ کے تفوّق کا ذکر کرکے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافت ارض کے لئے زمینی مخلوقات کے نام اور ان کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ہے، اور فرشتوں کی استعداد اس کی متحمل نہیں۔"[۵۲۱]

شیخ طنطاوی جوہری تحریر فرماتے ہیں:

فمن لم یقدر علی معرفۃ مراتب الاشیاء لا یستحق ان یکون خلیفۃ علیھا۔ جو ہستی اشیائے عالم کے مراتب سے ناواقف ہو وہ ان اشیاء پر خلیفہ ہونے کی مستحق نہیں ہوسکتی۔[۵۲۲]

۴۔ علمِ تکوین کی اہمیّت

حضرت آدمؑ کو تمام اشیاء کا علم سکھانے والا خود اللہ تعالیٰ ہے، جو بنصِ قرآنی "معلم اول" ہے۔ (وعلّم آدم الاسماء کلھا) اس میں اس بات کی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے منصوبے کے مطابق اولادِ آدم میں یہ صلاحیت رکھ دی ہے کہ وہ اشیائے عالم اور ان کے خواص کا علم حاصل کریں. اس لحاظ سے اولادِ آدم مظاہر کائنات کا علم بتدریج حاصل کرکے گویا "تعلیم الٰہی" کی تصدیق کر رہے ہیں۔

---

۵۲۱ تفسیر معارف القرآن، ۱/۱۷۸، مطبوعہ دیوبند۔

۵۲۲ تفسیر الجواہر، ۱/۵۲

علامہ رشید رضا تحریر فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام باتیں بتا دیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اللہ نے آدم کو یہ تمام باتیں خواہ ایک ہی وقت میں بتا دی ہوں یا متعدد مرتبہ۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ علمی قوت ہر آدمی میں عام ہے۔ اس لئے یہ لازم نہیں آتا کہ آدم کی اولاد "اشیائے کائنات" کو پہلے ہی دن جان لیں۔ انسانوں میں اس قوت کے اثبات کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ ان کو بحث و استدلال کے ذریعے اشیاء کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔[۹۲۳]

آدم اور اولاد آدم کے علم میں بین فرق یہ ہے کہ حضرت آدم کا علم "لدنی" تھا یعنی وہ علم جو کسی کو بارگاہِ خداوندی کی جانب سے بغیر کسب و مشقت عطا کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اولادِ آدم کا علم کسبی ہے۔ یعنی وہ علم جو محنت و مشقت کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ مگر اس کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم میں روزِ ازل ہی میں رکھ دی تھی، تاکہ وہ اشیائے عالم کی تسخیر کر کے خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

ان تفصیلات و تصریحات سے علم کی فضیلت تو ثابت ہوتی ہی ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ علم تکوین یا علم مظاہر کی اہمیت بھی۔ اس علمی برتری ہی کی بدولت انسان مسجودِ ملائکہ بنایا گیا۔

اس بحث سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ مظاہر فطرت اور ان کے نظاموں کا علم حاصل کرنا غیر اسلامی، یا ناجائز یا غیر ضروری یا بے کار و بے فائدہ نہیں بلکہ وہ عین "تعلیم الٰہی" اور منشائے خلافت کے مطابق ہے اور اس سے اعراض و چشم پوشی دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے نقصانِ عظیم کا باعث ہوگا، جیسا کہ تفصیلات آگے آ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی پیدائش کے فوراً بعد اس کو کائنات اور مظاہر کائنات کے علوم سے بہرہ ور کیا گیا ہے۔

۹۲۳؎ تفسیر المنار، ۱/۲۶۳

۵ ــ علم اسمار اور علوم و فنون

تفسیر بیضاوی اور تفسیر جواہر کی تصریحات کے مطابق " وعلم آدم الاسماء کلھا " کی وسعت اور اس کے اقتضار میں تمام علوم و فنون بھی داخل ہیں جن کو موجودہ زبان میں سائنس اور ٹکنالوجی کہا جا سکتا ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کیا ہے؟ مادہ (matter) اور اس کی قوتوں (energies) کی جان کاری اور ان سے استفادہ۔ مثلاً مختلف مصنوعات، کیمیاوی مرکبات، انواع و اقسام کے سامان تمدن کی تیاری کے لئے برق، بھاپ وغیرہ کو قابو میں کر کے مختلف میدانوں میں بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانا۔ چنانچہ آج دنیا میں جتنی بھی صنعتیں (INDUSTRIES) کام کر رہی ہیں اور اُن سے جو تمدنی و معاشی فوائد حاصل ہو رہے ہیں وہ سب انہی علوم کی ترقی کی بدولت ہیں۔

" علم اسماء " یا دوسرے لفظوں میں سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کئے بغیر موجودہ دور میں خلافت ارض کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

۶ ــ شرک اور مظاہر پرستی کا سدِ باب

مادہ پرست اور خدا بیزار لوگ کہتے ہیں کہ مذہب اور اخلاق ماحول کی پیداوار ہیں۔ ابتداءً انسان نے جب جنم لیا تو اپنے چاروں طرف ایک عجیب و غریب ماحول اور خوفناک مظاہر دیکھ کر ڈر گیا ہوگا اور انہیں رام کرنے اور ان کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے انھیں پوجنا شروع کر دیا ہوگا۔ اس طرح بزعم خود مذہب کی ابتدا ہوئی اور رفتہ رفتہ خدا کا تصور پیدا ہوا۔

بعض صحیح العقیدہ مسلمان بھی ان خیالات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم تحریر کرتے ہیں :

" اس میں کچھ شک نہیں (جیسا کہ ہربرٹ اسپنسر اور دیگر فلسفیوں اور محققوں نے ثابت کیا ہے) کہ انسان بھوت پریت یا سایہ سے خدا تک پہنچا ہے۔ اگرچہ اس کا ابتدائی خیال خوف کی وجہ سے اسے اپنے سایہ یا دوستوں اور بزرگوں کی موت یا خواب دیکھنے کی وجہ سے ہوا ہے"[۲۴]

مگر آدم کو " علم اسمار " دیا جانا اس بات کی تردید ہے کہ دنیا کا پہلا انسان جہل ودہشت کے تاریک اور ہیبتناک ماحول میں نہیں بلکہ علم و معرفت کے اجالے اور اس کی تیز روشنی میں نمودار ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں علم اسمار کی مشعل تھمادی گئی تو دوسرے ہاتھ میں "تسخیر اشیار" کی عنان (قوت دماغی کی شکل میں) دے دی گئی تاکہ وہ ان دونوں کی مدد سے خلافت کے میدان کو سر کرے۔

غرض آدم کو ابتدا ہی میں تمام اشیار کا علم دے دینے کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ وہ ان مظاہر سے کسی قسم کا خوف یا دہشت محسوس نہ کرے۔ گویا کہ ہر چیز کا تعارف شروع ہی میں کرا کے شرک اور مظاہر پرستی کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا، اور اعلان یہ کیا گیا تھا کہ یہ مظاہر انسان کے دیوی دیوتا نہیں بلکہ سب کے سب اس کے خادم اور حاشیہ بردار ہیں۔ اور انسان کا مرتبہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہے کہ وہ بجائے خالق ارض وسما کے ان مخلوقات کے آگے اپنا سر نیاز خم کرے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ اور ہم نے آدم کی اولاد کو یقیناً عزت بخشی اور انھیں بر و بحر میں سواریاں عطا کیں، (خود دو نوش کی)

---

[۲۴] مذہب اور سائنس، از مولوی عبدالحق، ص ۳۹، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۰ء

عمدہ چیزوں سے انھیں نوازا اور بہت سی مخلوقات پر انھیں کلّی فضیلت بخشی۔
(بنی اسرائیل : ۷۰)

۷ — نظریۂ ارتقار کی تردید

مذکورۂ بالا بحث سے یہ حقیقت بھی بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان کی تخلیق اور اس کی تربیت بالکل خصوصی حیثیت سے اور ایک خاص ماحول میں عمل میں آئی ہے۔ اور یہ تمام باتیں نظریہ ارتقار کی بھی تردید کر رہی ہیں۔

نظریہ ارتقار پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ لیکن یہاں پر جو بنیادی حقیقت ثابت ہو رہی ہے اس کا اظہار ضمناً مقصود ہے۔ جیسا کہ مادیین نظریہ ارتقار کی تشریح کرتے ہیں: ایک نوع کو دوسری نوع تک بتدریج پہنچنے میں ہزاروں لاکھوں سال لگ جاتے ہیں۔ مگر اس نظریہ کی رو سے انسان جب لاکھوں سال میں بندر سے اپنے موجودہ روپ میں ظاہر ہوا تو کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنے ظہور کے ساتھ ہی نطق وگویائی سے بھی متصف ہو جاتا اور تمام موجودات عالم اور ان کے خواص وتاثیرات سے بیک وقت واقفیت حاصل کر لیتا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس کو ہزاروں سال محنت کرنی پڑتی۔ اسی بنا پر بعض لوگوں کا قیاس ہے کہ انسان سب سے پہلے اشاروں کنایوں کے ذریعے اپنا ما فی الضمیر ادا کرتا رہا ہوگا۔ نطق وگویائی اور لکھنا پڑھنا وغیرہ بہت بعد کی چیزیں ہوں گی، جو ترقی یافتہ دور کی نشانی ہیں۔

مگر ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہی نطق وگویائی سے متصف کر کے قلم کے ذریعے (اس کی تشریح آگے آ رہی ہے) آپ کو تمام موجودات عالم کا علم عطا کر دینا اس بات کی کھلی تردید ہے کہ دنیا کا پہلا انسان اتفاقی طور پر یا "ارتقار" کے نتیجے میں نہیں بلکہ تخلیق خصوصی کے طور پر ظہور پذیر

ہوا ہے[۲۵] " خلق الانسان علمہ البیان " (اس نے انسان کو پیدا کر کے بولنا سکھایا) میں اسی صداقت عظمیٰ کا اظہار موجود ہے کہ تخلیق انسان اور اس کی قوت بیانی کی تعلیم کے درمیان کسی قسم کا فصل یا انقطاع موجود نہیں ہے۔ یہ فائدہ یہاں پر اس لئے حاصل ہو رہا ہے کہ ان دونوں فقروں کے درمیان حرف عطف موجود نہیں ہے۔ لہذا یہ دونوں امور بیک وقت اور بلا انقطاع عمل میں آئے ہیں۔ سائنٹفک نقطۂ نظر سے انسان کی تخلیق جس قدر حیرت انگیز ہے اس کی قوتِ گویائی اور اظہار بیان کی صلاحیت بھی اُسی قدر تحیر خیز ہے۔

۲۵؎ ابھی حال ہی میں آکسفورڈ سے ایک کتاب "نا معلوم حقائق کی لغت" The Encyclopedia of Ignorance کے نام سے شائع ہوئی ہے اس میں سائنس کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ساٹھ مستند ماہرین نے بنظر غائر اپنے اپنے علم و فن کا جائزہ لے کر یہ دکھایا ہے کہ انسانی معلومات کا دائرہ بہت ہی محدود ہے اور طبیعی و حیاتیاتی علوم کے بہت سے ایسے اسرار ہیں جن کو انسان اب تک نہیں جان سکا ہے۔ اس وقیع اور قابل قدر کتاب میں نظریہ ارتقاء کی تردید میں بھی چند مضامین بہت اچھے ہیں۔ اور ایک مضمون کا عنوان ہی " نظریۂ ارتقاء کے مغالطات"

Fallacies of Evolutionary Theory ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ انسان نام نہاد ارتقائی قوانین کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ اور ان کو حقائق کا نام دینا سفسطہ اور مغالطہ ہے۔ چنانچہ صاحب مضمون (Tomlin) اپنے مضمون کے آخر میں تحریر کرتا ہے: " موجودہ ارتقائی تفکیر میں سخت پیچیدگی۔ جو بہت سے مغالطات پیدا کرنے کا باعث ہے ـــــ یہ ہے کہ حیاتیاتی حقائق کی تشریح و توجیہہ از کار رفتہ طبیعی نظریات کی روشنی میں کی جاتی ہے۔"

(انسائیکلو پیڈیا آف اگنورنس، ص ۲۳۴، آکسفورڈ ۱۹۷۸ء)

یہ دونوں چیزیں صفاتِ خداوندی کی مظہر ہیں، اس لئے انسان ان کی مکمل حقیقت کبھی نہیں سمجھ سکتا۔

نیز انسان کو خلیفہ (ایک ذمہ دار اور جواب دہ ہستی) قرار دیا جانا بھی نظریہ ارتقار کی تردید ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز آپ سے آپ ظہور میں آجائے اس پر شرعی و اخلاقی نقطۂ نظر سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس صورت میں اس کو کسی خالق و صانع اور مربی و منتظم کی قدرت اور منصوبہ بندی کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حالانکہ قرآنِ حکیم کائنات سے متعلق ہر چیز کی خدائی منصوبہ بندیوں کے تذکرے سے بھرا پڑا ہے۔

۸۔ قوتِ گویائی اور تعلیم بالقلم

چونکہ اوپر کی بحث میں تخلیق انسان اور تعلیم بیان کا تذکرہ ضمناً اور بالکل مجمل طور پر آیا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم کے دیگر مقامات کی روشنی میں اس موضوع پر کچھ مزید روشنی ڈالی جائے تاکہ تخلیقِ آدم کے بعد "تعلیم اسمار" تک جو درمیانی مدارج ہیں وہ بھی واضح ہو جائیں اور قرآنِ حکیم کے مختلف بیانات میں تطبیق بھی ہو جائے۔ چنانچہ دیگر مواقع پر مذکور ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد نہ صرف اُس کو بولنا سکھایا اور قلم کے ذریعے اُس کی تعلیم دی بلکہ اُس کو وہ سب بتادیا جس کو وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا۔ (وہ ذات برتر) جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے

سے پیدا کیا۔ پڑھ! تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔ اور انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیا جسے وہ (پہلے سے) نہیں جانتا تھا۔ (علق: ۱-۵)

اور ایک دوسرے مقام پر اس اجمال کی تفصیل میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو پیدا کرنے کے بعد سب سے پہلے اس کو بولنا سکھایا (اور نطق و گویائی اور اظہار بیان کی تعلیم دی۔ پھر اس کے بعد مظاہر کائنات کی پہچانت کرائی گئی۔ سب سے پہلے نطق و گویائی اور اظہار بیان کے عطا کئے جانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ مظاہر کائنات کے علم و معرفت کو اپنی زبان میں ادا کرنے کے قابل بن جائے، جس کے بغیر علوم کی ترقی اور حجت و استدلال کا بازار گرم نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ سارے علوم اور تمام اسرار دلوں ہی میں بند رہتے اور ان کے باہر نکلنے کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝

رحمٰن وہ ہے جس نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو پیدا کر کے اس کو گویائی سکھائی۔ (پھر اس کے بعد انسان کو یہ علم دیا کہ) آفتاب و ماہتاب ایک حساب کے پابند ہیں۔ اور تمام، ستارے اور (تمام) درخت (تکوینی اعتبار سے) سجدہ ریز ہیں۔ اور آسمان کو اس نے اونچا کیا اور (اس میں) میزان رکھ دی (اور عرش سے فرش تک تمام موجودات کو یہ حکم دیا کہ کوئی (اپنی) میزان (خدا کے مقرر کردہ ضوابط طبیعی) سے تجاوز نہ کرے۔ (رحمٰن: ۱-۸)

ان آیات میں بنیادی طور پر چار باتیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ خدائے رحمٰن وہ ہے جس نے نوع انسانی کو قرآن کی تعلیم دی۔ اس قرآن کے ذریعے وہ تمام اسرار کھولے جا رہے ہیں جن کو انسان اس سے پہلے نہیں جانتا تھا یا انہیں فراموش کر چکا تھا، یا اُن کے بارے میں شکوک و شبہات اور غلط فہمیوں میں مبتلا تھا۔

۲۔ چنانچہ انسان کو پیدا کرنے کے بعد سب سے پہلے اُس کو نطق و گویائی اور

اظہار بیان کی قوت و صلاحیت عطا کی گئی۔ اس لحاظ سے دنیا کا پہلا انسان اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے اشاروں کنایوں کی زبان کا محتاج نہیں تھا بلکہ وہ حقیقتاً قوت گویائی سے متصف تھا۔

۳ــ اظہارِ بیان کے دو ہی طریقے ہیں جن کے ذریعے دلیل واستدلال قائم کیا جا سکتا ہے، یا جذبات واحساسات کا اظہار کیا جا سکتا ہے: (۱) نطق و گویائی (۲) کتابت۔ یہ دونوں طریقے انسان کو ابتدا ہی میں سکھا دیئے گئے۔ تاکہ وہ مظاہر کائنات سے جاہل نہ رہے، بلکہ ان سے بخوبی تعارف حاصل کر کے ان کے اندر ودیعت شدہ فوائد سے بھی مستفید ہو۔ اور دوسری طرف آنے والی نسلوں کو کائنات میں ان کی اصل پوزیشن سے بھی آگاہ کرتا رہے۔

۴ــ اسی بنا پر انسان کو سب سے پہلا جو علم دیا گیا وہ مظاہر کائنات کا علم تھا۔ جیسا کہ ان آیات کریمہ میں "علمہ البیان" کے فوراً بعد فرمایا گیا "الشمس والقمر بحسبان الخ" یعنی اظہار بیان کی قوت سے متصف ہوتے ہی فوراً تمام مظاہر کائنات کا علم دے دیا گیا۔ یہ آیات کریمہ "وعلم ادم الاسماء کلھا" کے اجمال کی بھی بخوبی تشریح و تفسیر کر رہی ہیں۔

اس لحاظ سے حضرت آدم کو "علم اسمار" دیئے جانے کی ترتیب یوں ہوئی:

۱ــ سب سے پہلے آپ کو بولنا سکھایا گیا۔

۲ــ پھر قلم کے ذریعے تعلیم دی گئی۔

۳ــ پھر اشیائے کائنات اور ان کے آثار و خواص کا علم بخشا گیا۔

سورۂ رحمان میں غور کرنے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس علم کے عطا کیئے جانے کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اُس کی ربوبیت کی توضیح و تفصیل کرنا نیز شرک اور دیگر فکری گمراہیوں کی تردید کرنا ہے۔ یہ مقصد مظاہر کائنات کے صحیح اور مفصل علم کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے انسان کو سب سے پہلے مظاہر کائنات کا علم دیا گیا تاکہ وہ دنیا کی بھول بھلیوں

میں بھٹکتے ہوئے اپنے خالق و معبود کو فراموش نہ کر بیٹھے۔

برسبیل تذکرہ سورۂ رحمٰن میں انسان کے آغاز و انجام کی تفصیلات اور ربوبیت کی کرشمہ سازیوں کا بیان انسان کی عبرت و بصیرت کے لئے ایک عجیب و غریب اور اعجازی انداز میں مرقوم ہے اور اس میں ترغیب و ترہیب کے دونوں فطری طریقوں سے کام لیا گیا ہے۔

قرآن حکیم کی تشریح و تفسیر کا ایک صحیح اور بہترین اصول یہ ہے کہ اس کی کسی مُجمل آیت یا کسی مبہم مقام کی تشریح اسی کی دیگر مفصل آیات سے کی جائے۔ القرآن یُفسّر بعضہ بعضاً۔ اس اصول کے مطابق نہ صرف مبہم آیت کریمہ کی بخوبی توضیح ہو جاتی ہے بلکہ متعلقہ تمام آیات بھی ـــــ جو ایک ہی موضوع سے متعلق ہوں ـــــ باہم مربوط اور معنی خیز بن جاتی ہیں۔ جن کے باعث قرآن کے ابہامات واضح اور اس کے اسرار و معارف کھلتے چلے جاتے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ پورا واقعہ عالم غیب کا ہے اور وہ بھی اس وقت کا جب کہ ابھی انسان اول کا ہماری دنیا میں ہبوط نہیں ہوا تھا اور نہ سلسلۂ رسالت ہی جاری ہوا تھا۔ لہٰذا اس کی تحقیق عالم شہود یا عالم ناسوت میں کیونکر ہو سکتی ہے! مگر اس واقعے سے مقصود انسان کی فضیلت اور اُس کے شرف عظیم کا اظہار ہے۔

۹ ـــ خلیفہ ہونے کا صحیح مطلب

اس موقع پر ایک اور اہم بحث یہ ہے کہ اس صفحۂ ارض پر انسان کے خلیفہ ہونے کی نوعیت و حیثیت کیا ہے؟ لفظ "خلیفہ" کے معنی جانشین، قائم مقام یا نائب کے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان زمین میں کس کا خلیفہ اور کس کا نائب و جانشین ہے؟ تو اس بارے میں عام طور پر یہ مفہوم چل پڑا ہے کہ وہ اللہ کا خلیفہ اور اس کا نائب ہے اور خلافت سے مراد خلافت الٰہیہ ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ ؒ نے اس نظریے

پر سخت تنقید کی ہے کہ "انسان اللہ کا خلیفہ ہے"[۵۲۶] کیونکہ خلافت کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کی غیر موجودگی میں قائم مقامی کی جائے یا کسی کی وفات کے بعد جانشینی عمل میں آئے۔ یا کسی کی معذوری کی بنا پر نیابت کا کام انجام دیا جائے وغیرہ۔ مگر معاذ اللہ خدا کے بارے میں اس قسم کی نیابت کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اس لئے یہ نظریہ غلط اور بے بنیاد ہے۔ بعض لوگوں نے یہ تاویل کی ہے کہ خلافتِ الٰہیہ سے مراد احکام ربانی کا نفاذ ہے۔ مگر یہ قرآن کا نظریہ نہیں لوگوں کی اپنی تاویل ہے۔

قرآن مجید میں کسی ایک جگہ بھی یہ مذکور نہیں ہے کہ میں "اپنا خلیفہ" بنانے والا ہوں۔ بلکہ ہر جگہ یہ لفظ نکرہ استعمال کیا گیا ہے۔[۵۲۷] یعنی "ایک خلیفہ" اور اس لفظ کے اصل لغوی معنی ہیں "پیچھے آنے والا" اس لحاظ سے آیت کریمہ "انی جاعل فی الارض خلیفہ" کا مطلب ہوگا دنیا میں پہلے سے جو مخلوق آباد تھی انسان اس کے پیچھے آنے والا ہے۔ اور مفسرین کا ایک گروہ اس کا قائل و مؤید ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر المنار۔

"و علم آدم الاسماء کلھا" سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی حضرت آدم کو تمام اسمار اور ان کے مسمیات بتا دینے کا مطلب یہ بھی ہوا کہ اس سے پہلے جتنے بھی موجودات اور جتنی بھی انواع حیات موجود تھیں سب کا علم دیدیا گیا۔ اب کوئی مزید یا نئی نوع اس دنیا میں آنے والی نہیں ہے۔ یہ در اصل اعلان ہے اس بات کا کہ اب نوع انسانی اور قیامت کے درمیان کچھ زیادہ فصل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے نوع انسانی کو اب قیامت کا انتظار کرنا چاہیئے —

---

۵۲۶ ماخوذ از فتاویٰ ابن تیمیہ، جلد دوم

۵۲۷ خلیفہ کا لفظ قرآن میں دو جگہ آیا ہے اور دونوں جگہ نکرہ ہے۔ اسی طرح اس لفظ کی جمع خلائف چار جگہ اور خلفاء تین جگہ آیا ہے، مگر کہیں بھی ان کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی گئی

صحیح مسلم کی ایک حدیث سے بھی اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔ جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہفتے کے چھ دنوں میں زمین اور اس کے ساز وسامان — لوازم حیات — کی تکمیل کرنے کے بعد ساتویں دن جمعہ کے روز بعد عصر دن کی بالکل آخری ساعتوں میں حضرت آدم کو پیدا کیا۔[۲۸]

اس کا مطلب (جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں) یہ ہے کہ تخلیق کائنات کی طویل ترین مدت کو اگر ہم سات ادوار میں تقسیم کر دیں تو حضرت آدم کی تخلیق ساتویں دور کے بالکل آخری مرحلے میں عمل میں آئی ہے۔ اس حیثیت سے گویا کہ اب یہ تماشا ڈراپ سین یا اس کا اختتام ہونے ہی والا ہے۔[۲۹]

قرآن انسان کو "خلیفہ" کہتا ہے۔ اب "حیاتیاتی" نقطہ نظر سے قرآن کے اس بیان کی صداقت اور اس کے دعوے کا ثبوت یہ ہے کہ لاکھوں سال گزر جانے کے باوجود انسان کے بعد یا اس کی نوع میں کسی قسم کا "ارتقاء" نہیں ہو سکا ہے اور نہ اس کے کوئی آثار و قرائن ہی نظر آ رہے ہیں۔ ورنہ پھر کیا وجہ ہے کہ ارتقاء انسان ہی پر آکر رک گیا؟ کیا اب یہ قانون باقی نہیں رہا؟ اس کی معقولیت کے اسباب آخر کیا ہیں؟ اب آپ اس کو نظریہ ارتقاء یا قانون ارتقاء کی ناکامی کہیے یا اس نظریہ کی رو سے "ارتقائے حیات" کا یہ ٹھہراؤ اور جمود، بہرحال اتنا تو ثابت ہو ہی گیا کہ انسان خلیفہ ہے۔ یعنی سب سے آخر میں آنے والا۔ اور متعدد حدیثوں کی تصریح کے مطابق موجودہ انسان ہی پر قیامت قائم ہو گی۔

یہ تھا لفظ خلیفہ کا لغوی مفہوم۔ اب رہی یہ بات کہ اس سے اصل مقصود کیا ہے اور آیا خلیفہ کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں یا نہیں۔ تو اس سلسلے میں قرآن حکیم

---

۲۸ ملاحظہ ہو صحیح مسلم، باب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار۔

۲۹ اس موضوع پر تفصیلی بحث اور حدیث بالا کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو میری کتاب: "وجود باری اور قیامت کے شواہد: دنیائے نباتات میں۔"

کی دیگر آیات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے اور جیساکہ خود پچھلے تمام بیانات سے بھی اس مسئلے پر بخوبی روشنی پڑتی ہے کہ انسان کی تخلیق بڑے رکھ رکھاؤ اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ عمل میں آئی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اچانک آسمان سے ٹپک پڑا یا الل ٹپ زمین سے اُگ گیا ہو۔ خلیفے کا لغوی مفہوم خواہ کچھ بھی ہو مگر اس میں ذمہ داری یا ذمہ دار ہستی ہونے کا مفہوم بھی شامل ہے، جیساکہ اگلی سطروں میں مذکور آیات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

امام راغب اصفہانی (المتوفی ۵۰۲ھ) نے لکھاہے کہ یہ لفظ اللہ تعالےٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں کی عزت و تکریم کی خاطر استعمال کیاہے۔[۳۰]

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ: اور وہی ہے جس نے زمین میں تم کو خلیفہ بنایا۔ (انعام: ۱۶۵)

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۝ پھر ہم نے تم کو اُن (قوموں کے) بعد زمین میں جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ (یونس: ۱۴)

ان آیات میں خلافت ارضی کا مقصد اور اس کا فلسفہ بخوبی سمجھایا گیاہے کہ انسان ایک ذمہ دار اور جواب دہ ہستی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور اس نگارخانۂ عالم میں اس سے حسنِ عمل کا مظاہرہ مطلوب ہے۔ ورنہ پچھلی قوموں اور پچھلی مخلوقات ہی کی طرح اس کا انجام بھی بہت بُرا ہوگا۔

حاصل یہ کہ انسان کو اللہ تعالےٰ نے خلیفے کا لقب اس لئے عنایت فرمایاہے کہ اسے اپنی ذمہ داری کا احساس رہے اور تمام انواعِ حیات سے اپنے آپ کو ممتاز اور برتر تصور کرتے ہوئے اپنے فرائض بجا لائے اور اپنے مقصدِ زندگی کو پورا کرے۔ اس لحاظ سے اس کے خلیفہ ہونے کا اصطلاحی

---

۳۰ ملاحظہ ہو: المفردات فی غریب القرآن، ص ۱۵۶

مفہوم یہ ہوا کہ وہ چونکہ اس کائنات کا کُل سر سبد ہے اس لئے وہ اپنے مقام و مرتبے کو پہچانتے ہوئے زمین کی جانشینی (خلافت) کے تقاضوں کو پورا کرے۔ نیز وہ چونکہ خدائے رحمان کا نمائندہ خصوصی ہے اس لئے وہ تمام موجودات عالم اور کل انواع حیات پر حکومت کرتے ہوئے ہر ایک سے اس کے مقام و مرتبے کے مطابق رحمت و شفقت کا برتاؤ کرے۔ اسی بنا پر اُس کو تمام اشیائے عالم اور کل انواع حیات کا علم دیا گیا ہے تاکہ وہ ہر ایک کے مقام و مرتبے کو اچھی طرح سمجھ لے۔ اور جیسا کہ گزر چکا اس سے شرک و مظاہر پرستی کا دروازہ بھی بند کرنا مقصود تھا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

اور ہم نے اولاد آدم کو بلا شبہ عزت بخشی اور انہیں بر و بحر میں سواریاں عطا کیں اور (خورد و نوش کی) عمدہ چیزوں سے انہیں نوازا اور بہت سی مخلوقات پر انہیں کلی فضیلت بخشی۔ (بنی اسرائیل : ۷۰)

ایک دوسرے موقع پر خلافت کی اہمیت اور اس کی ذمہ داری کا احساس اس طرح دلایا گیا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْعَدْلِ : اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا تم لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کرو۔ (ص : ۲۶)

ان تمام آیات سے جہاں ایک طرف انسان کے ذمہ دار اور جواب دہ ہستی ہونے پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق خصوصی طور پر اور مکمل منصوبے کے تحت ہوئی ہے۔ نہ تو وہ خود بخود ارتقائی طور پر ظہور پذیر ہوا ہے اور نہ وہ اپنے اعمال و افعال اور دستور حیات کی تدوین میں آزاد و خود مختار ہے کہ جو چاہے اپنی صوابدید کے مطابق کر ڈالے! انی جاعل

فی الارض خلیفۃ" (میں زمین میں ضرور ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) کے الفاظ
بھی اس کی صراحت کر رہے ہیں کہ انسان کی تخلیق و آفرینش پورے شعور اور ابدی
مشیت کے تحت عمل میں آئی ہے۔ جیسا کہ دوسرے مواقع پر اس منصوبے اور
قانون ازلی کی تصریح ایک عمومی قانون کی شکل میں اس طرح بیان کی گئی ہے:
وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۝ اور اس نے ہر چیز کو
پیدا کیا اور اُس کا ایک متعین ضابطہ بنایا۔ (فرقان: ۲)
اس مضمون کی آیتیں بہت ہیں۔ ان سب کا استقصار اس موقع پر طوالت
کا باعث ہوگا۔ بہرحال انسان کو تمام مخلوقات میں سب سے آخر میں پیدا
کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان مخلوقاتِ الٰہی میں غور و فکر کرکے اپنے
مرتبے و مقام کو پہچانے اور خالق کی نشانیوں کا سراغ لگائے جو ان مخلوقات میں
ایک منظم منصوبے کے تحت پھیلا دی گئی ہیں۔ اس مطالعے و جائزے کے ذریعے
علم و معرفت کے ابواب کھلتے ہیں اور شکوک و شبہات کا ازالہ ہوتا ہے۔

۱۰۔ عالمِ ارض میں انسان کی اہمیت

"اللہ تعالیٰ نے آدم ؑ کو تمام چیزوں کے نام اور اُن کے خواص بتا دیئے"
اس سے ایک اور بنیادی حقیقت یہ بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ اللہ نے اس مقصد
کے لئے ایک زبان اور لغت بھی وضع کی۔ کیونکہ اظہار بیان اور تعلیم و تدریس
کے لئے ایک زبان کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر یہ مقصد پورا
نہیں ہو سکتا[۳۱]۔ چنانچہ اس لحاظ سے خود خداوند عالم جل شانہ ہی سب سے
پہلا اور اصل "واضع لغت" قرار پاتا ہے[۳۲]۔ ظاہر ہے کہ یہ بات انسان کی
قدرت سے باہر تھی کہ وہ اپنے ظہور کے ساتھ ہی اپنے لئے ایک زبان
بھی خود ہی لے آتا، جو اس کو ہزاروں سال کی کوششوں کاوشوں اور

مسلسل تجربوں کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ بغیر ایک زبان کی تدوین کے کسی بھی قسم کی تعلیم ممکن نہیں۔

---

۵۳۱ اصول فقہ کی رو سے یہ مفہوم "دلالۃ النص" کے تحت واضح ہو رہا ہے، جس کو "قیاس جلی" بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی محض لغت (یا جملوں کی بناوٹ) سے کوئی ایسا مفہوم ثابت ہونا جس سے ظاہری الفاظ خاموش ہوں۔ اس کو ظاہری حکم کے لوازم اور مقتضیات بھی کہا جاتا ہے، جو غور و فکر کے بعد واضح ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآنِ حکیم میں غور و فکر کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

۵۳۲ یہ امام اشعری کا استدلال ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر معارف القرآن، ۱/۱۸۲

اب فلسفیانہ نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ کہ اللہ تعالیٰ نے۔ جو ہر قسم کے جواہر واعراض سے پاک ہے ۔۔ حضرت آدم سے کس طرح گفتگو کی اور انہیں کس طرح اور کس زبان میں ان امور کی تعلیم دی؟ یہ سب غیر ضروری اور لاطائل مسائل ہیں اللہ تعالیٰ کی "تعلیم ازلی" کا ایک واضح اور مکمل نمونہ آج ہمارے سامنے خود قرآنِ حکیم کی شکل میں موجود و محفوظ ہے۔ جس طرح تعلیم الٰہی کی اصل حقیقت و ماہیت کو سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں اسی طرح "وحی الٰہی" کی اصل کنہ و حقیقت کا ادراک بھی عقل انسانی سے باہر ہے۔ مگر اس وحی الٰہی کا وہ ابدی نمونہ جو قرآن حکیم کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے وہ اپنے لازوال حقائق و سچائیوں کے باعث ان اُمور کے برحق ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ یعنی ہم قرآن جیسے لازوال سرچشمۂ ہدایت کو محض دیکھ کر ہی ان تمام "امورِ غیب" کی صداقت و حقانیت کا یقین کر سکتے ہیں۔ اور اس کے لئے ہمیں مزید کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ خود عالم طبیعی کے بہت سے ایسے امور ہیں جن کی حقیقت انسان نہیں جانتا۔ مگر اس سے حقائق و واقعات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس کا صریح مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کو زندگی کے میدان میں یکہ و تنہا اور حیران و پریشان نہیں چھوڑ دیا اور ایک لمحے کے لئے بھی اس کی رہنمائی و رہبری سے غافل نہیں رہا۔ بلکہ ہر ہر مرحلے میں اُس کی یاوری و رہبری کی اور قدم قدم پر اُس کی اس طرح مدد کی جس طرح ایک بزرگ اور شفیق باپ ایک ننھے اور معصوم بچے کی قدم قدم پر مدد اور دستگیری کرتا ہے۔ اس طرح تخلیق انسان کے بعد خلّاق فطرت کا تعلق انسان سے کسی بھی مرحلے میں اور کسی بھی طرح منقطع نہیں ہوا۔ بلکہ ہر ہر قدم پر اس کی تعلیم جاری رہی، نا معلوم امور میں اُس کو صحیح راستہ دکھایا گیا" زندگی کے نشیب و فراز سمجھائے گئے اور ارضی احوال۔ سے نپٹنے کے تمام طریقے سمجھا دیئے گئے۔

اس بیان سے ان تمام فلاسفہ اور دہریین کے باطل نظریات کی تردید بھی مقصود ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور یہاں پر کوئی مابعد الطبیعی رہنما قوت کار فرما نہیں ہے۔ یا خالق کا کام صرف پیدا کر دینا ہے اور ہدایت و رہنمائی اُس کے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ یا یہ کہ یہ کائنات "اندھی مشیت" کے تحت رواں دواں ہے اور یہاں پر کوئی ناظم اور مدبر ہستی موجود نہیں ہے۔ یا یہ کہ تمام مظاہر کائنات اور کل انواع حیات آپ سے آپ رواں دواں ہیں، ان کا کوئی خالق و رب نہیں ہے۔ یا یہ کہ یہ پوری کائنات ایک مشین کی طرح جاری و ساری ہے اور تمام واقعات و حوادث محض علت و معلول کے بنیادی قانون کے ماتحت ظہور میں آرہے ہیں۔ یا "فطرت خود بخود خداؤں کی مداخلت کے بغیر سب کچھ کر لیتی ہے" یا "مادہ خالی ہیولیٰ یا محض منفعل ذات نہیں ہے بلکہ وہ مادر کائنات ہے جو خود اپنے ہی رحم سے تمام نتائج برآمد کرتی ہے۔"

بلکہ بعض گستاخوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "ہم نے خدا کی عارضی

خدمات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُس کو سرحد تک پہنچا دیا ہے۔"(معاذ اللہ)

قرآنِ حکیم نے ان تمام نظریات کی ترجمانی اور ان پر تبصرہ خود اپنے الفاظ اور اسلوب میں اس طرح کیا ہے:

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝

اور انھوں نے کہا کہ یہ تو صرف دنیوی زندگی ہے اور ہم کو صرف زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے (کوئی مافوق ہستی نہیں ہے)۔ ان کے پاس اس (غلط نظریئے) پر کوئی دلیل (صحیح علم) نہیں ہے۔ یہ لوگ صرف ظن و تخمین سے کام لیتے ہیں۔ (جاثیہ : ۲۴)

بہر حال اللہ تعالےٰ نے ایک بہت بڑے مقصد کی خاطر اس کائنات کی تخلیق کی اور اس کو اپنی ازلی حکمت و مصلحت کے تحت ہر قسم کی ضروریات زندگی اور سامان آرائش و زیبائش سے لیس کیا۔ پھر نہایت درجہ رحمت و شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسان کی قدم قدم پر رہنمائی کی اور کسی بھی حالت میں اس کو یکہ وتنہا نہیں چھوڑا۔ اور زندگی کے کسی بھی دور میں اپنے تعلق کو اس سے منقطع ہونے نہیں دیا۔ پھر اسی طرح دور آدم کے بعد نبی آخر زماں صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ تعالےٰ نے انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنے چند مخصوص بندوں کو منتخب کیا اور ان کے ذریعے اپنی مرضی اور پیغام اور نجات انسانی کے لئے واضح راہ عمل ظاہر کر دی۔ اللہ تعالیٰ کے اس آخری پیغام کا کامل نمونہ آج ہمارے سامنے قرآن کی شکل میں موجود و محفوظ ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک "کلام برتر" اور نوع انسانی پر پروردگار عالم کی رحمت و رأفت کا ایک نہایت درجہ اعلیٰ اور بہترین نمونہ ہے، جو نوع انسانی کے مشاہدے میں آسکتا ہے۔

طبیعی لحاظ سے جس طرح مظاہر فطرت میں رحمانیت کی جھلکیاں پائی جاتی

ہیں اسی طرح شرعی لحاظ سے اس کلام برتر میں نوع انسانی پر خلاق ازل کی شفقت و مہربانی کے نقوش دکھائی دیتے ہیں، جو تاریخی اعتبار سے تمام بنی نوع انسان کے لئے — بلا تفریق رنگ و نسل — ایک "عالمی منشور" کی حیثیت رکھتے ہیں. مذاہب عالم کی تاریخ میں ان سے بہتر، جامع، متوازن اور نوع انسانی کے لئے مشفقانہ و کریمانہ قوانین کا نظارہ چشم فلک نے کبھی نہیں کیا ہے۔ ایسا جامع و مکمل اور عادلانہ قانون — جو عقلی حیثیت سے فطرتِ انسانی اور اُس کی تمدنی ضروریات کے عین مطابق اور ہر دور کے لئے ناقابل تغیر و تنسیخ رہا ہو — ایک معجزہ اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ایک شاندار مظہر ہے۔

یہ نوع انسانی پر خالق عالم کی ربوبیت اور اس کے کریمانہ رشتے کے دو اعلیٰ مظاہر ہوئے، جو نوع انسانی کے ساتھ اس کے تعلق کو واضح کر رہے ہیں پہلا تعلق طبیعی (نیچرل) ہے اور دوسرا تعلق شرعی و اخلاقی۔ یعنی جس ہستی نے انسان کی ظاہری اور جسمانی و مادی ضروریات کے تحت اس جہان کی رنگارنگیوں کو پیدا کیا اُسی نے اس کی روحانی و اخلاقی ضروریات کے تحت انسانِ اول سے براہِ راست اور اس کے بعد دیگر انسانوں سے بالواسطہ طور پر وحی و الہام کی شکل میں رابطہ قائم رکھا۔ اور کسی بھی لمحے اُس کی ہدایت و رہنمائی سے غافل نہیں رہا۔

انسانِ اول کی یہ خصوصی تعلیم و تربیت اس بات کا اظہار و اعلان ہے کہ اس کائنات میں انسان کی بہت بڑی اہمیت ہے اور اس کی بہت بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ وہ دیگر مظاہر عالم کی طرح کوئی معمولی وجود نہیں ہے بلکہ وہ اس کائنات کی وہ ہستی ہے جس کے گلے میں "خلافت ارض" کا طوق (اصلاح عالم کا فریضہ اور عدلِ الٰہی کے قیام کی ذمہ داری بشکل جہاد)[۳۳] ڈالا گیا ہے۔

[۳۳] خلافت ارض کے نقطۂ نظر سے فلسفۂ جہاد کی تشریح و تفصیل دوسرے اور چھٹے باب میں دیکھیے

ڈال دیا گیا ہے۔ یہ وہ بار "امانت" ہے جس کے اٹھانے سے تمام موجودات عالم عاجز آ گئے اور پوری کائنات تھرا گئی۔ طبیعی اعتبار سے مظاہر کائنات کو عدل و رحمت کا مظہر بنانے کی ذمہ داری خلاق فطرت نے براہ راست اپنے ذمے رکھی اور ان کے لئے طبیعی ضوابط اور قوانین بنا دیئے جن سے کوئی سرمو بھی تجاوز نہیں کر سکتا (اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ)۔ مگر شرعی و اخلاقی اعتبار سے عالم انسانی میں نظام عدل کے قیام کی ذمہ داری خود انسانوں ہی کے سپرد کی گئی کہ ہر دور میں چند صالح افراد اٹھیں اور یہ ازلی و آفاقی فریضہ انجام دیتے رہیں۔ (وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ)۔ اس سے فطرت و شریعت کی یکسانیت اور ہم رنگی مطلوب ہے۔ سورۂ رحمان کی ان آیات میں حکم اول مظاہر فطرت کو دیا جا رہا ہے اور حکم ثانی عالم انسانی کو جس کو ارادہ و اختیار کی آزادی سے نوازا گیا ہے تاکہ امتحان و آزمائش پوری ہو۔ یہ ہے تخلیق آدم کا مقصود اور اس کی خصوصی تعلیم و تربیت کی اصل وجہ۔

۱۱۔ علم اسماء اور نظام ربوبیت

علم اسماء کی تحقیق کرنا دراصل "کارہائے ربوبیت" یا خدا کی پیدا کردہ مخلوقات کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہے جو بطور "ربوبیت" (خدا کے وہ کام جو بطور مخلوق پروری اس عالم مادی میں جاری و نافذ ہیں) اس کائنات اور اس کے حیرت انگیز نظاموں میں جاری و ساری ہے۔ اس لحاظ سے "خلیفے" کا ایک کام اور اس کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ علم اسماء یا "نظام ربوبیت" کی تحقیق اور اُن کے اسرار سربستہ کی راز جوئی کر کے مشرک اور بے دین لوگوں کی رہنمائی کرے، جن کو مظاہر عالم کے سمجھنے میں دھوکا اور اشتباہ ہو جاتا ہے یا دانستہ طور پر جن سے وہ غلط نتائج اخذ کر کے لوگوں میں غلط فہمیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔

اسی بنا پر قرآن حکیم کے مختلف مقامات میں نظام کائنات کو سمجھنے اور ان سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور اس سے اعراض کر کے غلط روش اور غلط طرز فکر اختیار کرنے والوں کی سخت مذمت کی گئی ہے

اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ ۙ وَّ اَنْ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُھُمْ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۢ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ ○ کیا انہوں نے ارض و سماوات کے عالم میں اور ان تمام چیزوں میں جن کو اللہ نے پیدا کر رکھا ہے نظر نہیں کی؟ اور اس پر غور نہیں کیا کہ عجب نہیں کہ ان کا وقت (موت یا تباہی کا) بھی قریب آپہنچا ہو؟ اس (واضح حقیقت) کے بعد وہ آخر کس چیز پر ایمان لائیں گے؟ (اعراف: ۱۸۵)

وَکَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْھَا وَھُمْ عَنْھَا مُعْرِضُوْنَ ○ اور ارض و سماوات میں کتنی ہی ایسی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں۔ (یوسف: ۱۰۵)

حقیقت یہ ہے کہ عالم ارض اور عالم سماوات اور ان کے حیرت انگیز نظاموں میں اتنے دلائل و شواہد اور اس قدر نشانہائے ربوبیت موجود ہیں جن سے اعراض کرنا اور آنکھیں بند کر لینا مشکل ہے۔ صحیفۂ فطرت کے ایک ایک ورق اور اس کے ہر نقش و نگار پر اس کے حیرت انگیز خالق و مربی اور مدبر و منتظم کا نام اور اتہ پتہ ایک عجیب و غریب اور اعجازی زبان میں مرقوم ہے جس کو سمجھنا ہی نشانہائے ربوبیت کو سمجھنا اور اس علم کی چھان بین کرنا دلائل آفاق و انفس کی چھان بین اور تحقیق و تدوین کرنا ہے، تاکہ منکرین و معاندین پر اتمام حجت ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ نظام کائنات میں غور و فکر کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور اس پر مختلف حیثیتوں سے ابھارا گیا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ

لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ یقیناً زمین اور آسمانوں کی تخلیق اور دن رات کے ہیر پھیر میں عقلمندوں کے لئے بہت سے نشانات موجود ہیں۔

(آل عمران : ۱۹۰)

نظام کائنات سے عبرت و بصیرت حاصل نہ کرنے والوں نیز صحیح افکار و نتائج کو جھٹلانے اور ان سے اعراض و اغماض کرنے والوں کو بہائم اور چوپایوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ اور ہم نے دوزخ کے لئے بہت سے جن اور انسان پھیلا رکھے ہیں، جن کے دل تو ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں ہیں۔ اور ان کی آنکھیں تو ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں ہیں۔ اور ان کے کان تو ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے (کیونکہ) یہ لوگ غافل و بے پروا ہیں۔ (اعراف: ۱۷۹)

حضرت آدم کو علم اسمار دیئے جانے کی ایک بڑی حکمت و مصلحت یہ بھی تھی کہ اولادِ آدم میں یہ علم پھیلے اور منشائے خداوندی کے مطابق اس دنیا میں دلیل و استدلال اور حجت و برہان کا بازار گرم ہو۔ مگر آجکل یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ علوم فطرت یا علوم تکوین ــــ جن کو موجودہ زبان میں سائنس کہا جاتا ہے ــــ مادیت و نیچریت کے ہم معنی ہے۔ حالانکہ حقیقتاً سائنسی علوم میں اس قسم کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو حیرت انگیز طور پر آج قرآن اور اسلام کی تصدیق و تائید کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ غلطی جو کچھ بھی ہے وہ محض بعض لوگوں کے اپنے ذہنوں اور اپنے افکار میں ہے، اصل علوم میں نہیں۔ اور ہمیں انہی غلط افکار و نظریات کی تردید کرنی ہے۔

مگر اس مقصد کے لئے ہمیں اصل علوم سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ سائنس درحقیقت کائنات کے آثار و مظاہر کے آزادانہ مطالعے اور طریق فکر کا نام ہے۔ کائنات کے مظاہر اور ان کے اسرار کا مشاہدہ و تحقیق کر کے اس کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے قوانین و ضوابط کو ترتیب دے کر استقرائی حیثیت سے نتائج اخذ کرنا ہی سائنس کا مقصد اور اس کا طریقۂ کار ہے۔ اس حیثیت سے تمام سائنسی علوم قرآنِ حکیم کے طرزِ فکر اور اُس کے تلقین کردہ نظام سے پوری طرح ہم آہنگ اور اس کے مؤید و مصدق نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ موضوع وقت کا اہم ترین موضوع ہے۔ اور اس پر تحقیقی کام کرنا وقت کی ایک اہم ترین علمی ضرورت ہے۔ جب تک یہ کام نہیں ہوگا ذہنی و فکری اعتبار سے عالم انسانی کی رہنمائی نامکمل رہے گی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار نہیں ہو سکے گی۔

سائنٹفک بنیادوں پر قرآن حکیم کے نظام دلائل کے جائزے یا دلائل آفاق کی تدوین کے دو بڑے مقاصد ہیں:

۱۔ اہل ایمان کے علم و یقین میں اضافہ اور دینِ حق پر اُن کی ثابت قدمی

۲۔ منکرین حق کے شکوک و شبہات کا ازالہ اور ان پر اتمام حجت۔

جیسا کہ حسب ذیل آیات سے ثابت ہوتا ہے۔

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ ۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝

حا میم - یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے جو بڑی قوت اور بڑی حکمت والا ہے۔ یقیناً زمین اور آسمانوں میں ایمان لانے والوں کے لئے بڑی بڑی نشانیاں موجود ہیں۔ اور خود تمہاری خلقت اور (صفحۂ ارض پر) جانداروں کے پھیلاؤ میں یقین کرنے والوں کے لئے دلائل موجود ہیں۔ اور اسی طرح دن رات کے ہیر پھیر میں اور جو کچھ اللہ نے اوپر سے رزق (پانی کی شکل میں) اتارا پھر اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کیا اور ہواؤں کے نظام اور بدل میں دانشمندوں کے لئے واضح نشانیاں موجود ہیں۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جن کو ہم سچائی کے ساتھ پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ تو یہ لوگ اللہ اور اس کے نشانات و دلائل کے بعد آخر کس چیز پر ایمان لائیں گے؟ (جاثیہ : ۱-۶)

لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ٥ تاکہ وہ اُس کو متنبہ کر سکے جس کا دل زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر بات ثابت ہو جائے۔ (یٰس : ۷۰)

۱۲ — علم اسماء اور معرفت الٰہی

علم اسماء کی تحقیق کا سب سے اہم مقصد معرفت الٰہی کا حصول ہے۔ یعنی نظام ربوبیت کی تحقیق کے نتیجے میں خدائے تعالیٰ کی بے مثال صفات مثلاً اس کی وحدت و یکتائی، قدرت و ہمہ دانی، حکمت و مصلحت، مخلوق پروری، رحمت و رأفت اور اس کی عجیب و غریب منصوبہ بندی کا بھرپور نظارہ و مشاہدہ ہو جاتا ہے، جو توحید شہودی اور عین الیقین کی منزل اور اس کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ اور اس منزل پر پہنچ جانے کے بعد انسان کو فکری اعتبار سے کسی بھی طرح بھٹکنے اور غلط راستوں کی طرف نکلنے کا موقع باقی نہیں رہتا۔

اس اعتبار سے حسب ذیل آیات کریمہ تمام سائنسی اور طبیعی علوم اور ان کے

مطالعے کا نچوڑ اور اُن کا ماحصل ہیں۔ جو کوئی غیر جانبداری کے ساتھ مظاہر فطرت اور ان کے نظاموں کی چھان بین کرے گا وہ لازمی طور پر اس منطقی نتیجے تک ضرور پہنچے گا۔ گویا کہ ان آیات میں استقرائی نتیجے کی حیثیت سے پورے قرآن اور مطالعۂ کائنات کا عطر کشید کر لیا گیا ہے۔ یہ وہ بلند پایہ آیات ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اگر پہاڑ پر نازل کر دی جاتیں تو وہ اُس کے معارف کی تاب نہ لا کر پاش پاش ہو جاتا۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ج هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ○ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ط سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ط یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○

وہی اللہ ہے جس کے سوا (اس کائنات میں) کوئی دوسرا الہ (نرالے اور حیرتناک افعال والا) موجود نہیں ہے۔ قابل مشاہدہ اور ناقابل مشاہدہ (طبیعی اور مابعد الطبیعی عالموں کا) جاننے والا وہی ہے۔ وہ نہایت مہربان اور سراپا رحمت ہے (جیسا کہ تمام مظاہر کائنات گواہی دے رہے ہیں) وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی دوسرا الہ موجود نہیں ہے (جو اپنی مخلوق پر غایت درجہ مہربان ہو)۔ وہ بادشاہ ہے، (سب عیبوں سے) پاک ہے، ہر طرح سالم ہے، امن دینے والا ہے، نگہبانی کرنے والا ہے، سب پر غالب ہے، (خرابیوں کا) درست کرنے والا اور بڑی عظمت والا ہے۔ اللہ (جس کی یہ شان ہو) لوگوں کے شرک (اور ان کی تمام فکری لغزشوں) سے پاک ہے۔ وہی (اکیلا) اللہ ہے جو تمام انواع حیات کو پیدا کرنے والا، ٹھیک ٹھیک (ضابطوں کے مطابق ان سب کو) بنانے والا اور رحم مادر میں اُن کی (صورت گری

کرنے والا ہے (ان تمام خوبیوں کی وجہ سے) اس کے اچھے اچھے نام ہیں۔ (حقیقت یہ ہے کہ ان بے مثال ضوابط کے نتیجے میں) زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں اُس کی تسبیح کر رہی ہیں (اور اُسی کا کلمہ پڑھ رہی ہیں۔ اور اس بنا پر) وہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔ (حشر: ۲۲ - ۲۴)

حدیث شریف میں ان آیات کی بڑی فضیلت آئی ہے جو بلاوجہ نہیں ہے۔ یہ آیات سائنٹفک نقطۂ نظر سے نہایت درجہ بصیرت افروز اور معنی خیز ہیں، جن کی وجہ سے موجودہ دور میں ان کی بہت زیادہ اہمیت ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عالم مادی میں صفات الٰہی (اسمائے حسنیٰ) کی جھلکیاں اور ان کا ایمان افروز نظارہ موجود ہے، جو نگاہ بصیرت ڈالنے پر عیاں ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر علامتی فطرت کو زمین اور آسمانوں کا نور کہا گیا ہے (اللّٰہ نور السمٰوٰت والارض) اس نور الٰہی کا مشاہدہ ہی "دورۃ الشہود" کہلاتا ہے، جو بندۂ مومن کی معراج ہے۔ سائنٹفک نقطۂ نظر سے جہاں ایک طرف یہ مقصد عظیم حاصل ہوتا ہے (بشرطیکہ یہ نقطۂ نظر صحیح اور خدا پرستانہ ہو) تو دوسری طرف کائنات اور اس کے مظاہر سے متعلق ہمہ قسم کے اوہام و خرافات کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے یعنی ان صفات سے متصف شخص بدعقیدگیوں کا شکار نہیں ہو سکتا اور باطل و بے بنیاد فلسفوں کے جال میں نہیں پھنس سکتا۔ کیونکہ وہ "نورِ الٰہی" کے سائے میں چل رہا ہوتا ہے۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ط ایسا شخص جو کہ پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اُس کو زندہ بنا دیا اور اس کو ایسا نور دے دیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے لوگوں کے درمیان چلتا ہے تو کیا وہ اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کی حالت یہ ہے کہ وہ تاریکیوں میں ہے جن سے وہ نکلنے ہی نہیں پاتا؟ (انعام: ۱۲۲)

اس موقع پر "نور" کی جو بصیرت افروز تشریح علامہ ابن قیم نے "الوابل الصیب" میں کی ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔ فرماتے ہیں:

"اللہ کا دین نور ہے، اس کی کتاب نور ہے، اس کا رسول نور ہے، اس کا وہ گھر جس کو اُس نے اپنے پرستاروں کے لئے تیار کر رکھا ہے نور روشن ہے، اور خود اللہ تبارک و تعالیٰ زمین و آسمانوں کا نور ہے۔ اُس کے اسماء سے نور ہے اور اُس کے چہرے کے نور سے تمام تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں[۳۵]"

بہرحال مطالعۂ فطرت کے ذریعے جو سچی تڑپ اور صحیح جذبہ وولولہ انسان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے اُس کی تسلی و تشفی دین الٰہی اور صحیفۂ الٰہی کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے جو اس کے لئے بمنزلہ نور ہے۔ اسی طرح مطالعۂ فطرت کے باعث کسی کے دل میں جو سوالات یا شکوک و شبہات وغیرہ پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان سب کا ازالہ بھی دین ابدی ہی کے ذریعے ممکن ہو سکتا ہے۔ گویا کہ دین الٰہی مطالعہ فطرت کے سلسلے میں بھی انسان کا صحیح رہنما اور اُس کا رہبر و ہادی ہے جو اُس کے لئے صحیح سمتوں اور صحیح لائنوں کا تعین کرتا اور غلط راہوں کی طرف نکلنے سے اُسے روکتا ہے۔ دین ابدی اور اُس کے صحیفۂ حکمت میں جگہ جگہ ایسے نشانہائے میل نصب کر دیئے گئے ہیں جو غلط سمتوں کی طرف نکلنے والوں کے لئے بمنزلہ پہرے داروں یا روشنی کے میناروں کا سا کام دے سکتے ہیں، خواہ انسانی علوم کتنے ہی ترقی یافتہ کیوں نہ بن جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس موضوع سے متعلق سیکڑوں آیتیں موجود ہیں اور یہ قرآن حکیم کا ایک مستقل موضوع ہے۔

---

[۳۴] یہ میرا اپنا نقطۂ نظر اور حاصل تحقیق ہے۔ اس موضوع پر مزید تفصیل کے لئے پانچویں باب میں "وحدت الوجود یا وحدت الشہود" کی بحث دیکھنی چاہیئے۔

[۳۵] الوابل الصیب، ص ۱۱۰، مطبوعہ دارالافتاء، ریاض۔

۱۳ ـ خلاق فطرت کی ہمہ دانی

ان تصریحات و تفصیلات سے یہ حقیقت بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کائنات کی تمام اشیاء اور ان کی تمام جزئیات کا علم ــــ اُن کے خالق و ناظم اور مدبر و مربی ہونے کی حیثیت سے ــــ حاصل ہے۔ ورنہ حضرت آدم کو ابتدائے آفرینش ہی میں تمام اسماء کی تعلیم دے دینا ممکن نہ ہوتا اور کائنات کی پوری مشنری ایک ہمہ گیر منصوبے اور نظام کے تحت رواں دواں ہرگز نہ ہوتی۔ اس سے ان تمام فلاسفہ اور اُن کے ہمنواؤں کی باطل خیال آرائیوں کی تردید بھی مقصود ہے جن کا نظریہ و عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہیں ہے یا نہیں ہو سکتا۔

اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَ ھُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ۝ کیا وہ بے علم رہ سکتا ہے جس نے پیدا کیا ہے (تمام مخلوقات و موجودات کو)؟ حالانکہ وہ بہت ہی باریک بیں اور (ہر چیز سے) باخبر ہے۔ (ملک : ۱۴)

وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ ۚ وَ ھُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۝ اور اُس نے (اس کائنات کی) ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے۔ (انعام : ۱۰۱)

اَلَاۤ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ ۝ ہاں آگاہ رہو کہ وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ (حٰم سجدہ : ۵۴)

۱۴ ـ قوانین فطرت غیر متغیر

ان حقائق کے ملاحظے سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ پوری کائنات اور اس کے تمام مظاہر ایک نظم و ضبط کے پابند ہیں اور اُن کے اُصولوں میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہو رہا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ یعنی روز ازل میں اللہ تعالےٰ

نے ان مظاہر کے جو ضوابط یا موجودات کے جو خواص و آثار دورِ آدم میں بلکہ اس سے بھی پہلے متعین کر دئیے تھے وہی اب تک برابر چلے آرہے ہیں، جن سے موجودہ دور کا انسان بتدریج آگاہی حاصل کر رہا ہے۔ اگر ان مظاہر اور اُن کے آثار و خواص میں بدنظمی اور انتشار ہوتا اور ان کے اصولوں میں تغیر و تبدل ممکن ہوتا تو پھر ان کی تعلیم و تدریس ممکن نہ ہوتی اور نہ ان علوم کی باضابطہ تدوین ہی عمل میں آسکتی۔ خود نقاشِ فطرت کا ارشاد ہے:

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ ○ اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔ (زمر: ۶۲)

وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا ○ اور اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اُس کا ایک متعین ضابطہ بنایا۔ (فرقان: ۲)

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی ○ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ○ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی ○ ۔ پاکی بیان کر اپنے رب برتر کی، جس نے (تمام مخلوقات کو) پیدا کیا اور (اُن کا جسمانی نظام) ٹھیک ٹھاک کیا۔ اور وہ جس نے (تمام مخلوقات کا اپنا اپنا فطری و طبیعی نظام) مقرر کیا پھر (ہر) ایک کو اُس نظام کے مطابق) چلنے کی توفیق دی۔ (اعلیٰ: ۱-۳)

یہ چند ہمہ گیر اور وسیع کلیات ہیں جن کا دائرہ عالم جمادات، عالم نباتات، عالم حیوانات اور عالم افلاک سب پر محیط ہے۔ ان کلیات کے مطابق ایک ننھے سے ایٹم سے لے کر ایک بڑے سے بڑے نظام شمسی تک ہر ایک نظام ربوبیت ہی کے ماتحت رواں دواں ہے۔

اللہ تعالیٰ مخلوقات کو پیدا کرنے کے بعد انہیں بے ضابطہ اور بے مہار چھوڑ نہیں دیتا بلکہ نہایت درجہ منظم اور حیرت انگیز طریقے سے اُن کی نگرانی اور دیکھ بھال کر رہا ہے۔ اس مادی کائنات کی تمام اشیاء اور اُن کے تمام قوانین و ضوابط نہایت درجہ منظم اور باضابطہ ہیں، جن میں بدنظمی اور انتشا

کا کہیں نام و نشان بھی موجود نہیں ہے۔

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ لا هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۞ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ ۞ تو خدائے رحمان کی تخلیق میں کوئی تفاوت نہیں دیکھے گا۔ نظر ڈال کر دیکھ کیا تجھے (اس وسیع و عریض عالم موجودات میں) کہیں کوئی شگاف بھی نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر ڈال کر دیکھ، تیری نظر تھک کر اور ناکام ہو کر لوٹ آئے گی۔ (مگر تجھے کوئی رخنہ یا فطور ہرگز نظر نہیں آسکے گا) (ملک : ۳-۴)

۱۵ــــ فطرت و شریعت کی ہم آہنگی

یہیں سے یہ اصول بھی نکلتا ہے کہ علم دین اور علم تکوین یعنی علم فطرت nature میں اصلاً کوئی تعارض و تضاد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہوئے اور ہر دو ایک ہی مبدء فیض کی جانب سے تعلیم کئے ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ دونوں درحقیقت ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں، نہ کہ باہم متحارب و متصادم اور دست بگریباں۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۞ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو حکمت (و منصوبہ بندی) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یقیناً اس باب میں اہل ایمان کے لئے ایک بہت بڑی نشانی موجود ہے۔ (عنکبوت : ۴۴)

ان دونوں کی تطبیق و ہمنوائی سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی سرچشمے کے دو مظہر ہیں۔ ایک سے اعلیٰ درجے کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار مقصود ہے تو دوسرے سے اس کی صفات ازلی اور ابدی سچائیوں کا اثبات مطلوب ہے۔ قرآن اور کائنات ایک دوسرے کے لئے ایک

آئینے کی مانند ہیں ۔ ہر ایک کو دوسرے میں اپنا عکس نظر آتا ہے اور اپنے صحیح نقش و نگار اُبھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۱۶۔ اسباب و علل کا سلسلہ

مظاہر کائنات کا نظم و ضبط کا پابند ہونا اور ان میں متعین قوانین و ضوابط کا پایا جانا اس حقیقت کی نشان دہی ہے کہ یہ موجودات چند خصوصیات و امتیازات کے پابند ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں ایک خاص اثر و تاثیر رکھ دی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر اس عالم مادی میں اسباب و علل کا ایک وسیع سلسلہ قائم کیا گیا ہے، اگرچہ علت العلل اور مسبب الاسباب خود حق تعالےٰ جل شانہ ہے۔ یہ اس کی حکمت بالغہ کا مظاہرہ ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے مصالح اور ان کی آزمائش دونوں کا بخوبی لحاظ رکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے چیزوں میں ایسے خواص رکھے ہیں جو دوسرے خواص کو جنم دیتے ہیں۔ انہی خواص و تاثیرات کی بدولت حیوانات و نباتات کے درمیان بہت سی چیزوں کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے اور زندگی کی گاڑی چلتی رہتی ہے۔ مثلاً آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کا تبادلہ[۳۶] اور نائٹروجن کا چکر[۳۷] (nitrogen cycle) وغیرہ۔ اس دو طرفہ تبادلے کی

---

[۳۶] حیوانی زندگی کا دارو مدار آکسیجن پر ہے جو آزادانہ طور پر فضائی کرہ (atmosphare) میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح نباتاتی زندگی کا دارومدار کاربن ڈائی آکسائیڈ پر ہے۔ اب حکیم مطلق کی خلاقی اور اس کی ربوبیت درحمانیت کا مظاہرہ ملاحظہ ہو کہ جو چیز حیوانی زندگی کے لئے ضروری اور لازمی تھی اسکو نباتات کے ذریعہ پیدا کرنے کا انتظام کیا۔ اور جو چیز نباتات کی غذا ہے اسکو حیوانات کے ذریعے پورا کرنے کا نظام بنایا۔ (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

وجہ سے نظام فطرت میں ایک حیرت انگیز توازن قائم ہے۔

غرض قرآن حکیم میں ایسی بہت سی آیتیں موجود ہیں جن میں مادی کائنات میں جاری شدہ اسباب و علل کے اثبات میں بنیادی اشارے کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر ہے کہ اللہ نے آسمان سے (یعنی آسمان کی بلندی سے) بارش برسائی، پھر اس بارش کے ذریعے قسم ہا قسم کے نباتات اُگا دیئے۔

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ط فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ○ اور اس نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہم نے اُس پانی کے ذریعے مختلف نباتات کے جوڑے نکال دیئے۔ (طٰہٰ: ۵۳)

اس آیت کریمہ میں مختلف قسم کے پیڑ پودوں کے اُگنے کا سبب بارش کو قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ دیگر آیات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے موقع پر رنگ برنگے میووں کو اس بارش اور پانی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اس دو طرفہ عمل اور ردعمل کے باعث ان دونوں طبقات کی بنیادی ضروریات ایک دوسرے کے ذریعہ پوری ہو رہی ہیں۔ بلکہ اس سے نظام فطرت میں ایک حیرتناک قسم کا تناسب بھی قائم ہے۔ ورنہ افراط و تفریط کے باعث یہ نظام درہم برہم ہو کر نیز حیوانات و نباتات کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔ تفصیلات کے لئے سائنسی کتب کا مطالعہ فرمایئے۔

۵۳ے اسی طرح نائٹروجن (غذا) ایک بہت اہم اور ضروری جز) بھی غذا کے ذریعے نباتات سے حیوانات کے جسموں میں داخل ہوتا ہے۔ پھر وہ بول و براز کے ذریعے خارج ہو کر بطور کھاد پھر نباتات میں پہنچتا اور دوبارہ غذائی اشیاء کا روپ دھار لیتا ہے۔ اور اس طرح یہ چکر برابر چلتا رہتا ہے۔ اس کو سائنس کی اصطلاح میں "نائٹروجن کا چکر" کہتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ط (اے مخاطب) کیا تونے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہم نے اُس پانی کے ذریعے مختلف قسم کے رنگ برنگ میوے نکال دیئے۔ (فاطر: ۲۷)

ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے کہ ان میووں اور انواع و اقسام کے پھلوں وغیرہ کا ذائقہ اور اُن کی لذت جدا جدا مقرر کی گئی ہے، جو ان اشیاء میں "تاثیر" پر "نص قطعی"^۳۸ (صریح اور واضح بیان) ہے۔ پھر اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس باب میں دانشمندوں کے لئے وجود باری کے دلائل موجود ہیں۔

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ قف وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ اور زمین میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے چند قطعے ہیں (جن میں) انگوروں کے باغ، کھیتیاں اور کھجوروں کے درخت — شاخوں دار اور بے شاخوں والے موجود ہیں، اور وہ (سب کے سب) ایک ہی پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں۔ (مگر اس کے باوجود) ہم ذائقے میں ایک کو دوسرے پر فوقیت دیتے ہیں۔ اس میں عقل مندوں کے لئے (وجود باری

---

۳۸ نص لغت میں کسی بات کے ظاہر کرنے میں مبالغہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اور اصول فقہ کی اصطلاح میں نص سے مراد وہ بیان ہے جو معنی کے لحاظ سے "ظاہر" سے واضح ہو اور وہ حاصل کلام کا درجہ رکھتا ہو۔
(ملاحظہ ہو: دستور العلماء، از قاضی عبدالنبی احمد نگری، ۳/ ۴۰۳ مطبوعہ بیروت، ۱۳۹۵ھ)

دلائل موجود ہیں۔ (رعد: ۴)

حاصل یہ کہ اشیائے کائنات اور خاص کر عالم نباتات میں "الوان" (رنگوں) اور "اُکُل" (ذائقوں) کا اختلاف پایا جاتا ہے، جو ان انواع میں سے ہر ایک کی مخصوص نوعی خواص و تاثیرات پر دلالت کرتا ہے۔ یہ خواص و تاثیرات وجود باری اور اُس کی ربوبیت کا بھی زبردست ثبوت ہیں، جن میں غور و فکر کرنے کے باعث اس سلسلے میں ناقابلِ تردید دلائل و شواہد فراہم ہوتے ہیں یہی خواص و تاثیرات تمام طبّی اور سائنسی علوم کی بھی بنیاد ہیں، جو ان دلائل و شواہد کی فراہمی میں آج ہمارے معاون و مددگار نظر آرہے ہیں۔ لہذا ان علوم کا انکار کرنا یا اشیاء میں خواص و تاثیرات کے نظریے کو غلط اور مہمل قرار دینا قرآن حکیم کی ان تصریحات کے خلاف ہے۔

اشیاء میں خاصیت و تاثیر کیا ہے؟ آگ جلاتی ہے، پانی آگ بجھاتا ہے۔ پانی پیاس بجھاتا ہے۔ پانی نظامِ ہضم میں مدد دیتا ہے۔ پانی سے نباتات اُگتے ہیں۔ پانی تمام زندہ اشیاء کا جزو ہے۔ پانی نخزمایہ (پروٹوپلازم) کا جزو ہے۔ پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن دو عناصر سے مرکب ہے۔ سنکھیا کھانے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ شکر مٹھاس پیدا کرتی ہے۔ نمک منہ کے ذائقے کو تلخ کر دیتا ہے۔ نمک سوڈیم اور کلورین دو عناصر کا مجموعہ ہے۔ کریلا ذائقے میں کڑوا ہے مگر صحت کے لئے مفید ہے۔ لیموں میں بہت سے طبی فوائد موجود ہیں۔ ہم سانس کے ذریعے آکسیجن لیتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ نباتات کی غذا خاص کر کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے۔ غذا میں مواد لحمیہ (پروٹینز) مواد نشائیہ (کاربوہائیڈریٹس)، مواد شحمیہ (فیٹس) معدنی نمکیات (منرل سالٹس) اور حیاتین (وٹامنز)[۲۹] پائے جاتے ہیں، جو ہمارے جسمانی نظام کے نشوونما اور ان کی تندرستی کے لئے بہت اہم ہیں۔ انسان نباتات کے

بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

اسی طرح بجلی ہمارے گھروں کو منور کرتی ہے۔ بجلی ایک طاقت ہے جو الکٹرانوں کے ایک سیدھ میں بہاؤ کا نام ہے۔ کسی چیز کو گرم کرنے سے اُس سے حرارت اور بھاپ خارج ہوتی ہے۔ اس بھاپ کو مقید کرکے اس سے بڑے بڑے کام لئے جاتے ہیں۔ بھاپ سے مشینیں چلتی ہیں۔ بھاپ سے ریلیں اور موٹریں چلتی ہیں۔ بھاپ اور بجلی ہماری اکثر تمدنی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ ایٹم میں ایک زبردست قوت موجود ہے جو ایٹمی قوت یا جوہری توانائی کہلاتی ہے۔ جوہری توانائی سے بجلی حاصل ہوتی ہے۔ جوہری توانائی سے سمندری جہاز، آبدوز اور میزائیل وغیرہ چلتے ہیں۔ جوہری توانائی سے ایٹم بم بنایا جاتا ہے، جس کی تباہ کاریاں ہیبتناک اور رونگٹے کھڑا کردینے والی ہیں۔

اسی طرح روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ برقی مقناطیسی لہروں کے ذریعے ہماری آواز کو کرۂ ارض کے چاروں طرف پھیلایا جا سکتا ہے جس کے باعث ہم اپنے ریڈیو پر آن کی آن میں دنیا بھر کی خبریں سن لیتے ہیں۔ آواز کے طبیعی اُصولوں کی بنیاد پر ایجاد کردہ ٹیلی فون کے ذریعے ہم دور دراز فاصلوں کے باوجود ایک دوسرے سے بات کر سکتے ہیں۔ ٹرانسمیٹر، ٹیلی پرنٹر اور ٹیلکس وغیرہ کے ذریعے اپنے پیغامات دنیا کے کسی بھی حصے میں آن کی آن میں پہنچا سکتے ہیں۔

مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے یہ چند اہم پہلو آپ کے سامنے رکھ دیئے گئے ہیں۔ تمام چیزوں کا استقصار مقصود نہیں ہے۔ ان امور

سے۳ protiens, carbohydrates fats, minerai salts and vitamins.

اور حقائق کے ملاحظے سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ پورا کارخانۂ قدرت اسباب و علل اور خواص و تاثیرات کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ اور ہماری روزمرہ کی زندگی میں ان اسباب و علل اور ان کی کارفرمائیوں سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔

غرض یہ اور اس طرح کی بے شمار چیزیں ہیں جن کا ذکر سائنسی اور طبی علوم میں کیا جاتا ہے۔ اشیاء کی انہی خواص و تاثیرات سے استفادے کا نام اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اور یہ نعمتیں ان اشیاء کی تسخیر سے حاصل ہوتی ہیں، جن کا بیان تفصیل کے ساتھ اگلے باب میں آرہا ہے۔

اشیاء میں خواص و تاثیرات کے انکار کا نظریہ دراصل اشعری علم کلام کا حصہ[۱۶۵] ہے۔ جس کا زمانہ اب ختم ہوگیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اشیاء

---

۱۶۵ اشعری علم کلام (بانی ابوالحسن اشعری المتوفی ۳۲۵ھ یا ۳۳۰ھ) دوسری اور تیسری صدی ہجری میں فلسفۂ یونان اور اس کی ترویج و اشاعت کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے الحاد کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ مگر آج موجودہ سائنسی علوم کی ترویج و اشاعت کے نتیجے میں ہم کو جس قسم کے الحاد و دہریت کا سامنا ہے اس کا تقاضہ ہے کہ ہم قرآن کی اصل تعلیمات پر نظر رکھتے ہوئے موجودہ ہمہ گیر چیلنج کا سامنا کریں اور حقائق کا انکار نہ کریں۔ حقائق بہرحال حقائق ہوتے ہیں جن کے انکار کی نہ تو قرآن ہمیں تعلیم دیتا ہے اور نہ اس قسم کے علمی حقائق کا انکار دین کی کوئی خدمت ہے۔

آج اشعریت کی بجائے "سلفیت" (اپنے وسیع معنی میں) اور "ماتریدیت" (بانی ابو منصور ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ) کی ترویج و اشاعت کی ضرورت ہے۔ یعنی ہم اپنے عقیدے کے اعتبار سے (بقیہ ص۔۔ پر)

ہیں خواص و تاثیر اللہ تعالیٰ نے اپنی عجیب و غریب حکمت و مصلحت کے باعث رکھ چھوڑی ہے، جو اس کے ہمہ گیر نظامِ تقدیر[۱۴۲] اور "نظامِ ربوبیت" کا ایک جزو اور ایک زبردست مظہر ہے۔ اشیاء میں خواص و تاثیر کا انکار قرآن کے واضح بیانات کا انکار ہے جو کسی بھی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس میں کوئی عقلی خوبی ہو سکتی ہے۔ بلکہ قرآن عظیم کے دلائل آفاق و انفس کا تقریباً سارا دار و مدار انہی خواص و تاثیرات یا اسباب و علل پر ہے۔ آپ ان خواص و تاثیرات کا اقرار کئے بغیر دلیل و استدلال سے کام نہیں لے سکتے اور کسی منکر خدا پر حجت و برہان قائم نہیں کر سکتے۔ اس طرح پورا عقلی و استدلالی نظام ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اور کائنات کے آثار و مظاہر میں غور و فکر کرنا ایک بے کار اور عبث کام ٹھہرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ اس عقل و فکر کے لازمی نتائج ہوں گے جو محض اس غلط مفروضے کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں کہ اشیاء میں خواص و تاثیر مطلق موجود نہیں ہے۔ حالانکہ زمانۂ قدیم سے اب تک عوام و خواص سب کے سب

(بقیہ صفحہ گذشتہ) پکے اور ٹھیٹ سلفی ہوں اور کلامی نقطۂ نظر سے ماتریدی، تاکہ موجودہ فکری چیلنج اور اس کے فتنوں کا صحیح طور پر مقابلہ کیا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ "ماتریدیت" ہی ــــ اپنے اصل جوہر کے اعتبار سے ــــ ایک ایسا طرزِ فکر ہے جو فکرِ جدید سے کمل طور پر ہم آہنگ ہونے اور اس کا مقابلہ کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اور اسی میں جدید علم کلام کی تدوین کی بھی صلاحیت ہے۔ لہٰذا جدید علم کلام کی تدوین کے لئے ماتریدیت کے صالح عناصر اور اس کی روح سے استفادہ ناگزیر ہوگا۔ یعنی اس کے لاطائل فلسفیانہ مباحث کو چھوڑ کر، جن کا اب چلن نہیں رہا۔

۱۴۲ ملاحظہ ہو پچھلے صفحات میں فقرہ ۱۴ کے تحت سورۂ فرقان اور سورۂ اعلیٰ کی آیات۔ نیز اس کی تفصیل اگلے صفحات و ابواب میں بھی کی گئی ہے۔

ان خواص و تاثیرات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ برابر مستفید ہو رہے ہیں۔ اور کبھی ان کا انقطاع عمل میں نہیں آسکتا۔ اور آج تو جدید مصنوعات اور جدید سواریوں وغیرہ سے استفادہ کرنا عملاً اور علانیہ طور پر گویا کہ ان خواص و تاثیرات کا اقرار و اعتراف کرنا ہے۔ مثلاً جب ہم کسی کو ٹیلی فون کرتے ہیں تو ہمارا عقیدہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر ہم یہ سمجھ کر ٹیلی فون کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے ہماری آواز مطلوبہ دور دراز مقام تک فوراً پہنچ جائے گی۔ اور ہمارا اس طرح خیال کرنا گویا کہ اس ٹیلی فونی نظام میں کارفرما "تاثیر" کا اقرار و اعتراف کرنا ہے۔ اسی طرح جب ہم کسی موٹر، ٹرین یا ہوائی جہاز پہ سوار ہوتے ہیں تو گویا کہ ہم غیر شعوری طور پر اس کی مشنری میں کارفرما برق و بھاپ کی "قوت محرکہ" کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں کہ اس کی بدولت ہم اتنے وقت میں فلاں مقام تک پہنچ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب جادو یا طلسم یا کوئی آسیبی خلل نہیں ہے بلکہ خدائے رحمان ہی کے مقرر کردہ مادی اشیاء کے ضوابط کا نتیجہ ہے، جن کی حقیقت طبیعی علوم (physical Sciences) کے تحت ظاہر ہوتی ہے۔ ان حقائق کا انکار کر کے ہم موجودہ تمدنی دنیا میں ایک دن بلکہ ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتے۔ آج ہماری زندگی کے تمام شعبوں کو یہ علوم اور ان کی کارفرمائیاں پوری طرح گھیرے ہوئے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موجوداتِ عالم کا جو "تقدیری نظام" بنا یا ہے، جس کو علم جدید کی اصطلاح میں نظامِ فطرت کہا جاتا ہے، اس میں ایسی خوبیاں رکھ دی ہیں کہ ان کے بنیادی اصول و ضوابط کو کام میں لا کر انسان ان اشیاء اور ان کے نظام سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اور یہ چیز

؎ یہاں پر معجزاتِ انبیاء خارج از بحث ہیں۔

جس طرح انکارِ خدا کی دلیل نہیں بن سکتی (منکرین و معاندین کی منطق کے مطابق) اسی طرح وہ خداوند کریم کے نافع وضار اور مسبب الاسباب ہونے کی نفی بھی نہیں کر سکتی۔ نفع و نقصان کی اصل باگیں رب العلمین ہی کے قبضے و اختیار ہی میں رہتی ہیں اور تمام اشیاء پر اُسی کی حکمرانی رہتی ہے۔ ان مظاہر میں اس کے احکام سے سرتابی کی مجال نہیں ہے۔ وہ جب چاہے ان اشیاء سے اُن کی یہ خصوصیات زائل کر سکتا ہے اور جب چاہے ان کو فنا کر سکتا ہے۔ مگر یہ ایک دوسری بحث ہے۔ اس سے موجوداتِ عالم میں ودیعت شدہ "فوائد (جن کو قرآن حکیم کی دیگر آیات میں اللہ کی نعمتوں اور اس کے نشانات سے تعبیر کیا گیا ہے) سے انکار لازم نہیں آتا[۴۳]۔ یہ دونوں باتیں اپنے اپنے حدود میں بالکل صحیح ہیں اور ہم کو افراط و تفریط کا شکار ہوئے بغیر ان دونوں کے درمیان صحیح حدود کو قائم رکھنا ہے۔ ورنہ سر رشتۂ حیات ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا اور سوائے حیرانی و سرگردانی کے کچھ بھی حاصل نہ ہو سکے گا۔

اس عالم رنگ و بو میں خواص و تاثیرات کا پایا جانا اس بات کی علامت ہے کہ یہ کائنات اور اُس کے مظاہر دفعتاً نمودار نہیں ہو گئے۔ بلکہ مختلف مراحل سے گزر کر یا دوسرے لفظوں میں ارتقائی منازل طے کر کے موجودہ حالت تک پہنچے ہیں۔ اگر خداوند عالم چاہتا تو آن کی آن میں اور دفعتاً کوئی حیوان یا پیڑ پودا لباسِ وجود میں جلوہ گر ہو سکتا تھا۔ مگر ایسا

۴۳۔ ہم کو بنیادی طور پر دو باتوں کا حکم دیا گیا ہے: ایک مظاہر فطرت یا اللہ کی نشانیوں میں غور و خوض کر کے اس کی ربوبیت کی حقیقت کو سمجھنا۔ اور دوسرے انہی مظاہر و نشانات باری سے بطور نعمہائے الٰہیہ مستفید ہونا، جو حقیقتاً ان آیات و نشانات میں غور و خوض اور تحقیق و تفتیش کا انعام اور اس کا صلہ ہیں۔ اس کی تفصیل اگلے ابواب میں آ رہی ہے۔

نہیں ہوا۔ بلکہ قوانین فطرت کا ایک مضبوط سلسلہ جاری کیا گیا۔ جو تدریج و ارتقا کی شکل میں جاری و ساری ہے۔ مثلاً ایک انسان اپنی جسمانی تکمیل کے لئے پورے نو ماہ تک بطنِ مادر میں رہ کر باہر آتا ہے اور بتدریج ایک طویل عرصے کے بعد جوان ہوتا ہے۔ پہلے وہ ایک خلوی ہوتا ہے، پھر چند خلوی، پھر کثیر خلوی۔ ہر خلیہ (cell) اپنے اندر ایک پوری کائنات رکھتا ہے[۴۴] جس میں ودلیعت شدہ خواص و تاثیرات کے مطالعے پر ابواب کے ابواب سیاہ کئے جا سکتے ہیں۔ یہی حال دیگر تمام اشیاء اور ان کے متعلقہ علوم کا بھی ہے۔

غور فرمایئے تو نظر آئے گا کہ یہ سارا سلسلۂ وجود خواص و تاثیرات اور اسباب و علل کا حیرت انگیز مجموعہ ہے۔ اور اس عالم مادی میں تدریج و ارتقاء کے اُصول کے باعث ان کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

ان خواص و تاثیرات اور اسباب و علل کے درمیان کامل نظم و ضبط اور مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو ایک ناظم اور ضابطہ ساز اور مدبر و منتظم کی طرف اشارہ اور رہنمائی کرتی ہے، یہی خدا ہے۔

حضرت آدمؑ کو مظاہر فطرت کی شناخت و پہچان کرانے کے ساتھ ساتھ اُن کے آثار و خواص کا علم عطا کئے جانے کی ایک اہم غرض و غایت یہ بھی تھی کہ انسان ان ظاہری اسباب و علل میں غور و فکر کر کے ان کے پس پردہ کارفرما شاہدِ حقیقی کی جلوہ افروزیوں کا پتہ لگائے اور اپنی عقل و دانش کو ہمیشہ مصروف اور برسرِ پیکار رکھے۔ یہ گویا ایک بہت بڑا امتحان اور ایک بہت بڑی آزمائش

---

[۴۴] حیوانی اور نباتاتی خلیوں کی ساخت و برداخت اور اُن کی کارفرمائیوں کا علم ایک وسیع اور مستقل علم ہے، جس کو علم خلیہ: cytology یا cell biology کہتے ہیں۔ یہ حیاتیات (biology) کی ایک شاخ ہے۔

ہے جو ازل سے جاری و ساری ہے۔

اور اس علم کی دوسری غرض و غایت یہ تھی کہ اشیائے عالم کے خواص و تاثیرات سے واقفیت حاصل کر کے ان میں خالق کائنات کی طرف سے ودیعت شدہ فوائد سے (خدائے رحمان کی نعمتوں کے طور پر) مستفید ہو کر اپنی زندگی کو بہتر بنائے۔ اول سے آخرت بنتی ہے تو ثانی سے اُس کی دنیا سنورتی ہے۔ اور ان دونوں میں توازن قائم رکھنا ہی اسلام کا اصل کارنامہ ہے۔

آج اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے ان مادی علوم اور مادی اشیار کی کارفرمائیوں کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ مادی اعتبار سے قوت و طاقت حاصل کرنا اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے بہت ضروری ہے ورنہ سیاسی اعتبار سے غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی دراصل اسباب و علل اور نظام تعلیل ہی کے ماتحت ہے۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے مادی اسباب و علل کا جائزہ لینا اور اس کے لئے مکمل منصوبہ تیار کرنا بہت ہی اہم بات اور بنیادی چیز ہے۔ مگر یہ چیز محض خواہشات اور آرزؤں کے سہارے برپا نہیں ہو سکتی۔ لہذا اہل اسلام کے طرز فکر میں تبدیلی آنی ضروری ہے اور انہیں ہر حال میں حقیقت بیں اور حقیقت شناس ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا کے لئے جو مادی قوانین جاری و ساری کئے ہیں اُن سے صرف نظر کرنا قوموں کے لئے پیام موت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر تفصیل اگلے ابواب میں آرہی ہے۔

۱۷۔ عالم اسباب کے چند مزید حقائق

اوپر کی بحث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اشیار و اجسام میں تاثیر اور خاصیت موجود ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تمام طبی علوم بھی۔۔ جن کا تعلق سائنسی علوم ہی سے ہے۔۔۔ درست اور صحیح ہیں۔ لہذا علاج و

معالجہ اور ادویات کی کارفرمائی وغیرہ کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ یہ چیزیں توکّل کے خلاف ہیں۔ بلکہ یہ تو تعلیم الٰہی کے عین مطابق ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علاج معالجہ کیا ہے اور اپنی امت کو اس کی تعلیم دی ہے۔[۴۵]

قرآن مجید اس سلسلے میں ہمارے لئے ایک بہترین رہنما ہے جس نے چند بنیادی اصولوں کو پیش کر کے ہمارے سامنے ایک خاکہ رکھ دیا ہے۔ سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ اُس نے امراض وعوارض کے وجود کو تسلیم کر کے بیماروں

---

۴۵ ممکن ہے بعض حضرات کو یہ بحث غیر ضروری معلوم ہو۔ مگر ایک تو یہ پچھلی بحث کا تتمہ ہے۔ دوسری حیثیت سے اس میں قرآن اور حدیث کے بعض نئے دلائل اور نئے گوشے آرہے ہیں۔ اور تیسری حیثیت سے اس بحث کے آخر میں چند ایسے نتائج نکالے گئے ہیں جو ہمارے فکر و نظر میں تبدیلی پیدا کرنے اور ہمارے اذہان کو صیقل کرنے میں نہایت درجہ موثر ہیں۔ اس وقت دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے ہماری پستی و انحطاط اور ہمارے فکری و علمی جمود کی جو حالت وکیفیت ہے اس کا تقاضہ ہے کہ کارِ تجدید و اصلاح کے لئے خرابیوں کی اصل جڑ بنیاد تلاش کی جائے۔ پھر اس کا علاج تجویز کیا جائے۔ اصلاح نیچے سے اور درجہ بدرجہ ہونی چاہیئے اصل جڑ کو برقرار رکھتے ہوئے محض شاخوں کو چھانٹ دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ مادی اور سائنسی علوم سے صدیوں کی دوری نے ہمیں بہت سی غلط فہمیوں اور غیر معقول باتوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ ہمارے ذہن و فکر میں اساسی تبدیلیاں پیدا کی جائیں اور سوچنے سمجھنے کا انداز بدلا جائے مسلم معاشرے میں حقائق کے سمجھنے اور ان سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے پیش پا افتادہ مسائل کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر ناخنِ تدبیر سے انہیں سلجھایا جائے۔

اور مریضوں کو شرعی طور پر رخصتیں عطا کی ہیں۔ اور دوسری حقیقت یہ کہ علاج و معالجے کے اصول کو اصولی طور پر تسلیم کر کے گویا کہ اسباب و علل کے برحق ہونے کی تصدیق کی ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا:

اگر تم بیمار ہو یا حالتِ سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص حاجت ضروریہ سے فارغ ہوا ہو یا تم نے (اپنی) بیویوں سے قربت کی ہو، پھر تم کو (طہارت کے لئے) پانی نہ ملے تو تم پاک زمین سے تیمم کر لیا کرو۔ (نساء: ۴۳، مائدہ: ۶)

اس آیت کریمہ میں مریض کے لئے پانی نہ ہونا تیمم کے لئے شرط نہیں ہے۔ بلکہ یہ حکم دراصل سفر اور مابعد کی حالتوں کے ساتھ مشروط ہے، ورنہ مریض کے لئے محض اُس کا مطلقاً مریض ہونا ہی تیمم کے جواز کے لئے کافی ہے[۵۴۶]

اسی طرح رمضان شریف کے روزے جو فرض ہیں مرض اور سفر کی صعوبتوں کا خیال کرتے ہوئے ان کی قضا دوسرے دنوں میں جائز رکھی گئی ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ

جو شخص تم میں بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار ہے۔

(بقرہ: ۱۸۴)

اسی طرح حج اور عمرہ کے بارے میں حکم یہ ہے کہ قربانی کا جانور قربان گاہ تک پہنچنے سے پہلے سر منڈوانا جائز نہیں۔ مگر کسی بیماری یا سر کی تکلیف وغیرہ کی بنا پر اس میں رخصت ہے کہ اس سے قبل بھی سر منڈوانا جائز ہے۔

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ط فَمَنْ كَانَ

---

۵۴۶ ملاحظہ ہو احکام القرآن، جصاص رازی، جلد ۲ ص ۳۶۸

مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ج اور اپنے سروں کو اُس وقت تک نہ منڈاؤ جب تک کہ قربانی (کا جانور) اپنے مقام تک نہ پہنچ جائے۔ البتہ اگر کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اُس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو وہ سر منڈوا کر) فدیہ دے دے۔ یعنی (تین) روزے یا (چھ مسکینوں کو) خیرات یا (ایک بکری) ذبح کرنے (میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرے)۔ (بقرہ : ۱۹۶)

ان آیات کے ملاحظے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جسمانی عوارض و اسباب شرعاً معتبر ہیں۔ اور ان اسباب و تاثیرات سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی شریعت حقہ نے ان اسباب و علل اور اثرات و طبائع کا اعتبار کرتے ہوئے مختلف شرعی اُمور میں رخصت و اجازت دے رکھی ہے اور احکام و فرائض کی ادائیگی میں تخفیف و تیسیر کے اصول کو تسلیم کیا ہے۔

یہ تو جسمانی عوارض کے برحق ہونے کا اصولی بیان تھا۔ اب ان عوارض و موانع کو زائل کرنے کے لئے علاج و معالجے کے مبنی برصواب ہونے کا بیان ملاحظہ ہو۔ شہد کا تذکرہ کرکے فرمایا کہ اس میں لوگوں کے لئے (بہت سی بیماریوں میں) شفاء رکھ دی گئی ہے۔

يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ اس کے پیٹ سے ایک سیال چیز نکلتی ہے جس کی رنگتیں مختلف ہوتی ہیں۔ اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔ (نحل : ۶۹)

پھر اس کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے :

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝ اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے ایک بہت بڑی دلیل موجود ہے۔ (نحل : ۶۹)

یعنی باری تعالےٰ کے وجود اس کی وحدانیت اور اُس کی بے نظیر ربوبیت کی جو اسباب و علل کے اس وسیع سلسلے میں غور و فکر کرکے حقائق و معارف کا

استنباط کرتے ہیں اور منکرین و معاندین کی رہبری و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

اس موقع پر یہ حقیقت بھی ملحوظ رہنی چاہیئے کہ قرآن حکیم کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی ایک عظیم خصوصیت "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" (ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والا) کے بمصداق ہر باب میں کوئی واضح حکم دے کر یا کوئی واضح اشارہ کر کے تفصیلات (خصوصاً شرعی امور میں) اپنے رسول برحق اور ہادی مطلق کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے زیر بحث موضوع (علاج و معالجہ اور اسباب و علل وغیرہ) کے بارے میں ہم کو سیرت نبوی اور سنت مطہرہ میں واضح ہدایات ملتی ہیں۔ جن کے ملاحظے کے بعد مزید کسی قسم کے شک و شبہ اور قیل و قال کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اس موضوع پر سب سے بہترین تصنیف علامہ ابن قیمؒ (۶۹۱ - ۷۵۱ھ) کی "زاد المعاد فی ہدی خیر العباد" ہے۔ اس میں علامہ موصوف نے اس سلسلے میں مروی تمام احادیث و روایات کو مختلف عنوانوں کے تحت جمع کر کے ان کی حکمتیں اور علتیں بیان کی ہیں۔ ان احادیث کے مطابق رسول اکرم صلعم نے مختلف مواقع پر خود بھی علاج و معالجہ کیا ہے اور صحابہ کرام کو بھی مختلف چیزوں کے ذریعہ علاج کا طریقہ بتایا ہے۔ اس لحاظ سے "طب نبوی" کا مطالعہ ایک مستقل موضوع ہے اور بہت اہم بھی۔ طب نبوی کے ان جواہر پاروں پر ایک محقق (عبد الغنی عبد الخالق) نے اپنے دو معاونین (ایک طبی ماہر اور ایک عالم حدیث) کی مدد سے بڑا اور قابل قدر کام یہ کر ڈالا ہے کہ زاد المعاد کی مذکورہ بالا تمام روایات کی چھان بین اور اصل مراجع سے ان کی تصحیح و مقابلہ کرنے کے بعد ... مفید حواشی سے آراستہ کر کے اس کو "الطب النبوی لابن القیم الجوزیۃ" کے نام سے شائع کر دیا ہے[۵۴۷]۔

---

۵۴۷ یہ کتاب مکتبۃ النہضۃ الحدیثۃ، مکہ مکرمہ سے شائع ہوئی ہے۔

اس لحاظ سے یہ ایک بہت وقیع اور معرکۃ الآراء علمی کتاب بن گئی ہے۔

بہرحال اس موقع پر زاد المعاد سے علامہ موصوف کی اصولی بحث کی تلخیص پیش کی جاتی ہے، جو موصوف نے ابتدائی فصلوں میں کی ہے، اور اس کتاب کے حوالے سے چند حدیثیں بھی ۔۔۔ زیر بحث موضوع سے متعلق ۔۔۔ نقل کی جاتی ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مرض کے لئے دوا موجود ہے۔ جب کسی بیمار کو دوا دی جاتی ہے تو وہ اللہ کے حکم سے صحت یاب ہو جاتا ہے۔

صحیحین (بخاری و مسلم) میں حضرت ابو ھریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی بیماری دنیا میں بھیجی ہے اُس کے لئے شفا (کا سامان) بھی بھیجا ہے۔

مُسند احمد بن حنبل اور سُنَن (ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ) میں ابو خزامہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ بتایئے کچھ پڑھ کر پھونکنے کے بارے میں جن کو ہم اختیار کرتے ہیں، یا وہ دوائیں جن کو ہم بطور علاج استعمال کرتے ہیں، یا مصیبتوں سے بچنے کی وہ تدبیریں جن کو ہم اختیار کرتے ہیں، کیا یہ تمام چیزیں اللہ کی تقدیر کو پھیر دیتی ہیں؟ فرمایا کہ یہ سب چیزیں بھی تقدیر ہی سے ہیں[1]

"یہ حدیثیں اسباب و مسببات (علل و معلومات) کے وجود پر دلالت کر رہی ہیں اور ان میں ابطال ہے ان لوگوں کا جو اس حقیقت کو تسلیم کرنے

---

[1] یعنی ایسا کرنا بھی تقدیر ہی کے ماتحت ہے اس سے الگ نہیں، مطلب یہ کہ یہ بات پہلے ہی سے مقدر ہو چکی ہوتی ہے کہ فلاں بندہ فلاں تدبیر سے اچھا ہو جائے گا۔ لہذا ان اسباب و علل کے مطابق عمل کرنا تقدیر الٰہی کے منافی نہیں ہے۔

سے انکار کرتے ہیں۔ نیز رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بیان کہ "ہر مرض کی دوا (اس کارخانۂ قدرت میں) موجود ہے"۔ اس کا عمومی اعتبار سے یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ بعض قاتل امراض اور ایسے امراض بھی ہوسکتے ہیں جو طبیبوں کی دسترس سے باہر ہوں، اور جن کا علم اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی سے پوشیدہ رکھا ہو اور وہ اس کی پہنچ سے باہر ہو۔[۴۹] سوائے اتنے علم کے جتنا کہ اس نے خود سکھا دیا ہے۔ اسی بنا پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شفا کو موقوف کیا اس پر کہ دوا کو بیماری سے جوڑا جائے (یعنی بیماری اور دوا کے ملاپ سے شفا وجود میں آئی ہے) کیونکہ مخلوقاتِ الٰہی میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے

---

۴۹ علامہ ابن قیم کی بصیرت اور دوربینی کی داد دینی پڑے گی کہ انھوں نے اس حقیقت کو بطور ایک اصول تسلیم کر کے دراصل علم کی وسعت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ طب جدید درحقیقت الٰہی پوشیدہ اسباب وعلل اور کارخانۂ قدرت کے پوشیدہ اجزا و عناصر کی دریافت کے ذریعے علاج و معالجہ کو بہتر سے بہتر بنانے کا نام ہے۔ بہر حال یہ کلیہ جس طرح دورِ قدیم میں صادق آرہا تھا اسی طرح وہ دورِ جدید میں بھی پوری طرح صادق آرہا ہے۔ اور شاید قیامت تک اسی طرح صادق آتا رہے گا۔ یہ ایک زندہ اور ابدی حقیقت ہے کہ انسان آج جس قدر امراض کا علاج دریافت کرتا جا رہا ہے اسی قدر نئے نئے امراض پیدا ہوتے جا رہے ہیں، جو اس کی حکمت و دانش کیلئے ایک چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ مگر حقیقتاً کارخانۂ قدرت میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے اور یہ تناسب غالباً قیامت تک اسی طرح باقی رہے گا، تاکہ انسان کو ہمیشہ اپنی کمزوری اور بےکسی کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا رہے، اور وہ اپنے سے ایک برتر ہستی کے وجود کا اقرار و اعتراف کر کے اس کی بارگاہِ صمدیت کی جانب لپکنے پر آمادہ ہوسکے۔

جس کی ضد نہ ہو۔ اس طرح ہر بیماری کی ایک ضد اس کی دوا کی شکل میں موجود ہے۔

اس لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحت یابی کو بیماری سے دوا کی موافقت پر موقوف فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب دوا اپنی کیفیت میں بیماری کے درجے سے تجاوز کر جاتی ہے یا کمیت میں زیادہ ہو جاتی ہے تو ایک نئے مرض کی شروعات ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ بیماری کے درجے سے کم ہو جائے تو بیماری کے مقابلہ سے قاصر رہتی ہے۔ نیز معالج اگر دوائی سے واقف نہ ہو تو اس صورت میں بھی شفاء حاصل نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر زمانے (کے طبعی حالات) اس دوائی کے استعمال کے لئے سازگار نہ ہوں تو اس صورت میں بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح بدن اگر کسی دوائی کا متحمل نہ ہو یا اس کو انگیز کرنے کی قوت نہ رکھتا ہو یا اس کی تاثیر میں اس طرح کا کوئی دوسرا مانع موجود ہو تو ان سب صورتوں میں بھی عدم مطابقت کی وجہ سے جسمانی شفا حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح حصول صحت کے لئے مرض اور دوا کے درمیان کامل مطابقت اور ہم آہنگی ضروری ہے۔ حدیث شریف کے یہ دونوں بہترین پہلو ہیں۔

موجودات عالم کی اس ضد اور ان کے درمیان مزاحمت و مقابلہ آرائی کے اس پہلو اور ایک دوسرے پر غالب آجانے کی اس (عجیب و غریب) خصوصیت پر غور کرنے سے رب العالمین کی کمال قدرت، اس کی حکمت و دانائی، اس کی محکم صنعت، اس کی منفرد ربوبیت و وحدانیت اور مخلوقات پر اس کی حکمرانی و قہرمانی کا عالم واضح ہو جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس (عظیم و برتر ہستی) کے علاوہ سب کے سب متضادات (ایک دوسرے کی ضد) کا مجموعہ ہیں۔ نیز یہ کہ وہی ایک غنی اور بے نیاز ہے اور اس کے سوا سب کے سب محتاج اور حاجت مند ہیں۔

ان احادیث صحیحہ میں علاج و معالجہ کی جو تعلیم دی گئی ہے وہ توکل کے

منافی نہیں ہے۔ جس طرح کہ بھوک، پیاس اور گرمی وسردی کا ازالہ ان کی ضد سے کرنا توکل کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ توحید کی حقیقت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ ان اسباب کو چھیڑا نہ جائے جن کو اللہ تعالیٰ نے تقدیری اور شرعی دونوں حیثیتوں سے مسببات کے (لازمی) تقاضوں کے طور پر (پورے عالم رنگ و بو میں) پھیلا رکھا ہے[۵۰]

اس میں رد ہے ان لوگوں کا جو دوا دارو کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر شفا ہمارے لئے مقدر ہے تو دوا چنداں مفید نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح شفا اگر مقدر نہیں ہے تب بھی دوا سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔[۵۱]

یہ بیان کیا ہے مختلف حکمتوں اور بصیرتوں سے بھرپور اسباق و بصائر کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ اصول و کلیات صرف طب و صحت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دراصل ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں بھی اسباب وعلل کی کارفرمائی کا یہی حال ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی عالم اسباب سے الگ اور آزاد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو کچھ اس ڈھنگ سے پیدا کیا ہے کہ اس کا ہر ذرّہ دوسرے ذرّے سے اور ہر فرد دوسرے فرد سے بندھا ہوا ہے، اور کوئی کسی سے مستغنی اور

---

۵۰ مطلب یہ کہ مسببات کے حصول کے لئے ان اسباب سے تعرض کرنا لازمی ہے۔ جب تک پانی نہ پیا جائے پیاس زائل نہ ہوگی۔ جب تک غذا استعمال نہ کی جائے بھوک دور نہ ہوگی۔ اسی طرح جب تک کسی قوم کے پاس مناسب ہتھیار اور اسلحہ موجود نہ ہو وہ کسی فوج کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ جب تک قوت و طاقت حاصل نہ کی جائے کسی کو زیر نہیں کیا جاسکتا جب تک جہاد نہ کیا جائے دشمن کا زور اور غلبہ دور نہیں ہوسکتا اور اپنے دین و ملت کا دفاع عمل میں نہیں آسکتا۔ وقس علی ذلک۔

۵۱ زاد المعاد، ۳/۶۶-۶۷، دار الافتار، ریاض

بے پرواہ نہیں ہے۔ استغنا، صرف ایک ذات برتر کی شان ہے۔ ورنہ تمام مخلوقات و موجودات محتاج اور عالم اسباب کے وسیع سلسلوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

۱۸۔ علم مقادیر اور عصر جدید میں اس کی اہمیت

اوپر کی تفصیل سے یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ یہ عالم آب و گل اضداد اور مقادیر کا مجموعہ ہے۔ ہر چیز میں مخصوص اثرات اور مخصوص مقداریں ہوتی ہیں، جو دوسری چیز میں نہیں پائی جاتیں۔ مگر ان چیزوں کے تقابل سے ایک دوسرے کی تاثیرات کا ازالہ ہوتا رہتا ہے، اور اُن کے خواص ایک دوسرے پر غالب آتے رہتے ہیں۔ جب دو چیزیں باہم ملتی ہیں تو اُن کے خواص طبیعی میں ایک کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہ اجزاء و عناصر ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کش مکش میں جیت اُس جزء یا عنصر کی ہوتی ہے جس کے خواص طبیعی زیادہ مؤثر اور طاقتور ہوتے ہیں[۵۲]۔ مگر اس باہمی کش مکش کی بنیادی صورت کے باوجود ان اجزاء و عناصر کا باہمی اتحاد اور تال میل کی کیفیت بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ جب یہ اجزاء و عناصر باہم ملتے ہیں تو وقتی کش مکش (کیمیاوی عمل اور ردِّ عمل) کے بعد حیرت انگیز طور پر باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم کو مختلف قسم کے سالمات (molecules) اور کیمیاوی مرکبات (compounds) کی شکل میں نظر

---

۵۲ مثلاً دودھ اور پانی جب باہم ملتے ہیں تو دودھ کا رنگ پانی پر غالب آجاتا ہے۔ اگر دودھ میں تھوڑی سی شکر ڈال دی جائے تو اس کے اجزاء گھل کر دودھ کے تمام اجزاء (سالمات) کے ساتھ مل جاتے اور انھیں میٹھا کر دیتے ہیں یہی حال دیگر تمام اشیاء کا بھی ہے۔

آتا ہے۔ گویا کہ ان کے درمیان کسی قسم کا "جھگڑا" ہی نہیں ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جب دنیا کی مختلف اشیاء کا جائزہ لیا جائے تو اس سے مختلف علوم کی بنیاد پڑتی ہے۔ مثلاً :-

۱۔ غذا اور جڑی بوٹیوں کے طبی (medicinal) خواص و فوائد کا جائزہ لیا جائے تو اس سے علم المفردات یا علم الادویہ pharmacology وجود میں آتا ہے۔

۲۔ دنیا کی تمام چیزیں جن اجزاء و عناصر سے مرکب ہیں، اگر ان اجزاء و عناصر کے خواص و تاثیرات کا جائزہ لیا جائے تو اس سے علم کیمیا chemistry کی بنیاد پڑتی ہے۔

۳۔ اشیائے عالم میں جو قوتیں (حرکات و سکنات کے اعتبار سے) کارفرما ہیں اگر ان کا منظم مطالعہ کیا جائے تو یہ علم طبیعیات (physics) کہلائے گا۔

اس طرح مظاہر عالم کے خواص و تاثیرات کا دائرہ بہت وسیع اور آفاقی ہے۔ انہی تمام چیزوں کا علم حضرت آدم کو دیا گیا تھا جن کا علم اولادِ آدم بتدریج حاصل کر رہے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم مادی کی ہر چیز اور ہر مظہر فطرت ایک خاص مقدار اور بالکل نپے تلے انداز میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ خواہ وہ عالم حیوانات کی قبیل سے ہو یا عالم نباتات کی قبیل سے، جمادات سے متعلق ہو یا افلاک سے۔

وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ ○ اور اس کے ہاں ہر چیز ایک متعین مقدار کے ساتھ ہے۔ (رعد)

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ○ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کو باضابطہ بنایا۔ (فرقان : ۲)

وَ اَنۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ مَّوۡزُوۡنٍ ﴿۱۹﴾ اور ہم نے زمین میں ہر چیز تلی پیدا کی ہے۔ (حجر: ۱۹)

موجودہ دور سے پہلے ہم "مقدار" "تقدیر" اور "موزوں" اشیاء کی اصل حقیقت سے ناواقف تھے۔ مگر آج ان چیزوں کی حقیقت اور ربانی کلمات کی قدر و قیمت علم المفردات، علم الادویہ اور حیاتیاتی علوم[۵۳] کی تحقیق و تدوین کے باعث پوری طرح واضح ہو چکی ہے۔ جو لوگ ان علوم سے ناواقف ہیں وہ ان آیات کریمہ کے صحیح مفہوم اور ان کی صحیح قدر و قیمت سے واقف نہیں ہو سکتے۔ مثلاً یہ علم کہ مختلف غذائی اشیاء میں مواد لحمیہ، مواد نشاستہ، مواد شحمیہ، معدنی نمکیات اور حیاتین وغیرہ کا تناسب کیا ہے اور اُن کے فوائد و خصوصیات اور تاثیرات کیا ہیں؟ اور بنیادی طور پر یہ غذائی مادے کن اجزاء اور عناصر پر مشتمل ہیں اور کس قدر حیرت انگیز تناسب کے ساتھ ان مادوں کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے[۵۴] کارخانۂ قدرت میں شاید سب سے زیادہ دلچسپ

---

۵۳ خصوصیت کے ساتھ حیاتیات (بیالوجی) کی وہ شاخیں جو انواع حیات اور اُن کے متعلقات کے کیمیاوی تجزیے و تحلیل سے متعلق ہیں۔ مثلاً:

حیاتیاتی کیمیا ____________ biochemistry

سالماتی حیاتیات ________ molecular biology

خوردبینی حیاتیات ____________ microbiology

کیمیاوی خوردبینی حیاتیات ___ chemical microbiology

۵۴ اس موضوع پر تفصیلی مطالعے کے لئے دیکھئے اردو میں:

۱۔ ہماری غذا، مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند)

۲۔ دیہاتی معالجے، مطبوعہ ہمدرد دواخانہ دہلی (بقیہ ص ۹۳ پر)

یہی علم ہے۔ ؎۵۵
انسان کی صحت اور اس کے معاشی و اقتصادی فوائد اور دیگر بہت سے اغراض و مقاصد کی رُو سے ان علوم کی تحصیل بے حد ضروری اور اہم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کارزارِ حیات میں جد و جہد ہماری صحت پر

اور انگریزی میں ملاحظہ ہو۔
Encyclopedia of Medicinal Foods, London
Encyclopedia of Medicinal Herbs,
نیز ان طبی علوم کے ساتھ ساتھ حیاتیاتی کیمیا (biochemistry) کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

۵۵ مثلاً تمام غذائی مادے اور دنیا کی اکثر و بیشتر چیزیں زیادہ تر چودہ عناصر (کارخانۂ قدرت میں بافراط پائے جانے والے) سے مرکب ہیں۔ جیسے آکسیجن، نائٹروجن ہائیڈروجن، کاربن، کیلسیم، میگنیشیم وغیرہ۔ مگر ذرا سے تناسب کے بدل جانے سے چیزیں کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں بعض اوقات صرف ایک ایٹم کے اِدھر یا اُدھر ہونے سے بہت بڑا فرق ہو جاتا ہے۔
ایک دلچسپ مثال دیکھئے ہیرا اور کوئلہ سو فیصد کاربن کی بنی ہوئی چیزیں ہیں مگر ایک انتہائی خوبصورت، چمکدار، قیمتی اور سخت ترین (دنیا کی تمام چیزوں میں سب سے زیادہ سخت) ہے، جبکہ دوسرا سیاہ فام، بدصورت، ارزاں اور بھربھرا ہے۔ کیا یہ ایک حیرت انگیز حقیقت نہیں ہے؟ اسی طرح آکسیجن عنصر کی بنیادی خصوصیت چیزوں کو جلنے اور جلانے میں مدد دینا ہے۔ اور ہائیڈروجن ایک جلنے والی گیس ہے۔ مگر ان دونوں کے کیمیاوی تعامل سے پانی وجود میں آتا ہے، جو ان دونوں کی مفرد خصوصیات کے برعکس بالکل نئی خصوصیت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی اشیاء کو بجھانے میں مدد دینا۔ انسان ان چیزوں کے ہیر پھیر اور ان کے اسرار و عجائب کی اصل کنہ و حقیقت سمجھنے اور ان کا صحیح ادراک کرنے سے قاصر ہے۔

موقوف ہے۔ پھر طبی علوم کی تعلیم و تدریس اور دوا سازی وغیرہ کی معاشی اہمیت بھی ظاہر ہے۔ آج کل تو مختلف طبی آلات اور نئی نئی مختلف قسم کی دواؤں کی اتنی صنعتیں اور فیکٹریاں قائم ہو گئی ہیں جن کا شمار بھی مشکل ہے۔ اس وقت دنیا میں اسلحہ سازی کی صنعت کے بعد دواؤں کی صنعت دوسرے نمبر پر ہے۔ طبی علوم میں ریسرچ اور مختلف پودوں اور دواؤں پر تحقیقات کے الگ شعبے اور علمی ادارے و اکیڈمیاں قائم ہیں۔ اس طرح "علم مقادیر" (مختلف اجزا و عناصر اور ان کے درمیان تناسب کا علم) سے صحیح فائدہ عصر جدید کا انسان اُٹھا رہا ہے۔ جو لوگ اس علم سے نابلد رہیں گے وہ نہ صرف مخلوقاتِ الٰہی اور موجودات عالم کی حقیقت سے نابلد رہیں گے بلکہ "علم مقادیر" میں پیچھے ہونے کے باعث اس علم سے حاصل ہونے والے مادی فوائد سے بھی عاری رہیں گے۔ انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد اگرچہ اصولی حیثیت سے معاش نہیں بلکہ معاد ہے، مگر معاش کے مسئلے کو یکسر نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ درحقیقت معاد کی صلاح و فلاح بھی معاش ہی کی صلاح پر منحصر ہے۔ ان دونوں میں توازن قائم رکھنا چاہیئے، ورنہ خلافت ارض کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔

۱۹ — صرف اسماء حقائق نہیں

(طبیعی و حیاتیاتی علوم کی نارسائی)

اسماء اور علم اسماء کی یہ بحث اُس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک کہ اس کے ایجابی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے سلبی پہلوؤں پر بھی نظر نہ ڈالی جائے۔ فکر و نظر کے تزکیہ کے لئے تصویر کے یہ دونوں رُخ نظروں کے سامنے رہنے چاہیئے۔ اس بحث سے جہاں ایک طرف

"علم آدم" کی صحیح نوعیت واضح ہوتی ہے تو دوسری طرف قرآنِ حکیم کی عظمت و برتری کا ایک نیا اور حیران کن پہلو سامنے آتا ہے، اور چودہ سو سال قبل کے دعوے آج بھی اپنی جگہ پر اٹل اور ناقابل ترمیم وتغیر نظر آتے ہیں۔

چنانچہ عصر جدید کی بے مثال علمی ترقی، جدید سے جدید تر بے شمار علوم و فنون کی تحقیق و تدوین اور مادی اشیاء کے ہزاروں جزئیات وخصوصیات اور ان کی باریکیوں کا علم حاصل کر لینے کے باوجود انسان اب تک ان اشیاء کی اصل حقیقت و ماہیت یا اُن کے باطنی اسرار واحوال کا ادراک نہیں کر سکا ہے۔ بلکہ اُس کا علم محض ان چیزوں کے "ظاہری آثار و خواص" ہی تک محدود ہے۔

چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ — ۱۹۵۳ء) نے زیر بحث آیت کریمہ "وعلم آدم الاسماء کلھا" سے خوب استنباط فرمایا کہ آدمؑ کو صرف اسماء کا علم دیا گیا تھا، اصل حقائق کا نہیں۔ اور انسان کا علم آج بھی وہیں ہے جہاں وہ روزِ اول تھا۔[۵۶]

مطلب یہ کہ انسان کو پہلے ہی دن جو نام بتا دیئے گئے تھے (خواہ وہ مسمّیات سے متعلق ہوں یا آثار و خواص سے) آج کا انسان باوجود اپنی ہمہ جہتی علمی ترقی کے اس پر ایک تنکے برابر بھی اضافہ نہیں کر سکا ہے۔ انسان اشیائے عالم کا جس باریک بینی اور دقت نظر سے تجزیہ کرتا جا رہا ہے، نئی نئی چیزیں — مختلف اجزاء و عناصر کے روپ میں — اُس پر منکشف ہو رہی ہیں۔ جن کے ظاہری افعال و خواص سے تو وہ مستفیض ہو سکتا ہے مگر ان کی باطنی حقیقت و کیفیت سے وہ

---

۵۶ ماخوذ از سیرت النبی، ۴/ ۴۹۰

ناآشنائے محض ہے۔ بالفاظ صریح آج کا انسان طبیعی اور حیاتیاتی علوم کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کر چکا ہے اور مختلف انواع حیات کی ساخت و پرداخت اور ان کے ترکیبی مادوں کا تفصیلی علم رکھتا ہے۔ علم کیمیا اور علم خلیات (cytology) کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہے۔ مظاہر حیات میں پائے جانے والے عناصر اور ان کی کارفرمائیوں کا علم "حیاتیاتی کیمیا" (biochemistry) اور علم "کیمیائی خوردبینی حیاتیات" (chemical microbiology) کے ذریعہ احاطہ کر رہا ہے۔ مگر اس قدر تفصیلی علم اور گہری واقفیت حاصل کر چکنے کے باوجود اس بنیادی راز کی پردہ دری نہ کر سکا کہ ان اجزا و عناصر سے آخر جسموں کے اندر کون سی کیمیاوی تبدیلی کس طرح اور کیوں کر واقع ہو جاتی ہے؟ خلیوں (CELLS) کے اندر کی پیچیدہ مشنری کیونکر حرکت میں آتی ہے اور ان کے بنیادی مادہ (پروٹو پلازم) میں کیا تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں؟[۵] مختلف قسم کے ہزاروں لاکھوں

---

[۵] حیاتیات کے جہاں بہت سے مسلّمات ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اور ان حقائق کا اعتراف ہیں درسی کتابوں تک میں نظر آتا ہے مثلاً "علم نباتات" کا مشہور مصنف اے، سی، دتّا لکھتا ہے: ہم جانتے ہیں کہ تخمایہ (پروٹو پلازم) بجائے خود ایک زندہ مادہ ہے، جو بہت زیادہ پیچیدہ پروٹینوں (مواد لحمیہ کے سالمات) کا مجموعہ ہے۔ اسی وجہ سے غذائی پروٹین (جو خارج سے بطور غذا جسم کے اندر داخل کئے جاتے ہیں) پیچیدہ پروٹو پلازمی پروٹینوں میں بدل جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر غذا بے جان شے سے جاندار شے یعنی پروٹو پلازم میں داخل ہوتی ہے۔ یہ نظام تغذیہ کا بنیادی ہدف ہے یہ پُر اسرار تغیر کس طرح واقع ہوتا ہے اس کو ہم نہیں جانتے۔ ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ پروٹو پلازم (تمام زندہ اشیاء کا بنیادی مادہ) میں اس کی قوت پائی جاتی ہے۔" (باقی صفحہ ۹۷ پر)

خلیوں کے درمیان باہمی تعامل اور تبادلے کا سلسلہ ابتداءً کیونکر جاری ہوتا اور پھر ان میں ہمیشہ اور مسلسل کیسے قائم رہتا ہے؟ ۵۵ ہماری اندرونی دنیا کے

A class book of Botony, by A. C. Dutta, P 277, 1978,

Botany for Degree Students, by A. C. Datta,p. 361, Oxford University Press, 1979.

۵۵ ایک امریکی محقق کرک (F. H. C. Crick) کے الفاظ میں: "ہماری ناواقفیت کا وسیع علاقہ یہ نہیں ہے کہ خلیے کے اندر کیا ہو رہا ہے، بلکہ یہ ہے کہ خلیوں کے درمیان کیا ہو رہا ہے؟ اس بارے میں ہمارا علم محض جزئی ہے۔ کیونکہ ہمارا (موجودہ) علم ہمارے مشاہدات کی تشریح کے لئے بالکل ناکافی ہے"۔

The Encyclopedia of Ignorance, p. 302, Oxford, 1978.

خلیہ کا جغرافیہ

"ہر خلیہ اپنی جگہ پر ایک کارخانہ ہے، جس میں ہمیشہ مختلف قسم کا کیمیادی عمل اور ردّ عمل ہوتا رہتا ہے"۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اگنورنس، ص ۱۳۳)۔

"ہر خلیہ اپنے اندر ایک عجیب و غریب دنیا رکھتا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے پہلے خلیئے کے اندرون کے تفصیلی مطالعے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس موقع پر پہلی مرتبہ جب کہ طاقتور برقی خوردبین کے ذریعے اس کے اسرار واشگاف ہوئے، جو کسی چھوٹی چیز کو ایک لاکھ گنا زیادہ بڑا کر کے دکھاتی ہے۔ اس طرح بصری طور پر اس کے اندر واقع ہونے والے کیمیادی تغیرات وغیرہ کا مشاہدہ ممکن ہو سکا"۔

The Chemistry of Life, p. 17, Penguin Books, 1977.

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وسیع علاقے اب تک نا معلوم ہیں۔ خلیے کے پے چیدہ اور عارضی اعضاء کے بنانے کے لئے کس طرح کیمیاوی مادوں کے سالمے باہم رمل

واقعہ یہ ہے کہ ہر جاندار کی ابتدا ایک خلیے سے ہوتی ہے۔ پھر خلیوں کی تعداد میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا جاتا ہے ان کی پے چیدگی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ تعجب خیز چیز مختلف خلیوں۔ زندگی کی اکائیوں۔ کے درمیان اتحاد عمل کا مظاہرہ ہے، جس پر تمام ماہرین سائنس حیران ہیں کہ ایک خالق و صانع اور نگراں و ناظم کے بغیر اس قدر منظم و مربوط مظاہرہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس اتحاد عمل ہی کی بدولت مختلف خلیے مل کر ایک عضو بناتے ہیں۔ پھر تمام اعضاء اتحاد عمل ہی کے باعث ایک جسم کی تشکیل کرتے ہیں، جو ربوبیت کا حیرت انگیز شاہکار ہوتا ہے، خلیوں کا نشو ونما نہایت درجہ منظم اور حیرت انگیز طور پر ہندسی اشکال میں ہوتا ہے۔ گویا کہ کوئی ماہر انجنیر ایک ایک خانہ کو ناپ ناپ کر اور تراش تراش کر بنا رہا ہے۔ کیا مجال ہے کہ کوئی ایک خانہ بھی چھوٹا یا بڑا ہو جائے، یا اس میں کوئی بدنظمی اور انتشار پیدا ہو جائے۔ (خلیوں کے یہ ہندسی اشکال شہد کی مکھیوں کے چھتوں سے بہت مشابہت رکھتے ہیں) ایک انسانی جسم میں اربوں کھربوں خلیے ہوتے ہیں۔ گویا کہ ایک انسانی وجود بے شمار "زندہ اجسام" یا "کارخانوں" کا مجموعہ ہے۔ "زندگی کی ان اکائیوں" میں ہر آن کچھ نہ کچھ کیمیاوی تغیر ہوتا رہتا ہے اور یہ خلیے ایک لمحے کے لئے بھی "خاموش" نہیں رہتے۔

قُلِ انْظُرُوا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ: کہہ دو کہ تم غور سے دیکھو کہ زمین اور آسمانوں میں کیا کیا چیزیں موجود ہیں!

(یونس: ۱۰۱)

قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ ○

کہہ دو کہ صرف اللہ ہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرتا رہتا ہے۔ لہذا تم کہاں بہکے جا رہے ہو! (یونس: ۳۴)

جاتے ہیں۔"[۵۹] جینز (genes) اور کرموسوم (chromosome) کا حیرتناک عمل کس طرح واقع ہوتا ہے؟ اور اس عجیب و غریب عمل کے ذریعے نسلی و وراثتی خصوصیات کس قدر تنظیم و انضباط کے ساتھ پچھلی نسلوں سے اگلی نسلوں میں منتقل ہو رہی ہیں[۶۰]۔ تمام زندہ اجسام کا لازمی مادہ پروٹین (protien) ہے، مگر پروٹین کے ایک سالمے (molecule) کی ساخت اور اس کی مشنری کو سمجھنے سے انسانی عقل عاجز اور بے بس نظر آتی ہے[۶۱]۔

---

۵۹ ملاحظہ ہو ڈاکٹر الکسس کیرل کی مشہور کتاب Man the Unknown کا اردو ترجمہ "نا معلوم انسان" از پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری ایم۔اے ص ۱۳، مطبوعہ مدراس یونیورسٹی۔

۶۰ ایک ماہر حیاتیات کہتا ہے: یہ کہنا کہ جسم کی ساخت کو جینز Genes کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے، سائنٹفک نقطۂ نظر سے اس کی تشریح کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے بہ نسبت یوں کہنے کے کہ اس کو خدا کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے۔" The Encyclopedia of Ignorance, P. 252

۶۱ "پروٹین جو تمام ذی حیات خلیوں کے لئے اجزائے لازم کی حیثیت رکھتے ہیں، پانچ عناصر پر مشتمل ہیں: کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک۔ پروٹینی سالمہ ان عناصر کے ... ۴۰، ہزار دقیق ایٹم پر مشتمل ہوتا ہے۔ (خدا موجود ہے، مترجم عبدالحمید صدیقی، ص ۱)

"پروٹین کے ایک سالمے میں امینو ایسڈز (amino acids) کے ہزاروں یا سیکڑوں سلسلے ہوتے ہیں۔" The Penguin Dictionary of Biology.

"پروٹین کے سالمے میں امینو ایسڈ کی ترتیب کا مسئلہ دنیائے سائنس کو بدحواس کر دینے والا ہے۔"

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

مادے کے ساتھ حرکت یا زندگی کا کیا تعلق ہے؟ اس کو سائنس اب تک دریافت نہیں کر سکی ہے۔ ان اجزاء و عناصر کی حرکات اور کیمیا وی

Asimov's Guid To Science. Vol. 2. P. 80.

"پروٹین کا سالمہ (اپنی ساخت کے لحاظ سے) فن تعمیر کا ایک اعلیٰ اور عظیم الشان نمونہ ہے، جس کو قدرت نے پیدا کیا ہے۔ لاتعداد، گوناگوں اور پیچیدہ طریقوں سے اس میں (مختلف) جواہر (atoms) اکھٹا ہو جاتے ہیں۔" Outlines of Zoology. p. 16 "اب تک دریافت شدہ پروٹینوں میں سب سے ہلکے پروٹین کا وزن ہائیڈروجن ایٹم کے وزن سے گیارہ ہزار گنا ہے۔ جب کہ سب سے بھاری پروٹین کا وزن دس ملین (ایک کروڑ گنا ہے۔" (ایضاً ص ۱۲)

"پروٹین ایمنو ایسڈ کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقے کی ہے جس سے یہ باہم ملیں۔ اگر یہ غلط شکل میں یک جا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں۔" (خدا موجود ہے، ص ۲۸)

"حیوانات کی ہر نوع میں سیکڑوں قسم کے خلیے ہوتے ہیں۔ اور حیوانات کی بے شمار انواع میں سے ہر نوع اپنے ایک مخصوص طرز کے پروٹین کی حامل ہوتی ہے۔ پروٹین کے اقسام حیرت انگیز طور پر کثیر ہیں۔" (آؤٹ لائنس آف زوالوجی، ص ۱۶)

"پروٹین ایک نہایت ہی پیچیدہ مرکب ہے، جو زندہ مادے کا اہم ترین جزو ہے۔ زندہ چیزوں کا جسم زیادہ تر پروٹین ہی سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ پروٹین اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں پروٹین کا موجود ہونا ضروری ہے۔ زندہ پروٹین کی خصوصیت اس کی

تغیرات ہی کا صحیح علم انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا تو ظاہر ہے کہ وہ حیات اور مظاہر حیات کا بھی صحیح علم و ادراک نہیں کر سکتا۔ چنانچہ احساس، ادراک، شعور اور تعقل وغیرہ کو ابھی رہنے ہی دیجئے، جو زندگی کے اعلیٰ مظاہر ہیں، صرف اُس کے ادنیٰ مظاہر تک کی بھی اُس کو کوئی شُد بُد حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ چنانچہ "حیات" کی ان نارسائیوں کے باب میں ماہرین حیاتیات اپنے علوم کی ابتدا ہی اس نکتے سے کرتے ہیں:۔

Life itself is mysterious, and its origen still remains shraueded in mistery.

ترجمہ: زندگی بجائے خود پُر اسرار ہے۔ اور اسی طرح خود اُس کے مادے کا راز بھی اب تک پردۂ خفا میں ہے۔[۶۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ازخود تحویل کی قوت ہے۔ ازخود تحویل سے یہ مراد ہے کہ کوئی زندہ شے اپنی اصلی حالت پر زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتی۔ اس میں کیمیاوی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی تحلیل ہوتی رہتی ہے۔" (جدید معلومات سائنس، از آفتاب حسن، ۱/۱۴۶)

"تمام زندہ چیزوں میں مخصوص قسم کے مادے پائے جاتے ہیں، جو اس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں کہ سالہا سال کے تجربوں کے بعد بھی کیمیادان یہ دریافت نہیں کر سکے کہ ان کی اندرونی ساخت کیسی ہے۔ پیچیدہ مادے صرف جاندار دنیا میں پائے جاتے ہیں، ان کی کوئی مثال بے جان دنیا میں نہیں ملتی۔ (ایضاً ص ۱۵۱)

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝

۶۲ Botany For Degree Students, by A. C. Dutta, (introduction). Oxford University Press, 1979.

حیاتیات کا سب سے اہم ترین اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ "زندگی" کیا ہے اور مادۂ حیات (پروٹو پلازم) کیونکر وجود میں آیا؟ مگر کوئی بھی ماہر یا سائنٹسٹ اس مسئلے کو ہاتھ نہیں لگا سکتا اور اس پر کسی قسم کا اظہار رائے یا لب کشائی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا تعلق نیچر یا علوم طبیعی سے نہیں بلکہ براہ راست سُوپر نیچر یا عالم فوق الطبیعی سے ہے۔[۶۳] تمام سائنس داں مہر لب ہیں اور اس بنیادی مسئلے کو نظر انداز کر کے دیگر ادنیٰ درجے کے مسائل و مباحث سے تعرض کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اب بھی ایک موہوم سی امید ہے کہ سائنس داں رفتہ رفتہ تمام معموں کو حل کر لیں گے اور کل اسرار سربستہ سے واقف ہو جائیں گے۔ چنانچہ کتاب "دی کیمسٹری آف لائف" کا مصنف اسٹیون روز (Steven Rose) حیاتیات کی ایک شاخ "حیاتیاتی کیمیا" کے بعض پیچیدہ اور ناحل مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"حیاتیاتی کیمیا ابھی ایک جدید علم ہے، اور بہت سی چیزوں کا صرف "نصف ادراک" ہی کیا جا سکا ہے۔ یا غلطی سے یہ بات مان لی گئی ہے کہ ان کے مکمل ادراک کے لئے ہم کو محققین کی دوسری یا تیسری نسل کا انتظار کرنا چاہیئے۔"[۶۴]

---

[۶۳] ڈاکٹر الکسس کیرل نے اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کیا ہے:
"اور یہ دنیا نامعلوم اور پوشیدہ قوتوں کا مجموعہ ہے .... اس کی تخلیق طبیعات اور ہیئت کی فنی مہارتوں کے ذریعے ایک نامعلوم مادے سے ہوئی ہے۔"
(نامعلوم انسان، ص ۲۶)

[۶۴] The Chemistry of Life, by Steven Rose, p. 263, Penguin Books, England, 1977.

یہ حیاتیات کے باب میں علم انسانی کی نارسائیوں کی محض ایک جھلک تھی۔ اب رہے طبیعی علوم (physical sciences) جن کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ طبیعیات اور کیمیا پر ہوتا ہے، تو ان میں بھی انسان کی ناواقفیتوں کا یہی حال ہے۔ اس موقع پر چونکہ تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں ہے (کیونکہ یہ موضوع بجائے خود ایک مستقل کتاب کا طالب ہے) لہذا یہاں پر صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

انسان مادے کی سب سے چھوٹی اکائی جوہر (ایٹم) اور اس کے اجزا (الکٹران، پروٹان اور نیوٹران) اور مختلف ایٹمی مرکزوں سے خارج ہونے والی شعاعیں: الفا شعاعیں (alfa rays) بیٹا شعاعیں (beta rays) اور گاما شعاعیں gammarays وغیرہ سب کا علم نہایت درجہ مشقت اور باریک بینی کے ساتھ حاصل کر چکا ہے۔ اور اس حقیقت کا بھی پتہ لگا چکا ہے کہ الکٹران میں منفی برقی چارج اور پروٹان میں مثبت برقی چارج ہوتا ہے۔ مگر وہ اس راز پر سے نہ اٹھا سکا کہ یہ برقی چارج بذات خود ہے کیا اور وہ کس طرح کام کرتا ہے؟ مثبت اور منفی کی کیا خصوصیات ہیں؟ اور اُن کی تعریف کیا ہے؟ واضح رہے کہ مثبت (positive) اور منفی (negative) کے "نام" محض اُن کی باہمی کشش و دفع کرنے کی ایک "ظاہری خاصیت" کی بنا پر رکھا گیا ہے۔ ورنہ ان کی صحیح منطقی تعریف ممکن نہیں۔ اور نہ خود ان برق پاروں ہی کی حقیقت و اصلیت معلوم ہے۔

یہ تو ان برق پاروں کا حال ہوا جن سے دنیا کے تمام عناصر (elements) کی تشکیل ہوئی ہے۔ اب خود ان عناصر اور ان کے "کیمیاوی تغیرات" کو دیکھئے تو اور زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ عناصر کی دنیا "طلسم ہوشربا" سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ غرض اب تک جتنے بھی عناصر

اور ان کے اندرونی اجزا دریافت ہو چکے ہیں وہ سب کے سب محض "نام ہی نام" (اسماء) ہیں[۶۵] اس عالم آب و گل میں جتنی بھی چیزیں اور جتنے بھی "کیمیادی تغیرات" (مختلف عناصر کے باہمی ملاپ اور تعامل سے وجود میں آنے والے سالمات و مرکبات) پائے جاتے ہیں، ان کی صحیح صحیح توجیہہ و تعلیل نہیں ہو سکتی اور کوئی قطعی و یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت عظمیٰ کا اظہار قرآن حکیم میں اس طرح کیا گیا ہے۔

وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝ اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ (اسراء: ۸۵)

جن چیزوں کو ہم سائنسی ادب یا اپنی بول چال میں "حقائق اشیاء" یا "اسرار سربستہ کی راز جوئی" وغیرہ کہتے ہیں، وہ دراصل مادی اشیاء کے محض چند ظاہری پہلو ہوتے ہیں۔ جن کو دریافت کر کے انسان خوش ہو جاتا ہے کہ اس نے "حقائق" پر سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ حالانکہ اصل حقائق کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اسی کو قرآن حکیم اپنے بلیغ اسلوب میں "علم قلیل" سے تعبیر کرتا ہے[۶۶] یہ بھی محض انسان کا دل رکھنے

---

[۶۵] مثلاً ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن، کاربن، کلورین، سلفر، فاسفورس، سلیکون، کیلشیم، میگنیشیم، پوٹاشیم، لوہا اور سوڈیم وغیرہ وغیرہ ان عناصر کی خصوصیات مفرد طور پر کچھ ہوتی ہے تو مرکب ہونے کے بعد کچھ اور ہو جاتی ہے۔ (جیسا کہ پچھلے صفحات میں پانی کی مثال دی جا چکی ہے) اور انسان یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

[۶۶] ایک مغربی فاضل نے اس ابدی صداقت کا بڑی خوبی کے ساتھ اعتراف کر کے اس ربانی اصول کی صحت پر مہر تصدیق اس طرح ثبت کی ہے:

"سائنس کے نئے اکتشافات "نا معلوم" میں غوطے نہیں لگاتے، بلکہ وہ ان مشاہدین کے ذریعے جن کی آنکھیں تاریکی میں بہ نسبت دوسروں کے (بقیہ صفحہ ۱۰۸ پر)

اور اس کی ہمت افزائی کے طور پر ہے کہ کہیں وہ اپنی تحقیق و تفتیش سے بد دل نہ ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان صرف اشیاء کے "ناموں" (الاسماء) اور اُن کی "ظاہری کارکردگیوں" (علم قلیل) ہی سے واقف ہے، اُن کی اصل حقیقت و ماہیت (وہ باطنی اسرار جو امورِ غیب میں داخل ہیں) سے واقف نہیں ہے[۶۷]۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ کہیں یہ ذرہ خاک تمام چیزوں کی حقیقت سے واقف ہو کر اس کائنات میں "خود مختار" اور خود سر نہ ہو جائے، یا خدا کی برابری کا دعوی کرنے نہ لگ جائے۔ بلکہ اُس کو اپنی کمزوری و بے بسی کا شدید احساس ہوتا رہے اور دوسری حیثیت سے وہ یہ محسوس کرے کہ وہ کسی اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) زیادہ گہرائی کے ساتھ حقیقت تک پہنچ سکتی ہیں، "معلوم" کے چند دھندلے سے حاشیے بناتے ہیں لیکن یہ سوال کہ سائنس میں "معلوم" کیا ہے؟ اس کا فلسفیانہ جواب ہوگا "کچھ بھی نہیں"۔ جب کوئی ماہر سائنس یہ کہتا ہے کہ "کچھ معلوم ہے" تو اس کی مراد محض یہ ہوتی ہے کہ وہ (طبیعی) واقعات کے سلسلے میں ایسی چند یکسانیتوں کو جانتا ہے جو اس تصور کو بظاہر معقولیت بخشتی ہیں کہ یہاں پر (علت و معلول کی بنا پر) چند اسباب کارفرما ہیں۔ اور مشاہدے میں آئی ہوئی یہ یکسانیتیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ مظاہر چند قوانین کے تابع ہیں۔"

The Encyclopedia of Ignorance, p. 252.

۶۷ اللہ تعالیٰ نے اظہار ربوبیت کے طور پر اس مادی کائنات میں دو طرح کے قوانین جاری کیے ہیں: (۱) ظاہری (۲) باطنی۔ اور انسان محض ظاہری قوانین ہی معلوم کر سکتا ہے۔ باطنی یا مخفی قوانین کا پتہ چلانا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ باطنی قوانین کی راز جوئی خدا کی خدائی میں دخل دینے کے مترادف ہے اور انسان کبھی اس موقف میں آہی نہیں سکتا۔

کی مملکت اور قلمرو میں رہتا ہے تاکہ وہ اپنے سے ایک برتر اور ہمہ دان وہمہ بین ہستی کے وجود کا اعتراف کرکے (جس کا مشاہدہ اس عالم مادی میں قدم قدم پر ہو رہا ہے) اس کے حضور میں سجدہ ریز ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "مادہ" میں ودیعت شدہ فوائد سے تو مستفید ہو سکتا ہے، مگر وہ کسی بھی طرح مادے کی "آخری حقیقت" معلوم نہیں کر سکتا۔ یہ علم اصلی و حقیقی صرف اُس کے خالق و مالک (جل جلالہ) کو ہی ہو سکتا ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ط اور اُسی کے پاس ہیں مخفی چیزوں کی (تمام) کنجیاں، جن کو اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

(انعام : ۵۹)

یہ عالم مادی کی ایک عظیم ترین حقیقت اور سر الٰہی ہے، جس کے اقرار واعتراف سے کسی بھی وسیع النظر عالم اور محقق کو چارۂ کار نہیں ہے۔ پچھلے صفحات میں آپ چند ماہرین سائنس کے بیانات ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اب اس موقع پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بھی چند اعترافات ملاحظہ ہوں۔ دور جدید کا مشہور فلسفی اور عالم فطرت ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے :

"عالم طبیعی ہم کو ایک محدود دائرے تک لے جاتا ہے، جس سے آگے ہم جا نہیں سکتے اور سبب اول اور اُس کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔"[۶۸]

عہد حاضر کے سب سے بڑے فلسفی اور مادہ پرست برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) تک کو اقرار اور اعتراف ہے کہ مادی علوم کی ترقی جس رفتار سے ہو رہی ہے اُسی نسبت سے جہل میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

۶۸ھ منقول از تفسیر الجواهر، ۳۵/۱

"سائنس کی حالیہ ترقیوں نے ایک بہت بڑی تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار کر دیا ہے کہ ہر ترقی ہمارے علم کو اس سے بھی کم کر دیتی ہے جتنا ہم پہلے حاصل سمجھتے تھے۔" ؎۶۹

مختصر تاریخ سائنس کا مؤلف سر ڈبلو، سی، ڈامپیرس لکھتا ہے :

"علم کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا جا رہا ہے اتنا ہی عدم علم یا نامعلوم کا رقبہ بھی وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور جتنا زیادہ ہم نامعلوم میں گھستے ہیں اتنا ہی جو کچھ ہم کو وہاں ملتا ہے اس کو صاف وسادہ قابل فہم الفاظ میں بیان کرنا دشوار ہوتا ہے۔" ؎۷۰

حاصل یہ کہ انسان کا علم روزِ اول ہی سے "علم اسماء" تک محدود رہا ہے اور وہ "حقیقت اسماء" تک نہیں پہنچ سکا اور نہ کبھی پہنچ سکتا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک طرف انسان ایٹم کا سینہ چیر کر اس کے اندر ودیعت شدہ توانائیوں (ایٹمی قوت) سے مستفید ہو رہا ہے اور عناصر کے باہمی آمیزے سے طرح طرح کے عجائبات کو ظہور میں لا رہا ہے (ملاحظہ ہو دوسرا اور تیسرا باب)، مگر دوسری طرف حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے وہ ان عناصر کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہے۔ یعنی "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"۔ اس عالم رنگ و بو میں نہ صرف زندگی اور اس کے مظاہر پُراسرار ہیں بلکہ خود مادہ اور اس کے ظواہر بھی پُراسرار اور حیرت انگیز ہیں۔

؎۶۹ Will to Doubt بحوالہ مذہب اور سائنس ص ۱۴۶

؎۷۰ A Short History of Science, by W. C. Dampiers

بحوالہ مذہب اور سائنس، از مولانا عبدالباری ندوی، ص ۱۴۶

نظریۂ میکانیت[41] کی ناکامی

ان ٹھوس اور ناقابل تردید حقائق کے ملاحظے سے انیسویں صدی کے ان تمام مادیین (materialists) کے دعوے باطل ہو جاتے ہیں اور میکانیت پسندوں کا سر غرور نیچا ہو جاتا ہے جس کا دعویٰ اور عقیدہ تھا کہ اس جہانِ آب و خاک کی کل مشنری اور اس کے تمام کل پرزوں کی مادی و میکانکی نقطۂ نظر سے مکمل توجیہہ و تعلیل کی جا سکتی ہے اور ہمیں اس آب و رنگ میں کسی فوق الطبیعی قوت کے تسلیم کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے اس نظریہ کی تشریح بڑی خوبی کے ساتھ ان الفاظ میں کی ہے:

"دنیائے مادیات میں نیوٹن اور تاریخ فطرت میں ڈارون کے اکتشافات کی انتہا بالآخر میکانیت پر ہوئی اور پھر یہاں تک کہا گیا کہ ہمارے سب مسائل دراصل طبیعیات ہی کے مسائل ہیں یعنی دوسرے لفظوں میں یہ کہ حیات، فکر، ارادہ، احساس غرض یہ کہ ہر شے کی توجیہہ جواہر اور ان کے خواص کی بنا پر، جو گویا بالذات ان میں موجود ہیں، ہو جائے گی۔ یوں میکانیت کا تصور، جو سر تا سر ایک طبیعی تصور ہے ہمہ گیر اصول بن گیا اور فطرت کے ہر پہلو کی تشریح اس کے ماتحت ہونے لگی"[42]

بیسویں صدی کی تحقیقات نے اس باطل عقیدے کی کمر توڑ کر رکھ دی یعنی وہ نظریہ جو قانونِ علیت CAUSATION کے میکانکی تصور کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ جدید طبیعی تصورات مثلاً نظریۂ اضافیت اور کوانٹم تھیوری

---

[41] machanism

[42] تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۴۳، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۸ء

وغیرہ کے منظر عام پر آنے کے بعد زمین بوس ہو گیا۔

"علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، عین اسی زمانے میں پے در پے چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہل گئیں اور علم طبیعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا: مادہ اور توانائی، ذرہ اور موج، جوہر اور عنصر، زمان و مکان اور علت و معلول جیسے بنیادی تصورات ہی سرے سے بدل گئے۔ اور خود قوانین قدرت کا بھی ایک نیا مفہوم لیا جانے لگا۔ ان تغیرات نے نیوٹن اور میکسول کی طبیعیات کی بجائے اس جدید طبیعیات کی تشکیل کی جس کی بنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی ہے"[۷۳]

ڈاکٹر الکسس کیرل نظریہ میکانیت کے علمبرداروں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"نفسیاتی مظاہر کو خلیوں کی فعلیات یا حرارتی میکانکس کی اصطلاحات میں بیان کرنا محض الفاظ سے کھیلنے کے مترادف ہوگا۔ تاہم انیسویں صدی کے میکانکی ماہرین فعلیات اور ان کے چیلے، جن کا وجود اب تک چلا آرہا ہے، اسی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ انسان کو طبیعیات اور کیمیا کے اندر محصور کر لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ صحیح تجربات سے اس قسم کے غیر منصفانہ نتائج اخذ کرنا درحقیقت خاص خاص فنون میں غلو کا نتیجہ ہے"[۷۴]

یہی مصنف ایک دوسری جگہ بیان کرتا ہے:

"یہ کہنا کہ دماغی خلیے دماغی افعال کا مرکز ہیں ایک فضول ادعا ہوگا۔

۷۳؎ مذہب اور سائنس، مقدمہ از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ص ۳۶ - ۳۷

۷۴؎ نامعلوم انسان، ص ۴۵

کیونکہ دماغ کے خلیوں میں دماغی افعال کا مشاہدہ کرنا ممکن نہیں ہے"۔ [۵۷]

یہ ہے نظریہ میکانیت اور مادہ پرستانہ طرز فکر کے عروج و زوال کی داستان جو اپنے اندر بہت سی عبرتیں اور بصیرتیں رکھتی ہے۔ ایک حیثیت سے دیکھئے تو انسان مادے کے بنیادی اجزا و عناصر کے اسرار اور اس کی باریکیوں کا دقت نظر سے جائزہ لے رہا ہے۔ علم کیمیا کے میدان میں حیرت انگیز کرشمے دکھا رہا ہے۔ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنا رہا ہے (جو انہی عناصر کے دقیق علم کا نتیجہ ہے)۔ افلاک پر ڈورے ڈال رہا ہے اور چاند ستاروں کی تسخیر کر رہا ہے۔ مگر دوسری حیثیت سے دیکھئے تو وہ اتنا بے بس ہے کہ اس کو ایک ذرے کی بھی اصل حقیقت و ماہیت کا کوئی علم نہیں ہے۔ موجودات عالم کی صحیح کنہ و حقیقت کو وہ نہیں جانتا اور زندگی کے مبادی سے بھی وہ واقفیت نہیں رکھتا۔ بلکہ ہر چیز کو حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھتا اور تحیر و درماندگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

انسانی دائرۂ کار کے یہ دونوں ہی پہلو نہایت درجہ عجیب و غریب، متضاد اور بصیرت افروز ہیں، جو دراصل اس احساس کو شدید سے شدید تر کر دیتے ہیں کہ انسان دراصل اس کائنات میں بالکل آزاد اور خود مختار نہیں ہے بلکہ وہ کسی اور کی سلطنت و قلمرو میں رہتا ہے۔ فکر و عمل میں آزاد ہونے کے باوجود وہ خود کو اکثر پابہ جولاں اور سلاسل عبدیت میں جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ انسان کو قابو میں رکھنے کے لئے یہ دونوں ہی پہلو مابعد الطبیعی نقطۂ نظر سے بہت اہم اور ضروری ہیں [۵۸]

۵۷؎ نامعلوم انسان، ص ۳۴

۵۸؎ ان مباحث کے نتیجے میں ایک اور حقیقت یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ انسان جب طبیعی اور حیاتیاتی نقطۂ نظر سے اپنی اصلیت و (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

وَفِي الْأَرْضِ آيٰتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ اور خود تمہاری ہستیوں میں بھی، کیا تم (ان کو) دیکھتے نہیں ہو! (ذاریات: ۲۰-۲۱)

وَيُرِيكُمْ آيٰتِهِ ۖ فَأَيَّ آيٰتِ اللّٰهِ تُنكِرُونَ ۝ اور وہ تم کو اپنے نشانات و دلائل دکھا دے گا۔ پھر تم اللہ کے کن کن نشانات و دلائل کا انکار کرتے پھرو گے؟[۷] (مؤمن: ۸۱)

یہ قرآنِ عظیم کا عجیب و غریب اعجاز ہے کہ چودہ سو سال قبل اس نے جو دعوے کئے تھے وہ اپنی جگہ پر پتھر کی لکیر بنے ہوئے ہیں، اور ہیم ولگاتار

(۱۱۰ صفحہ کا بقیہ) ماہیت دریافت نہیں کر سکتا تو وہ اپنی زندگی کے ضوابط بھی خود وضع نہیں کر سکتا۔ کیونکہ طبیعی و حیاتیاتی علوم کے مقابلے میں سماجی اور اقتصادی علوم محض قیاسی اور ناقابل ثبوت ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر سائنسی علوم کے یقینی اور قطعی مسائل میں جب کسی کلی حقیقت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا تو پھر محض قیاسی اور غیر یقینی علوم میں قطعی بات اور حتمی صداقت کا فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے، جب کہ انسانی تعلقات کے قوانین ہی اب تک پوری طرح معلوم نہیں ہو سکے ہیں؟ لہٰذا وہ اپنے ضوابط زندگی کے لئے مافوق الطبیعی احکام و ہدایات کا محتاج ہے۔

۷۔ لفظ "آیات" آیۃ کی جمع ہے، جس کے لغوی معنی نشانی یا ظاہری علامت کے ہیں۔ یہ بذات خود دلیل نہیں ہوتی بلکہ منطقی دلیل کی طرف نشان دہی کرنے والی ہوتی ہے۔ مثلاً دھواں اس بات کی علامت ہوگا کہ متعلقہ مقام پر آگ موجود ہے۔ اس لحاظ سے ہماری یہ طبیعی اور نیچرل کائنات ــ اپنے تمام مظاہر اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ ــ ایسے حقائق و نشانات سے بھری ہوئی ہے جو منطقی دلائل کے مقدمات بن سکتے ہیں اور استقرائی طور پر انہیں ترتیب دے کر ان سے (بقیہ صفحہ آئندہ)

ان کی تصدیق وتائید کا سلسلہ جاری ہے۔ کیا انسانی لٹریچر میں اس کی کوئی مثال موجود ہے!

۲۰— وارثینِ علمِ آدم کا فریضہ

اس آیت کریمہ (وعلم آدم الاسماء کلھا) کا منشا و مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولادِ آدم خصوصاً وارثین علم آدم دنیا کی تمام چیزوں اور کل موجودات عالم کا علم حاصل کریں اور عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق دینی و دنیوی ہر حیثیت سے عالم انسانی کی رہنمائی کریں۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط

اور تم اپنے رب کے راستے کی طرف دانش مندی اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے بہترین طریقے سے مباحثہ کرو۔ (نحل : ۱۲۵)

حیرت کی بات ہے کہ جب ہم قرآن کریم کی ان آیات کو پڑھتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں اور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے "باپ" نے فرشتوں کے سامنے تمام اسمار گنوا کر اپنی برتری ثابت کر دی اور اپنی فضیلت کا

(ص ۱۱۱ کا بقیہ حاشیہ) وہ تمام مابعد الطبیعی حقائق ثابت کیے جا سکتے ہیں جن کا ادعا قرآن اور اسلام کرتے ہیں۔

اب یہ علمائے اسلام کا کام ہے کہ طبیعی و حیاتیاتی تمام سائنسی علوم کا جائزہ لے کر قرآن کے اس منشا و مقصد کے مطابق دلائل آفاق و انفس کی تدوین کریں۔ یہ ایک فرض کفایہ ہے جس سے آج بہت غفلت برتی جا رہی ہے اس کار عظیم کے بغیر عصر جدید میں قرآن کی حقانیت واضح نہیں ہو سکتی اور اس کا اصل کارنامہ ظاہر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ موجودہ انسان اور موجودہ معاشرے پر حجت بھی پوری نہیں ہو سکتی۔

سکہ بٹھا دیا۔ مگر وہ کبھی کوشش نہیں کرتے کہ اپنے باپ کا یہ علم حاصل کر کے اُس کے "وارث" بنیں اور اقوامِ عالم پر اپنی فضیلت و برتری ثابت کریں۔ جبکہ دوسری قومیں یہ علم صحیح طور پر حاصل کر کے نہ صرف آفاق عالم پر اپنی برتری کا جھنڈا لہرائے ہوئی ہیں بلکہ زندگی کے ہر میدان میں ہم کو نیچا بھی دکھا رہی ہیں۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جب حضرت آدم سے کہا گیا کہ "تم ان کو تمام موجودات عالم کے نام بتا دو" تو آپ نے یہ تمام نام فرفر سنا دیے۔ مگر آج وارثینِ علم آدم کے سامنے جب "چیزوں کے نام" آتے ہیں تو وہ یا تو وحشت زدہ ہو جاتے ہیں یا ان کو "غیر اسلامی" یا "علم غیر" یا "علم باطل" کہہ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ (محنت و مشقت اور فکری و اجتہادی قوتوں کے ذریعے ان اشیار اور ان کے آثار و خواص کو خود سے دریافت کرنا اور علم کی ترقی اور اس کی ترویج و اشاعت میں حصہ لینا تو بہت دور کی بات ہے) حالانکہ ان تمام اشیار، ان کے آثار و خواص، ان کے اعمال اور ان کی کارکردگیاں وغیرہ سب کے سب انہیں ازبر ہونا چاہیے تھا۔ جیساکہ اس آیت کریمہ سے مترشح ہو رہا ہے۔

قَالَ يَآدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ۔ ارشاد ہوا کہ اے آدم! تم ان کو تمام چیزوں کے نام بتا دو تو انھوں نے (فرفر) اُن کے نام فرشتوں کو بتا دیے۔ (البقرہ: ۳۳)

اس "علم آدم" سے منہ موڑنے ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم دنیوی حیثیت سے کمزور اور زوال و انحطاط کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور زندگی کے ہر میدان میں دوسروں کے دست نگر بن کر گویا کہ اقوامِ عالم کے محتاج اور اُن کے غلام بنے ہوئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ روئے زمین پر "خلیفہ" وہی ہو سکتا ہے جو علم اسمار یا

" علم آدم " (تمام سائنسی وصنعتی علوم) کا صحیح معنی میں وارث ہو۔ یہ ان آیات کریمہ کا عقلی و منطقی نتیجہ ہے۔ اب مسلمان غور کریں کہ وہ اپنے باپ کے علم سے کہاں تک بہرہ ور ہیں اور خلافت ارض کے تقاضوں کو کہاں تک پورا کر رہے ہیں!

"تسخیر فطرت آدم کی صفت، اُس کا وظیفۂ حیات اور اس کا مقصود زندگی ہے۔ تسخیر فطرت سے مغرب نے غیر معمولی قوت حاصل کر لی ہے۔ جن قوموں نے اس میں حصہ نہیں لیا وہ مغلوب اور کمزور ہو گئی ہیں۔ علوم و فنون کی ترقی اور تسخیر فطرت نے زندگی کے متعلق نئے زاویئے نگاہ پیدا کر دیئے ہیں۔ مسائل حیات کی صورت بدل گئی ہے۔ قدیم تصورات کو نئے سانچوں میں ڈھالنا لازمی ہو گیا ہے"![۵۸]

۲۱ — کیا حضرت آدم سائنٹسٹ تھے

میرے ان خیالات سے واقف ہو کر بعض دوستوں نے سوال کیا کہ کیا حضرت آدم بھی کوئی سائنٹسٹ یا ماہر سائنس تھے جو تمام جزئیات و کلیات پر حاوی ہو گئے تھے؟ تو میں نے جواباً عرض کیا کہ قرآن کریم کی نص قطعی (واضح و صریح ارشاد) کی موجودگی میں یہ سوال غیر ضروری ہے، اور اس قسم کے شبہات میں پڑنے کی ہم کو کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ جب ہم کو صاف اور واضح طور پر بتا دیا گیا کہ "اللہ نے آدم کو تمام اشیاء، اور ان کے آثار و خواص کے نام بتا دیئے" تو اب ہم خواہ مخواہ اس قسم کے شبہات میں کیوں پڑیں! اور اس علم کی اہمیت حضرت آدم علیہ السلام سے بڑھ کر اولاد آدم کے لئے ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یعنی گویا کہ یہ علم اصلاً اولاد آدم کے لئے

---

[۵۸] فکر اقبال، ص ۴۵۸ - ۴۵۹

تھا جو آدمؑ کے واسطے سے انہیں عطا کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی توجیہہ یوں کی جا سکتی ہے کہ حضرت آدم کو اگرچہ تمام علوم — فکری و نظری طور پر — سکھا دیئے گئے تھے، مگر عملاً عہد آدم میں ان کا ظہور نہیں ہوا۔ بلکہ بالفعل اور بتدریج عصر بہ عصر تحقیق و تفتیش کے ذریعے ان کا ظہور ہو رہا ہے۔

اور اس کی ایک توجیہہ یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ بیان در اصل قرآن حکیم کی اعجازی حکمت و رہنمائی کے تقاضے کے تحت موجودہ دور کے کاہل اور "خالی الذہن" مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان کے تن مردہ میں نئی رُوح اور نیا حوصلہ بیدار کرنے کے لئے ایک تازیانۂ الٰہی ہے۔ تاکہ وہ مایوسی اور احساس کمتری کے موجودہ جال سے باہر نکل کر زندگی کے میدان میں نئے جوش اور نئے عزم کے ساتھ جدوجہد کرنے اور اقوام عالم کے درمیان موجودہ مسابقت کے دور میں بازی جیتنے پر آمادہ ہو سکیں۔ امت مسلمہ کو آمادۂ جدوجہد کرنا اور زندگی کے میدان میں دوبارہ سرگرم عمل کرنا موجودہ دور کی سب سے بڑی ضرورت اور خلافت ارضی (زمین کی جانشینی) یا اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے بہت اہم ہے۔

لہذا میں سمجھتا ہوں کہ قرآنِ حکیم کی یہ اعجازی رہنمائی، خاص کر موجودہ دور کے مسلمانوں کے لئے جو انہیں تمام علوم و فنون کو — جن کے ذریعے خلافت ارض کی تکمیل ہو سکتی ہو — نہ صرف ضروری بلکہ درحقیقت آدم کی میراث اور اُس کی کھوئی ہوئی متاع قرار دینا قرآن عظیم جیسے ابدی کلام ہی کی خصوصیت ہو سکتی ہے۔ یہ اس کتاب حکمت کی بے مثال رہنمائی اور اُس کی ایک چھوٹی سی آیت (و علم آدم الاسماء کلھا) کا اعجاز ہے۔ مگر کون ہے جو اس چھوٹے سے ربانی فقرے کی تمام حکمتوں اور بصیرتوں کا احاطہ اور اس کی مکمل تشریح و تفسیر کر سکے!

قرآن حکیم ایک زندہ اور ابدی صحیفہ ہے۔ اس کے دامن میں ایسے

جواہر پارے موجود ہیں جو رہتی دنیا تک اپنے سب سے بڑے وصف "ہدایت و رہنمائی" کے مطابق زندگی کے ہر میدان میں امت مسلمہ کی ــــ خصوصیت کے ساتھ ــــ رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اس کی اعجازی زبان اور اس کے اعجازی اسلوب کو سمجھنے کی ہے۔ جب تک اس بحر حکمت میں غوطہ زنی نہ کی جائے "اندر" کا حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک "ضرب کلیمی" سے اس کے سینے کو چیرا نہ جائے اس "قلزم خاموش" کے اسرار فاش نہیں ہو سکتے۔

غرض یہ تمام تفصیلات اس لئے بیان کی گئیں کہ خلافت ارض کی تکمیل کے لئے ان علوم کے ساتھ ساتھ متعلقہ مسائل کی حقیقت بھی واضح ہو جائے، جدید علوم و افکار کا ایک خاکہ ذہن نشین ہو جائے، قرآنِ حکیم کا صحیح تعارف اور عصر جدید میں اس کی رہنمائی کا اعجازی پہلو کھل کر سامنے آ جائے اور اس سلسلے کے تمام شکوک و شبہات بھی رفع ہو جائیں۔ کوئی بھی بات بلا دلیل اور بلا سند بیان نہ کی جائے۔ اور حتی الامکان تمام دلائل قرآن سے لائے جائیں۔ اس مقصد عظیم کے لئے میں نے صرف مذکورہ بالا ایک آیت کریمہ کو منتخب کر کے اس کو اپنی اس پوری کتاب کا مرکز و محور قرار دیا ہے۔ اور تمام مباحث کا دائرہ اس ایک مرکز کے گرد گھوم رہا ہے۔

بہر حال ان علوم کی اہمیت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب اگلے باب میں ان علوم کی عملی حیثیت سے اہمیت و افادیت کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

دوسرا باب

تسخیر اشیاء اور نعمہائے الٰہیہ

- علم اسماء کی تفصیل
- سائنسی علوم کا پھیلاؤ
- قرآن کی بلاغت اور اس کے اعجاز کا ایک نمونہ
- خلافت ارض اور جہاد
- تسخیر اشیاء اور باطنی نعمتیں
- بیسویں صدی میں استعماریت کی نئی شکل

تسخیر اشیاء اور نعمہائے الٰہیہ

علم اسماء کی تفصیل

پچھلے باب میں علم اسماء کا تعارف کرایا گیا تھا۔ اس باب میں علم اسماء کی تفصیل اور عملاً ان سے استفادے کی نوعیت و اہمیت بیان کی جاتی ہے۔

زمانۂ قدیم کا انسان صرف زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، ہوا، پانی، بادل، حجر، شجر، مٹی، حشرات، گائے، بیل، بکری، اونٹ، گھوڑا، گدھا، ہاتھی، کتا، بلی، شیر، لومڑی، جنگل، پہاڑ، لوہا، تانبا، پیتل، سونا، چاندی، دریا، سمندر، مچھلی، پرندے، چاول، گیہوں، دال، سبزی، گوشت، انڈا، دودھ، دہی، وغیرہ وغیرہ ہی سے واقف تھا یا چند زراعتی، تمدنی اور جنگی آلات واوزار وغیرہ سے۔

مگر آج کا انسان ایٹم الکٹران، پروٹان، نیوٹران، پوزیٹران، ڈیوٹران، فوٹان، ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن، کاربن، ہیلیم، پوٹاشیم، میگنیشم، ریڈیم، یورینیم (تمام ۱۰۵ عناصر) برق، بھاپ، ایٹمی قوت، ایٹمی شعاعیں، لاشعاعیں، کائناتی شعاعیں، پروٹوپلازم، امیبا، پروٹوزوا، جینز، کروموسوم، کلوروفل، کلوروپلاسٹ، انزائم، مائیٹوکانڈریا، ہیموگلوبین، ہارمون، پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، وٹامن، کاربن ڈائی آکسائیڈ، گلوکوز، پنسلین، مختلف قسم کے کیمیاوی ایسڈ اور ان کے بے شمار مرکبات،

ربڑ اور اس کی مصنوعات، پلاسٹک اور اُس کی مصنوعات، مختلف قسم کی کیمیاوی کھادیں اور ادویات، نئی نئی دھاتوں کی دریافت اور ان کی مصنوعات، بے شمار قسم کی پیچیدہ مشینیں اور مختلف صنعتوں میں استعمال ہونے والے آلات، تھرمامیٹر، بیرومیٹر، فلاسک، ریفریجیٹر، ٹرین موٹر، ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹیلی فون، ٹیلی وژن، برقی ولاسلکی تار، ٹیلکس، ٹیلی پرنٹر، راکٹ اور خلائی جہاز وغیرہ وغیرہ سے بھی واقف ہے۔

آج کا انسان روئے زمین پر سوا ملین (ساڑھے بارہ لاکھ) کے قریب حیوانات و نباتات کے وجود کا پتہ لگا کر ان کے آثار و خواص کا مطالعہ کر رہا ہے جو "حیاتیات" (Biology) کے دائرے میں آتے ہیں[۱] اسی طرح آج کرۂ ارض پر پائے جانے والے دو لاکھ کے قریب "غیر نامیاتی مرکبات" (inorganic componds) اور چالیس لاکھ کے لگ بھگ "نامیاتی مرکبات" (organic componds) سے واقفیت حاصل کر چکا ہے[۲] جن کا مطالعہ علم کیمیا (chemistry) کے تحت کیا جاتا ہے۔ سمائے دنیا میں پائے جانے والے لاتعداد ستاروں اور اربوں کہکشاؤں کے نظاموں اور ان کی خصوصیات کا مطالعہ علم فلکیات (astronomy) کے تحت کیا جا رہا ہے۔ اور زیرِ زمین پائی جانے والی اشیاء خصوصاً مٹی

---

[۱] Asimov's Guide to Science, Vol. 2, p. 304,
1978ء میں حیوانات و نباتات کی دریافت شدہ تعداد صرف ستر ہزار تھی جبکہ یہ تعداد آج بارہ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ کھوج برابر جاری ہے اور دن بدن نئے نئے انواعِ حیات علمِ انسانی میں آ رہے ہیں۔ اس لحاظ سے مخلوقاتِ الٰہی کی صحیح تعداد کا علم صرف خلّاقِ فطرت ہی کو ہو سکتا ہے۔

[۲] علم کیمیا، ۲/۱۵۸

اور چٹانوں کے مختلف نمونوں، ان کی بناوٹ، ان کی ساخت و پرداخت اور معدنیات وغیرہ کا مطالعہ علم ارضیات Geology کے تحت عمل میں آرہا ہے۔

اس لحاظ سے تحقیقات کا دائرہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا ہے موجودات عالم یا خدائی مخلوقات کی تعداد میں بھی برابر اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ دوربین اور خوردبین کی ایجاد کے بعد تو ہمارے سامنے نئے جہانوں کے ظہور کا ایک تانتا سا بندھ گیا ہے۔ اور ایسے ایسے حقائق منظرِ عام پر آرہے ہیں جن کے ملاحظہ سے حیرت ہوتی ہے۔

جس طرح قدیم چیزوں سے واقفیت "علم اسماء" میں داخل تھی، اسی طرح جدید سے جدید تر تمام چیزوں سے واقفیت بھی علم اسماء میں داخل ہے۔ بلکہ قیامت تک جتنی بھی نئی نئی چیزیں اور ان کے خواص و تاثیرات دریافت ہوتے جائیں گے وہ سب کے سب ـــــ مفسرین کی تصریح کے مطابق ـــــ علم اسماء ہی کے دائرے میں ہوں گے، جن کی دریافت کی صلاحیت خلاّق فطرت نے روز ازل ہی میں حضرت آدم علیہ السلام کے توسط سے تمام انسانوں میں رکھ دی تھی۔[۵۳]

سائنسی علوم کا پھیلاؤ

ان اصطلاحات کی وسعت یا "ناموں کی کثرت" کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ سائنسی علوم کی بے انتہا ترقی اور پھیلاؤ کی بدولت

---

۵۳ اگر "کرموسوم" کے ذریعے وراثتی خصوصیات کی منتقلی کا نظریہ صحیح ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ تمام وراثتی خصائص آدم ہی کے توسط سے ان کی اولاد میں منتقل ہو سکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

خود ان علوم (طبیعیات، کیمیا، حیاتیات اور ارضیات وغیرہ) میں سے اب ہر علم و فن کی لغات اور ڈکشنریاں تک الگ تیار ہونے لگی ہیں۔ مثال کے طور پر ادارہ Penguin Books (England) کی تیار کردہ مختلف سائنسی لغات ملاحظہ ہوں، جن میں سے ہر ایک کئی کئی ہزار الفاظ و اصطلاحات پر مشتمل ہے[۵۳]۔

پھر ان علوم میں سے ہر علم — کثرت مباحث کی بدولت — مزید شاخ در شاخ تقسیم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف "حیاتیات" ہی کو لے لیجئے جس کی اب تک بیسیوں شاخیں وجود میں آچکی ہیں۔ جیسے:

علم عضویات ———— morphology
نسیجیات ———— histology
علم تشریح ———— anotomy
فعلیات ———— physiology
علم طبیعی ماحول ———— ecology
علم درجہ بندی (انواع حیات کی قسموں کی) ———— taxonomy

---

[۵۳] جو یہ ہیں:-

1--The Penguin Dictionary of physics.

2--The Penguin Dictionary of Biology.

3--A Dictionary of Science.

(یہ لغت خصوصیت کے ساتھ علم کیمیا کے لئے مخصوص ہے)

4--Dictionory of Geology.

5-- A Dictionary of Geography.

6--A Dictionary of Electronics

علم توالد و تناسل ———— genetics

معدوم شدہ جانوروں اور پودوں کا علم ———— palaeontology

نباتاتی معاشیات ———— economic botany

یہ وہ علوم ہیں جو عام طور پر حیاتیات کی درسی کتابوں کا جزء واور اس کے مباحث ہوتے ہیں۔ اور حیاتیات کی دو اصولی شاخوں : (۱) علم نباتات (botany) اور (۲) علم حیوانات (Zoology) کی کسی بھی درسی کتاب کے عموماً لازمی اجزاء کے طور پر یہ مباحث پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ حیاتیات کی چند جدید شاخیں وہ ہیں جو فنی لحاظ سے مخصوص نوعیت کی حامل ہیں۔ ان کے بغیر حیاتیات کا مطالعہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ وہ یہ ہیں :

علم خلیات ———— cytology

حیاتیاتی کیمیا ———— biochemistry

طبیعی حیاتیات ———— physical Biology

بحری حیاتیات ———— marine biology

تابکاری حیاتیات ———— radio biology

خوردبینی حیاتیات ———— microbiology

سالماتی حیاتیات ———— molecular biology

کیمیاوی خوردبینی حیاتیات ———— chemical microbiology

برقی فعلیات ———— electrophysiology

حیاتی برقیات ———— bioelectricity

انزائمیات ———— enzymology

مائی ٹوکانڈریا کا علم ———— mytocondriology

بطور مثال یہاں پر صرف ایک علم کی متعدد شاخیں بیان کی گئی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس موقع پر حیاتیات کی ان شاخوں میں کسی علم و فن کا تذکرہ چھوٹ گیا ہو۔

بہرحال اس سے موجودہ سائنسی علوم کی وسعت واہمیت اور اُن کی ہمہ گیری کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام علوم اور یہ تمام مسائل و مباحث علم اسماء ہی کی تفصیلات ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان چیزوں (مادہ و توانائی کے آثار و خواص) کو مسلمان محققین اور سائنس داں دریافت کرتے تو ان کے نام بھی وہ اپنی زبان میں کچھ اور رکھتے، جس کی وجہ سے شاید وہ اجنبیت نہ ہوتی جو آج دکھائی دے رہی ہے۔ اور دوسری حیثیت سے وہ علوم و فنون کے میدان میں بھی اقوام عالم کی رہبری کر کے پوری دنیا کے امام بنتے۔ جیسا کہ قرون وسطیٰ میں بغداد، سسلی اور اسپین وغیرہ نے علوم و فنون کی ترقی میں تاریخی رول ادا کیا تھا، جس کے باعث موجودہ یورپ کی ذہنی بیداری اور اس کی نشاۃ ثانیہ (renaissance) عمل میں آسکی۔

---

۵ اگرچہ علوم و فنون کی اصطلاحوں کے مترادفات ہماری زبان میں بھی وضع کر لئے گئے ہیں، مگر جس رفتار سے سائنس کی ترقی ہو رہی ہے، اس رفتار سے وضع اصطلاحات کا کام نہیں ہو رہا۔ اور پھر بہت سی اصطلاحات فرسودہ اور ناکارہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس بنا پر اکثر انگریزی کی اصطلاحات کے استعمال ہی کو ترجیح دینی پڑتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اصل معاملہ محض اصطلاحات کا بھی نہیں ہے بلکہ صحیح معنی میں ان علوم کے غیر دینی اور غیر ضروری ہونے کا تصور ہے۔ جب تک "علم" کی تقسیم کا یہ غلط تصور نہیں بدلے گا کوئی حقیقی تبدیلی نہیں آسکتی۔

نیز اس سلسلے میں ایک اور تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ اردو والوں کو اب تک "گل و بلبل" اور "بادہ و ساغر" ہی سے فرصت نہیں مل سکی ہے، لہٰذا وہ ان بنیادی اور ضروری علوم کی طرف توجہ کہاں سے کرتے! یہی وجہ ہے کہ اردو کا دامن اب تک ان مفید تجربی علوم سے بالکل ہی خالی نظر آتا ہے، خصوصاً وہ علوم جو اوپر گنائے گئے ہیں۔

قرآن کی بلاغت اور اس کے علمی اعجاز کا ایک نمونہ

ضمناً میں اس موقع پر ایک نکتہ یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سارے علوم اور یہ تمام مسائل و مباحث محض قرآن حکیم کے ایک لفظ "الاسماء" کی تفصیل ہیں۔ یہ قرآن حکیم کی بلاغت اور اُس کا سب سے بڑا اعجاز ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ میں علوم و فنون کے سمندر کو نہیں بلکہ بلا مبالغہ "سمندروں" کو سمو دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم کو اس موقع پر صرف ایک لفظ "الاسماء" کی بلاغت اور اس کے حیرت انگیز مفہوم میں نظر آرہا ہے۔ اس ایک لفظ کی تشریح و تفسیر — مکمل طور پر — پوری نوع انسانی اپنے تمام علوم و فنون سمیت قیامت تک نہیں کر سکتی۔ اور علوم و فنون کی پوری پوری عظیم الشان لائبریریاں بھی اس ایک لفظ کی کامل توجیہ و تشریح میں عاجز و بے بس رہیں گی۔ یعنی موجوداتِ عالم اور اُن کے خواص و آثار سے متعلق جتنی بھی تفصیلات — مختلف علوم کے تحت — مدوّن کی جائیں گی وہ سب کی سب اس "ایک حرفی کوزے" میں سما جائیں گی بلکہ "ھل من مزید" کی صدائیں بھی بلند ہوتی رہیں گی۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ کہدو کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے میرے رب کی باتوں کے (لکھے جانے) کے لئے، تب بھی میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم ہو جائے گا، اگرچہ ہم اس کی مدد کے لئے اُسی جیسا ایک اور سمندر لے آئیں۔ (کہف : ۱۰۹)

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ اور زمین میں جتنے بھی درخت ہیں سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر اپنے بعد مزید سات سمندروں کو لے آئے تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔ یقیناً

اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ (لقمان : ۲۷)

یہی وجہ ہے کہ تمام جن و انس مل کر بھی "حقائق و معارف سے لبریز" اس جیسا کلام پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ عجمی لوگ قرآن حکیم کے ادبی اسلوب و محاسن اور اس کی اصل معجزانہ بلاغت کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو کیا ہوا، اس کی حکمت و دانش، اس کے معجزنما بیانات اور اس کے اس حیرت انگیز پہلو سے اس کی عظمت و برتری کا کچھ تو اندازہ کرسکتے ہیں۔ قرآن کا اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ ہر دور میں اس کے حالات و مقتضیات کے مطابق اس کا علمی اعجاز مختلف حیثیتوں سے کھل کر سامنے آتا رہتا ہے اور اس کے کلام برتر اور کلام الٰہی ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتا رہتا ہے۔ اگر کوئی قوم (اپنی زبان کی اجنبیت کی بنا پر) یا کوئی دور (اپنے زمانی تاخر کی وجہ سے) اس کے کسی ایک پہلو کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے تو اس کے اعجاز کا دوسرا پہلو اس کے سامنے آجاتا ہے۔ غرض آج کے جدید ترین علمی دور میں اس کا یہ علمی اعجاز اہلِ دانش کو مبہوت و ششدر کردینے کے لئے کافی ہے جو عقل سلیم اور فکر سلیم رکھنے والوں اور حساس دل و دماغوں کو متاثر کرنے والے ایک اعلیٰ ترین کلام کے روپ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اس جیسا کوئی دوسرا مشاہدہ نوع انسانی نے اب تک نہیں کیا ہے۔

خلافت ارض اور جہاد

اس موقع پر بنیادی سوال یہ ہے کہ انسان کو علم اسماء دیئے جانے کا مقصد و مدعا کیا ہے؟ تو اس کا جواب جیسا کہ پچھلے صفحات میں دیا جاچکا ہے یہ ہے کہ اس سے خلافت ارض کے اغراض و مقاصد کی تکمیل مقصود ہے۔ خلافت ارض کا سب سے بڑا مقصد زمین میں ــــ انفرادی و اجتماعی ہر حیثیت سے ــــ عدل و انصاف قائم کرنا اور ظلم و زیادتی کو مٹانا ہے۔ تاکہ یہ دنیا امن و امان اور سکون و آشتی کا گہوارہ بن جائے۔ اور پروردگار عالم کی ربوبیت

درحمانیت جس طرح تمام مظاہر کائنات میں محیط نظر آ رہی ہے، اسی طرح اس کی رحمانیت کا بھرپور مظاہرہ خود انسانی زندگی کے مختلف مظاہر میں بھی نظر آئے۔ ورنہ تضاد و ثنویت کی وجہ سے انسان اور کائنات کے درمیان تال میل اور کمل ہم آہنگی نہیں رہے گی۔ لہذا انسانی کوشش ۔ خصوصاً خدا کے مخلص اور فرمانبرداروں کی سعی ۔۔۔۔ یہ ہونی چاہیئے کہ جس طرح بھی ہو سکے اس مقصدِ عظیم کی تکمیل کے لئے اپنی تمام توانائیاں صرف کر ڈالیں۔ اسی وجہ سے اہلِ اسلام کو دنیا کے باطل فلسفوں، باطل نظاموں اور طاغوتی قوتوں کے خلاف جہاد کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيرًا ۝ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝ اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک متنبہ کرنے والے کو بھیج دیتے۔ (مگر ایسا کرنے کے بجائے ہم نے ایک جامع اور مکمل کلام نازل کر دیا جو سب کے احوال و کوائف کے لئے کافی ہے) لہذا تم منکرین کا اتباع مت کرو (اور باطل نظاموں کو تسلیم نہ کرو) بلکہ اس (کلام برحق) کے ذریعے ان کا (اور ان کے فلسفوں کا) زور و شور کے ساتھ مقابلہ کرو۔

(فرقان: ۵۱ ــ ۵۲)

یہاں پر دو حقیقتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ ہر ہر شہر و بستی یا ہر ہر قوم میں ایک ایک ہادی بھیجنے کے بجائے ایک ایسا جامع کلام بھیج دیا گیا جو سب کی ہدایت کے لئے کافی ہے۔ اس سے اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ مابعد کے ادوار کے لئے علٰحیدہ علٰحیدہ رسول اور الگ الگ پیغامات بھیجنے ضروری نہیں رہے۔ بلکہ یہی واحد کلام تا قیامت تمام اقوامِ عالم کے لئے متنبہ اور خبردار کرنے والا بن سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ قرآن کے ذریعے جہاد کا صاف و صریح مطلب یہ ہوا کہ اس میں چونکہ علمی اعتبار سے باطل افکار و نظریات اور جدید سے جدید تر ہر قسم کے فلسفوں اور نظاموں سے نپٹنے کا سامان بھی رکھ دیا گیا ہے، اس لئے ہم کو قرآن کے ذریعے

جہاد کرنے یعنی اُس کے ابدی حقائق و معارف کا استنباط کر کے عالمِ انسانی کی رہبری کر لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ موجودہ دور عقلیت (rationalism) اور نظریاتی کشمکش کا دور ہے۔ اور آج وہی دین و مذہب کامیاب ہو سکتا ہے جو عقلی و نظریاتی اعتبار سے دوسرے نظاموں کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ قرآن حکیم اس حیثیت سے بھی ایک کامیاب اور بے مثال صحیفہ نظر آتا ہے۔

اس موقع پر ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ "جہاد" کا مطلب لازمی طور پر "قتال" یا تلوار اٹھانا نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب کوشش اور جدوجہد کرنے کے ہیں۔ یعنی دینِ برحق کی سربلندی کے لئے جدوجہد کرنا۔ اب رہا دینِ برحق کی مدافعت میں جنگ و جدال سے کام لینا، تو یہ محض اُس کی ایک شکل ہے جو زبانی یا علمی و استدلالی حجت کے بعد آخری چارۂ کار کے طور پر روا رکھی گئی ہے۔ خود مذکورۂ بالا آیت کریمہ کو دیکھئے تو نظر آئے گا کہ اس میں بجائے تلوار کے محض قرآن کریم کے ذریعے جہاد کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ یعنی علمی و نظریاتی اعتبار سے اقوامِ عالم اور ان کے علوم و فلسفوں کا مقابلہ کرنا۔ جہاد کے موضوع پر شرعی و فقہی نقطۂ نظر سے تفصیلی بحث چھٹے باب میں کی گئی ہے۔ یہاں پر محض تمہید کے طور پر چند اشارات کر دینا مقصود ہے، تاکہ خلافتِ ارض اور تسخیرِ اشیاء سے اس کا تعلق واضح ہو جائے۔

جہاد کی دو قسمیں ہیں: (۱) علمی یا قلمی جہاد (۲) جہاد بالسیف یا طاقت کا اظہار و استعمال۔ قسمِ ثانی کا مظاہرہ خاص خاص حالات اور تقاضوں پر موقوف ہے۔ مگر قسمِ اول ہمیشہ جاری رہ سکتا ہے اور رہنا چاہیئے۔ یعنی دلیل و استدلال کے ذریعے باطل نظاموں کا مقابلہ اور دینِ رحمت (دین اسلام) کی سربلندی اور عملاً اس کو غالب کرنے کے لئے

راہیں ہموار کرنا۔ اسی وجہ سے انسان کو پیدا کرنے کے فوراً بعد قوت بیانیہ دلیل و استدلال اور علم اسماء وغیرہ سب کچھ عطا کر دیا گیا (جیسا کہ تفصیل باب اول میں گزر چکی) تاکہ بنی نوع انسان کے درمیان نظریاتی کشمکش جاری رہے اور قوت و استدلال کے ذریعے وہ ایک دوسرے پر غالب آتے رہیں۔

مگر انسان کی فطرت میں دو قسم کی قوتیں کارفرما ہیں : (۱) ایک تو اس کا ضمیر یا نفس ناطقہ conscience ہے جو اُس کو ہمیشہ نیکی اور تعمیر سیرت پر اُبھارتا رہتا ہے۔ (۲) اور دوسرے اُس کا نفس امارہ یا حیوانی قوت ہے جو اُس کو بدی اور تخریب کی طرف آمادہ کرتی رہتی ہے۔ ان دونوں قوتوں میں برابر کشمکش اور آویزش برپا رہتی ہے۔ انسان کی آزمائش کے لئے یہ دونوں قوتیں اللہ نے ہر انسان میں برابر برابر رکھ دی ہیں۔ مگر جس وقت اجتماعی حیثیت سے کسی قوم کا قوام بگڑ جاتا ہے اور اس پر حیوانی قوت اور اس کے اثرات غالب آجاتے ہیں اور پھر اس کے نتیجے میں اللہ کی زمین فتنہ و فساد سے بھر جاتی ہے تو ایسے موقعوں پر بجائے جہاد بالقلم کے جہاد بالسیف ضروری ہو جاتا ہے تاکہ فتنوں کا استیصال ہو جائے اور زمین میں امن و امان برقرار رہے۔

یہ ہے خلافت ارض اور جہاد کا تعلق اور اس کی نوعیت۔ اب رہا تسخیر اشیاء کا معاملہ — جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے — تو یہ اصلاً جہاد کی تیاری کے لئے ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے، بجائے خود مقصود و مطلوب نہیں۔ اور دوسری حیثیت سے مسلمان اپنے دین و ایمان پر ثابت قدم رہتے ہوئے اگر دنیوی میدان میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو شرعی حیثیت سے ان پر کوئی رکاوٹ یا پابندی عائد نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کی یہ کوشش ہر حیثیت سے محمود و مستحسن سمجھی جائے گی۔ پھر اس صورت میں جب کہ آج دین و ملت کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے خود دنیوی حیثیت سے ہمارا مضبوط و مستحکم ہونا

نہایت ضروری ہے۔

بعض لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ دنیوی علوم و فنون سے تعرض اور ان میں انہماک شاید اسلام کی قناعت پسندانہ قسم کی ہدایات کے خلاف ہو مگر یہ ایک منفی صورت حال ہے جو بعض خاص احوال و کوائف کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس سے میدانِ عمل میں مثبت طور پر جد و جہد کرنے کی ممانعت نہیں نکلتی۔ اسلام تو دین و دنیا کا سب سے کامیاب تصور پیش کرتا ہے، جس سے زیادہ کا ہم کسی دوسرے مذہب میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ عزلت و گوشہ نشینی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ میدان کارزار کو گرم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ورنہ اللہ کی اس دھرتی سے شر و فساد اور ظلم و زیادتی کا استیصال کس طرح ہو سکے گا؟

قرآنِ حکیم میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جو ہم کو دنیوی اور مادی میدان میں بھی آگے بڑھنے پر اُبھارتی ہیں۔ خصوصاً وہ آیات جن میں مظاہر فطرت کی تسخیر کرنے اور ان کی قوتوں سے استفادہ کرنے کا حد درجہ مؤثر اور طاقتور اسلوب میں تذکرہ کیا گیا ہے (تفصیل آگے آرہی ہے)۔ نیز ایک موقع پر دنیا داروں اور دین داروں کا تذکرہ کرنے کے بعد بطور اصول یہ حتمی فیصلہ بھی سنا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مادی نعمتیں اور دنیوی بخششیں صرف دنیا داروں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ دین داروں کا بھی ان میں حصہ ہے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝

ہم تمہارے رب کی نوازش (دنیوی) سے اِن کو بھی نوازتے رہیں گے اور اُن کو بھی۔ اور تمہارے رب کی عنایات (کسی کے لئے بھی) ممنوع نہیں ہیں۔ (بنی اسرائیل: ۲۰)

غرض خلافت ارض کا ایک اہم ترین مقصد "جہاد" ہے۔ اور جہاد کی تیاری کے لئے ہر دور کے تقاضوں کے مطابق ہر قسم کے علوم و فنون سے

آراستہ رہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ جہاد کوئی وقتی یا عارضی چیز نہیں بلکہ ایک دائمی فریضہ ہے، جو دین کے علمبرداروں پر مستقل طور پر عائد ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا موجودہ دور میں صحیح معنی میں علمی و قلمی جہاد کے لئے سائنسی علوم سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے بغیر اقوامِ عالم پر علمی اعتبار سے حجّت پوری نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح آج "ہتھیار کے ذریعے جہاد" کرنے کے لئے خصوصیت کے ساتھ صنعت اور ٹکنالوجی سے واقفیت اور اس میں کمال حاصل کرنا ضروری ہے[لہ]۔ تاکہ حالات کے مطابق اقوامِ عالم سے نبرد آزمائی کی جا سکے اور ان پر رعب و داب قائم کر کے[لہ] عدلِ الٰہی کو دینِ رحمت کی شکل میں غالب کیا جا سکے۔ جہاد کی اس ہمہ جہتی تیاری سے جہاں ایک طرف امت اسلامیہ کو فوجی و سیاسی اور بین الاقوامی نقطۂ نظر سے بہت سارے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں تو دوسری طرف خود معاشی و اجتماعی حیثیت سے بھی ملّتِ اسلامیہ کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ اور اتنے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو شمار سے بھی باہر ہیں۔ یہ ہے علم اسمار کا صحیح مقصد و منشا اور اس کی اصلی غرض و غایت۔ اب اگلے صفحات میں اسی کی تفصیل بیان کی جائے گی۔

لہ کیونکہ آج تیر اور تلوار کا زمانہ نہیں بلکہ راکٹ اور میزائلوں کا دور ہے۔

لہ بمطابق آیہ کریمہ:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ الخ

اور تم ان سے لڑائی کے لئے اتنی قوت اور زور آور گھوڑے تیار کرو جتنے تم کر سکتے ہو، کہ اس سے اللہ کے دشمنوں پر دھاک بٹھا سکو۔

(انفال: ۶۰)

اس آیت کریمہ پر تفصیلی بحث کے لئے چھٹا باب دیکھئے۔

تسخیر اشیاء اور باطنی نعمتیں

غرض انسان کو علم اسماء دیئے جانے کا بنیادی مقصد — جیساکہ تفصیل گذر چکی — مظاہر کائنات سے تعارف حاصل کر کے ان میں ودلیعت شدہ فوائد سے مستفید ہونا اور خلافت ارض کے میدان کو سر کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان مظاہر و موجودات میں انسان کے لئے بے شمار فوائد اور عجیب و غریب نعمتیں ودلیعت کردی ہیں جو اس کی ربوبیت و رحمانیت کا حیرت انگیز مظہر ہیں۔ قرآنِ حکیم میں صاف صاف فرمادیا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ
وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ

کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے تمہارے لئے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں مسخر کردیں اور تم پر اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں پوری کردیں! (لقمان: ۲۰)

یہاں پر "ظاہری اور باطنی نعمتیں" خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ کتب تفسیر میں ان کے مختلف مفہوم و مصداق بیان کئے گئے ہیں جن کو مختصر طور پر نمبروار بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ بعض کے نزدیک ظاہری نعمتوں سے ظہورِ اسلام اور دشمنوں پر فتح اور باطنی نعمتوں سے مراد فرشتوں کے ذریعے امداد ہے۔

۲۔ ظاہری نعمتوں سے مراد شکل و صورت کا حُسن اور اعضاء کی درستی ہے اور باطنی نعمتوں سے مراد معرفت ہے۔

۳۔ ظاہری نعمتوں سے مراد حواس ظاہری اور باطنی سے مراد عقل اور دماغ ہیں[۵]

---

۵ یہ تینوں اقوال تفسیر کشاف سے ماخوذ ہیں۔

۴۔ امام رازی کے نزدیک ظاہری نعمتوں سے مراد جسمانی اعضاء کی درستی اور باطنی نعمتوں سے مراد ان اعضاء میں کارفرما پوشیدہ قوتیں ہیں۔[9]

۵۔ علامہ زمخشری نے نسبتاً ایک زیادہ بہتر اور فکر انگیز مفہوم بیان کیا ہے جو خود ان کا اپنا قول ہے[10]۔ فرماتے ہیں:

الظاهرة كل يعلم بالمشاهدة، والباطنة مالا يعلم الا بدليل او لا يعلم أصلاً۔ فكم في بدن الانسان من نعمة لا يعلمها ولا يهتدى الى علم بها: ظاہری سے مراد ہر وہ نعمت ہے جو مشاہدے میں آسکے۔ اور باطنی سے مراد وہ نعمت ہے جو کسی دلیل سے معلوم ہوسکے یا بالکل ہی معلوم نہ ہوسکے۔ اس لحاظ سے انسان کے بدن میں کتنی ہی ایسی (پوشیدہ) نعمتیں ہیں جن کو انسان نہیں جانتا اور ان کی طرف راہ یاب نہیں ہوتا۔[11]

ظاہری و باطنی نعمتوں کا یہ محض ایک جزوی پہلو ہے جو اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔ مگر کلّی اعتبار سے میرے نزدیک اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ظاہری

---

[9] تفسیر کبیر، ۶/ ۴۴۴ھ

[10] واضح رہے کہ شرعی امور و احکام کے برعکس تکوینی امور سے تعلق رکھنے والی آیات کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور اس قسم کی آیات کی تفسیر کبھی مکمل اور "حرف آخر" نہیں بن سکتی۔ بلکہ سائنسی علوم کی جیسے جیسے ترقی ہوتی جائے گی ان آیات کریمہ کا بہتر مفہوم اور ان کے حیرت انگیز اعجازی پہلو خود بخود واضح ہوتے جائیں گے، جو دراصل نوع انسانی کی فکری و اعتقادی اور تہذیبی و تمدنی ہر اعتبار سے رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ موجودہ دور میں قرآن عظیم کا یہ سب سے بڑا اعجاز اور اس کا حیرت انگیز "ہدایتی" پہلو ہے، جس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

[11] تفسیر کشاف، ۳/ ۲۳۵

نعمتوں سے مراد وہ نوازشات الٰہیہ ہیں جو آفرینش آدم سے لے کر عصر حاضر تک برابر معلوم و متعارف چلی آرہی ہیں۔ یعنی وہ لوازم حیات جن کے استعمال سے ہر دور کا انسان بخوبی واقف رہا ہے۔ اور باطنی نعمتوں کی فہرست میں یوں تو وہ تمام مخفی فوائد آسکتے ہیں جن کا ذکر مفسرین نے کیا ہے۔ مگر وہ انسانی جسم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ان کا اطلاق دنیا کی تمام چیزوں اور تمام اجسام میں پوشیدہ فوائد پر ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے باطنی نعمتوں سے مراد مادہ (matter) اور توانائی (energy) کے وہ سارے پوشیدہ اسرار و حقائق اور ان میں ودیعت شدہ فوائد ہیں جو علوم سائنس کی ترقی کی بدولت منکشف ہو سکے ہیں۔ جن کو موجودہ انسان مسخر کر کے بخوبی فائدہ اٹھا رہا ہے مثلاً برق، بھاپ، جوہری توانائی[13]، جوہری آئی سوٹوپ اور بے شمار قسم کے کیمیاوی مرکبات (chemical compounds) جو مصنوعی غذاؤں، ادویہ، کھادوں اور دیگر بے شمار مصنوعات کی تیاری سے متعلق ہیں۔ اور اسی طرح مختلف قسم کے تُرشے acids وغیرہ جن کا استعمال جدید صنعتوں (industries) میں بہت عام اور اہم ہے۔

یہ تمام نعمتیں روز ازل ہی سے کائنات میں موجود تھیں، جن سے انسان علم اسماء کی ترقی اور علم تسخیر (ٹکنالوجی) کی قوت کی بدولت صحیح فائدہ اب اٹھا رہا ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ

---

[13] جوہری توانائی کے مضر پہلوؤں پر بحث اگلے ابواب میں آرہی ہے۔

وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۚ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے پانی برسایا۔ پھر اُس پانی سے تمہاری روزی کی خاطر طرح طرح کے میوے نکالے۔ اور کشتیوں کو تمہارے قابو میں کیا تاکہ وہ سمندر میں اُس کے حکم سے چلتی رہیں (تاکہ تم جہاں چاہو باآسانی سفر کر سکو) اور دریاؤں کو تمہارے لئے مسخر کیا (کہ حسب منشا تم ان پر بندھ باندھو اور اُن کا رُخ موڑ لو) اور تمہارے لئے آفتاب و ماہتاب کو مسخر کیا (کہ ان کی توانائیوں سے تم حسب خاطر مستفید ہو سکو) اور تمہارے لئے رات اور دن کو کام میں لگایا (تاکہ تمہارے کام کرنے اور راحت پانے کے اوقات متعین ہو سکیں)۔ اور اُس نے (اس طرح) تمہارے (تمام فطری) مطالبات پورے کر دیئے۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہو تو نہ کر سکو گے۔ انسان بڑا ہی ستم گار اور ناشکرا ہے (جو ان نعمتوں سے مستفید ہونے کے باوجود خدا کا انکار کر بیٹھتا ہے)۔ (ابراہیم: ۳۲-۳۴)

ایک اور موقع پر ارشاد ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

اور اُس نے زمین اور اجرام سماوی کی تمام چیزیں تمہارے کام میں لگا دی ہیں۔ یقیناً اس باب میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے (بہت سے) دلائل موجود ہیں (حاشیہ ۱۳)

ان تمام آیات میں غور کیجیے۔ ان آیات کا منشا و مقصد کیا ہے اور یہ حکم کس کو دیا جا رہا ہے؟ تسخیر اشیاء کس چیز کا نام ہے[۱۳] ؟ باطنی نعمتیں کس طرح وجود میں آتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ حکم "خلیفۃ الارض" کو دیا جا رہا ہے کہ وہ علم اسماء

کے "منتر" اور "دست تسخیر"[۱۶] کی قوت سے "باطنی نعمتوں" کو منظر عام پر لائے۔

۱۶؎ تسخیر کے لغوی معنی ہیں: کسی کو جبراً کام میں لگانا، رام کرنا، قابو میں کرنا وغیرہ۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ "کسی خاص مقصد کے لئے کسی کو زبردستی لے جانا تسخیر کہلاتا ہے۔ اور "مسخّر" وہ ہے جس کو کسی کام پر (جبراً) لگایا گیا ہو۔" (مفردات القرآن)
اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی اور قوت قاہرہ کے ذریعے تمام موجودات عالم کو انسان کے خادم اور حاشیہ بردار کی حیثیت سے مختلف کاموں پر مامور اور تیار کر رکھا ہے اور ان میں مخفی طور پر بے شمار فوائد ودیعت کر دیئے ہیں۔ اب انسان کا کام — اپنے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے — یہ ہے کہ وہ ان "خدام" سے اپنی عقل و دانش اور ضرورت کے مطابق خدمت لے اور ان مخفی فوائد کا پتہ لگا کر اور اپنے تمدنی مسائل و مشکلات حل کر کے دنیائے انسانیت کے گیسو سنوارے۔ چنانچہ ارشاد باری "وآتاکم من کل ماسالتموہ" (اور اس نے تمہارے تمام فطری مطالبات پورے کر دیئے) کے مطابق انسان کی کوئی مشکل اور اس کی کوئی فطری و تمدنی ضرورت ایسی نہیں ہے جس کا حل "ضروریات سے بھرپور" اس کائنات ارضی میں موجود نہ ہو۔ ان صاف و صریح ارشادات کے باوجود ان نعمتوں سے مستفید نہ ہونا، یا اشیائے عالم کی تسخیر کو ایک کارِ عبث تصور کرنا محرومی نہیں تو پھر کیا ہے!

۱۷؎ اشیائے عالم کا اصل "مسخّر" (تسخیر کرنے والا) جیسا کہ سابقہ حاشیے میں صراحت کی جا چکی، خالق کائنات جل شانہ ہے۔ تمام موجودات پر اسی کا حکم اور اسی کی فرمانروائی چل رہی ہے۔ اس کے حکم سے ایک ذرہ بھی سرتابی نہیں کر سکتا۔ اس حیثیت سے سب اس کی قوت قاہرہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں (وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)۔ مگر چونکہ انسان بھی — علمائے اسلام کی تصریح کے مطابق — صفاتِ خداوندی کا مظہر ہے، اس لئے وہ بھی ایک خاص دائرہ میں حاکم و مختار ہے جس طرح کہ سمیع و بصیر ہونا صفاتِ الٰہی ہیں، مگر انسان بھی ایک

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

یہ باطنی نعمتوں یا مادہ اور انرجی کے پوشیدہ حقائق کو منکشف کرنے کا "فارمولا" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "مادے کی توڑ پھوڑ" اور "انرجی" کے اصولوں کو کام میں لانے سے مختلف ایجادات واکتشافات کی شکل میں "نعمتوں" کی بارش ہونے لگتی ہے۔ جیسے بجلی اور بھاپ سے چلنے والی ہزاروں قسم کی مشینیں موٹر، ٹرین، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر وغیرہ بہت سی تمدنی ضروریات۔ اسی طرح فن زراعت میں استعمال ہونے والے جدید آلات، مشینیں اور ادویات[۱۵۱]۔ اور سب سے زیادہ مفید اور حیرت انگیز ترقی شاید طبیعیات اور علم کیمیا کی ترقی کی بدولت عمل میں آسکی ہے۔ اس وقت دنیا میں جتنی بھی صنعتیں کام کر رہی ہیں، چاہے وہ مشینوں کی تیاری سے متعلق ہوں یا

(بقیہ حاشیہ ص۱۳۵) حد کے اندر سمیع و بصیر ہے۔ جیساکہ قرآن کریم کے بے شمار مقامات میں اس کی تصریح موجود ہے۔ لہٰذا موجودات عالم کا اصل مُسخّر باری تعالیٰ جل شانہ ہے۔ مگر مجازاً انسان کو بھی مسخر موجودات کہا جا سکتا ہے۔ اور ان دونوں میں کوئی تعارض وتضاد نہیں ہے۔

مگر میں نے اس موقع پر "علم تسخیر" کو ٹکنالوجی کے معنی میں بطور ایک اسلامی اصطلاح استعمال کیا ہے۔ تاکہ جدید علوم وفنون اور موجودہ پس ماندہ مسلمانوں کے درمیان حائل شدہ خلیجوں کو پاٹا جا سکے۔ اور ذہنی ونفسیاتی اعتبار سے انہیں جدید علوم وفنون سے قریب کر کے انھیں وسیع تر کار خلافت کے لئے آمادہ کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے اس سے بہتر قرآنی اصطلاح موجود نہیں ہے۔

۱۵۱ زراعت کی ترقی سے ہماری غذائی ضروریات۔ ہمارے جسمانی نشوونما کے لئے پوری ہوتی ہیں تو فن طب کی ترقی سے ہماری جسمانی صحت درست ہوتی ہے۔ اور نقل وحرکت کی سہولتوں سے ہمارے جسم کو راحت پہنچتی ہے اور مشقتوں کا احساس کم سے کم ہونے لگتا ہے۔ اس لحاظ سے آج یہ تمام چیزیں ہماری بنیادی تمدنی ضروریات میں شمار ہونے لگی ہیں اور ان کے بغیر زندگی کا تصور ہی مشکل معلوم ہونے لگا ہے۔

دیگر مصنوعات کی، سب میں بنیادی طور پر ان دونوں کا عمل دخل ہے۔ صرف اکیلے پٹرولیم سے اس وقت دنیا میں ہزاروں کیمیاوی صنعتیں چل رہی ہیں، جیسے موم، مصنوعی ربر، وارنش، الکحل، پلاسٹک، خوشبویات، مصنوعی ریشے اور دھماکہ خیز مادے وغیرہ[۱۱۶]۔ اسی طرح لوہے اور فولاد کی ہزاروں صنعتیں، الکٹرانکس آلات کی ہزاروں صنعتیں، پلاسٹک کی ہزاروں صنعتیں اور ربر کی ہزاروں صنعتیں کام کر رہی ہیں۔ یہی حال دیگر تمام اشیاء کا بھی ہے کہ ہر ایک مادے یا چیز (اسم) سے سیکڑوں ہزاروں چیزیں تیار ہو رہی ہیں مگر اس خوبی کے ساتھ کہ ان مصنوعات کو دیکھ کر اصل چیز یا مادے کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ غرض تمدن جدید میں لوہے کی مصنوعات اور الکٹرانک آلات کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے۔ اگر موجودہ تمدن سے صرف ان دو چیزوں کو ہٹا دیا جائے تو شاید اس کے ڈانڈے تمدن قدیم سے مل جائیں۔

ان علوم اور ان کے فوائد سے قطع نظر صرف معاشیاتی نقطۂ نظر سے غور کیجئے کہ یہ صنعتیں کتنی اہم ہیں! قوموں کی ترقی اور اُن کی خوش حالی کا دارو مدار ان صنعتوں پر کتنا ہے! اس وقت روئے زمین پر ہزاروں نہیں لاکھوں صنعتیں کام کر رہی ہیں اور دنیا کی قوموں میں ان کے درمیان سخت مقابلہ چل رہا ہے۔ کروڑوں آدمی مختلف مصنوعات کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں اور انسانی تمدن دن بدن ترقی کرتا جا رہا ہے[۱۱۷]۔ آج قوموں کی زندگی صنعتوں سے

---

[۱۱۶] عربوں سے سستا تیل حاصل کر کے مغربی قومیں محض اپنی فنی جانکاری ــــ علم اسماء اور علم تسخیر میں مہارت ــــ کی بدولت اس سستے تیل سے مختلف کیمیاوی مصنوعات تیار کرتی اور خوب نفع کماتی ہیں۔

[۱۱۷] اور دوسری حیثیت سے فوجی و عسکری میدان میں بھی اسی نسبت سے ترقی ہو رہی ہے اور سخت مقابلہ چل رہا ہے۔

وابستہ ہو گئی ہے۔ اور جو قوم "بے صنعت" ہے وہ گویا کہ فقیر اور کنگال ہے، جو دنیا کے اسٹیج پر زیادہ دنوں تک ٹھہر نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ سرزمین "زور آوروں" کا مسکن و ماوٰی ہے۔ یہاں جو کمزوری دکھائے گا وہ قانونِ قدرت کے مطابق پیس کر رکھ دیا جائے گا۔ جیسا کہ فلسفۂ تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔

خلاّق فطرت نے یومِ ازل ہی میں تمام مظاہرِ فطرت کے چند قوانین و ضوابط مقرر کیے پھر ان مظاہر کا علم انسان کو عطا فرمایا کہ وہ ان مادی قوانین و ضوابط سے آگاہی حاصل کر کے موجودات عالم سے فائدہ اٹھائے۔ جس کے باعث "نئی نئی نعمتیں" ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ جن کا تذکرہ "وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً" (اور اُس نے تم پر اپنی کھلی و پوشیدہ تمام نعمتیں پوری کر دیں) نیز "وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" (اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہو تو نہ کر سکو گے) میں کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو قوم یا مِلّت ان علوم سے واقف ہو گی اور منشائے خداوندی کے مطابق موجودات عالم کی تسخیر کرے گی وہی خلافت ارض کی اصل مستحق بنے گی حصول خلافت کے لئے تسخیر موجودات ضروری ہے۔ اور تسخیر موجودات کی کنجی علم اسماء ہے۔ لہٰذا علم اسماء (سائنس) خلافت ارض کا پہلا باب اور اس کا اولین زینہ ہے۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جو قوم اس باب میں پیچھے رہ جائے وہ "منصبِ امامت" سے بطور سزا معزول کر دی جاتی ہے۔ یعنی دوسروں کی غلام اور حاشیہ بردار بنا دی جاتی ہے۔ کیونکہ قانونِ فطرت اور قانونِ خداوندی کے مطابق اس دنیا میں کاہلوں کا کوئی کام نہیں رہتا۔

ہر دور کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ زندہ قوموں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال لیں ورنہ وہ گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دی جائیں گی۔ یا ان کو تاریخ کے "عجائب خانوں" کے

حوالے کر دیا جائے گا۔ گویا کہ وہ مردہ قومیں ہیں اور اُن کا مقام دنیا کے اسٹیج کے بجائے میوزیم ہی زیادہ مناسب ہو سکتا ہے۔

بیسویں صدی میں استعماریت کی نئی شکل

آج غیر قوموں پر سیاسی غلبے یا استعماریت و نوآبادیت (colonialism) کا دور نہیں رہا۔ بلکہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپین قوموں نے برق و بھاپ کو مسخر کر کے اور اپنی طاقت و اقتدار کے بل بوتے پر جن جن ایشائی اور افریقی ممالک پر قبضہ کر لیا تھا، وہ بیسویں صدی میں خود انہی قوموں کے وضع کردہ فلسفۂ قومیت و وطنیت (nationalism) کے منطقی نتیجے کے طور پر، ایک ایک کر کے سب کے سب آزاد ہوتے چلے گئے۔ اور ان مفتوح و مغلوب قوموں کے جذبۂ آزادی کو دبانے اور کچلنے کے لئے ان کی قوت و طاقت اور شان و شوکت کچھ بھی کام نہ آسکی۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ وہ قومیں جو اقوام مغرب کے غلبے و تسلّط سے سیاسی طور پر آزاد ہو گئیں؛ ذہنی، تہذیبی، اور تمدّنی اعتبار سے ان اقوام کے تسلّط سے آزاد نہ ہو سکیں۔ کیونکہ تعلیم اور علوم و فنون نیز صنعت و ٹکنالوجی کے باب میں یہ قومیں بدستور پس ماندہ اور مغرب سے کوسوں دور رہیں۔ نتیجہ یہ کہ سیاسی آزادی کے باوجود گویا کہ اپنی تمدنی اور فوجی ضروریات کے باب میں عملاً انہی کی دست نگر اور انہی کی غلام بنی ہوئی ہیں۔ اور یہ تمدّنی غلامی اُس وقت تک برقرار رہے گی جب تک کہ یہ قومیں علوم و فنون میں کمال حاصل کر کے صنعت اور ٹکنالوجی میں ترقی نہیں کر لیتیں اور ہر حیثیت سے اپنے آپ کو خود کفیل نہیں بنا لیتیں۔

ایک حیثیت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تہذیبی و تمدنی غلامی در اصل سیاسی غلامی سے بھی بدتر ہے، بلکہ وہ نوآزاد ملکوں کے سیاسی عدم استحکام اور اندرونی خلفشار کی ایک علامت بنا ہوا ہے۔ کیونکہ غالب اور ترقی یافتہ

قومیں اس قوت کو ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ اور اس حربے کی وجہ سے بڑی طاقتوں کو ان غیر ترقی یافتہ اور پس ماندہ ملکوں کے اندرونی معاملات میں دخیل بننے اور اپنی من مانی شرائط کے منوالنے کا بھی موقع مل جاتا ہے۔ اس طرح گویا کہ نوآزاد ملکوں کی سیاسی آزادی بڑی طاقتوں یا طاقتور قوموں کے پاس رہن رہتی ہے اور وہ وقت آنے پر جو چاہتی ہیں کر گزرتی ہیں۔ بلکہ اب تو کچھ ایسے تماشے ظاہر ہونے لگے ہیں کہ آزاد ممالک کی بھی خیر نظر نہیں آرہی ہے اور کھلم کھلا جارحانہ کارروائیاں شروع ہو چکی ہیں۔ جن میں سے ایک واضح مثال ماضی قریب میں فلسطین مرحوم کی تھی اور ایک تازہ مثال افغانستان کی ہے، جو اپنی آزمائش کے بدترین دور سے گزر رہا ہے۔

اسی طرح بڑی طاقتوں کی حریصانہ اور للچائی ہوئی نظریں آج مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک اور خصوصاً خلیجی ملکوں پر لگی ہوئی ہیں اور وہ ان کے معاملات میں دخیل بن کر ان پر قبضہ کر لینے کیلئے مختلف حیلوں اور بہانوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کیونکہ ان ممالک سے حاصل ہونے والی خام پیداوار (پیٹرول) کی حیثیت اپنی صنعتی، تمدنی اور عسکری اہمیت کے لحاظ سے دنیا کی شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان حالات میں قصہ آدم اور اس کا فلسفہ ہم کو جھنجوڑ رہا ہے اور یہ سبق دے رہا ہے کہ ہم جتنی جلد ہو سکے مغرب کی ــــ یا زیادہ صحیح معنوں میں ترقی یافتہ قوموں کی ــــ اس بدترین غلامی اور اُن کے طلسمی جال سے باہر نکلیں اور اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونا سیکھیں۔ مادی اعتبار سے قوت و طاقت حاصل کئے بغیر ہم سیاسی استحکام کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اور مادی قوت

وطاقت کا راز علوم و فنون اور سائنس و صنعت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے، ذہنی و فکری قوتوں کو بیدار کرنے اور انہیں پروان چڑھانے میں پوشیدہ ہے۔ لہذا ملت اسلامیہ کو خود کفیل بنانے کی خاطر پوری سنجیدگی کے ساتھ اس معاملہ میں غور کرنا اور عملی طریقے اختیار کرنا چاہیئے، تاکہ پندرھویں صدی اسلام کی صدی بن سکے اور دین اسلام کا بول بالا ہو۔

تیسرا باب

خلافتِ ارض کے لئے

علم کیمیا اور طبیعیات کی اہمیّت

- علم کیمیا اور طبیعیات کی اہمیت
- قوانین فطرت اور خدائی منصوبہ
- ایٹم اور قرآن
- قرآن اور بعض طبیعیاتی مظاہر
- خدائی نعمتوں کا فلسفہ
- علم کیمیا اور طبیعیات کی تفصیلات
- ایٹم کا حیرت انگیز نظام
- مرکبات کے جلوے
- کیمیا کے کرشمے
- جوہری توانائی اور آئسوٹوپ کی کرشمہ سازیاں
- یہ نعمتیں کس کے لئے ہیں ؟
- ایک لمحۂ فکریہ

تیسرا باب

خلافت ارض کے لئے

علمِ کیمیا اور طبیعیات کی اہمیّت

پچھلے صفحات میں علم تسخیر اور خداوند کریم کی نعمتوں سے استفادہ کرنے کے سلسلے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ بہت مختصر ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ علم تسخیر (تسخیر اشیاء) کی صحیح اہمیت کو سمجھنے کے لئے اس سلسلے میں کچھ مزید تفصیل بیان کی جائے اور موجودہ سائنسی و صنعتی علوم سے اس کے گہرے ربط و تعلق کا حال پوری طرح آشکارا کر دیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ تمام تفصیلات روح قرآن سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہوں تاکہ ہماری قوم و ملت کے فکر و نظر میں بنیادی تبدیلی آئے اور اس کے ذہنی و نفسیاتی احوال و کوائف بدل سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک واضح طرزِ فکر اور صحیح آئیڈیالوجی کے بغیر کوئی انقلابی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اسی وجہ سے اس موقع پر جدید سائنسی علوم کا کچھ تعارف کرا دینا بھی ضروری معلوم ہوا تاکہ ان علوم کا ایک بنیادی خاکہ اور ان کی اہمیت و افادیت کا ایک جامع تصور سامنے آجائے جو ہمیں صحیح فیصلہ کرنے اور صحیح سمتوں میں قدم بڑھانے میں مدد دے سکتا ہے۔

علمِ کیمیا اور طبیعیات کی اہمیّت

اصل بحث شروع کرنے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ میں نے اس موقع پر سائنسی علوم میں صرف علم کیمیا اور طبیعیات کو منتخب کیا ہے۔

علم کیمیا اور طبیعیات کی اہمیت

کیونکہ یہی وہ دو بنیادی علوم ہیں جن پر دیگر تمام سائنسی و صنعتی علوم (ٹکنالوجی) کا مدار ہے۔ یعنی "علم تسخیر" یا "تسخیر اشیار" کے لئے جب تک ان دو علوم سے مدد نہ لی جائے کوئی بھی چیز معرض وجود میں نہیں آسکتی، اور کسی بھی "مظہر قدرت" پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ آج دنیا میں مختلف قسم کی ہزاروں لاکھوں صنعتیں (industries) کام کر رہی ہیں۔ مگر کسی بھی صنعت کو وجود میں لانے اور اس کو چلانے کے لئے عملاً ان دو بنیادی علوم سے صرف نظر ممکن نہیں۔

لہذا ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی کھوئی ہوئی شان و شوکت کے حصول اور خلافت ارضی کی تکمیل (اسلام کی نشأۃ ثانیہ) کے لئے ان علوم کی اہمیت وافادیت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ پھر ہر ممکن طریقے سے امت مسلمہ کو ان علوم سے بہرہ ور کرکے خلافت ارضی کے میدان میں آگے بڑھانے کی تدبیریں سوچی جائیں۔ چونکہ عام طور پر ان علوم کے افادی پہلو نظروں سے اوجھل ہیں اور عوام تو عوام اکثر خواص تک کو بھی نہیں معلوم کہ ان علوم کا تعلق قرآن اور خلافت ارضی سے کیا ہے؟ اس لئے کچھ فنی تفصیلات بھی ضروری معلوم ہوئیں۔

غرض علم تسخیر کا تعلق اگرچہ تمام سائنسی اور صنعتی علوم سے بہت گہرا ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ طبیعیات اور کیمیا کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہے۔ ان علوم کی اہمیت ضمناً قرآن حکیم سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ یعنی کائنات کے جو ہمہ گیر اصول وضوابط قرآن حکیم میں بیان کئے گئے ہیں ان کی تنقیح کے ضمن میں اس قسم کے حقائق بھی ثابت ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کا بنیادی مقصد اگرچہ فکری و نظریاتی حیثیت سے انسان کے غلط افکار اور اس کے غلط معتقدات کی تنقیح اور اس کی بدعملی کی اصلاح ہے، مگر قرآن حکیم کی عظیم خصوصیت (تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ)[1] کے مطابق اس میں ایسے

---

[1] ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والا۔

ایسے ضمنی حقائق ملتے ہیں جو کسی بھی غلط رویہ اور غلط روش کی اصلاح کے لئے کافی وشافی ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم اس حیثیت سے بھی ہمارے لئے ایک رہنما اور رہبر ہے۔

اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ (تو کیا میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کو حکم مان لوں، حالانکہ اسی نے اس کتاب کو تمہارے پاس تفصیل کے ساتھ بھیج دیا ہے۔ (انعام : ۱۱۴)

لہٰذا ان علوم کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے اس سلسلہ میں اصولی اعتبار سے خود قرآنِ حکیم کے چند اشارات اور بنیادی حقائق کی توضیح کی جاتی ہے۔

قوانین فطرت اور خدائی منصوبہ

قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ـــ اور سائنسی تحقیقات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ـــ کہ یہ عالم رنگ و بو اور یہ سارا سلسلۂ وجود مختلف اسباب و علل کے روپ میں رواں دواں ہے۔ نظام فطرت کے یہ اسباب و علل اور یہ خواص و تاثیرات اس بات کی علامت ہیں کہ یہ کائنات اور اس کے آثار و مظاہر دفعتاً نمودار نہیں ہو گئے بلکہ طبیعی و فطری اور تدریجی مراحل طے کر کے موجودہ حالت تک پہونچے ہیں۔ اگر خداوند عالم چاہتا تو آن کی آن میں اور دفعتاً عالم سماوات، عالم جمادات اور عالم نباتات و حیوانات کے سارے مظاہر لباس وجود میں جلوہ گر ہو سکتے تھے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہو سکا بلکہ اس نے ان تمام آثار و مظاہر کے لئے کچھ مادی قوانین و ضوابط مقرر کر دیئے جو ان مظاہر کے طبیعی و نوعی ضوابط کہلاتے ہیں۔ مثلاً زمین اور تمام اجرام سماوی اپنی موجودہ شکل اختیار کرنے سے پہلے ابتداءً گیس کی شکل میں تھے۔ جس کی تعبیر قرآن حکیم میں "دخان" (دھواں) کے لفظ سے کی گئی ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ

ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ۝ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا ۚ وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝

پھر وہ متوجہ ہوا آسمان کی طرف جو اس وقت دھوئیں (کی شکل میں) تھا۔ پس اس نے اس سے اور زمین سے کہا کہ تم دونوں آجاؤ، خواہ خوشی سے ہو یا ناخوشی سے۔ دونوں نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ پس اس طرح اس نے دو دنوں میں سات آسمان بنا دیئے۔ اور ہر آسمان میں (اس کے فطری احوال کے مطابق) اس کا معاملہ پہنچا دیا۔ اور ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں (ستاروں) سے آراستہ کیا اور (اس کی) حفاظت کی۔ یہ ہے منصوبہ ایک زبردست اور ہمہ دان ہستی کا۔ (حم سجدہ: ۱۱-۱۲)

ان آیات کریمہ کا مطلب سمجھنے سے پہلے یہ اولین حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ قرآن حکیم کے یہ اور اس قسم کے دیگر تمام بیانات اس دور میں نازل ہوئے ہیں جب کہ سائنٹفک نقطۂ نظر سے ان چیزوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی اور اس دور کے لوگ اس قسم کے حقائق اور تفصیلات کو سمجھنے کے متحمل نہیں تھے۔ لہذا خدائی اسکیم کے مطابق اس قسم کی چیزوں کو اشاروں کنایوں کی زبان میں اور زیادہ تر تشبیہات و استعارات کے روپ میں بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال ان آیات میں جو اشارے کنائے موجود ہیں ان کی قدر و قیمت موجودہ دور کے لحاظ سے بہت اہم اور فکر انگیز ہے۔ اور جدید سے جدید تر تمام تحقیقات ان اشاروں کنایوں کی اہمیت و افادیت کو مزید اُجاگر کرتے جا رہے ہیں، اور دن بدن ان کی تصدیق و تائید ہوتی جا رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کو ۔۔۔ اپنی زبردست قدرت اور زبردست علم کے باوجود ۔۔۔ اسباب و علل کے روپ میں ظاہر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اگر وہ چاہتا تو زمین اور ساتوں آسمانوں کو آن کی آن میں جلوہ گر کر سکتا

تھا۔ مگر ایسا کرنے کے بجائے اس نے چند طبیعی قوانین و ضوابط مقرر کئے۔ (جن کا بیان دیگر آیات میں موجود ہے) پھر ان طبیعی قوانین کے تحت ارض و سماوات دونوں (یا دو ہزار سالوں میں[۵۲]) بتدریج دھوئیں یا گیس (دُخان) کی حالت سے نکل کر ٹھوس حالت میں پہونچے۔

زمین و آسمان سے "خوشی یا ناخوشی چلے آؤ" کہنا بطور تمثیل ہے۔ "ہم خوشی خوشی چلے آتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ ہم تیرے منصوبے کے مطابق تیرے مقرر کردہ قوانین و ضوابط کو قبول کر کے اپنی موجودہ ہیئت یا شکل و صورت کو تبدیل کرنا اور دیگر انواع و اقسام کے مرکبات کیمیاوی chemicai compounds کا روپ دھارنا نیز قسم ہا قسم کے انواع حیات کا قالب اختیار کرنا پسند کرتے ہیں۔ تیرے احکام سے سرتابی کی ہم میں مجال نہیں ہے۔ یہ گویا کہ مادہ (matter) کی اطاعت الٰہی کا اعلان کلّی تھا جو آج تک انہی طبیعی قوانین و ضوابط کی شکل میں جاری و ساری ہے[۵۳]۔

---

۵۲ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق کہ اس کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے (وَ اِنَّ یومًا عِندَ رَبِّكَ كَاَلفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ : حج ۴۷) اس سے دراصل ایک لمبی مدت کا اظہار مقصود ہے، متعین ایک ہزار سال ہی مقصود نہیں ہے۔ اس سے موجودہ علم کائنات (cosmology) کے نظریات کے درمیان تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم بمرادہ۔

۵۳ مادے کے اندر جاری و ساری الٰہی قوانین و ضوابط (طبیعی و کیمیاوی) کو جانتے اور ان پر عمل پیرائی کے باعث مادی مظاہر و ظواہر کی "تسخیر" عمل میں آتی ہے، جن سے واقفیت حاصل کر کے موجودہ دور کا انسان فائدہ اٹھا رہا ہے۔ خلیفہ بن کر مظاہر عالم سے مستفید ہونے کے لئے ان رازوں کا جاننا ضروری ہے جن کو خالق ارض و سما نے ان کے سینے میں ودیعت کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ بصورت دیگر "کن ھا" (زبردستی یا ناخوشی) کا کوڑا حرکت میں آتا اور آن کی آن میں — بغیر طبیعی قوانین و ضوابط اور بغیر اسباب و علل کے — تمام زمین و آسمان، چاند و سورج، ستارے، جمادات، نباتات اور حیوانات، سب کے سب (ایک معجزہ کی طرح) ظاہر ہو جاتے[1] - اور دو ہزار سالوں کی لمبی مدت کی ضرورت نہ پڑتی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالٰے نے اپنی بے مثال حکمت و منصوبہ بندی کے تحت یہاں پر ایک مضبوط سلسلۂ علل و اسباب قائم کر دیا ہے، جس میں کہیں بھی کوئی رخنہ یا شگاف نظر نہیں آتا۔

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ نظر پھیر کر دیکھو کہیں کوئی رخنہ بھی نظر آتا ہے؟ (ملک ۳)

اسی طرح زمین اور اجرام سماوی کی تخلیق کے بعد زمین میں سامانِ معیشت (مختلف نباتات و حیوانات کی شکل میں) بتدریج چار دنوں (یا چار ہزار سال) میں ظہور میں لایا گیا۔

وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ اور اس نے زمین میں برکت رکھی اور سب سامانِ معیشت طلبگاروں کے لئے اعتدال کے ساتھ چار دن میں مقرر کر دیے۔ (حٰم سجدہ ۱۰)

اس طرح چھ دنوں (یعنی چھ مدارج) میں عالم افلاک، عالم جمادات، عالم نباتات اور عالم حیوانات کے تمام مظاہر و ظواہر محض ایک دخانی مادہ (گیس یا دھویں) سے نکال کھڑا کر دیا جو اس کی ربوبیت کا زبردست اور حیران کن کارنامہ ہے۔ اور اس کی اصل کنہ د

---

[1] اگرچہ یہ فطری اسباب و علل بھی غور کرنے والوں کے لئے ایک معجزے سے کسی بھی کم نہیں ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو انہیں "معجزات ربوبیت" کہہ سکتے ہیں۔

حقیقت کا ادراک انسان کسی بھی حال میں نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسان اشیاء کی اصل حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا۔ بلکہ اس کا علم ہمیشہ ظاہری اسباب و علل ہی تک محدود رہتا ہے۔

غرض ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی تجویز اور منصوبہ بندی کا تذکرہ بھی موجود ہے کہ یہ ساری کارروائی ایک مقررہ ضابطہ اور الٰہی فیصلہ کے تحت عمل میں آئی ہے۔ جس کی تعبیر لفظ "تقدیر" سے کی گئی ہے۔ تقدیر کے معنی اندازہ یا تجویز کرنے کے ہیں یعنی کسی کام کا مفصل ضابطہ یا منصوبہ بنانا۔

امام راغب اصفہانی (المتوفی ۵۰۲ھ) لکھتے ہیں۔

"قدر اور تقدیر کے معنی کسی چیز کی مقدار کو ظاہر کرنے کے ہیں۔ اور تقدیر کا ایک مطلب طاقت اور قدرت عطا کرنا بھی ہے۔ اس لحاظ سے اشیائے عالم سے متعلق تقدیر الٰہی کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) (انہی کام کرنے کی) قدرت و طاقت عطا کرنا۔ (۲) ان کو حکمت کے تقاضے کے مطابق ایک مخصوص مقدار اور مخصوص شکل عطا کرنا ــــــ اس لئے کہ فعل الٰہی کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اول یہ کہ کسی چیز کو بالفعل وجود میں لانا۔ یعنی ابتدا ہی میں اس کو کامل وجود اس طرح بخشنا کہ جب تک مشیت الٰہی اس کے فنا یا تبدیل کی نہ ہو اس میں کسی قسم کی کمی نہ ہو سکے۔ جیسے سماوات اور ان میں موجود شدہ چیزیں (کہ ان کے نظاموں میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں روز اول میں جس طرح پیدا کر دیا تھا اسی کے مطابق وہ جاری و ساری رہیں گے)۔

(۲) دوم یہ کہ کسی چیز کے اصول کو بالفعل اور اس کے اجزاء کو بالقوہ وجود بخشنا۔ اور اس کے لئے ایسا ضابطہ بنا دینا کہ وہ اس کے خلاف جا نہ سکے۔ جیسے کھجور کی گٹھلی کے متعلق تقدیر الٰہی کہ اس سے کھجور کا درخت ہی اُگے نہ کہ سیب یا زیتون کا۔ اور انسان کی منی کی تقدیر یہ بنائی کہ اس سے انسان

ہی پیدا ہو نہ کہ اور قسم کے جانور[۵۵]

اس اصول کی وضاحت علامہ سید سلیمان ندوی نے بہت خوبی کے ساتھ کی ہے:

"غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے۔ اور اس کے خالق نے اس کے روز پیدائش سے اس کو جو حکم دے دیا ہے، اس کی تعمیل سے وہ سرمو انحراف نہیں کرتا۔ آسمان سے لیکر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے۔ آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے، اور وہ ہر آن و ہر لمحہ اس میں مصروف ہے۔ زمین کو سرسبزی و شادابی کا کام سپرد ہے۔ اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے۔ ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے، اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے۔ درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں وہ بخوشی ان کو کر رہے ہیں[۵۶]"۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ نے ہر چیز کا ایک متعین ضابطہ اور ایک متعین قانون طبیعی law of nature بنا دیا ہے، جس کی خلاف ورزی دنیا کی کوئی نوع اور کوئی مادی شے نہیں کر سکتی۔ اس قانون الٰہی کی تفصیل دیگر مقامات میں اس طرح کی گئی ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۝ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ایک ضابطہ بنایا (فرقان ۲)

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ اللہ نے ہر چیز کا ایک

---

۵۵ المفردات فی غریب القرآن، ص ۳۹۵، دار المعرفۃ، بیروت۔

۵۶ سیرۃ النبی ۴/۲۰، دار المصنفین اعظم گڈھ،

اندازہ (پہلے ہی سے) بنا دیا ہے (طلاق ۳)

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ٥ بلاشبہ ہم نے ہر چیز ایک متعین اندازہ سے پیدا کی ہے (قمر ۴۹)

وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ٥ اور اس کے پاس ہر چیز ایک متعین مقدار کے ساتھ ہے۔ (رعد ۸)

یہ قرآن حکیم کے چند وسیع اور ہمہ گیر کلیات ہیں جن کا اطلاق عالم افلاک، عالم جمادات، عالم نباتات اور عالم حیوانات کی ہر چیز اور ہر مظہر قدرت پر ہو سکتا ہے۔ ان میں مادہ کے تمام قوانین: طبیعی (physical) نوعی، عضویاتی (morphological) فعلیاتی، (physiological) تشریحی (anatomical) طبی (medicinal) ادویاتی (pharmacutical) اور کیمیاوی (chemical) اور مادہ میں جاری ہر قسم کی توانائیاں: بھاپ، برق، آواز، روشنی اور مقناطیس سب کچھ داخل ہیں، جن کا مطالعہ آج سائنسی علوم کے تحت کیا جا رہا ہے۔ چونکہ یہ کلیات مطلقاً مذکور ہیں اور ان میں کسی قسم کی تقیید نہیں ہے، اس لئے اشیائے کائنات کی جتنی بھی حیثیتیں اور جتنی بھی خصوصیات ہو سکتی ہیں، سب کی سب مراد ہو سکتی ہیں۔ مادہ اور توانائی کی ان خصوصیات کو ہم قرآنی اصلاح کے مطابق "علم المقادیر" یا "مقداروں کا علم" کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ ایک بہت جامع اور وسیع اصطلاح ہوگی۔

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ سائنس کسی چیز کو پیدا یا کسی قانون کو وضع نہیں کرتی بلکہ قدرت کے انہی مخفی قوانین کا پتہ چلاتی ہے اور اسرار ربوبیت کو وا کرتی ہے۔ کسی بھی سائنسی علم و فن میں جو مسائل و مباحث زیر بحث آتے ہیں وہ یہی "قوانین قدرت" یا "قوانین ربوبیت"

ہوتے ہیں۔

ایٹم اور قرآن

قرآن حکیم خود ربانی انکشاف کے مطابق کائنات کے تمام رازوں کا امین ہے:

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

کہدو کہ اس (کتاب) کو اس نے اتارا ہے جو زمین اور آسمانوں کے (تمام) بھیدوں کا جاننے والا ہے (فرقان ۶)

مگر اس کی ایک خاص زبان اور خاص اسلوب ہے جو انسانی زبانوں سے میل نہیں کھاتا۔ اس کا بنیادی مقصد جیسا کہ عرض کیا جا چکا نوع انسانی کے غلط علمی تصورات کی اصلاح ہے۔ اور یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہ کائنات بغیر ایک خدائی اسکیم و منصوبہ بندی کے یونہی بلا مقصد آپ سے آپ وجود میں نہیں آگئی ہے بلکہ اس کائنات کا ایک ایک ذرہ حتیٰ کہ اس کا ایک ایک ایٹم اور ایک ایک سالمہ (molecule) تک ایک متعین قانون اور ایک مقررہ ضابطے کے تحت بغیر کسی انتشار و بدنظمی کے ایک خالق و ناظم اور برتر ہستی کی نگرانی میں رواں دواں ہے۔ ورنہ اس قدر تحیر خیز نظم وضبط اور ڈسپلن کی کوئی دوسری توجیہ ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔

وہ ذات برتر اتنی زبردست اور ہمہ داں ہے کہ بڑے بڑے اجرام سماوی سے لے کر ایک معمول اور ننھے سے ایٹم بلکہ اس کے اندرونی اجزا (الکٹران، پروٹان اور نیوٹران وغیرہ جو انسانی آنکھ کو طاقتور خوردبینوں سے بھی نظر نہیں آتے) تک اس کی نظروں سے غائب نہیں ہو سکتے اور کوئی بھی ذرہ اس کے علم سے باہر نہیں ہو سکتا۔

عٰلِمِ الْغَیْبِ ج لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ

لَا فِی الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۙ

(وہ) ہر پوشیدہ چیز سے واقف ہے۔ اس کے علم سے کوئی رتی سی چیز بھی — خواہ وہ آسمانوں میں ہو یا زمین میں — غائب نہیں ہے۔ اور (اس مقدار مذکور سے) کوئی چھوٹی یا بڑی چیز بھی (غائب نہیں ہے، بلکہ ان تمام اجزا کا حساب علم الٰہی کی) کھلی کتاب میں موجود ہے (سبا ۳)

قرآن حکیم کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ اس آیت کریمہ میں تین قسم کے ذرات کا بیان ہوا ہے۔ ایک "مثقال ذرۃ" دوسرا نسبتاً اس سے چھوٹا اور تیسرا نسبتاً اس سے بڑا۔ اور بنیادی طور پر کائنات میں تین ہی قسم کے ذرات پائے جاتے ہیں۔ ایک ایٹم، دوسرا ایٹم کے اندرونی اجزا اور تیسرے ایٹم کے مرکبات (compônds)۔ یہ ایک فلسفیانہ قسم کی تقسیم معلوم ہوتی ہے۔

ان تین قسم کے ذرات و مرکبات میں سے ایک قسم وہ ہے جو ان دونوں کی درمیانی ہونے کے اعتبار سے معیاری اور بطور مثال ہے اور بقیہ دو قسمیں اس معیاری قسم سے محض نسبتی و اضافی تناسب رکھتی ہیں۔ اور یہ معیاری ذرہ یا جزء وہ ہے ایٹم (جوہر) جس سے کائنات کی تمام چیزیں مرکب ہیں۔ ان کی مختصر تشریح حسب ذیل ہے:

مثقال ذرۃ: یہ اس آیۃ کریمہ میں سب سے زیادہ اہم الفاظ ہیں۔ لغوی اعتبار سے اس کا مفہوم ہوگا ہر وہ رتی سی چیز جس میں وزن پایا جاتا ہو۔ عام محاورے کے مطابق اس کا مطلب "ذرہ برابر" سی چیز سمجھی جاتی ہے۔ مگر یہاں پر اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ وہ چیز کتنی رتی یا کتنی مقدار کی ہونی چاہیے؟ لہذا ہر اس رتی سی چیز پر "مثقال ذرۃ" کا اطلاق ہو سکتا ہے جو مادہ کا حقیر ترین جزء ہو اور اس میں وزن بھی پایا جاتا ہو۔ اگرچہ وہ حقیر ترین سہی۔ واضح رہے کہ مادہ (matter) کی بنیادی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ چیز جس میں وزن اور مقدار پائے جائیں، ایٹم چونکہ مادہ کی اکائی ہے

اس لئے یہ دونوں خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں۔[۵]

---

[۵] جدید سائنس کی یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت ہے کہ وہ کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کے کروڑوں اربوں گنا حصہ تک کو صحت اور درستی کے ساتھ ناپ سکتی اور تول سکتی ہے۔ چنانچہ ایٹم کا وزن بھی معلوم کر لیا گیا ہے۔ ہائیڈروجن کے ایک ایٹم کا وزن ایک گرام کا ۱۶۶۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ واں حصہ ہوتا ہے۔ جس کو مختصر طور پر اس طرح لکھا جاتا ہے: 1.66×10^{-24} ملاحظہ ہو کتاب:

The Chemistry of Life. by Steven Rose, p. 25, Penguin Books, England, 1977.

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے ایک گرام وزن مقدار مادہ (MASS) میں 10^{24} ایٹموں کی تعداد ہوتی ہے یعنی عدد ایک کے بعد ۲۴ صفر لگا دینے سے جو عدد بنتا ہے وہ ایٹموں کی تعداد کو ظاہر کرتا ہے ملاحظہ ہو کتاب:

The Key to the Universe (A Report on the New Physics), by Nigel Caldar, p. 17, B.B.C. London

نیز ملاحظہ ہو:

The Encyclopedia of Ignorance, Edited by Ronald Duncan, p. 38, Oxford, 1978.

اسی طرح ایک ہائیڈروجن ایٹم کی موٹائی یا اس کا قطر ایک سنٹی میٹر کے دس کروڑویں حصے (1×10^{-8}) کے برابر ہوتا ہے۔ (کیمسٹری آف لائف، ص ۲۵، حوالۂ مذکور)

یہ تو ہائیڈروجن جیسے سادہ ترین ایٹم کی مقدار مادہ کا بیان ہوا، جو بنیادی طور پر ایک الکٹران اور ایک پروٹان کا مجموعہ ہوتا ہے۔ (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

وَلَآ اَصْغَرَ : اس سے چھوٹا۔ یعنی ایٹم سے چھوٹا۔ لفظ "اصغر" اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ جو یہاں ایٹم سے اس کی نسبت ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس موقع پر معنوی اعتبار سے اس لفظ کی وسعت میں وہ تمام ذرات داخل ہو سکتے ہیں جو ایٹم سے نسبتاً چھوٹے ہوں، خواہ وہ الکٹران، پروٹان اور نیوٹران ہوں یا ڈیوٹران (deuteron) یا زیٹران (positron) میسان (meson) اور فوٹان (photon) وغیرہ۔ نیز آئندہ زمانہ مستقبل میں جتنے بھی نئے نئے ذرات منکشف ہوتے جائیں گے (ایٹم سے چھوٹے) وہ سب کے سب اس دائرے میں آجائیں گے۔ نیز اس میں کائناتی شعاعیں (cosmic rays) وغیرہ بھی شامل ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح الفا شعاعیں، بیٹا شعاعیں اور گاما شعاعیں بھی جو ایٹموں کے مرکزوں سے خارج ہوتی ہیں۔

وَلَآ اَكْبَرَ : اس سے بڑا۔ یعنی ایٹم سے بڑا۔ یہ بھی اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ اور اس کی معنوی وسعت میں ایٹم سے بڑے ذرات و مرکبات

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ) اور ایٹم کے اصل وزن میں پروٹان ہی کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جبکہ الکٹران کا وزن یا اس کی مقدار مادہ پروٹان کے مقابلے میں ۱۸۳۶ واں حصہ ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

Asimov's Guide to Science, Vol. 1. p. 295,

Pelican Books. London, 1979.

مگر "انسائیکلو پیڈیا آف اگنورنس" یا "قاموس نامعلومات" (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) میں پروٹان کے ساتھ الکٹران کا تناسب بجائے ۱۸۳۶ کے ۱۸۴۰ دکھایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۲۵ (یہ ایک خفیف سا فرق ہے)۔

خواہ وہ سالمات (molecules) کی شکل میں ہوں یا شہاب ثاقب وغیرہ ذرات اور بڑے بڑے اجزا کی شکل میں، سب کے سب داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ قرآن حکیم کی بلاغت اور اس کا کمال اعجاز ہے کہ قیامت تک دریافت ہونے والے ہر قسم کے ذرات اور اجزا۔۔ خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے اور کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں ۔۔ اس دو حرفی کوزے " وَلَآ اَصۡغَرَ مِنۡ ذٰلِكَ وَ اَكۡبَرَ " میں سما جائیں گے۔ بلکہ " هَلۡ مِنۡ مَّزِيۡدٍ " کی صدائیں بھی بلند کرتے رہیں گے۔

نیز یہاں پر سماوات کے تذکرے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اجرام سماوی میں بھی اسی قسم کا جوہری (atomic) اور عنصری نظام قائم ہے۔ ان حقائق کے اظہار و انکشاف سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ کائنات کا کوئی بھی بھید اور صحیفۂ فطرت کا کوئی بھی راز سربستہ خالق کائنات کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔ بلکہ اس کے علم ازلی کی رو سے ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز حتیٰ کہ ایٹم اور اس کے ذرات تک کا اس کو علم ہے اور ایک ایک ذرہ کی تفصیل "کتاب مبین" میں مذکور ہے۔ اس سے اس کی زبردست حساب دانی اور زبردست علم کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ایٹم اتنی چھوٹی سی چیز ہے کہ صرف ایک قطرۂ آب میں موجود شدہ ایٹموں کی تعداد کو پوری دنیا کے تمام انسان عمر بھر گن نہیں سکتے۔[۵۵] اس سے آپ پوری دنیا اور کل کائنات میں موجود شدہ ایٹموں کی تعداد کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

ایٹم کا مطالعہ ایک وسیع علم (اٹمک فزکس) کے تحت کیا جاتا ہے اس کے اسرار و عجائب کی انتہا نہیں ہے، مگر یہ محض نظری علم نہیں بلکہ عملی اہمیت کا علم ہے۔ ایٹم کا خالق اور اس کے ضابطوں کو بنانے والا بھی خالق

---

۵۵ تا ۔۔

۵۵ پانی کے ایک قطرے میں تقریبا ۱۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ x ۳۳ ایٹم ہوتے ہیں۔

خالق ارض وسما ہی ہے (وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا)۔ ایٹم کا اندرونی نظام نہایت درجہ محکم اور محیر العقول ہے۔ جو صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ[۹] کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ نیز "كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ[۱۰]" کا صحیح نظارہ ہمیں عناصر (elements) اور سالمات (molecules) کی دنیا میں نظر آتا ہے۔ عناصر کے مفرد خواص اور ان کی باہمی ترکیب کیمیاوی سے وجود میں آنے والے نئے نئے خصائص کے مطالعے سے عقل انسانی بالکل چکرا جاتی ہے اور رب العالمین کی قدرت و ربوبیت کا اقرار کئے بغیر چارہ کار نہیں رہتا، سوائے ان لوگوں کے جن کی عقل پر یا تو پردہ پڑ چکا ہو یا جن کی آنکھیں بے نور ہو گئی ہوں۔

مختلف اشیاء میں موجود شدہ عناصر اور سالمات کے اس تفصیلی مطالعہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے اس کو ہم قرآنی اصطلاح میں "علم المقادیر" کہہ سکتے ہیں۔ یعنی "مقداروں کا علم"۔ مثلاً فلاں چیز میں کیمیاوی عناصر کس کس مقدار میں اور کس کس تناسب کے ساتھ ہیں۔ یہ علم فکری و عملی دونوں حیثیتوں سے اہم ترین بھی ہے اور مفید ترین بھی۔

قرآن حکیم کی مختلف آیات میں اس عالم آب و خاک میں پائے جانے والے ان اجزا و عناصر کا تذکرہ بطور اشارہ اس طرح کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ اور یقیناً ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا ہے۔ (مؤمنون ۱۲)

اس بلیغ حقیقت کی صداقت جدید ترین تحقیقات کی رو سے اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ موجودہ دریافت شدہ ۱۰۴ عناصر میں سے

---

۹ یہ اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط و مستحکم بنا لیا ہے۔ (نمل ۸۸)

۱۰ ان آیات کا ترجمہ پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے۔

انسان اور دیگر اکثر موجودات عالم کی تخلیق صرف ۱۴ عناصر: ہائیڈروجن، نائٹروجن، کاربن، آکسیجن، کلورین، سوڈیم، میگنیشیم، سلیکون، فاس فورس، پوٹاشیم اور کیلشیم وغیرہ سے ہوئی ہے۔ انسانوں اور دیگر حیوانات کے علاوہ نباتات میں بھی یہی چودہ بنیادی اجزا یا "مٹی کا خلاصہ" (سُلٰلة من طین) پائے جاتے ہیں۔ اصل میں یہ خمیرہ یا پروٹو پلازم (protoplsm) کے بنیادی عناصر ہیں جو دنیا بھر کے تمام حیوانات و نباتات میں مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے حسب ذیل آیت کریمہ حد درجہ بلیغ اور معنی خیز ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ اور اللہ نے تم کو زمین سے نباتات کی طرح اُگایا ہے۔ (نوح ۱۷)

یہ بڑی بلیغ اور حقیقت افروز تشبیہ ہے۔ اس کا مطلب دور قدیم میں جو کچھ بھی سمجھا گیا ہو، ظاہر ہے کہ اس سے مراد انسانوں اور نباتات کے عناصر کے اتحاد کی طرف اشارہ ہے۔ مگر صاحب تفسیر کبیر کی داد دینی پڑے گی کہ انھوں نے صدیوں قبل اس کی حسب ذیل تشریح کر کے اپنی علمی بصیرت اور دور بینی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

وانما یخلقنا من النطف وھی متولدۃ من الاغذیۃ من النبات المتولد من الارض۔ اللہ ہم کو ان نطفوں سے پیدا کرتا ہے جو غذا کی پیداوار ہیں۔ اور غذا نباتات کی پیداوار ہے اور نباتات زمین کی پیداوار ہے[۱۱۸]۔

نباتات کے مختلف اجزا و عناصر سے مرکب ہونے کی طرف اشارہ حسب ذیل آیت کریمہ سے بھی واضح ہوتا ہے۔

---

[۱۱۸] تفسیر کبیر ۸/ ۲۱۷

وَ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ شَیۡءٍ مَّوۡزُوۡنٍ ۝ اور ہم نے زمین میں ہر چیز وزن کی ہوئی اگائی ہے۔ (حجر ۱۹)

یہ عالم نباتات کے لئے ایک بہت بڑا کلیہ اور ہمہ گیر اصول ہے کہ اس کی ہر چیز "موزوں" ہوتی ہے۔ یہ لفظ "وزن" سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں "تولی ہوئی چیز"۔ یہاں پر بلاغت ملاحظہ ہو، یہ نہیں فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نباتات کو تول تول کر پیدا کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ فرمایا جا رہا ہے کہ عالم نباتات سے تعلق رکھنے والی ہر چیز تول تول کر یعنی ایک متعین مقدار اور متعین حساب کے تحت پیدا کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے نہ صرف کسی بھی پیڑ پودے کی ایک ایک پتی، ایک ایک گل بوٹا اور ڈالی ڈالی متعین مقدار اور نپی تلی بطن ارض سے نمودار ہوتی ہے، بلکہ اس کے ثمرات و حاصلات میں کارفرما اُن کے اندرونی غذائی مادے تک مثلاً مواد لحمیہ (protiens) مواد نشائیہ (carbohydrates) مواد شحمیہ (fats) معدنی نمکیات (mineral salts) اور مختلف قسم کے حیاتین (vitamins) وغیرہ تمام اجزاء انسانی و حیوانی جسم کو نشو و نما دینے اور ان کی صحت و تندرستی کو برقرار رکھنے والے ضروری اجزاء و عناصر۔ سب کے سب متعین مقدار اور بالکل نپے تلے انداز میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان غذائی مواد کے جو سالمات اور مرکبات بنتے ہیں کیا مجال ہے کہ ان کے نظام میں کبھی ایک ایٹم یا ایک جوہر کی بھی تبدیلی یا ہیر پھیر کبھی واقع ہو جائے جس چیز کے سالمے[۱۲] میں جتنے عناصر سیکڑوں،

---

۱۲ کسی چیز کا سالمہ (مالیکیول) دو یا دو سے زیادہ عناصر کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔ مثلاً پانی کا ایک سالمہ ہائیڈروجن کے دو ایٹموں اور آکسیجن کے ایک ایٹم کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اور اس قاعدہ میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی حال دیگر تمام اشیاء کا بھی ہے جیسا کہ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

ہزاروں سال پہلے ہوا کرتے تھے، آج بھی ان سالموں میں اتنے ہی ایٹم اسی ترتیب و تنظیم سے نمودار ہو رہے ہیں۔ زمانے کی تبدیلیوں، زمین کے مختلف خطوں، آب و ہوا کی تبدیلیوں کا ان نظاموں پر کوئی اثر کبھی نہیں پڑتا۔ کیا یہ ایک حیرت انگیز نظام نہیں ہے؟ کیا ایسا حکیمانہ، منصوبہ بند اور محکم نظام محض بخت و اتفاق کے طور پر وجود میں آسکتا ہے یا محض بخت و اتفاق کے سہارے قائم و دائم رہ سکتا ہے؟

اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کیلئے "حیاتیاتی کیمیا" (Biochemistry) سالماتی حیاتیات (moleculer biology) "خوردبینی حیاتیات" (micro biology) اور "کیمیائی خوردبینی حیاتیات" (chemical microbiology) وغیرہ علوم کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یہ سب حیاتیات (biology) کی شاخیں ہیں اور وسعت مباحث کی بنا پر مستقل علوم شمار ہوتے ہیں۔ ان علوم کے مطالعے سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و ربوبیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نباتاتی اور حیوانی زندگی کا ایک ایک ایٹم اور ایک ایک سالمہ تک حیرتناک حد تک ایک پوشیدہ اور ان دیکھی تنظیم کی جلوہ افروزیوں کا مظہر نظر آتا ہے۔ ان آثار و مظاہر میں "شعور اور حساب دانی" کے بے مثال جلوے نظر آتے ہیں جس کی تعبیر کے لئے خدا کو نہ ماننے والے سائنس داں ایک ہمہ گیر "ریاضیاتی ذہن" یا "ذہنی مادہ" وغیرہ قسم کی اصطلاحیں تراشتے ہیں۔ حالانکہ مادی اعتبار سے ان مظاہر کے اس قدر منظم و مربوط عمل اور عجیب و غریب کرشموں کی ___ جو معجزات ربوبیت کہلاتے ہیں ___ کوئی توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ مجبوراً ایک زبردست ریاضی داں اور ذہین ترین ہستی کے وجود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

قرآن اور بعض طبیعیاتی مظاہر

قرآن حکیم اصلاً علوم و فنون کی کتاب نہیں ہے۔ مگر ضمناً اس میں تمام علوم و فنون کا تذکرہ مل جاتا ہے۔ پچھلے باب میں "باطنی نعمتوں" کے تحت مادّے کے پوشیدہ اسرار بلکہ ایٹمی قوت تک کا تذکرہ ــــ معنوی اعتبار سے ــــ موجود ہونے کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اسی طرح پچھلے صفحات میں مذکور "مقدار"، "قدر" اور "تقدیر" وغیرہ کے تحت ہر قسم کے مادی اسرار اور مادی قوتیں (برق، بھاپ، روشنی اور مقناطیس وغیرہ) بھی آجاتی ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے ازل ہی سے ایک متعین ضابطے کے تحت مادہ میں جاری و ساری کر رکھا ہے۔

طبیعیات (physics) کے ان مظاہر میں سے قرآن مجید میں آگ کا تذکرہ خصوصی حیثیت سے کیا گیا ہے، جو قدیم زمانہ سے تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر قابل استفادہ رہی ہے۔ آگ اس حیثیت سے بھی اہم ہے کہ وہ ہماری گھریلو اور تمدنی ضروریات کے علاوہ بھاپ اور روشنی کا بھی ایک ماخذ ہے۔ آگ کی اسی تمدنی اہمیت کی بنا پر اس کا تذکرہ بطور ایک نعمت خداوندی ایک اعجازی انداز میں کیا گیا ہے:

اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ○ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ○ اچھا ذرا بتلاؤ تو سہی جس آگ کو تم سلگاتے ہو، اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا (اس کو) ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ (واقعہ ۷۱ــ۷۲)

قرآن حکیم ایک زندہ جاوید کلام ہے، جس میں اشاروں ہی اشاروں میں ایسی آفاقی صداقتیں بیان کر دی جاتی ہیں جو ہر دور کے احوال و کوائف پر صادق آسکتی ہوں۔ چنانچہ یہاں پر بھی مذکورہ بالا آیت کریمہ کے بعد

متصلاً ارشاد ہوتا ہے:

نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ۚ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۚ ہم نے اس آگ کو (ہر قسم کے) مسافروں[۳۵] کے لئے ایک یادگار اور فائدہ بخش چیز بنا دیا ہے۔ لہٰذا تم اپنے زبردست رب کے گن گاؤ۔ (واقعہ ۷۳-۷۴)

آگ زمانۂ قدیم میں جس طرح ایک مفید شے اور ایک اہم تمدنی ضرورت تھی، دورِ جدید میں وہ اس سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ بلکہ ایک ایسی اہم ترین اور بنیادی شے جس کے بغیر آج ہم کسی سفر یا سواری کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے یہ ایک بہت بڑی پیش گوئی تھی جو آج پوری ہو چکی ہے اور آئندہ بھی ہر دور میں پوری ہوتی رہے گی۔ فرمایا یہ جارہا ہے

---

[۳۵] یہاں پر لفظ "مقوین" بہت اہم ہے۔ مفسرین نے اس کے دو معنی بیان کئے ہیں:-

(۱) "منتفعین" یا "مستمتعین" یعنی فائدہ اٹھانے والے۔ اس صورت میں مسافر یا مقیم کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ یہ سب کے لئے عام ہے۔ ملاحظہ ہو: تفسیر ابن کثیر ۴/۲۹۷

تفسیر مجاہد، مرتبہ عبدالرحمٰن طاہر سورتی ص ۶۵۱، مطبوعہ قطر

تفسیر تیسیر الکریم الرحمان، از عبدالرحمٰن بن ناصر ۸/ ۴۲، مطبوعہ مکہ مکرمہ

(۲) مسافر لوگ۔ صاحب کشاف اور دیگر مفسرین نے اس کی توجیہ اس طرح کی ہے:

المقوین: الذین ینزلون القواء وھی القفر۔ یعنی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بیابان میں پڑاؤ ڈالتے ہیں (تفسیر کشاف وجلالین وتفسیر ابن کثیر وغیرہ) یہ اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے جس کو وسعت دے کر ہر قسم کے مسافرین کے لئے بولا جا سکتا ہے۔ یا پھر قول اول کے مطابق اس کا مفہوم عام ہی رکھا جا سکتا ہے اور معنی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا مطلب یہ کہ آگ یا آگ کے ماخذ سے فائدہ اٹھانا تو ایک عام بات ہوگی مگر مسافرین کے لئے اس میں ایک درجہ تخصیص ہے۔

اس طرح ایک لحاظ سے یہ عام ہے اور ایک لحاظ سے خاص۔

کہ "آگ سفر کرنے والوں کے لئے ایک یادگار اور نفع بخش چیز ہے" اس کلیہ کی صداقت جس طرح دورِ قدیم میں صادق آتی تھی (جنگل وغیرہ میں تاپنے اور روشنی کا کام لینے) میں اسی طرح آج وہ بھاپ اور پٹرول وغیرہ کی صورت میں ہر قسم کی سواریوں کو چلا رہی ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ سواریوں میں کام آنے والا ایندھن خواہ وہ لکڑی اور کوئلے کی شکل میں ہو یا پٹرول اور ڈیزل وغیرہ کی شکل میں، سب کا سب کاربن کہلاتا ہے جو نباتات ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ پٹرول بھی کاربن ہی ہے جو ایک نظریہ کے مطابق قرن ہا قرن پہلے درختوں سے بھرے ہوئے جنگلات کے زمین میں دب جانے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

ان آیات کریمہ کی بلاغت ملاحظہ ہو، اس موقع پر یہ نہیں فرمایا جا رہا ہے کہ تم لکڑیاں جلا رہے ہو یا کوئلہ یا پٹرول جلا رہے ہو یا کوئی دوسرا سیال ایندھن۔ بلکہ یہ فرمایا جا رہا ہے "وہ آگ جو تم جلا رہے ہو"۔ اس کلیے میں ہر قسم کا جدید سے جدید تر آتش گیر مادہ اور شعلہ پذیر ایندھن داخل ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح قیامت تک ایجاد ہونے والے ہر قسم کے نئے نئے ایندھنوں کا بھی بخوبی احاطہ ہو سکتا ہے، جن کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے نباتات سے ہو۔ اس حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ گویا کہ نئی نئی ایجاد ہونے والی سواریوں کی طرف بھی اشارہ اور بہت بلیغ پیشین گوئی ہے، جس کی وسعت میں راکٹ اور خلائی جہاز وغیرہ سب داخل ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح ایک دوسری آیت کریمہ میں بھی نئی نئی سواریوں کے وجود میں آنے کی خبر چودہ سو سال پہلے ہی دی جا چکی ہے:

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○ اور اس نے گھوڑے، خچر اور گدھے بھی پیدا کئے، تمہاری سواری اور زینت کی خاطر۔ اور وہ (آئندہ)

ایسی (سواریاں) پیدا کرے گا جن کو تم (اس وقت) نہیں جانتے (نحل ۸)
دورِ قدیم میں سواریوں کا دارومدار گھوڑوں، گدھوں اور خچروں ہی پر تھا۔ اور یہ سواریاں اس دور میں بہت معزز اور قابلِ فخر سمجھی جاتی تھیں۔ جیساکہ اس موقع پر لفظ "زینۃ" کے موقع استعمال سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ان کا تذکرہ کرنے کے بعد "اصولاً بتا دیا کہ اللہ تعالےٰ زمانہ مستقبل میں نئی نئی سواریاں وجود میں لائے گا"[۱۱۵] یہاں پر فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ تمدنی ہنگاموں کی اصل باگ ڈور بھی اللہ تعالےٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ سارے ہنگامہ ہائے حیات اس کے ازلی منشار منصوبے ہی کے ماتحت رواں دواں ہیں۔

غرض آگ دراصل کاربن اور کاربونک اشیاء کے جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ عنصر (element) ہماری زندگی میں بہت اہم مقام رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ ہماری زمین کے پرت کا صرف ۰.۰۳ فی صد حصہ ہے، لیکن پھر بھی یہ اہم ترین عناصر میں سے ایک ہے۔ پودوں، جانوروں اور تمام جانداروں کے جسم میں یہ عنصر موجود ہوتا ہے۔ قدرت میں یہ عنصر کوئلے، پیٹرولیم، کھریا اور چونے کے پتھروں جیسے مرکبوں کی شکل میں پایا جاتا ہے۔

آگ اور کاربن کی یہ اہمیت و افادیت بہت ہی اہم ہے، جو نباتات کی دین ہے۔ دیگر جان داروں میں بھی کاربن نباتات ہی

---

[۱۱۵] اور اس میں برق و بھاپ اور ایٹمی قوت اور سیال ایندھن وغیرہ ہر قسم کی قوتوں سے چلنے والے موٹر، ٹرین، ہوائی جہاز، اسٹیمر اور خلائی جہاز وغیرہ سب کے سب شامل ہو سکتے ہیں۔

کے ذریعہ منتقل ہوتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے کارخانۂ قدرت میں ایک حیرت انگیز تناسب قائم رہتا ہے۔

بہر حال کاربن کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر درختوں کی لکڑی دھڑا دھڑ جلنے اور آگ پکڑنے لگتی ہے، جس کا تذکرہ اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے:

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْہُ تُوْقِدُوْنَ ○ وہی ہے جس نے تمہارے لئے سبز درخت سے آگ پیدا کر دی، جس کو تم سلگاتے ہو۔ (یٰس ۸۰)

شیخ طنطاوی جوہری نے لکھا ہے کہ "مرخ" اور "عفار" نامی درختوں کی کچی شاخوں کو رگڑنے سے آگ نکلتی ہے[۱۵] مگر اس سے آیت کریمہ کا مفہوم بہت محدود ہو جاتا ہے۔ اصل مفہوم وہی معلوم ہوتا ہے جو اوپر بیان کیا جا چکا۔ نباتات کی جسامت کی بڑی مقدار کاربن پر مشتمل ہوتی ہے۔ خشک درختوں کے وزن کا ۴۵٪ بلکہ اس سے زیادہ حصہ کاربن کا ہوتا ہے۔ کاربن نامیاتی مرکبات organic compounds کا غالب حصہ ہوتا ہے۔ اگرچہ فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار صرف ۰.۰۳٪ ہے، مگر یہی جزو نباتات کے کاربن حاصل کرنے کا واحد ماخذ ہے[۱۶]۔ اور کاربن ڈائی آکسائیڈ صرف انہی چیزوں کے جلنے سے حاصل ہوتی ہے جن میں کیمیاوی عنصر کاربن موجود ہو[۱۷]

---

۱۵ تفسیر الجواہر، ۱۷/۱۵۴

۱۶ A Class Book of Botany, by A. C. Dutta, p. 229, Oxford University Press, 1978.

۱۷ علم کیمیا حصہ دوم ص ۱۱۴۔

یہ دراصل ربوبیت کے معجزات میں سے ہے کہ سبز درختوں میں کاربن جیسا عنصر شامل کر کے انہیں جلنے کے قابل بنا دیا گیا۔ اصل میں عناصر کی نیرنگیاں اور کارفرمائیاں بڑی ہی عجیب و غریب اور حیرت انگیز ہیں، جو انسانی فہم و دانش سے بالاتر معلوم ہوتی ہیں۔ جیسا کہ تفصیلات گزر چکیں انسان کا علم ہمیشہ ”ظاہری آثار و مظاہر“ ہی تک محدود رہتا ہے اور حقیقت حال تک رسائی کسی حال میں بھی نہیں ہو سکتی۔

خدائی نعمتوں کا فلسفہ

قرآن حکیم میں یہ اور اس قسم کی دیگر آیات کا تذکرہ بنیادی طور پر بگڑے ہوئے عقائد و نظریات کی اصلاح کے طور پر کیا گیا ہے۔ نیز نوع انسانی پر خداوند کریم کی مختلف نعمتوں کا ذکر کر کے اس کے جذبۂ احسان شناسی کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان خدا کے ساتھ باغیانہ رویہ ترک کر کے اس کے ساتھ وفاداری کی روش اختیار کرے۔

یہ ہوا ان علوم کا دینی و علمی اور فکری و نظریاتی پہلو، جو تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ اور اس کا دوسرا رُخ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان علوم کی ترقی سے بہت سے دنیوی فوائد ــــ معاشی، تمدنی، فوجی اور سیاسی وغیرہ ــــ بھی مقصود ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کائنات اور نظام کائنات میں سطحی غور و فکر اور سطحی مطالعہ سے کوئی ٹھوس، پائیدار اور استقرائی نتیجہ نکل نہیں سکتا، جب تک منظم طور پر مشاہدہ و تجربہ نہ کیا جائے۔ یہ منظم مشاہدہ و تجربہ ــ جو استقراء کی جان ہے ــــ عملی سائنس کی بنیاد بھی ہے۔ اس طرح عملی سائنس کے ظہور کے ساتھ ہی مختلف قسم کے آلات و اوزار وجود میں آتے ہیں، جن کے لئے نئی نئی صنعتیں جنم لیتی ہیں، نئی نئی راہیں کھلتی ہیں، نئے نئے اکتشافات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مادے کے

پوشیدہ حقائق قوانینِ فطرت کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس طرح ان علوم کی ترقی کے نتیجے میں لازمی طور پر مختلف نعمتوں کا ظہور ہونے لگتا ہے اور تمدن بھی آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگتا ہے۔ اس حیثیت سے دنیا کی تمام چیزیں اور تمام نعمتیں قابلِ استفادہ ہیں، جو ان علوم کی ترقی کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۝ وہی ہے جس نے زمین کی ساری چیزیں تمہارے لئے پیدا کیں (بقرہ ۲۹)

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ ـ وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے رام کردیا کہ اس کے کندھوں پر چلو پھرو اور اللہ کا رزق کھاؤ (ملک ۱۵)

غور فرمائیے یہ نعمتیں کیا ہیں اور ان کا فلسفہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ کائنات میں غور و فکر کے نتیجے میں قدرت کے جو اسرار ظاہر ہوتے ہیں اور پھر ان اسرار کے ظہور کے نتیجے میں جو دلائل خدا پرستی کے حق میں مدون ہوتے ہیں، ان کا صلا اور انعام ہیں۔ یہ اللہ تعالےٰ کی عجیب و غریب اسکیم ہے کہ نظام کائنات کے سربستہ رازوں کی نقاب کشائی سے اس کی توحید، قدرت و ربوبیت اور حکمت و منصوبہ بندی وغیرہ کے جو دلائل بے نقاب ہو جاتے ہیں، خواہ ان اسرار سربستہ کی نقاب کشائی فرمانبردار لوگ کریں یا نافرمان لوگ۔ مگر جو بھی یہ کام کرے گا وہ انعام و اکرام کے طور پر ان نعمتوں کا مستحق بنے گا جو اس علمی و فکری عمل کے لازمی نتائج و ثمرات کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

دنیوی نعمتوں کی تقسیم میں اگرچہ فرمانبرداروں اور نافرمانوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے مگر قانون فطرت کے مطابق جو قوم اس میدان میں آگے بڑھتی ہے وہ گویا کہ ان دنیوی نعمتوں کی حق دار بن جاتی ہے۔ اور

جو قوم ان نعمتوں کے بٹورنے میں پیچھے رہ جاتی ہے وہ قانون فطرت کے مطابق دنیا کے اسٹیج سے اتار دی جاتی ہے یا خلافت ارض کے میدان میں پیچھے ڈال کر دیگر اقوام کی غلام یا حاشیہ بردار بنا دی جاتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلم قومیں جب تک سائنسی علوم کو سینے سے لگائے تسخیر موجودات میں منہمک رہیں وہ بڑی آن بان کے ساتھ سریر آرائے سلطنت رہیں اور دیگر قوموں پر ان کی دھاک بیٹھی رہی۔ جس طرح کہ آج یورپ اور امریکہ کی دھاک دیگر اقوام پر بیٹھی ہوئی ہے۔ مگر جیسے ہی انھوں نے اس وظیفے کو ترک کیا وہ مغلوب و مقہور ہو گئیں حتیٰ کہ پوری پانچ صدیاں گزر جانے کے باوجود آج تک ان کی ذلت و مسکنت کا یہی حال ہے، جب کہ آج عددی اعتبار سے پورے ستاون ممالک ان کے قبضے میں ہیں۔ اور یہ ذلت و مسکنت اس وقت تک باقی و برقرار رہے گی جب تک کہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر پھر سے اپنا "وظیفۂ حیات" جاری نہ کر دیں اور پھر سے "میراث آدم" پر قابض نہ ہو جائیں۔ آج "علم آدم" اور "علم اسماء" پکار پکار کر ہمیں "خلافت ارض" کی طرف پھر سے متوجہ ہونے کی دعوت دے رہے ہیں "فھل من مدکر؟"

ایک دوسرے نقطۂ نظر سے غور کیجیے۔ پچھلے صفحات میں قرآن کے جو عظیم اور ہمہ گیر کلیات (علم مقادیر کے طور پر) بیان کیے گئے ہیں ان کی صداقت کا صحیح حال مادی علوم کے تفصیلی مطالعے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ تفصیلی مطالعہ حاصل اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ یہ علوم

پوری طرح ترقی کر چکے ہوں۔ لہذا قرآنی نقطۂ نظر سے ان علوم کی ترقی مطلوب ہے، اور اس سے دوہرے دینی و دنیوی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اگر مسلمان قومیں قرون وسطیٰ کی طرح موجودہ دور میں بھی ان علوم و فنون میں امام ہوتیں اور جدید تحقیقات میں ان کا بھی حصہ ہوتا تو ان علوم کی غلط اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے تشریح و توجیہ کے باعث جو عالمگیر فکری بے راہ روی اس وقت پائی جا رہی ہے وہ ہرگز رونما نہ ہوتی۔ اور اس نقطۂ نظر کے باعث موجودہ تمدن میں جو غلط اور مضر رجحانات ـــــ خدا بیزاری اور آخرت فراموشی کی وجہ سے ـــــ پیدا ہو گئے ان کا سدباب ہوتا۔ اور عالم انسانی جن ہلاکت خیزیوں سے اس وقت دو چار ہے ان سے وہ محفوظ رہتا۔ اس طرح امت مسلمہ کے اس میدان میں پیچھے رہ جانے کے باعث عالم انسانی کو دوہرے اور عظیم نقصانات سے دوچار ہونا پڑا ہے، جس کی تلافی بہت مشکل سے ہو سکے گی۔

علم کیمیا اور طبیعیات کی تفصیلات

واضح ہو گیا کہ خدائی نعمتوں کو بٹورنے کے لئے سائنسی علوم و فنون یا علم اسماء یا اور زیادہ صحیح معنوں میں "علم آدم" کی ضرورت ہے۔ جو قوم یا ملت ان علوم سے بے بہرہ رہے گی وہ نہ تو خدائی نعمتوں کی مستحق بن سکے گی اور نہ ہی صحیح معنیٰ میں خلیفہ کہلا سکے گی۔ یہ علوم در اصل وہ "چابیاں" ہیں جن سے "خلافت ارض" کے تمام بند دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہ کوئی جادو یا طلسم یا "خفیہ منتر" نہیں بلکہ خدا کے مقرر کردہ مادی قوانین و ضوابط ہیں جن کا علم نظری اعتبار سے حضرت آدم کو دیا گیا تھا اور عملی اعتبار سے تمام بنی آدم کو سونپا گیا ہے۔

ان علوم کی اسی بنیادی اہمیت کے پیش نظر طبیعیات و کیمیا کی

جو ان میں سب سے زیادہ اہم ہیں۔ تھوڑی سی تفصیل بیان کر کے ان کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تاکہ اندازہ ہو کہ خلافت ارض کی تکمیل کی راہ میں ان علوم کی کتنی اہمیت ہے اور ان علوم سے غافل رہ کر آج ہم اس میدان میں کس قدر پیچھے ہو گئے ہیں۔

علم کیمیا اور طبیعیات کو طبیعی علوم (physical sciences) بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی تعریف اور شاخیں حسب ذیل ہیں:

طبیعیات (physics) : وہ سائنس ہے جس میں مادے (کل اشیائے عالم) میں پائی جانے والی قوتوں : (۱) حرارت (۲) برق (۳) مقناطیس (۴) روشنی (۵) اور آواز کے اصولوں سے بحث کی جاتی ہے، اور ان قوتوں (energies) کے اثرات مادے پر دکھلائے جاتے ہیں۔

طبیعیات کی حسب ذیل شاخیں ہیں :

۱۔ حرارت اور حرکیات ـــــ heat and thermodynamics

۲۔ آواز ـــــ sound

۳۔ روشنی ـــــ light

۴۔ برق ـــــ electricity

۵۔ مقناطیسیت ـــــ magnatism

۶۔ جوہری طبیعیات ـــــ atomic physics

کیمیا (chemistry) : وہ سائنس ہے جس میں دنیا کی تمام مادی اشیاء کی بناوٹ، ان کی ساخت و پرداخت اور ان کے کیمیاوی تغیرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یعنی کوئی شے کن کن عناصر سے مرکب ہے اور اس کے خواص و تاثیرات کیا ہیں؟ نیز یہ کہ مختلف عناصر یا مادوں کو ملا کر کس طرح نئے نئے مرکبات اور نئی نئی مصنوعات پیدا کی جا سکتی ہیں وغیرہ۔ مختصر الفاظ میں علم کیمیا نام ہے اشیاء کی خصوصیات اور ان کی تبدیلیوں کو

متعین کرنے کا۔

علم کیمیا کی اہم شاخیں یہ ہیں:

۱۔ غیر نامیاتی کیمیا ——— inorganic chemistry

۲۔ نامیاتی کیمیا ——— organic chemistry

۳۔ حیاتیاتی کیمیا ——— biochemistry

۴۔ ارضیاتی کیمیا ——— geohemistry

۵۔ معدنیاتی کیمیا ——— mineral chemistry

۶۔ طبیعیاتی کیمیا ——— physical chemistry

علم کیمیا اور طبیعیات کے یہ تمام علوم اگرچہ بہت اہم اور بنیادی ہیں اور ان کا ایک دوسرے کے ساتھ بہت گہرا تعلق بھی ہے۔ مگر ان میں نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمیا، حرارت، برق اور جوہری طبیعیات سب سے زیادہ اہم اور عظیم افادیت کے حامل ہیں۔ موجودہ تمدن میں کیمیاوی مصنوعات، برقی آلات (electronics) جوہری توانائی (atomic energy) اور جوہری آئی سوٹوپ (isotope) وغیرہ کی جو کرشمہ سازیاں نمودار ہو رہی ہیں، وہ انہی علوم کی کارستانی ہے۔ جوہری طبیعیات کا علم اب اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ اب اس کے مرکزے کا علم "مرکزائی طبیعیات" (nuclear physics) کے نام سے الگ ہو گیا ہے۔

اسی طرح آج الکٹرونکس اور ٹیلی کمیونیکیشن بھی اپنی وسعت مباحث کے اعتبار سے "برق" سے الگ مستقل علوم بن گئے ہیں۔ اور ان موضوعات پر اتنا لٹریچر منظر عام پر آگیا ہے کہ ان سب کو پڑھنا ہی دشوار ہو گیا ہے۔ یہ علوم محض نظری نہیں ہیں بلکہ عملی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور آج صرف برقیات (الکٹرونکس) کی ہزاروں صنعتیں (industries) کام کر رہی ہیں۔ مثلاً بجلی کے بلب، گھنٹیاں، مختلف قسم کے میٹر، پنکھے، ہیٹر، ریفریجیٹر،

گھڑیاں (الکٹرونک)، ریڈیو، ٹرانسسٹر، ٹیپ ریکارڈر، ٹیلی وژن ٹیلی فون ٹیلکس، ٹیلی پرنٹر اور راڈار وغیرہ ہزاروں قسم کی چیزیں جن کا شمار بھی مشکل ہے، سب الکٹرانکس ہی کی صنعتیں ہیں۔ صرف آپ کے مکان کی بجلی کے نظام میں استعمال ہونے والی چیزوں (مثلاً وائر، پلاسٹک پائپ، سیلنگ روز، ہولڈر اور سوئچ وغیرہ وغیرہ) ہی کو دیکھ لیجیے کہ اس کی صنعت وانڈسٹری کتنی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

یوں تو آج دنیا میں مجموعی اعتبار سے لاکھوں صنعتیں کام کر رہی ہیں۔ مثلاً بجلی اور بھاپ سے چلنے والی ہزاروں قسم کی مشینیں، موٹر، ٹرین اور ہوائی جہاز وغیرہ، اسی طرح فن زراعت میں استعمال ہونے والے جدید آلات، مشینیں اور کیمیاوی کھادیں وغیرہ، طب جدید میں استعمال ہونے والے بے شمار آلات، مشینیں اور ادویات وغیرہ، لوہے اور فولاد کی ہزاروں صنعتیں، پلاسٹک کی ہزاروں صنعتیں، ربر کی ہزاروں صنعتیں، پٹرولیم کی ہزاروں صنعتیں، اور فوجی و عسکری آلات کی ہزاروں صنعتیں کام کر رہی ہیں۔ مگر ان تمام صنعتوں میں علم کیمیا اور طبیعیات کا عمل دخل بنیادی ہے۔ ان دو علوم کی کارفرمائی کے بغیر ان میں سے کسی صنعت کا پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ اس اعتبار سے یہ علوم کسی بھی قسم کی صنعت و ٹکنالوجی کے لئے "منتر" کا کام کرتے ہیں۔ ان کے بغیر جدید صنعت و حرفت کا تصور بھی مشکل ہے۔

کوئی بھی کارخانہ قائم کرنے کے لئے سب سے پہلے فنی اعتبار سے جانکاری حاصل کرنا اور متعلقہ صنعت کا فارمولا اور اس کے دیگر مسائل کا حل ان علوم کی روشنی میں نکالنا پڑتا ہے۔ اب جو لوگ ان علوم میں جس قدر زیادہ ماہر ہوں گے وہ اسی قدر خوبی اور حسن تدبیر سے اس کام کو نپٹا سکیں گے۔

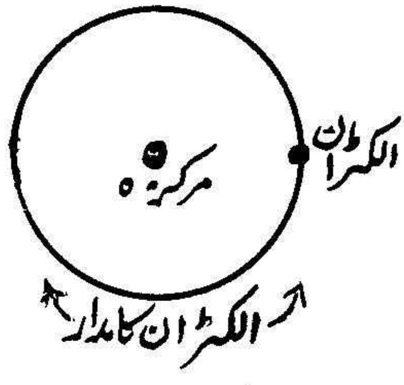
ان علوم اور ان کے فوائد سے قطع نظر صرف معاشی نقطۂ نظر سے غور کیجئے کہ قوموں کی ترقی اور خوش حالی کے اعتبار سے یہ صنعتیں کتنی اہم ہیں! اس وقت روئے زمین پر لاکھوں صنعتیں کام کر رہی ہیں اور دنیا کی قوموں کے درمیان اس سلسلے میں سخت مقابلہ چل رہا ہے۔ آج قوموں کی زندگی صحیح معنوں میں صنعتوں سے وابستہ ہو گئی ہے۔ اور جو قوم آج "بے صنعت" ہے وہ گویا کہ فقیر اور کنگال ہے، جو یا تو ترقی یافتہ قوموں کی محتاج اور غلام بنی رہے گی یا ان کا لقمۂ تر۔ اس کے علاوہ اور کوئی تیسری شکل نہیں ہے۔

غرض ان علوم کا ایک بنیادی خاکہ اور تصور ذہن نشین کر لینے کے بعد ان کے چند مزید اصول وکلیات کی تھوڑی سی تفصیل بیان کی جاتی ہے تاکہ ان کے اہم متعلقات و مباحث کا ایک جامع نقشہ سامنے آجائے۔ اب اس سلسلے میں سب سے پہلے ایٹم اور اس کے متعلقات کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے، جو علم طبیعیات وکیمیا کی جان اور دورِ جدید کی تمام ترقیوں کی گویا بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید طبیعیات اور کیمیا کا تعلق ایٹمی سائنس یا عناصر کے علم سے بہت گہرا ہے۔ علوم طبیعی کا بیان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ عناصر کا بیان نہ کیا جائے۔ اور ان عناصر کی مختلف مادّوں اور مرکبات کیمیاوی کے ساتھ ان کی مطابقت دکھائی نہ جائے۔

ایٹم کا حیرت انگیز نظام

آج دنیا میں، اب تک کی دریافت کے مطابق، ایک سو پانچ (۱۰۵) عناصر (ان میں بعض غیر قدرتی بھی شامل ہیں) پائے جاتے ہیں۔ دنیا کی تمام چیزیں ـــ خواہ وہ جمادات سے ہوں یا نباتات وحیوانات سے ـــ انہی

عناصر سے مرکب ہیں یعنی اگر کسی چیز کا کیمیاوی مَعمَل (لیبوریٹری) میں تجزیہ کیا جائے تو ان میں یہی اجزا نکلتے ہیں۔ اصل میں جس "دخانی مادے" سے اس جہان رنگ و بو کی تخلیق ہوئی تھی اس مادے کی "وحدت" تمام آثار و مظاہر میں دکھائی دیتی ہے۔ ان عناصر میں کچھ ہلکے ہیں تو کچھ بھاری، کچھ کمیاب ہیں تو کچھ وافر مقدار میں پائے جانے والے ہیں۔ ان میں کچھ دھاتیں ہیں اور کچھ غیر دھاتیں۔ مگر سب میں بنیادی طور پر ایک ہی نظام وحدانیت کارفرما ہے۔ وہ یہ کہ ہر ایک میں "الکٹرانی" اور "مرکزائی" نظام پایا جاتا ہے۔ کسی میں الکٹرانوں کی تعداد کم ہوتی ہے تو کسی میں زیادہ۔ اسی طرح مرکزے میں پروٹانوں اور نیوٹرانوں کا نظام کارفرما ہے۔ سب سے ہلکا عنصر وہ ہے جس کے مرکزے میں صرف ایک پروٹان ہو اور اس کے گرد ایک الکٹران چکر لگا رہا ہو۔ اس کو ہائیڈروجن کا نام دیا گیا ہے۔ اس کی شکل یوں ہے:



ہائیڈروجن کے جوہر کی شکل جس کے مرکزہ میں صرف ایک پروٹان ہوتا ہے اور اس کے گرد ایک الکٹران چکر لگاتا ہے۔

ہائیڈروجن کے بعد کا عنصر وہ ہے جس کے مرکزے میں دو نیوٹران اور دو پروٹان (باہم جڑے ہوئے) ہوتے ہیں۔ اور ان کے گرد دو الکٹران گردش کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کو ہیلیم (helium) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسی طرح لیتھیم (lithium) کے مرکزے میں ۳+۴ بیریلیئم berylium کے مرکزے میں ۴+۵، بورون (boron) میں ۵+۵، کاربن carbon میں ۶+۶، نائٹروجن (nitrogen) میں ۷+۷، آکسیجن (oxygen) میں ۸+۸ پروٹان اور نیوٹران

بالترتیب پائے جاتے ہیں۔ اور قدرتی عناصر میں سب سے بھاری عنصر یورینیم (uranium) ہے جس کے مرکزے میں ۹۲ پروٹان اور ۱۴۶ نیوٹران ہوتے ہیں۔ اور اس کے مرکزے کے گرد ۹۲ الکٹران مختلف مداروں میں (ایک مکمل نظام شمسی سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز طور پر) گردش کرتے ہیں۔ کارخانۂ قدرت میں یہ ایک نفیس ترین نظام ہے کہ کسی عنصر کے مرکزے میں جتنے پروٹان (مثبت چارج والے برقی ذرات) گردش کر رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً لوہے کے مرکزے میں ۲۶ پروٹان ہوتے ہیں تو اس کے گرد گردش کرنے والے الکٹران بھی ۲۶ ہی ہوتے ہیں۔ ریڈیم کے مرکزہ میں ۸۸ پروٹان ہوتے ہیں تو الکٹران بھی ۸۸ ہی ہوتے ہیں۔ جوہری اجزا کے اس ہیر پھیر سے ہمیں چند اصول معلوم ہوتے ہیں جن کی مختصر تفصیل یہ ہے:

۱۔ کارخانۂ قدرت میں تمام عناصر ــــ پروٹانوں کی تعداد کے لحاظ سے ــــ ترتیب وار ملتے ہیں۔ اور اس ترتیب سے ان کو سلسلہ وار نمبر دئے گئے ہیں۔ مثلاً ہائیڈروجن کا ایٹمی نمبر ۱ ہے، ہیلیم کا ۲، کاربن کا ۶، فاسفورس کا ۱۵، لوہے کا ۲۶، تانبے کا ۲۹، چاندی کا ۴۷، سونے کا ۷۹، ریڈیم کا ۸۸ اور یورینم کا ۹۲۔ (اختصار کے خیال سے درمیان والے عناصر کے نام اور نمبر چھوڑ دئے گئے ہیں) اس طرح کارخانۂ قدرت میں ایک سے بانوے تک تمام درمیانی عناصر مل جاتے ہیں اور کوئی بھی عنصر چھوٹ نہیں سکا۔ بالفاظ دیگر اس خدائی نظام میں کہیں بھی رخنہ یا انتشار نہیں ہے۔

۲۔ کسی مرکزے میں موجود شدہ پروٹانوں اور نیوٹرانوں (بے چارج والے ذرات) کی مجموعی تعداد کے لحاظ سے اس عنصر کا ایٹمی وزن ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہائیڈروجن کا ایٹمی وزن ایک ہے، ہیلیم کا ۴، کاربن کا ۱۲، آکسیجن کا ۱۶، کوبالٹ کا ۵۹، پلاٹینم کا ۱۹۵ اور یورینیم کا ۲۳۸۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عناصر بالترتیب ہائیڈروجن کے ایٹم سے نسبتاً ۴ گنا ۱۲ گنا، ۱۶ گنا، ۵۹ گنا اور ۲۳۸ گنا بھاری ہیں۔

۳۔ کسی عنصر کی خاصیت کا اعتبار اس عنصر کے مرکزے میں موجود شدہ پروٹانوں کی تعداد پر منحصر ہے، ورنہ محض ایک پروٹان کی کمی بیشی سے اس عنصر کی خاصیت بدل جائے گی۔ مثلاً سونے جیسی قیمتی دھات اور پارہ جیسی حقیر چیز کے مرکزوں میں صرف ایک پروٹان، اور ان کے گرد چکر لگانے والے الکٹرانوں کی تعداد میں صرف ایک الکٹران) کا فرق ہوتا ہے۔ اگر سونے کے مرکزے میں ایک پروٹان داخل کر دیا جائے تو وہ پارہ بن جائے گا۔ اسی طرح اگر پارہ کے مرکزہ سے ایک پروٹان نکال دیا جائے تو وہ سونا بن جائے گا[۱۸]۔ ریڈیم کا ایٹمی نمبر ۸۸ اور ایٹمی وزن ۲۲۶ ہے۔ اگر مصنوعی تابکاری کے ذریعہ اس کے مرکزے سے ۶ پروٹان خارج کر دئے جائیں تو وہ سیسے کا جوہر بن جائیگا جس کا ایٹمی نمبر ۸۲ اور ایٹمی وزن ۲۰۷ ہے۔

ان عناصر میں بعض کمیاب اور بعض بہت ہی کمیاب ہیں۔ مثلاً یورینیم (جس سے ایٹم بم تیار ہوتا ہے) اور ریڈیم وغیرہ۔ اور بعض بہت افراط کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ جیسے ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور کاربن وغیرہ۔ ویسے کہنے کو تو اس عالم رنگ و بو میں قدرتی عناصر ۹۲ پائے جاتے ہیں، مگر دنیا کی اکثر چیزیں صرف ۱۴ عناصر سے مرکب ہیں جو وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن،

۱۸۔ اس عمل کے ذریعے مصنوعی طور پر سائنسی تجربہ گاہوں میں سونا بنا لیا گیا ہے مگر یہ اور بات ہے کہ یہ مصنوعی سونا قدرتی سونے سے زیادہ مہنگا ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس ایٹمی عمل پر جو بہت زیادہ پیچیدہ ہے بے انتہا صرفہ آتا ہے۔

کاربن، کلورین گیس، سوڈیم، میگنیشیم، ایلمونیم، سلیکون، فاسفورس، پوٹاشیم، کیلشیم اور لوہے جیسے ٹھوس مادے شامل ہیں۔ حیواناتی اور نباتاتی پروٹو پلازم میں بھی یہی اجزا پائے جاتے ہیں، جو پوری حیاتیاتی زندگی کا بنیادی مادہ ہے۔

ایٹم کا یہ پورا نظام بہت ہی گہرے سوجھ بوجھ اور حیرت انگیز نظم و ضبط کا پابند ہے جو ہر اعتبار سے "وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ" (اور اس کے ہاں ہر چیز ایک خاص مقدار کے ساتھ ہے) کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ آپ کسی بھی حیثیت سے غور کیجئے یہ عظیم ترین ربانی اصول ہر طرح سے صادق آئے گا۔ خدائی باتوں میں تبدیلی واقع نہ ہونے کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ انسانی علوم و نظریات خواہ کتنے ہی بدل جائیں، خدائی اقوال میں کوئی تبدیلی یا کسی قسم کی ترمیم کبھی واقع نہیں ہو سکتی بلکہ ہر نئی سے نئی تحقیق کی بدولت اس کے ابدی بیانات میں مزید نکھار پیدا ہو جاتا ہے — غرض یہ کلیہ (مقداروں یا پیمانوں کا علم) تمام علوم کا حاصل اور خصوصاً علم کیمیا کی جان ہے۔

مرکبات کے جلوے

یہ عناصر۔ جو تعداد میں ۹۲ ہیں، حروف تہجی کی طرح۔ مفرد عناصر کہلاتے ہیں۔ یہ کائنات کی بنیادی اینٹیں ہیں۔ جن سے اس جہانِ آب و گل کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہی مفرد عناصر جب دو یا دو سے زیادہ تعداد میں کیمیاوی طور پر باہم ملتے ہیں تو اس کے نتیجے میں سالمات یا مرکبات وجود میں آتے ہیں۔ (جس طرح حروف تہجی سے الفاظ و کلمات بنتے ہیں) مثلاً ہائیڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کا ایک ایٹم جب کیمیاوی طور پر ملتے ہیں تو ان سے پانی کا ایک سالمہ (molecule) وجود میں آتا ہے۔

اسی طرح سوڈیم کے ایک ایٹم اور کلورین کے ایک ایٹم کے کیمیاوی ملاپ سے نمک طعام کا ایک سالمہ بنتا ہے۔ کاربن کے ایک جوہر اور آکسیجن کے دو جوہروں کے تعامل باہمی سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کا ایک سالمہ نمودار ہوتا ہے جس کو ہم سانس کے ذریعہ خارج کرتے رہتے ہیں۔

یہ بعض سادہ قسم کے سالمات کی مثالیں ہوئیں۔ پیچیدہ قسم کے سالموں میں مختلف عناصر کے سیکڑوں ہزاروں جوہر (ایٹم) ہوتے ہیں مثلاً کلوروفل (درختوں کا سبز مادہ) کے ایک سالمہ میں کاربن کے ۵۵، ہائیڈروجن کے ۷۰، آکسیجن کے ۵، نائٹروجن کے ۴ اور میگنیشیم کا ایک ایٹم ہوتا ہے جس کا فارمولا اس طرح لکھا جاتا ہے: $C_{55} H_{70} O_5 N_4 Mg$ گلوکوز کے ایک سالمے میں کاربن کے ۶، ہائیڈروجن کے ۱۲ اور آکسیجن کے ۶ جواہر ہوتے ہیں۔ $(C_6 H_{12} O_6)$

پروٹین کے ایک سالمے میں مختلف عناصر کے ہزاروں جواہر (ایٹم) پائے جاتے ہیں اور یہ قدرتی سالموں میں سب سے زیادہ پیچیدہ سالمہ کہلاتا ہے۔ جس کی صحیح ساخت اور ایٹموں کی صحیح تعداد کو سائنس داں اب تک پوری طرح سمجھ نہیں پائے ہیں۔

غرض یہ سالمات و مرکبات دو قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ نامیاتی مرکبات: وہ سالمات (molecules) یا مختلف عناصر کے مرکبات ــــ دو یا دو سے زیادہ کی تعداد میں ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ کیمیاوی اتصال پانے والے ــــ جن میں عنصر کاربن (carbon) پایا جاتا ہو، نامیاتی مرکبات (organic compounds) کہلاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر کاربن کے تمام مرکبات عموماً نامیاتی مرکبات کہلاتے ہیں۔ [۱]

۲۔ غیر نامیاتی مرکبات: کاربن کے علاوہ دیگر تمام عناصر کے مرکبات

غیر نامیاتی مرکبات (inorganic compounds) کہلاتے ہیں۔ یوں ان میں کاربن کے بھی کچھ مرکبات ۔ استثنائی طور پر۔ پائے جاتے ہیں۔ (اگرچہ زیادہ تر کاربن نامیاتی مرکبات کا جزو ہوتا ہے)۔

نامیاتی مرکبات میں اکثر کاربن اور ہائیڈروجن کے عناصر ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ نیز ان کے علاوہ آکسیجن اور نائٹروجن وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک "نامیاتی مرکبات" کا مطلب دنیائے حیوانات و نباتات سے حاصل ہونے والے مرکبات سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ کاربن کی اشیاء قدرتی طور پر انہی چیزوں میں پائی جاتی ہیں۔ نامیاتی مرکبات کو "کاربونک مرکبات" بھی کہا جاتا ہے۔ نامیاتی مرکبات میں تیل، چربی، نشاستہ، مختلف غذائی اشیاء، لکڑی، کوئلہ، پلاسٹک، پٹرولیم، ربڑ، اسپرٹ، روئی، اون، صابن اور ہائیڈرو کاربن گیس وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام چیزوں میں دیگر عناصر کے ساتھ ساتھ کاربن پایا جاتا ہے۔ آج کل صنعتی اور تجارتی پیمانوں پر ان مرکبات کو مصنوعی طور پر بنایا جا رہا ہے۔ ان مرکبات کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ آج ان مرکبات (نامیاتی مرکبات) کی تعداد چالیس لاکھ کے لگ بھگ ہے اور غیر نامیاتی مرکبات کی تعداد دو لاکھ کے قریب۔

نامیاتی مرکبات کو۔ اپنی بنیادی جوہری ساخت اور ترتیب کے اعتبار سے۔ کئی گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کا مطالعہ بہت دلچسپ

۹۱؎ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر وہ مرکب جس میں کاربن پایا جاتا ہو وہ لازمی طور پر "نامیاتی مرکب" کہلائے۔ کیونکہ بعض غیر نامیاتی مرکبات بھی ایسے پائے جاتے ہیں جن میں کاربن ہوتا ہے۔ مثلاً کاربن کے آکسائیڈ دھاتوں کے کاربونیٹ سایانوجن اور اس کے متعلقہ مرکبات وغیرہ۔

جن کا مطالعہ بڑا حیران کن ہے۔ ان سب کی فنی تفصیلات اس موقع پر طوالت کا باعث ہو گی۔ مختصر یہ کہ مختلف عناصر کے درمیان "کیمیاوی تعامل" کی قوت ان کے الکٹرانوں کی تعداد کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر عنصر (element) اپنی ایک مخصوص "تعاملی خصوصیت" رکھتا ہے، جس کے باعث وہ دوسرے عنصر سے جُڑتا ہے یا اس سے مضبوطی کے ساتھ چمٹ کر کوئی سالمہ یا مرکب بناتا ہے، جس طرح کہ مفرد حروف تہجی باہم جڑ کر چند بامعنی الفاظ و کلمات بناتے ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا عجیب و غریب قانون ہے کہ کسی سالمے کی تشکیل کے لئے جب دو یا دو سے زیادہ عناصر کے جوہر باہم ملتے ہیں تو ان میں سے بعض — اندرونی ذرات کے نظام کے تحت — منفی (negative) اور بعض مثبت (positive) بن جاتے ہیں۔ اس طرح ان میں ایک مضبوط کشش اتصال قائم ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ عناصر بھی "جوڑے جوڑے" یا "زوج زوج" بن جاتے ہیں۔ (وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ: اور ہم نے ہر چیز میں جوڑے بنا دیئے ہیں تاکہ تم چونک سکو) عناصر کے درمیان یہ "قانون زوجیت" صرف سالموں کی تشکیل ہی میں پایا جاتا ہے (جب کہ ایک عنصر کا الکٹران نکل کر دوسرے عنصر کے مدار میں داخل ہو جاتا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھام لیتے ہیں، گویا کہ ایک زنجیر میں جکڑ دیئے گئے ہوں)۔ ورنہ عام طور پر کوئی ایٹم برقی اعتبار سے نہ مثبت ہوتا ہے اور نہ منفی۔

واضح رہے کہ قانون "گرفت" valency کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ برقی گرفت ——— electro valency

۲۔ مشترکہ گرفت ——————— covalency

۳۔ ہم پلہ گرفت ——————— cooridinate valency

مرکبات کے کیمیاوی تعامل کے لئے ان میں سے کوئی نہ کوئی قسم ہر مرکب میں پائی جاتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں ہر عنصر کی اپنی ایک خصوصیت ہوتی ہے، جس کے باعث وہ دوسرے عناصر سے تعامل کر کے کوئی مرکب بناتا ہے۔ اوپر میں نے قانون "زوجیت" سے متعلق جو مثال پیش کی ہے وہ ان تین قسموں میں سے پہلی قسم "برقی گرفت" سے تعلق رکھتی ہے، جو اس سلسلہ میں بہت واضح اور نمایاں ہے۔ بقیہ دو قوانین میں تھوڑی سی پیچیدگی ہے جس کی وجہ سے ان پر اس کے اطلاق کے لئے کچھ مزید غور و خوض کی ضرورت ہے۔

اس حیثیت سے اگر ان کیمیاوی مرکبات و سالمات کا جائزہ لیا جائے تو اس سے بہت سے اسباق و بصائر منظرِ عام پر آسکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مختلف خصوصیات رکھنے والے عناصر کا باہمی ربط و تعامل اور ان کے کرشمے انسان کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ یہ عناصر جب ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ ملتے ہیں تو مختلف چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ ان عناصر کے طبیعی خواص کے اختلاف کے باوجود نتیجہ ہمیشہ یکساں نکلتا ہے۔ مثلاً آکسیجن جب ایک مخصوص تناسب کے ساتھ نائٹروجن سے ملتی ہے تو ہوا بن جاتی ہے۔ مگر وہی عنصر جب ہائیڈروجن کے ساتھ ایک خاص تناسب کے ساتھ ملتا ہے تو پانی بن جاتا ہے۔ اسی طرح یہ عناصر کبھی انسانی گوشت پوست اور خون اور ہڈی وغیرہ کا روپ دھارتے ہیں تو کبھی پیڑ پودے، حجر شجر اور مرغ و ماہی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ چیز ایک ہے مگر تناسب کی تبدیلی کے ساتھ شکل بدل جاتی ہے۔ غرض دنیا میں پائی جانے والی تمام چیزیں اور کل موجودات مختلف عناصر اور سالمات کا

مجموعہ ہوتے ہیں، خواہ وہ آب و خاک ہوں یا باد و باراں، کرۂ ارض کے جگر پارے ہوں یا عالم افلاک کے چاند تارے۔ چونکہ ہر مرکب اور ہر سالمے کی کچھ مخصوص خاصیتیں ہوتی ہیں جو دیگر سالمات و مرکبات سے جدا ہوتی ہیں۔ مثلاً گیہوں کا سالمہ اپنی ساخت، جوہری اختلاف و ترتیب اور کیمیاوی و طبعی خواص میں چاول کے سالمے سے مختلف ہوگا۔ اسی طرح دال کے سالمے میں پائے جانے والے خواص مرچ کے سالمے میں پائے جانے والے خواص سے مختلف ہوں گے۔ گوشت کا سالمہ انڈے کے سالمے سے جدا ہوگا۔ آم کا سالمہ انگور کے سالمے سے مختلف ہوگا وقس علی ذلک۔ اس طرح دنیا میں جتنی چیزیں پائی جاتی ہیں اتنے ہی سالمے موجود ہیں جو بنیادی طور پر اپنی ساخت و پرداخت اور اختلاف عناصر و جواہر میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ کیمیاوی خواص اور سالماتی خواص بہت وسیع علوم ہیں۔ نامیاتی کیمیا، غیر نامیاتی کیمیا، طب اور ادویات وغیرہ تمام علوم کا دارومدار انہی خواص و تاثیرات پر ہے۔ ان علوم کے مطالعے سے قدرت و ربوبیت کے عجائب اور حیرت انگیز کرشموں کا حال ظاہر ہوتا ہے جن کی تفصیل کے لئے دفتروں کے دفتر درکار ہوں گے۔ ان موضوعات پر بیشمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں جو زیادہ تر انگریزی زبان میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت تخلیق کو سمجھنے کے لئے ان قوانین و ضوابط کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ انہی تمام قوانین و ضوابط کا علم حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا تھا۔ (وعلم آدم الاسماء کلھا) یہ قوانین و ضوابط اللہ تعالیٰ کے تخلیق کردہ و جاری کردہ ہیں جو اس کائنات مادی میں ازل ہی سے موجود ہیں مگر ان سے واقفیت یا تو نظری حیثیت سے حضرت آدمؑ رکھتے تھے یا عملی حیثیت سے موجودہ دور کا انسان واقفیت حاصل کر رہا ہے۔ سائنس اور سائنس داں ان قوانین کے واضع نہیں بلکہ صرف مفتش و محقق ہیں یہی

وجہ ہے کہ وہ ان قوانین کو سمجھنے میں کبھی کبھی غلطی کر جاتے ہیں یا دھوکا کھا جاتے ہیں۔ جیسا کہ ان علوم کی تاریخ شاہد ہے۔ چنانچہ جب کوئی سائنس داں کسی پچھلے سائنس داں کی۔۔ ان قوانین کو سمجھنے کے سلسلے میں۔۔ کوئی غلطی واضح کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ "سائنس کا نظریہ بدل گیا" اس سے بعض لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ سائنس تو محض چند بدلتے ہوئے نظریات کا نام ہے۔ حالانکہ وہ در اصل "خدائی قوانین" کو سمجھنے میں تھوڑی سی غلطی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ان قوانین کو علی وجہ البصیرت سمجھنے کے لئے جتنے علوم یا جتنے پہلوؤں سے ان کو جانچ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، وہ سب انسان کو میسر نہیں ہیں۔ کیونکہ لاکھ ترقی کے باوجود اس کا علم محدود، اس کی نظر محدود اور اس کی عقل محدود ہے۔ خداوند عالم۔ جل جلالہ۔ چونکہ لامحدود ہے اس لئے اس کی صفات ہی کی طرح اس کے قوانین بھی لامحدود ہیں۔ (اصل میں لامحدود قوانین ہی اس کی لامحدود صفات پر دلالت کر رہے ہیں) مگر انسان اپنی محدودیت کی بنا پر صرف چند "محدود قوانین" ہی کا احاطہ کر سکتا ہے۔ اور انہی محدود قوانین میں خوش قسمتی سے۔۔ بلکہ خدائی منصوبے اور اس کی حکمت ابدی کے مطابق۔۔ انسان کی تمام "فطری ضروریات" پوری ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ان علوم کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کرنا چاہیئے۔ اور ان قوانین سے واقفیت کے لئے تمام فزیکل علوم سے بحث کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ کائنات بخت و اتفاق کا نتیجہ ہوتی تو ان منظم قوانین کا کوئی وجود ہی نہ ہوتا اور کسی علم و فن کی باقاعدہ بنیاد ہی نہ پڑتی۔

بہر حال کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک ہی عنصر کے دو یا دو سے زیادہ جوہر (ایٹم) مل کر ایک سالمے کی تشکیل کرتے ہیں۔ مثلاً ہائیڈروجن گیس کا سالمہ اس کے دو ایٹموں پر مشتمل ہوتا ہے اور آکسیجن گیس کا سالمہ اس کے دو جوہروں سے مرکب ہوتا ہے۔ سہولت کی خاطر انہیں مخفف طور پر

اس طرح ظاہر کیا جاتا ہے :

ہائیڈروجن گیس کا سالمہ : H_2 (H سے مراد ہائیڈروجن ہے اور ۲ سے مراد دو ایٹم)

آکسیجن گیس کا سالمہ : O_2 (O سے مراد آکسیجن اور ۲ سے مراد دو ایٹم)

علم کیمیا میں "ایٹمی وزن" اور "سالماتی وزن" کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ پچھلے صفحات میں عناصر کے ایٹمی اوزان کی تفصیل لکھی جا چکی ہے یعنی ہر عنصر کے مرکزے میں جتنے پروٹان ہوتے ہیں، اسی نسبت سے ان کا ایٹمی وزن مقرر ہے۔ اب رہا سالماتی اوزان کا مسئلہ تو اس کی تشریح یہ ہے کہ کسی سالمے میں موجود شدہ عناصر اور ان کے جوہروں کا مجموعی وزن کیا ہے؟ تو اس کو ظاہر کرنے کے لئے بھی ہائیڈروجن ایٹم ہی کو بطور معیار۔ اس کے سب سے زیادہ ہلکے ہونے کی بنا پر۔ مانا جاتا ہے۔ مثلاً ہم کو یہ معلوم کرنا ہے کہ پانی کا سالماتی وزن ——————

molecular wiegHT کیا ہے؟ تو ہم پانی کے سالمے کی کیمیاوی تحلیل کر کے اس میں پائے جانے والے عناصر اور ان کے مجموعی وزن کو ہائیڈروجن ایٹم کے وزن کے اعتبار سے ظاہر کریں گے۔ جیسے :

پانی کا سالمہ = H_2O

اس کا مطلب ہوا ہائیڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کا ایک ایٹم۔ لہذا ہائیڈروجن کے دو ایٹموں کا مجموعی وزن ہوا ۲، اور آکسیجن کے ایک ایٹم کا وزن ہوا ۱۶ (کیونکہ اس کے مرکزہ میں ۱۶ پروٹان اور نیوٹران پائے جاتے ہیں)۔ اس طرح پانی کے ایک سالمے کا "سالماتی وزن" ہوا : ۱۸

(۲ + ۱۶ = ۱۸)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سالمہ ہائیڈروجن کے واحد ایٹم کے مقابلے میں ۱۸ گنا بھاری ہے۔ اسی طرح نمک طعام کے ایک سالمے کا سالماتی وزن (مالیکیولر ویٹ) ۵۸ اور گلوکوز شکر کے ایک سالمے کا سالماتی

وزن ۱۸۰ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے پروٹین کے بعض سالمے (پروٹین کے سالموں کی بہت سی قسمیں ہیں) دس لاکھ گنا یا اس سے بھی زیادہ بھاری ہوتے ہیں۔ [۲۲]

۱۸۷۴ء سے پہلے سائنس دانوں کو سالمات (مالیکیولس) کی ساخت و پرداخت اور ان کی متعین شکل کے بارے میں کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ بلکہ وہ انھیں عناصر کا ایک غیر مرتب اور غیر منضبط ڈھیر تصور کرتے تھے [۲۳] اور خود سالمات کا بنیادی تصور سب سے پہلے ۱۸۲۷ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک ماہر نباتات رابرٹ براؤن کے ذریعہ ایک تجزیہ کے ضمن میں منکشف ہوئی تھی [۲۴]۔ یہ سالمات جن عناصر سے مرکب ہیں۔ جن کی تعداد آج ۱۰۴ بلکہ ۱۰۵ تک جا پہنچی ہے۔ ان کے انکشافات اور ان کی تشریح و تنقیح بھی انیسویں اور بیسویں صدی کے تجربات کے دوران عمل میں آسکی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جان ڈالٹن نے انیسویں صدی کے شروع میں نظریۂ جوہر (atomic theory) عناصر کے جوہروں کی خصوصیات اور ان کی پہچان کے لحاظ سے پیش کیا اور عناصر کی سب سے پہلی قابل لحاظ درجہ بندی ۱۸۲۹ء میں ایک ماہر ڈابیرینر Doberiner کے ذریعہ عمل میں آئی تھی [۲۵] مگر عناصر کی مکمل درجہ بندی کی سب سے کامیاب کوشش روسی سائنس داں منڈلیف Mendeleev کی قرار دی گئی ہے۔ اور

۲۲ھ The Chemistry of Life, p. 20.

۲۳ھ A Text Book of Inorgonic Chemistry, by P. B. Janardhan, p. 306, Oxford & IBH Publishing Co., 1978.

۲۴ھ Asimov's Guide to Science, Vol. 1, p. 232.

۲۵ھ A Text Book of Inorganic Chemistry, p. 46.

اس کے پیش کردہ قواعد کی بنیاد پر موجودہ تمام معلوم شدہ عناصر کو ترتیب دیا گیا ہے۔[۲۶]

مگر عناصر کی اس دریافت اور ان کی درجہ بندی کے باوجود ایٹم کی اندرونی ساخت اور ان کے اجزا کے بارے میں بیسویں صدی کے شروع تک دنیائے سائنس کو کوئی علم نہیں تھا۔ الکٹران، پروٹان اور نیوٹران وغیرہ تمام اجزا بیسویں صدی کی دریافت ہیں۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں یونانی نظریات کے زیر اثر صرف چار عناصر: مٹی، پانی، ہوا، اور آگ[۲۷] تسلیم کئے جاتے تھے۔ ایسے تاریک دور میں قرآن عظیم نے کائنات کے تمام اجزا و عناصر کو اصولی طور پر "تین قسموں" میں تقسیم کر کے ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے، جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ اس لحاظ سے یہ سارے سالمات و مرکبات قرآنی نقطۂ نظر سے محض اس کے ایک اعجازی اور حیرت انگیز لفظ " ولا اکبر " (ایٹم سے بڑا اجزاء) کے تحت آجاتے ہیں۔ اور تمام کیمیاوی علوم " و مثقال ذرۃ فی الارض ولا فی السماء ولا اصغر من ذلک ولا اکبر " کے ہمہ گیر کلیہ میں اصولی طور پر سما جاتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ تمام علوم نہ صرف بصیرت افروز ہیں بلکہ عملاً بہت اہم اور مفید بھی۔

ایٹم کو طاقتور سے طاقتور خوردبین کے ذریعہ دیکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ابھی حال ہی میں ایک نئی انتہائی طاقتور اور جدید ترین خوردبین ایجاد ہوئی ہے، جس کے ذریعہ پہلی مرتبہ ایک تنہا ایٹم کو دیکھنا اور کیمیاوی طور پر اس کو شناخت کرنا۔ دیگر عناصر سے ممکن ہو سکا۔ اس نئی

۲۶ھ Asimov's Guide to Science, Vol. 1, p. 236.

۲۷ھ ایک پانچواں عنصر "ایتھر" بھی مانا جاتا تھا۔

خوردبین کو "جوہری تفتیش کی میدانی رون خوردبین (atom probe field ion microscope) کا نام دیا گیا ہے۔ جس کے ذریعے کسی چیز کو بیس لاکھ سے پچاس لاکھ گنا بڑا کر کے دکھایا جاتا ہے[۲۸]۔

علم کیمیا کا یہ سارا مطالعہ بادی النظر میں بہت بڑا گورکھ دھندا معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ سب درحقیقت عملی تجربوں (experiments) سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے اکثر مسائل دو اور دو چار کی طرح بالکل واضح ہیں۔ سائنسی لیبورٹریوں میں ان علوم اور ان مادوں، سالمات و مرکبات پر مسلسل تجربات ہو رہے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں نئے نئے مرکبات معرض وجود میں آرہے ہیں اور اسی اعتبار سے نئی نئی صنعتیں جنم لے رہی ہیں۔ آجکل ایسی بہت سی صنعتیں وجود میں آچکی ہیں جن کا دارومدار نامیاتی مرکبات پر ہے۔ مثلاً مختلف قسم کے طبی ادویات[۲۹]، پلاسٹک کی مصنوعات، ڈیٹرجنٹ (detergents) صابن اور دیگر صفائی کے کام میں استعمال ہونے والے قسم ہا قسم کی مصنوعات)، پارچہ بافی، رنگ سازی اور دیگر بہت سی صنعتیں، جن میں کاربن یا کاربونک اشیاء استعمال کی جاتی ہیں۔ صرف پٹرولیم اور کوئلے سے۔ یہ دونوں بھی کاربن گروپ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کئی ہزار قسم کی صنعتیں چل رہی ہیں، جن کی تفصیلات کے ملاحظہ سے حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً پٹرولیم کی بعض صنعتیں (industries) یہ ہیں: پلاسٹک

۲۸۔ ملاحظہ ہو رسالہ "کاروان سائنس، جلد چہارم، شمارہ سوم و چہارم، ۱۱۳، نیز دیکھئے:

Asimov's Guid to Science Vol. 1, p. 233

۲۹۔ جدید طبی علوم (medical sciences) اور علم دوا سازی نے انہی "کیمیاوی اسرار" سے واقف ہو کر محیر العقول ترقی کی ہے۔ مثلاً مشہور دوا "پنسلین" محض ایک معمولی سی چیز پھپھوندی سے تیار کی جاتی ہے۔

مصنوعی ربر، جن سے موٹروں کے ٹائر وغیرہ بنائے جاتے ہیں؛ دھماکہ خیز مادے (جنگوں میں کام آنے والی اشیاء) مصنوعی ریشے (دھاگے وغیرہ)، خوشبویات، وارنش، مختلف قسم کے رنگ، موم، الکحل (اسپرٹ اور دیگر سیال مادے)، رقیق ایندھن، پکوان کی گیس، تارکول، چکنائی والے مادے (مثلاً گلیسرین وغیرہ)۔ پٹرولیم کی ان مصنوعات کو petrochemicals, کہا جاتا ہے۔ مغربی ممالک عربوں سے سستا تیل حاصل کر کے محض اپنی فنی جانکاری کی بناپر یہ مصنوعات تیار کرتی ہیں اور اربوں روپے کماتی ہیں۔

اسی طرح کوئلے جیسی معمولی سی چیز سے بھی پلاسٹک، دھماکہ خیز مادے، رنگ، ایندھنی گیس، تارکول، رقیق ایندھن، دوائیں، سرکہ، بینزین، ایسی ٹیلین، فینائیل، امونیا اور کیمیاوی کھادیں وغیرہ وغیرہ بے شمار صنعتیں وجود میں آچکی ہیں، جن کو دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ سب کی سب کوئلے جیسی معمولی اور حقیر چیز سے وجود میں آسکتی ہیں۔

یہ کیمیا کی جادوگری کا ایک مختصر سا نقشہ ہے۔ ان علوم کی اسی اہمیت کی بنا پر ایک نیا علم "صنعتی خوردبینی حیاتیات" (industrial microbiology) کے نام سے جنم لے چکا ہے۔ جس کے ذریعہ اس سلسلہ کے رازہائے ربوبیت کا پتہ چلانے میں مدد ملتی ہے۔

یہ نامیاتی کیمیا کا حال تھا۔ اب غیر نامیاتی کیمیا کا بھی ایک مختصر سا نقشہ ذہن میں رکھئے۔ غیر نامیاتی یا غیر کاربونک مرکبات کی اہم قسمیں یہ ہیں: آکسائیڈ (oxide) تیزاب (acid) کھار (base) اور نمک (salt) یہ دو یا دو سے زیادہ عناصر کے مجموعے ہیں، جن کے تعامل سے ہزاروں قسم کے تیزابی اور غیر تیزابی محلولات بنتے ہیں۔ اور جدید صنعتوں میں ان کا استعمال بہت عام اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

اسی طرح دریافت شدہ ۱۰۴ ۔ قدرتی و غیر قدرتی ۔ کیمیاوی عناصر میں تقریباً ۸۳٪ دھاتیں ہیں، جن سے ان کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ دھاتیں اپنی مختلف طبیعی خصوصیات کی بناء پر کئی زمروں میں تقسیم کی گئی ہیں۔ لوہا، تانبا، المونیم، میگنیشیم، میگنیز، کیلشیم، پوٹاشیم، سونا، چاندی، زنک، سیسہ، ٹین، کانسی، پیتل کرومیم، نکل، سوڈیم اور پلاٹینم وغیرہ سب کی سب دھاتیں ہیں۔ دھاتوں سے بہت سے طبیعی اور کیمیاوی فوائد حاصل کئے جاتے ہیں اور دو یا دو سے زیادہ دھاتوں کو ملا کر کوئی بہت ہی مضبوط دھات بھی بنائی جاتی ہے۔ سائنسی لیبوریٹریوں میں دن رات ان چیزوں پر تجربات ہو رہے ہیں۔ نئے نئے حقائق ظہور میں آ رہے ہیں اور ساتھ ہی نئے نئے مرکبات بھی۔

غرض کارخانۂ قدرت کے یہ مفردات اور مرکبات بے شمار فوائد کے حامل ہیں۔ ان کا تفصیلی علم حاصل کر کے آج انسان بر و بحر کی تسخیر کر رہا ہے اور خلاؤں میں تا نک جھانک کر کے افلاک پر ڈورے ڈال رہا ہے۔

میں نے اس موقع پر کوشش کی ہے کہ علم کیمیا اور خصوصیت کے ساتھ نامیاتی مرکبات کے چند بنیادی اصولوں کو ذہن نشین کرا دوں۔ یہ تمام اصول و ضوابط ہمہ گیر قانون الٰہی "وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ (اور ہر چیز اس کے پاس ایک خاص مقدار کے ساتھ ہے) کے تحت آتے ہیں۔

قومی معیشت بلکہ خلافت ارض کے نقطۂ نظر سے عناصر اور ان کا تفصیلی علم بہت ضروری ہے۔ خوش قسمتی سے یہ علم آج ہمارے سامنے نہایت درجہ مدوّن اور محقق شکل میں موجود ہے۔ آج ہم کو اس کی تحقیق و تدوین کی نہیں بلکہ صرف تحصیل کی ضرورت ہے۔ مگر اس سے زیادہ بد قسمتی اور کیا ہو گی کہ آج ہم اس انتہائی ضروری اور مفید علم کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے اس سے آنکھیں موند لیں اور اپنی حرماں نصیبی میں بدستور اضافہ کرتے رہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ط

اور اس نے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی موجود ہے، سب کا سب اپنی طرف سے تمہارے لئے رام کر دیا ہے۔ (جاثیہ: ۱۳)

کیمیا کے کرشمے

عناصر اور مرکبات سے متعلق ان بنیادی معلومات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب حسب ذیل ایک طویل اقتباس ملاحظہ فرمایئے، جس میں علم کیمیا اور جدید صنعتوں کے بہت سے راز پوری طرح فاش کر دیے گئے ہیں اور اسرار سربستہ کو بے نقاب کر دیا گیا ہے۔

"پٹرولیم اور ایندھن کی صنعت، صابن اور شیشے کی صنعت، کھادوں کی تیاری، دوسری صنعتی شاخوں اور کھیتی کے لئے کام آنے والی چیزوں کے بنانے میں تیزاب، کھار اور نمک بہت بڑی مقدار میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ پٹرولیم اور کولتار کو خالص کرنا، دھاتوں کا خالص حالت میں حاصل

ن۵۳ ان علوم کی اہمیت کے ساتھ ساتھ فن ریاضی (Mathamitics) کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ بغیر ریاضی میں کمال حاصل کئے ان علوم سے فائدہ اٹھانے کا تصور بھی مشکل ہے مثلاً کسی چیز (لوہا، تانبا، یا پیتل وغیرہ) کے ایک گرام مقدار مادہ (MASS) کو پگھلانے کے لئے جب اتنی حرارت یا توانائی کی مقدار درکار ہو گی تو اسی چیز کے ایک ہزار ٹن مقدار مادہ کو پگھلانے کے لئے کس قدر توانائی درکار ہو گی اور عملاً اس پر تخمیناً کتنا خرچ آئے گا؟ نیز اسی طرح مختلف دھاتیں کتنے درجۂ حرارت پر پگھلتی ہیں اور ان کی نوعی خصوصیات کیا ہیں؟ اس قسم کے سیکڑوں فنی سوالات پیدا ہوتے ہیں جنھیں ریاضی کی مدد سے حل کر کے ہر کام کا پہلے ہی سے منصوبہ بنا لیا جاتا ہے۔ بغیر ریاضی اور حساب کے کسی صنعت یا کارخانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

کرنا یہ اور اس طرح کی بہت سی اہم چیزیں بنانا سلفیورک ایسڈ اور اس کے نمکوں کے بغیر ناممکن ہے۔

نائٹروجن کھادیں، دھماکہ خیز مادے اور بہت سی دوائیں بنانے کے لئے نائٹرک ایسڈ اور اس کے نمکوں کا استعمال لازمی ہے۔

صابن اور شیشے کی صنعت میں پٹرولیم سے حاصل شدہ چیزوں (پٹرول اور مٹی کا تیل وغیرہ) کو خالص کرنے میں، کپڑے کی رنگائی میں، نان فیرس دھاتوں[۱۳۵] خاص طور پر ایلومنیم کی پیداوار میں کھار اور سوڈے کا استعمال بہت ضروری ہے۔

آج کل بالکل ہی نئی خصوصیات والی چیزیں بنانے کی بھی بہت اہمیت ہوگئی ہے۔ جدید صنعت کو ایسے مادوں کی ضرورت ہوتی ہے جو نہ صرف سخت اور مضبوط ہوں بلکہ ساتھ ہی ساتھ ہلکے اور زنگ مزاحم بھی ہوں اور ان کو کم اور زیادہ دونوں درجۂ حرارت پر استعمال بھی کیا جا سکتا ہو ان تمام خصوصیات کے علاوہ یہ چیزیں سستی اور آسانی کے ساتھ حاصل بھی ہو سکتی ہوں۔ دھات، لکڑی اور پتھر میں ایسی انوکھی خصوصیتوں کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ علم کیمیا ہی نے ہمیں ایسی بہت سی چیزیں عطا کی ہیں جن میں انوکھی خصوصیتیں ہوتی ہیں۔

(پلاسٹک کی بنی ہوئی چیزوں سے ہر ایک واقف ہے) گھروں میں استعمال ہونے والی چیزوں کے علاوہ موٹر کار، ریل گاڑی، ورکشاپ اور کھیتی میں پلاسٹک کی چیزوں کا کافی استعمال ہوتا ہے۔ یہ زیادہ مولیکیولی وزن والی چیزیں (پولیمر) جنھیں پلاسٹک کہتے ہیں کارک سے زیادہ ہلکی اور فولاد سے زیادہ سخت ہو سکتی ہیں۔ یہ "تیزاب مزاحم" اور شفاف یا غیر

---

[۱۳۵] لوہا اور اس جیسی کالی دھاتوں کو "فیرس دھاتیں" کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس تانبا، المونیم اور ٹین وغیرہ قسم کی رنگین دھاتوں کو "نان فیرس دھاتیں" کہتے ہیں۔

شفاف بھی ہو سکتی ہیں۔ آج کل قومی معیشت کا ایسا کوئی حصہ نہیں ہے جس میں پلاسٹک کا استعمال نہ ہوتا ہو مشینوں کے پرزے، نل، جہاز، موٹر کار، ہوائی جہاز اور دیگر چیزوں کے بنانے میں پلاسٹک کی بڑی اہمیت ہے۔ پلاسٹک دھاتوں سے ہلکی ہوتی ہے اور اس وجہ سے دھات کی مقدار کے مقابلے میں اتنے ہی وزن کی پلاسٹک سے زیادہ چیزیں بنائی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ۵ ٹن نان فیرس دھات کی جگہ صرف ایک ٹن پلاسٹک سے کام چل سکتا ہے۔ پلاسٹک اور اس سے بنی ہوئی چیزوں کی پیداوار دھاتوں اور ان سے بنی ہوئی چیزوں کی پیداوار کے مقابلے میں سستی ہوتی ہے۔

آج کل کیمیائی صنعتی کارخانوں میں مختلف قسم کی ہزاروں چیزیں بنائی جارہی ہیں، جن کے استعمال سے صنعت کو کروڑوں روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔

خوبصورت پلاسٹک کے بنانے میں کوئلہ، پٹرولیم، قدرتی گیس، چونے کا پتھر، کھانے کا نمک اور لکڑی وغیرہ بطور خام مال استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ پودوں اور کھیتوں سے حاصل ہونے والی بے کار چیزیں (جیسے بھوسا اور پودوں کے ڈنٹھل) بھی پلاسٹک بنانے کے کام آتے ہیں۔

قدرتی چیزوں کی جگہ ویسی ہی یا ان گنت خصیتوں والی مصنوعی چیزیں بنانے میں علم کیمیا نے ہماری بڑی مدد کی ہے۔ مثلاً ربڑ پٹرول سے حاصل کیا جاتا ہے۔ بھارت، سری لنکا، ملیشیا اور سنگاپور ان ملکوں میں سے ہیں جہاں ربڑ کی صنعت بڑی ترقی پر ہے۔ لیکن سائنس دانوں نے مصنوعی ربڑ ایجاد کر لیا ہے۔ آج کل دنیا میں کئی قسم کے مصنوعی ربڑ پائے جاتے ہیں۔ مصنوعی ربڑ کی پیداوار کی وجہ سے قدرتی ربڑ کی تجارت پر برا

اثر پڑ رہا ہے۔ ربڑ سے تقریباً چالیس ہزار مختلف قسم کی چیزیں بنائی جاتی ہیں
نئے ریشے بنانے میں بھی علم کیمیا کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آج کل سیلولوز (لکڑی کے ریشے) سے بہت مضبوط اور خوبصورت کپڑا بنایا جا رہا ہے۔ ایک ٹن لکڑی سے ڈیڑھ ہزار میٹر مصنوعی ریشم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اتنا ہی قدرتی ریشم حاصل کرنے کے لئے ہم کو تقریباً پانچ لاکھ ریشم کے کیڑے پالنے ہوں گے۔

پٹرولیم، کوئلے اور قدرتی گیس سے ہم مصنوعی اون اور "فر" (سموٗر) حاصل کر سکتے ہیں۔ مصنوعی ریشے قدرتی ریشوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اور ٹکاؤ والے ہوتے ہیں، اور ان میں کیڑا بھی نہیں لگتا۔ صابن بنانے میں ہزاروں ٹن چربی اور تیل استعمال ہوتا ہے۔ پٹرولیم سے بنائے جانے والے "ڈیٹرجنٹ" (جو صابن سے زیادہ اثر کرنے والے ہیں) حاصل ہو جانے سے اس کام کے لئے استعمال ہونے والی چربی اور تیل کھانے کے کام آجاتے ہیں جس سے کسی حد تک خوراک کا مسئلہ حل ہونے میں مدد ملتی ہے۔

ابھی تک مصنوعی ربڑ صرف الکوحل سے بنایا جاتا تھا اور یہ الکوحل خود اناج یا گڑ سے حاصل ہوتا ہے، جو کہ اہم غذائی چیزیں ہیں پٹرولیم کی گیس اب الکوحل کی جگہ استعمال کی جانے لگی ہے۔ اس لئے یہ غذائی چیزیں کھانے کے کام میں آسکتی ہیں۔

کھیتی میں بھی علم کیمیا نے ہماری زبردست مدد کی ہے مثلاً کیمیائی کارخانوں میں مختلف طرح کی کیمیائی کھادیں بنائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ کیمیائی صنعتوں میں جراثیم کش دوائیں، پودوں کی نشو و نما کے لئے مرکب، پیڑوں کو بیماریوں سے بچانے اور ان کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں کو مارنے کے لئے اور بھی بہت سی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ اناج

کی پیداوار بڑھانے میں کیمیائی چیزوں کی بڑی اہمیت ہے۔

عمارتیں بنانے کے شعبے میں بھی علم کیمیا کا بڑا اہم کردار ہے۔ اس کے ذریعہ عمارتیں بنانے میں کام آنے والی چیزیں جیسے چونا، سمنٹ، اینٹ اور رنگ وغیرہ حاصل ہوتے ہیں۔ عمارتیں بنانے میں اب پلاسٹک کا بھی استعمال ہونے لگا ہے مثال کے طور پر "فوم پلاسٹک" بہت ہلکی، مضبوط اور حرارت مزاحم چیز ہے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے فریم وغیرہ بنانے میں بھی کئی طرح کا پلاسٹک کام میں آتا ہے

کپڑے کی صنعت، اناج کی پیداوار، شیشے کی صنعت اور کاغذ وغیرہ کی صنعت میں علم کیمیا کا ایک اہم مقام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم کیمیا قومی معیشت کے تمام شعبوں کی ترقی میں ایک بہت ہی اہم مقام رکھتا ہے"[۲۳۵]

جوہری توانائی اور آئی سوٹوپ کی کرشمہ سازیاں

یہ طبیعیات اور کیمیا اور ان کی کارفرمائیوں کی محض ایک جھلک تھی۔ اب تکملے کے طور پر ایٹمی قوت اور اس سے حاصل ہونے والے محیرّ العقول فوائد کا بھی تھوڑا سا حال سن لیجئے تاکہ موجودہ علوم کی ترقی اور جدید تمدنی فوائد کی پوری تصویر سامنے آجائے۔

جوہری توانائی بیسویں صدی کی سب سے مشہور اور اہم دریافت ہے جس نے عصر جدید میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ اسی وجہ سے ایٹم کے مرکزہ (nucleus) کو اب بہت اہمیت حاصل ہوگئی ہے اور یہ ایک مستقل اور بہت ہی اہم بلکہ اہم ترین علم بن گیا ہے۔ اور اس موضوع

---

۲۳۵ ملخص از علم کیمیا، حصہ دوم ص ۲۰۱ – ۲۰۵، مطبوعہ ترقی اردو بورڈ (بعض مقامات پر خفیف سے ردوبدل کے ساتھ)

پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں[۴۳]۔

اس علم کو "مرکزائی طبیعیات" (نیوکلیر فزکس) کہا جاتا ہے۔ ایٹم اور اس کا مرکزہ نا قابل قیاس حد تک ننھی سی چیز ہے۔ مگر اس میں موجود شدہ پوشیدہ توانائی کو دیکھتے ہوئے اس کو "تباہ کارانہ حد تک بڑی چیز" کہا جا سکتا ہے۔ اس پوشیدہ اور دیو ہیکل طاقت کو۔ اس کی فوجی اور عسکری اہمیت کی بنا پر۔ حاصل کرنے کے لئے آج دنیا کا ہر ملک بے چین نظر آرہا ہے۔ اور اس کی وجہ سے ترقی یافتہ قوموں کے درمیان رقابت اور کشمکش کا ایک طویل اور نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

ایٹم ایک انتہائی درجہ ننھا سا ذرہ ہے۔ اس قدر ننھا کہ خالی آنکھ سے نظر آنے والی کسی چیز کے چھوٹے سے ذرہ میں تقریباً ایک ارب ایٹم ہوتے ہیں۔ خالص ریڈیم کے ایک گرام وزن میں تقریباً چالیس ارب ایٹم ہر سکنڈ منتشر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نصف گرام ریڈیم کے

۴۳ھ مگر بدقسمتی سے اردو زبان کا دائرہ اس سلسلے میں بہت تنگ ہے۔ اور اب تک میری نظر سے صرف یہ چند کتابیں گزر سکی ہیں:

۱۔ ایٹم آپ کا خادم، مطبوعہ انڈین اکیڈیمی، نئی دہلی۔

۲۔ ایٹم کی کہانی، مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی۔

۳۔ طبیعیات کے بنیادی تصورات، مطبوعہ ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی۔

(اس میں ضمناً ایٹم اور اس کے مرکزہ کا بیان بھی موجود ہے۔)

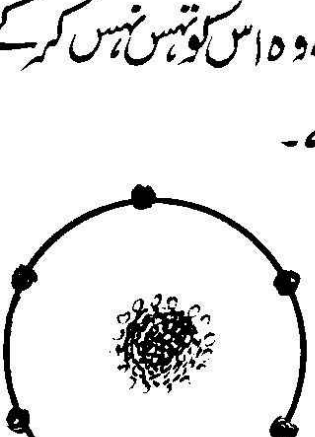
۴۔ جوہر کی سرگزشت، مطبوعہ لاہور (پاکستان)

مگر انگریزی زبان سے واقفیت رکھنے والوں کے لئے پورا ذخیرہ موجود ہے۔ مسلم معاشرہ میں علوم و فنون کو مروج کرنے اور انہیں ترقی دینے کے لئے ضروری ہے کہ تمام علوم و فنون کا ترجمہ قومی زبانوں میں کثرت کے ساتھ کیا جائے۔

ایٹموں کو منتشر ہونے میں ۱۶۲۰ سال کا عرصہ لگ جاتا ہے اور یہ عرصہ ریڈیم کی نصف زندگی کہلاتا ہے[۳۰۳]

شاید آپ ان ہوش ربا اعداد پر یقین نہ کریں مگر عملی تجربات کے پیش نظر آپ کو یقین کیے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ کوئی عقل مند آدمی کم از کم ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے وجود کا انکار تو نہیں کر سکے گا جو انہی ناقابل قیاس حد تک چھوٹے چھوٹے اجزا کی کارستانی ہے اور جس سے آج پوری دنیا خائف اور لرزاں و ترساں ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ طاقت کیا ہے اور کیسے حاصل ہو جاتی ہے؟ تو بات دراصل یہ ہے۔ جیسا کہ تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکیں — کہ ہر ایٹم کا مرکزہ (nucleus) جومر. ید چند ننھے ننھے ذرات کا مجموعہ ہوتا ہے (جن کو پروٹان اور نیوٹران کہتے ہیں) وہ ایک زبردست کشش اتصال کی بدولت باہم بڑی سختی کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان ذرات کو جب بزور الگ کیا جاتا ہے تو وہ اتنی ہی زبردست قوت وطاقت سے الگ ہوتے ہیں جتنی زبردست قوت وطاقت کے ذریعہ وہ باہم جڑے ہوئے تھے اور ان کی راہ میں جو چیز بھی حائل ہو جاتی ہے وہ اس کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں، حتیٰ کہ پہاڑ تک سرمہ بن جاتا ہے۔



ایٹم کا مرکزہ جس میں چند پروٹان اور نیوٹران باہم جڑے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔

یہ حیرتناک اور دیوزاد توانائی حاصل کرنے کے لئے ایٹم کے مرکزہ کو

۳۰۳؎ ملاحظہ ہو ایٹم آپ کا خادم، ص ۲۳

بڑی زبردست قوت کے ساتھ توڑنا پڑتا ہے جس کو عمل فشن (fission) کہتے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک گلاس پانی میں اتنی ایٹمی قوت ہوتی ہے جو ایک بڑے سے بڑے اسٹیمر کو بحر اٹلانٹک پار کرا سکتی ہے۔ آئین اسٹائن کے فارمولے $E = MC^2$ کے مطابق ایک پونڈ یورنیم کے مکمل فشن کے ذریعہ اتنی قوت حاصل ہو گی جتنی کہ پندرہ سو ٹن کوئلے کو جلانے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

یہ جوہری توانائی یا ایٹمی قوت تعمیری اور تخریبی دونوں پہلو رکھتی ہے۔ انسان اگر چاہے تو اس کے ذریعہ مفید مطلب کام لے کر کائنات ارضی کو گل و گلزار میں تبدیل کر سکتا ہے یا اس کے مضر اور خوفناک روپ کا مظاہرہ کر کے اس کو جہنم زار بھی بنا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے مفید پہلوؤں کے مطابق آج انسان اس قوت کے ذریعہ گھروں اور کارخانوں کو روشن کرنے اور بڑی بڑی مشینوں کو چلانے کے لئے بجلی پیدا کر رہا ہے (جس کو ایٹمی بجلی کہتے ہیں) اس قوت کے ذریعہ بحری جہازوں اور آبدوزوں کو چلا رہا ہے۔ اور مستقبل کے ہوائی جہازوں اور ٹرینوں کو چلانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔

اس کے علاوہ طب، کاشت کاری اور صنعت و حرفت کے مختلف میدانوں میں بھی اس پوشیدہ قوت کے ذریعہ انسان حیران کن فوائد حاصل کر رہا ہے، جس کی بدولت وقت اور پیسہ دونوں کی بچت ہو رہی ہے۔ چنانچہ تابکار آئی سوٹوپ[ف۳۵] (radio isotope)

ف۳۵ بعض قدرتی ایٹموں مثلاً ریڈیم کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ اس کا مادہ شعاعوں کی شکل میں اس کے جسم سے مسلسل (بقیہ اگلے صفحہ پر)

یا ٹریسر (tracer) کی مدد سے آج زراعت کے وسائل کو بہتر بنایا جا رہا ہے۔ اس کے ذریعہ پودوں میں کھاد کی نقل و حرکت کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ پودوں کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے مختلف محرکات کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ پودوں کو کمزور کرنے والے اور بیماریاں پھیلانے والے حشرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ کسی قطعہ ارض کی پیداواری صلاحیت کا کھوج لگایا جاتا ہے اس طرح فصلوں کو بہتر سے بہتر بنانے اور زرعی پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور ایک حیران کن بات یہ ہے کہ اس آئی سوٹوپ کے ذریعہ سائنس داں پچیس ہزار سال تک کے پرانے پودوں اور حیوانات کی صحیح صحیح عمر کا پتہ چلانے کے قابل ہو گئے ہیں۔

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ) خارج ہوتا رہتا ہے۔ یہ شعاعیں یا نہایت درجہ ننھے ننھے ذرات ایٹم کے مرکزہ سے تیزی کے ساتھ نکل کر قریبی اشیاء پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ مگر بعض ایٹموں میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی تو انھیں عمل فیوژن (fussion : ایٹم کے مرکزہ کو مزید نیوٹرانوں کے ذریعہ جوڑنے کا عمل) کے ذریعہ قدرتی ایٹموں کو مصنوعی ایٹموں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ یہ مصنوعی یا "انسانی ساختہ ایٹم" قدرتی ایٹموں کے برعکس بہت ہی ناپائیدار ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ریڈیم کے ایٹم کی طرح وہ بھی اپنے زائد ذرات (وہ ذرات جو عمل فیوژن کے ذریعہ ان کے مرکزہ میں داخل کئے گئے ہوتے ہیں) اپنے جسم سے خارج کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایٹموں کی اس شعاع زنی یا ذرات کے خروج ہی کا دوسرا نام تابکاری (radio activity) ہے۔
چونکہ ریڈیم ایک نہایت ہی قیمتی اور کمیاب عنصر ہے۔ اس لئے اس کے بدل کے طور پر کوبالٹ ۶۰ وغیرہ استعمال کئے جاتے ہیں جو ایک سستا اور وافر مقدار میں دستیاب ہونے والا عنصر ہے۔ مثلاً سو ڈالر کے کوبالٹ میں اتنی ہی تابکاری ہوتی ہے جتنی کہ بیس ہزار ڈالر کے ریڈیم میں۔

اسی طرح "آئی سٹوپ" کی طبی نقطۂ نظر سے اتنی اہمیت ہے کہ آج یہ ہسپتالوں میں "ڈاکٹری سامان" کا ایک ضروری جزو سمجھا جاتا ہے، جس کی بدولت ڈاکٹروں کو مختلف بیماریوں کا پتہ چلانے میں ملتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ ڈاکٹر مریض کے جسم کے اندرونی حصے کو اس طرح دیکھ سکتے ہیں جیسے وہ کوئی شفاف تجرباتی ٹیوب ہو۔ اس کے ذریعہ کینسر کا پتہ چلایا جاتا ہے، دفاعی رسولیوں کی کیفیت معلوم کی جاتی ہے اور دورانِ خون کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

یہ اس تابکاری آئی سوٹوپ کا کارنامہ ہے کہ آج اس کے ذریعہ برفباری کی پیمائش کی جاتی ہے، برف پوش کوہساروں سے آب پاشی کے لئے حاصل ہونے والے پانی کی مقدار کا صحیح اندازہ کیا جا رہا ہے۔ موسم کے تغیرات پر ریسرچ ہو رہی ہے جس کی بدولت ماہرین موسمیات موسمی حالات کے متعلق کسی حد تک قبل از وقت پیش گوئیاں کر سکتے ہیں۔ یہ اسی آئی سوٹوپ کا کرشمہ ہے جس کی وجہ سے جراثیم کشی کی جا رہی ہے اور غذائی اجناس کو عرصہ دراز تک محفوظ رکھنے کے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ اسی طرح صنعت و حرفت کے مختلف شعبوں میں آئی سوٹوپ کی اہمیت و افادیت مسلّم ہو چکی ہے، جس کی تفصیل طوالت کا باعث ہو گی۔

یہ تابکاری (radio activity) بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی اور زبردست نعمت ہے (جو باطنی نعمتوں کی فہرست میں آتی ہے) اور اس نعمت سے انسان آج زندگی کے ہر شعبے میں فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کی اہمیت کا حال اب یہ ہو گیا ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ ممالک اس کے بغیر زندگی محال تصور کرتے ہیں۔[۵۳۶]

---

۵۳۶ جوہری توانائی اور آئی سوٹوپ سے متعلق یہ ساری معلومات زیادہ تر کتاب "ایٹم آپ کا خادم" کی مدد سے فراہم کی گئی ہیں۔ یہ امریکہ کے دو مصنفین کی کتاب Atoms at Your Service کا اردو ترجمہ ہے۔

یہ نعمتیں کس کے لئے ہیں؟

یہ ہے "علم اسماء" کا فائدہ اور علم تسخیر کی معجز نمایاں جو ان دونوں چیزوں سے عاری قوموں کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ یہ علم اسماء اور علم تسخیر کی محض ایک جھلک ہے مکمل تصویر نہیں۔ مکمل داستان سرائی کے لئے شاید عمرِ خضر بھی ناکافی ہو۔ آپ کسی اچھی لائبریری کے شعبہ سائنس میں چلے جایئے اور مختلف سائنسی علوم کے ذخیرے پر نگاہ ڈالئے، تب آپ کو ان چیزوں کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ سائنس، صنعت اور ٹکنالوجی اور انجینئرنگ وغیرہ کے موضوعات پر لکھی ہوئی اگر تمام کتابوں کو ـــ مختلف زبانوں کی ـــ اکٹھا کر دیا جائے تو یقین ہے کہ ایک بہت بڑی اور عظیم الشان لائبریری بن جائے گی جو بلا مبالغہ لاکھوں کتابوں پر مشتمل ہو گی۔

غور فرمایئے کہ یہ تمام چیزیں اور یہ تمام مصنوعات کیا ہیں؟ کیا یہ سب "ظاہری و باطنی" نعمتیں اور نوازشات الٰہیہ نہیں ہیں؟

اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ وَ اَسۡبَغَ عَلَيۡكُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيۡرٍ کیا تم اس حقیقت سے واقف نہیں ہو کہ اللہ نے زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا دیا اور تم پر اپنی ظاہری و باطنی تمام نعمتیں پوری کر دیں! اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر واقفیت، بغیر دلیل اور بغیر کسی کتاب روشن کے جھگڑنے لگ جاتے ہیں (لقمان ۲۰)

وَاٰتٰىكُمۡ مِّنۡ كُلِّ مَا سَاَلۡتُمُوۡهُ ؕ وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ كَفَّارٌ ۚ اور اس نے تم کو وہ سب کچھ دیدیا جس کو تمہاری فطرت نے مانگا اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو

شمار کرنا بھی چاہو تو نہ کر سکو گے۔ یقیناً انسان بڑا ہی ناحق کوش اور ناشکرا ہے (جو ان نعمتوں سے مستفید ہونے کے باوجود کفر و معصیت کی راہ اختیار کرتا ہے۔ (ابراہیم ۳۴)

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو کبھی نہ گن سکو گے۔ واقعی اللہ بڑا ہی مغفرت والا اور بڑا ہی رحم دل ہے (جو انسان کی ناحق کوشی اور ناشکری کے باوجود ان نعمتوں کا سلسلہ منقطع نہیں کرتا، بلکہ اپنی نوازش ہائے کرم سے تمام انسانوں کو برابر نوازے چلے جا رہا ہے۔ (نحل ۱۸)

ان آیات کریمہ میں جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس مادی دنیا میں ودیعت شدہ فوائد سے مستفید ہونے کی راہ میں اپنی جن صلاحیتوں اور دماغ سوزیوں کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کی بنا پر وہ اکثر مغرور ہو جاتا ہے اور اس کے دماغ میں یہ جراثیم سرایت کرنے لگ جاتے ہیں کہ یہ سب میری اپنی صلاحیتوں اور ہنرمندیوں کا نتیجہ و ثمرہ ہے اور اس میں مجھے کسی اعلیٰ و برتر ذات یا کسی فوق الطبیعی قوت کے اقرار و اعتراف کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ اگر وہ غور کرے تو اس کو دو اور دو چار کی طرح صاف دکھائی دے گا کہ وہ جن مادی قوتوں اور جن مادی ضوابط سے مستفید ہو رہا ہے وہ خود خالق ارض و سما ہی کے ازل ہی سے مقرر کردہ فطری و طبیعی قوانین ہیں۔ اگر یہ کائنات بخت و اتفاق کا نتیجہ ہوتی تو پھر ناممکن تھا کہ ان مادی اشیاء کے تعامل سے ہمیشہ یکساں قسم کے نتائج ظاہر ہوتے۔ یہ انتہائی درجہ نظم و ضبط اللہ تعالیٰ ہی نے اپنی اس مادی کائنات میں اس لئے رکھا ہے کہ انسان اس میں ودیعت شدہ فوائد سے منظم و منضبط طور پر ـ بطور نوازشات الٰہیہ ـ مستفید ہو اور کفر و معصیت کی راہ ترک کر کے اس کا ممنون و مشکور ہو۔

اس نقطۂ نظر سے ان لوگوں کے غلط رویہ کی بھی اصلاح مقصود ہے۔

جو ایک خالق و مدبر ہستی کے وجود کا اعتراف کئے بغیر محض مادہ ہی کو سب کچھ تصور کر کے ان علوم و فنون میں منہمک و بدمست اور خداوند کریم سے غافل ہو گئے ہیں۔

مگر اس موقع پر دو سوال حاشیۂ ذہن میں ابھرتے ہیں: (۱) یہ نعمتیں کس کے لئے ہیں اور ان کا حقدار کون ہے؟ کیا صرف غیر مسلم یا مسلمان بھی؟ (۲) ان نعمتوں کا (بلکہ علم تسخیر کا) خلافت ارض سے کیا تعلق ہے؟ تو پہلے سوال کا ایک جواب ــ جیسا کہ پچھلے صفحات میں دیا جا چکا ــ یہ ہے کہ خدائی نعمتوں کا فلسفہ اصلاً یہ ہے کہ جو اس میدان میں کام کرتا ہے وہی اس کا مستحق بنتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ان آیات میں دراصل امت مسلمہ کو تسخیر فطرت (موجودات عالم سے منظم و منضبط طور پر استفادہ) کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ ان آیات میں خطاب اگرچہ عام دکھائی دیتا ہے مگر غور کرنے سے صاف دکھائی دیتا ہے کہ ان میں امت مسلمہ کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے۔ کیونکہ نہ صرف وہی اس عالم کون و فساد کی اصلاح کی اصل ذمہ دار اور صحیح معنی میں خلیفہ ہونے کی مستحق ہے بلکہ قرآن مجید کی اولین مخاطب بھی وہی ہے۔ لہٰذا قوم مسلم کا فرض ہے کہ وہ تسخیر اشیاء سے کام لے کر زمین کی پوشیدہ دولت اور اس کے پوشیدہ خزانوں سے استفادہ کر کے خداوند کریم کی طرف سے ان اشیاء میں ودیعت شدہ باطنی نعمتوں کو منظر عام پر لائے جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ق وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ بھی ہے سب تمہارے ہی لئے پیدا کیا ہے۔ (البقرہ ۲۹)

کیا ہمارے لئے ضروری نہیں ہے کہ قرآنی تصریحات کے مطابق "مقداروں کا علم" حاصل کر کے زمین کے جگر پاروں کو کام میں لائیں اور ان سے بھرپور فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی کو ہر حیثیت سے گل و گلزار

بنائیں؟ قوم مسلم اس ضروری علم اور قانون فطرت سے آخر کس بنیاد پر غفلت برت سکتی ہے؟ کیا اللہ تعالٰی نے ہمارے لئے یہ ارشاد نہیں فرمایا اور یہ خوشخبری نہیں سنائی کہ ان نعمتوں کے مستحق دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں اہل ایمان ہوں گے؟

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

کہدو کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی اس زینت کو جس کو اس نے اپنے بندوں کے لئے بنایا ہے اور کھانے پینے کی پاک اور ستھری چیزوں کو کس نے حرام کر دیا ہے؟ کہدو کہ یہ (تمام) چیزیں دنیا میں اہل ایمان کے لئے (بنائی گئی) ہیں اور قیامت کے دن تو خاص انہی کے لئے ہیں۔ سمجھدار وں کے لئے ہم اپنی آیتوں کو اسی طرح تفصیل سے بیان کرتے ہیں (اعراف ۳۲)

ان آیات کریمہ کی رو سے امت مسلمہ کے لئے جائز اور ضروری ہے کہ وہ اللہ کے قائم کردہ حدود میں رہ کر سارے جہان کی نعمتوں اور زمین کی تمام اشیاء سے استفادہ کرے اور فائدہ اٹھائے۔ اس سے بڑھ کر صاف اور صریح احکام اور کیا ہو سکتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ○ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ○ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے پانی برسایا۔ پھر اس پانی سے تمہاری روزی کی خاطر (طرح طرح کے) میوے

نکالے۔ اور کشتیوں کو تمہارے قابو میں کیا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلتی رہیں۔ (تاکہ تم جہاں چاہو باآسانی سفر کر سکو) اور دریاؤں کو مسخر کیا (کہ ان کی توانائیوں سے تم خاطر خواہ مستفید ہو سکو) اور تمہارے لئے رات اور دن کو کام میں لگایا (تاکہ تمہارے کام کرنے اور راحت پانے کے اوقات متعین ہو سکیں)۔ اور اس لئے (اس طرح) تمہارے (تمام فطری) مطالبات پورے کر دیے۔ (ابراہیم ۳۲-۳۴)

اَللّٰہُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِہٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۚ وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝

اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس میں کشتیاں اس کے حکم سے چل سکیں اور تاکہ تم اس کا فضل (روزی کے ذرائع) تلاش کر سکو۔ اس لئے کہ تم (اللہ کے) شکرگزار بن سکو۔ اور اس نے تمہارے لئے آسمانوں (اجرام سماوی) کی ساری چیزیں اور زمین کی ساری چیزیں — جو کچھ بھی موجود ہے سب کچھ اپنی طرف سے — تمہارے کام میں لگا دیا ہے۔ اس باب میں غور کرنے والوں کے لئے (قدرت خداوندی کے) دلائل موجود ہیں۔ (جاثیہ ۱۲-۱۳)

اور دوسرے سوال کا جواب — جیساکہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا — یہ ہے کہ خلافت اور علم تسخیر میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ محض معاشی اور تمدنی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ دینی، فوجی اور عسکری لحاظ سے بھی، جس کے نتیجے میں سیاسی اور بین الاقوامی اغراض و مقاصد بھی پورے ہوتے ہیں۔ علم تسخیر یا صنعت و ٹکنالوجی فوجی و عسکری نقطۂ نظر سے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ معاشی اور تمدنی حیثیت سے[۵۳]۔ لہٰذا ان علوم وفنون

---

[۵۳] اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے چھٹا باب۔

کو معمولی اور حقیر سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان علوم و فنون سے عاری رہ کر کوئی قوم صفحۂ ارض پر ہرگز زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کا خلیفہ ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔ جیسا کہ آج بین الاقوامی صورتِ حال سے ظاہر ہو رہا ہے۔ پھر ان نعمتوں کا صحیح حق دار بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس راہ میں خود سے محنت و مشقت کرنا بھی جانتا ہو۔ ورنہ کوئی آرام پسند قوم تو ان "نعمتوں" کی ــــ جو سامان معیشت اور مظاہر تمدن کی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں ـــ حفاظت بھی نہیں کر سکے گی، جو بغیر کسی محنت و مشقت کے محض روپیہ کے بل بوتے پر جمع کر لی گئی ہوں[۳۸]۔

ایک لمحہ فکریہ

غرض تکمیل خلافت اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے ان علوم و فنون سے واقفیت اور ان میں کمال حاصل کرنا نہ صرف ضروری ہے بلکہ حالات کی نزاکت کے اعتبار سے بعض صورتوں میں فرض کفایہ اور بعض صورتوں میں فرض عین ہے[۳۹]۔ ہمارے ایک ہاتھ میں قرآن و حدیث ہوں تو دوسرے ہاتھ میں علوم و فنون بھی ہوں۔ اور ہم کو ان دونوں میں ایک توازن قائم کر کے زندگی، خلافت اور نشأۃ ثانیہ کے میدان میں آگے بڑھتا چاہیے۔ ورنہ

۳۸ھ موجودہ بین الاقوامی حالات شاہد ہیں کہ آج محض روپے کے بل بوتے پر "سامان تمدن" تو جی بھر کر جمع کر لیا جا سکتا ہے مگر فوجی و عسکری نوعیت کی ہر چیز خریدی نہیں جا سکتی۔ یا اگر خریدی بھی جا سکتی ہے تو مشروط طور پر اور اپنی آزادی کو خطرے میں ڈال کر، مگر اس کے باوجود ان چیزوں کا صحیح استعمال بھی کالے دارد ہے۔ کیونکہ یہ چیز "فنی" قابلیت کے ساتھ محنت اور جفاکشی کی بھی طالب ہے۔

۳۹ھ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو چھٹا باب۔

ہم موجودہ طوفانی بھنور سے کبھی نہیں نکل سکتے۔ یہ دنیا مادی اسباب و وسائل کی دنیا ہے جن سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالےٰ نے جن چیز کے جو قوانین اور جو ضوابط بنا دیئے ہیں وہ ضرور پورے ہو کر رہتے ہیں۔لہذا ہمیں ہمت ہارے بغیر نئے عزم و حوصلے سے ایک راہِ عمل متعین کر کے اسلامی تاریخ کے موجودہ سب سے بڑے معرکے کو سر کرنا اور ایک نئی تاریخ بنانا ہے اور زندہ و بہادر قوموں کی صف میں اپنے آپ کو شامل کرنا ہے۔

پھر ہمارا مقصد محض خود کو طاقتور اور خود کفیل بنانا ہی نہیں بلکہ ہمیں موجودہ بگڑے ہوئے انسانی معاشرہ اور اس کے غلط فلسفوں، اس کے مضر و ہلاکت خیز تہذیبی اقدار، اس کے غلط تمدنی رجحانات، اس کی غیر صالح صنعتوں خصوصاً تباہ کن آلات و ہتھیار وغیرہ سب کی اصلاح بحیثیت "خیر امت" ہونے کے کرنی ہے۔ یہ ہمارا ایک اہم ملی اور انسانی فریضہ اور ہماری اجتماعی زندگی کا ایک اہم شعبہ ہے، جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سارے فوائد اور مفید نتائج اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ ہم مادی میدان میں بھی دیگر اقوام سے برتر نہیں تو کم از کم ان کے برابر تو ضرور ہو جائیں ورنہ کوئی کمزور اور مفلس قوم ان فرائضِ منصبی کو صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتی اور دنیا کی طاقتور اور احساس برتری کے نشے میں چور قومیں ایسی کمزور قوم کو خاطر میں نہیں لائیں۔ لہذا مادی حیثیت سے اپنے آپ کو طاقتور بنانا گویا کہ درحقیقت اپنے دین و ایمان کو طاقتور بنانا ہے۔ اس طرح ہم دینِ برحق اور اس کے صالح اقدار کو بھی غالب کر سکیں گے جو عند اللہ مطلوب و مقصود ہے۔

لہذا مسلم حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اس طرف خصوصی توجہ مبذول کریں اور اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے ملک و ملت کی بھلائی اور

اس کے دینی و دنیوی مفاد کی خاطر مثبت اقدامات کریں۔ اس سلسلے میں اگلے ابواب میں ان موضوعات پر تفصیلی بحث مختلف نقطہ ہائے نظر سے کی جارہی ہے اور عالم اسلام کو اس وقت درپیش صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے تجدید و اصلاح کی خاطر چند تجاویز پیش کی جا رہی ہیں۔

مگر موجودہ نفسیاتی حالات اور ذہنی کشمکش کی فضا کو بدلنے اور امت مسلمہ کو تعمیر عالم کی راہ پر پھر سے گامزن کرنے کے لیے سب سے پہلے ہمارے ذہنی جمود کو۔ جو ہماری ساری پس ماندگیوں اور بے چارگیوں کی علامت ہے۔ توڑنا اور موجودہ فکری پیمانوں کو بدلنا پڑے گا۔ ہمارے ملّی مسائل کو حل کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے کے لئے حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اور سائنٹفک طرز فکر۔ جو درحقیقت قرآن عظیم ہی کا پیدا کردہ انقلابی اور حقیقت پسندانہ طرز فکر ہے۔ اپنانا ہوگا۔ ہم اپنے اطراف کی دنیا اور اس میں کارفرما تکوینی اسباب و علل سے آنکھیں بند نہیں کرسکتے۔ اور نہ ہمیں ان حقائق کو نظر انداز کرنے کی قرآن و حدیث میں کہیں ہدایت کی گئی ہے۔ یہ اسباب و وسائل ہمارے ملّی و اجتماعی دفاع کے لئے کتنے اہم اور ضروری ہیں۔ ان کا اندازہ اگلے ابواب کی تفصیلات سے لگایا جا سکتا ہے۔

ہماری اس نکبت و ادبار میں چونکہ بعض تاریخی عوامل بھی کارفرما ہیں اور ہمارے ارباب ملت کی کچھ علمی کوتاہیاں بھی۔ اس لئے اگلے ابواب میں ان عوامل اور کوتاہیوں کا اصلاحی نقطۂ نظر سے ایک مختصر جائزہ لیا جاتا ہے، تاکہ ہماری ملّی سیرت کے تمام پہلو نمایاں ہوجائیں اور ہم ایک مکمل جائزے اور منصوبے کے ساتھ آگے بڑھ سکیں۔

چوتھا باب

خلافت ارض اور اسلام کا تاریخی کردار

- سائنس اور مسلمان
- مسلمانوں کے سائنسی کارنامے
- غیروں کا اعتراف
- مسلم قوموں کی موجودہ پس ماندگی کے بنیادی اسباب
- مسلم دور کا علمی سرمایہ غیروں کے پاس محفوظ
- قرآن مجید کا تاریخی کارنامہ
- علمی ارتقاء کا اصل محرک
- چند اہم ملاحظات

خلافت ارض اور اسلام کا تاریخی کردار

عالم انسانی پر اسلام کا علمی احسان

سائنس اور مسلمان

اس موقع پر قدرتی طور پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نظریاتی اعتبار سے قرآن حکیم میں جب اس قدر صاف اور صریح ارشادات موجود ہیں، جن کے ملاحظے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیروؤں کو مختلف علوم و فنون کی تعلیم سے نہ صرف یہ کہ روکتا نہیں بلکہ مختلف طریقوں سے ان کی ہمت افزائی بھی کرتا ہے تو خود مسلمان موجودہ دور میں اس قدر پس ماندہ اور مختلف علوم و فنون کی تحصیل میں پیچھے کیونکر رہ گئے؟

یہ ایک بہت اہم سوال ہے، جس کے جواب کے لیے پوری اسلامی تاریخ سے بحث کرنی پڑے گی اور بہت سے تلخ حقائق و واقعات کا جائزہ لینا پڑے گا۔ اور یہ ایک مستقل موضوع بحث ہے۔ مگر اس موقع پر مختصراً صرف اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم کی مثبت و ایجابی اور انقلابی دعوت فکر ہی کے باعث قرون وسطیٰ میں اہل اسلام نے دنیا بھر کے "بچے کچے" علمی سرمائے کو جمع کیا اور ان میں غور و خوض کر کے نئے سرے سے تمام علوم و فنون کو مدوّن کیا اور عملی سائنس (practical science) کی بنیاد ڈالی۔ اس سے پہلے علم کا جو کچھ سرمایہ تھا وہ محض نظری (theoretical) تھا۔ بغداد، قرطبہ (اسپین)، دمشق اور مصر وغیرہ میں بڑی بڑی یونیورسٹیاں، عظیم الشان کتب خانے، علمی

اکیڈمیاں، رصد خانے اور معمل (لیبوریٹیاں) وغیرہ قائم کیے۔ علماء، فضلاء اور سائنس دانوں کی خوب قدر دانی کی گئی۔ جس کے باعث علوم و فنون کو بہت ترقی ہوئی حتیٰ کہ تھوڑے ہی عرصے میں جابر بن حیان، محمد بن موسیٰ الخوارزمی، ابن الہیثم، ابوالعباس الفرغانی، محمد جابر البتانی، محمد بن زکریا الرازی، ابن سینا، ابوریحان البیرونی، ابن نفیس، ابوحنیفہ الدینوری، عمر خیام، ابن البیطار اور ابوالقاسم الزاہراوی جیسے نامور سائنس دان، محققین اور موجدین پیدا ہوئے۔ بطور مثال یہاں پر صرف چند نام گنائے گئے ہیں ورنہ اگر پوری طرح چھان بین کی جائے تو مسلم ناموروں کی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے اور ان کے کارناموں کی تفصیل کے لئے کئی دفتر درکار ہوں گے۔ اس لئے اس موقع پر صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے سائنسی کارنامے[1]

محمد بن زکریا رازی (۸۶۵ـ ۹۲۵ء) ایک زبردست طبیب اور کیمیا داں تھا۔ اس نے علم کیمیا پر بارہ کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے ایک بنیادی کتاب "کتاب الاسرار" ہے۔ اس کتاب کو مشہور مترجم جیراڈ Gerard نے ۱۱۸۷ء میں لاطینی زبان میں منتقل کیا،

---

[1] مسلم دور میں فلسفیانہ اور سائنسی علوم و فنون کی ترقی میں مختلف قوموں نے حصہ لیا مگر تقریباً سب کے سب چونکہ عربی زبان و ثقافت میں پوری طرح رنگے ہوئے تھے۔ اسی لئے سب کے سب عرب کہلائے۔ اور اسی مناسبت سے ان کے علوم بھی عربی علوم کے نام سے موسوم ہوئے مثلاً عربی فلسفہ، عربی طب وغیرہ۔ مگر اب ایک وسیع تر مقاصد کے پیش نظر اس طرز فکر کو بدلتے ہوئے بجائے "عرب سائنس" یا "عرب سائنس داں" کے "مسلم سائنس" اور "مسلم سائنس داں" کہنے کی ضرورت ہے۔

جو چودھویں صدی تک کیمیا وی معلومات کا بنیادی ماخذ رہی[۵۲]۔

رازی کا دوسرا اہم ترین کارنامہ کتاب "الحاوی" کی تدوین ہے، جو یونانی، ایرانی اور ہندوستانی (اور دیگر) طبی معلومات کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا لاطینی ترجمہ ۱۲۷۹ء میں ہوا۔ پھر ۱۴۸۶ء کے بعد یہ کتاب یورپ میں متعدد مرتبہ طبع ہوئی، جو صدیوں تک لاطینی مغرب کے دماغوں پر چھائی رہی[۵۳]۔ خوش قسمتی سے یہ کتاب اصل عربی میں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے ۲۵ جلدوں میں چھپ گئی ہے۔ اور اس کی ہر جلد ایک خاص فن (مرض) سے متعلق ہے۔ مثلاً امراض رأس پر ایک جلد ہے تو امراض عین پر ایک جلد ہے الخ

ابن سینا[۵۴] (۹۸۰ — ۱۰۳۷ء) ایک عظیم طبیب اور فلسفی تھا۔ اس کا خصوصی کارنامہ القانون فی الطب (Canon) کی تصنیف ہے، جو یورپ کی درسگاہوں میں بطور ٹکسٹ بک داخل نصاب تھی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف پندرھویں صدی کے آخری تیس سالوں میں لاطینی زبان میں اس کے پندرہ ایڈیشن شائع ہوئے۔ یہ زبردست کتاب ایک عرصہ دراز تک دنیائے طب کی انجیل بنی رہی[۵۵]۔

محمد بن موسیٰ الخوارزمی (۷۸۰ — ۸۵۰ء) ایک عظیم ماہر فلکیات اور

---

۵۲ History of the Arabs. by Philip K Hitty, p. 366, Tenth Edition, London, 1977.

۵۳ IBID

۵۴ انگریزی میں یہ Avicenna کے نام سے مشہور ہے۔

۵۵ ہسٹری آف دی عربس، از فلپ کے ہتی، ص ۳۶۶، لندن، ۱۹۷۷ء

ریاضی داں تھا۔ اس نے فلکیاتی جدولیں مرتب کیں اور جبر و مقابلے کے فن میں کتابیں لکھیں، جن کے آج صرف تراجم باقی رہ گئے ہیں۔ یہ فن ریاضی میں قدیم ترین تصنیفی عمل ہے۔ ان میں سے آخری کتاب "حساب الجبر و المقابلہ" میں آٹھ سو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ یارہویں صدی میں اس کا ترجمہ لاطینی میں جیرارڈ نے کیا اور یہ سولھویں صدی تک یورپ کی تمام یونیورسٹیوں میں درسی کتاب کی حیثیت سے مشہور و متعارف رہی۔[۵۶]

جابر بن حیان[۵۷] (پیدائش: ۷۲۱ء) علم کیمیا کا باوا آدم ہے۔ یہ نہ صرف اپنے دور کا سب سے بڑا بلکہ دنیا کا سب سے پہلا کیمیا داں ہے جس نے صحیح اصولوں کے تحت علمی تحقیق و تفتیش کی بنیاد مشاہدے و تجربے پر رکھتے ہوئے جدید علم کیمیا اور تجرباتی سائنس کی بنیاد ڈالی۔ وہ موجودہ بہت سے کیمیادی تجربات مثلاً حل کرنا، فلٹر کرنا، کشید کرنا، عمل تصعید sublimation کے ذریعہ اشیاء کا اڑانا اور قلماؤ (crystallization) کے ذریعہ اشیاء کی قلمیں بنانا وغیرہ سے واقف تھا اور ان سے بکثرت کام لیتا تھا۔ اس نے کوفے میں ایک تجربہ گاہ (لیبوٹری) قائم کی تھی جہاں وہ دن رات مختلف دھاتوں اور مرکبات پر تجربات کرکے نئے نئے اصول معلوم کیا کرتا تھا۔ پھر تحقیق و تفتیش کے بعد ان اصولوں کو کتابی شکل میں مدون کرتا تھا۔

بقول پروفیسر حتی چودھویں صدی کے بعد اگرچہ عربی اور لاطینی میں لکھی ہوئی سو سے زیادہ کتابیں اس کی طرف منسوب کر دی گئیں جو زیادہ تر جعلی ہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ بعض تصانیف صحیح ہیں۔ ان میں سے بعض کتابیں

---

۵۶ ہسٹری آف دی عربس، ص ۳۷۹

۵۷ یہ انگریزی میں Geber کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

آج بالکل محفوظ ہیں اور ان میں سے پانچ شائع ہو چکی ہیں۔ مثلاً کتاب الرحمۃ اور کتاب التجمیع وغیرہ۔ جابر بن حیان نے دھاتوں سے متعلق ارسطو کے نظریہ عناصر میں ترمیم کی اور اس کے نظریات اٹھارویں صدی کے موجودہ علم کیمیا کے آغاز تک خفیف سی تبدیلیوں کے ساتھ رائج رہے۔[۸]

ابو حنیفہ الدینوری (المتوفی ۲۸۲ھ مطابق ۸۹۵ء) دنیا کا سب سے پہلا محقق علم نباتات جس نے مختلف اقسام کے پودوں کی درجہ بندی کی اور اس موضوع پر دنیا کی سب سے پہلی کتاب "کتاب النبات" کے عنوان سے لکھی۔ خوش قسمتی سے اس کتاب کو نامور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ایڈٹ کر کے شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اس کی پہلی جلد منظر عام پر آ گئی ہے۔[۹] مگر اہل یورپ غلطی سے کارل لنئے الیس (Carl Linnaeus) ۱۷۰۷ – ۱۷۷۸ء کو نباتات کا سب سے پہلا محقق مانتے ہیں جو ابو حنیفہ الدینوری سے تقریباً نو سو سال بعد گزرا ہے۔[۱۰]

اس عظیم الشان کتاب کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور مصری عالم احمد امین تحریر کرتے ہیں: "اس میں صرف عرب نباتات پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ دیگر ممالک کے نباتات کا بھی تذکرہ ہے۔ اس طرح اس میں عرب ماہرین لغت اور دیگر مصنفین نے نباتات کے موضوع پر جو کچھ بھی تحریر کیا تھا ان سب کا احاطہ کرتے ہوئے ہر ایک پودے کا بلیغ طرز بیان کے ذریعہ اور بہترین انداز میں تعارف کرایا گیا ہے۔"[۱۱]

---

[۸] ہسٹری آف دی عربس، ص ۳۸۰ – ۳۸۱ (ملخص)

[۹] ملاحظہ ہو ماہنامہ معارف، ستمبر ۱۹۷۵ء

[۱۰] ملاحظہ ہو کتاب دنیا کے مشہور سائنس دان، مطبوعہ انڈین اکیڈمی، نئی دہلی۔

[۱۱] ضحی الاسلام، از احمد امین، ۱/ ۷ ۴، مطبوعہ بیروت۔

ابن الہیثم [۱۲] (۳۵۴ - ۴۳۰ ھ) مطابق ۹۶۵ - ۱۰۳۸ء) قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا ماہر طبیعیات، ریاضی داں، عالم فلکیات، فلسفی اور انجینیر تھا۔ اس نے ہندسی اور فعلیاتی علم المناظر [۱۳] سے متعلق بہت سی تحقیقات کیں اور جدید طبیعیات کی بنیاد ڈالی۔ اس سلسلے میں اُس نے جن اصولوں کی تحقیق و تدوین کی ہے وہ آج بھی بالکل صحیح اور موجودہ نظریات کے عین مطابق ہیں بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ در حقیقت اس عظیم سائنس داں کے وضع کردہ اصول آج تک جاری و ساری ہیں۔ مثلاً انعکاس (reflection) اور انعطاف (refrection) کے مباحث جو موجودہ طبیعیات کی رو سے روشنی light کی بحث کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس موضوع پر اس نے ایک معرکۃ الآرا کتاب "علم المناظر" کے نام سے لکھی۔ اس کی شرح علامہ کمال الدین الفارسی نے "کتاب تنقیح المناظر لذوی الابصار و البصائر" کے نام سے تحریر کی ہے۔ اور خوش قسمتی سے یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدر آباد کے اہتمام سے دو ضخیم جلدوں میں اب سے نصف صدی قبل شائع ہو چکی ہے۔ [۱۴]

"طبیعیات کی داستان" کے مؤلف نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ (علم المناظر کے اصولوں کی تحقیق و تدوین میں) جو کام ابن الہیثم نے انجام دیا ہے وہ فیثا غورث، کیپلر اور نیوٹن کے کاموں سے اہمیت میں کسی طرح بھی کم نہیں ہے .... اس کی "کتاب المناظر" کا ترجمہ لاطینی میں ۱۵۷۲ء

---

[۱۲] جو انگریزی میں Alhazen کے نام سے مشہور ہے۔

[۱۳] موجودہ اصطلاح میں اس کو بصریات یا opticals کہا جاتا ہے۔

[۱۴] ابن الہیثم کے تفصیلی کارناموں کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "الحسن ابن الہیثم" از زہیر الکبتی، وزارۃ الثقافۃ، دمشق۔

میں شائع ہوا۔[۱۵]

ابوریحان البیرونی (۳۶۲ — ۴۴۰ھ مطابق ۹۷۳ — ۱۰۴۸ء) مسلمانوں کا نابغہ اور عبقری Genius عالم جو اپنے دور کے تمام علوم پر حاوی اور یکتائے روزگار تھا۔ خصوصاً علم ریاضی و فلکیات میں بطلیموس کے بعد اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ وہ اپنے دور کی متعدد اور مشہور زبانوں کو جانتا تھا اور ان زبانوں کے سرمایۂ علم و ادب سے واقفیت رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے ہندوستان میں بھی کئی سال رہ کر سنسکرت زبان حاصل کی اور یہاں کے قدیم سرمایۂ علم کو عربی میں منتقل کیا۔ اس کے بہت سے کارناموں میں سے ایک کارنامہ علم فلکیات سے متعلق ایک مفصل انسائیکلوپیڈیا کی تدوین ہے جس میں اپنے دور تک کی تمام مشہور قوموں کے فلکیاتی نظریات کو نہایت درجہ دقت نظر کے ساتھ جمع کر کے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ان پر تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ بطلیموس (Ptolemy) کے نظریات تک اس کی تنقید سے بچ نہیں سکے جو ایک عرصۂ دراز سے لوگوں کے اذہان پر چھائے ہوئے تھے۔ یہ عظیم الشان اور بے مثال کتاب — جو صحیح معنی میں علمی کوششوں اور کاوشوں کا صحیح رخ متعین کرتی ہے — "القانون المسعودی" کے نام سے موسوم ہے۔ اور خوش قسمتی کی بات ہے کہ یہ کتاب دائرۃ المعارف کی کوششوں کی بدولت تین ضخیم جلدوں میں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔[۱۶]

۱۵؎ طبیعیات کی داستان از محمد نصیر احمد عثمانی، ص ۵۶، کراچی، ۱۹۵۱ء

۱۶؎ البیرونی کے حالات و واقعات اور اس کے کارناموں کی تفصیل کیلئے دیکھئے کتاب "ابوریحان البیرونی" از علی احمد الشحات، دارالمعارف مصر۔ نیز "البیرونی" از سید حسن برنی، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند۔

علامہ ابن نفیس (۱۲۱۱ — ۱۲۸۸ء) ایک بہت بڑا طبیب اور ماہر جراحت تھا۔ اسی نے سب سے پہلے اپنی کتاب "شرح التشریح" میں دوران خون (blood circulation) کا صحیح نظریہ پیش کیا اور اس سلسلے میں جالینوس اور ابن سینا کے نظریہ کی اصلاح کی۔ مگر یورپ کے فضلاء اس اکتشاف کو غلط طور پر ولیم ہاروے Harvey : ۱۵۷۸ — ۱۶۵۷ء) کی طرف منسوب کرتے ہیں جو تقریباً چار سو سال بعد گزرا ہے۔ تعجب ہے کہ انگریزی کی ایک طبی انسائیکلو پیڈیا میں اگرچہ ابن نفیس کا نام تو لیا گیا ہے مگر بالکل سرسری اور غلط انداز میں۔ گویا کہ ایک علمی تحقیق کو جھٹلاتے ہوئے اس پر پردہ ڈالنا مقصود ہے۔[۱۷]

ابوالقاسم الزاہراوی (۹۳۶ — ۱۰۱۳ء) ایک نامور طبیب اور جدید علم سرجری (surgery) کا بانی ہے۔ اس کی شہرۂ آفاق کتاب "التصریف" طبی معلومات کا ایک خزینہ ہے جس میں عمل جراحی (سرجری) پر بھی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ یہ اہم کتاب بھی صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں داخلِ نصاب رہی۔

ابوعبداللہ البتّانی (المتوفی ۳۱۷ھ مطابق ۹۲۹ء) ایک مشہور ماہر فلکیات تھا جس نے بطلیموس کی کتاب "المجسطی" کی اصلاح کی۔[۱۸]
عمر خیام (۴۴۰ — ۵۲۶ھ[۱۹] مطابق ۱۰۴۸ — ۱۱۳۱ء) ایک بلند پایہ ریاضی داں

---

[۱۷] تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب The Penguin Medical Encyclopedia, p. 207, Midllesex, England 1978.

[۱۸] دیکھئے جرمن مستشرق بروکلمان کی کتاب "تاریخ الآداب العربیۃ" ۲۲۲/۱ بحوالہ حواشی کتاب "صور الکواکب الثمانی والاربعین" ص ۲ — ۳، دائرۃ المعارف حیدرآباد۔

[۱۹] بتحقیق علامہ سید سلیمان ندوی "خیام" ص ۵۱ — ۶۰، اعظم گڈھ، ۱۹۷۹ء

اور ماہر ہیئت تھا۔ اس کی مرتب کردہ تقویم شمسی گریگوری (Gregory) کی
پیش کردہ تقویم سے (جو آجکل تمام مہذب دنیا میں رائج ہے) زیادہ صحیح ہے[۲۰]
پوپ گریگوری نے اس تقویم کو ۱۵۸۲ء میں پیش کیا تھا جو Gregorian
calender کہلاتا ہے[۲۱]

قرون وسطیٰ[۲۲] میں سائنس فلسفے سے الگ نہیں تھی بلکہ اس کی ایک شاخ تصور کی جاتی تھی جس میں ہیئت (فلکیات)، طبعیات اور عنصریات کے مباحث بھی داخل تھے۔ مگر مسلم دور میں اس میں جدید کیمیا، ارضیات (جیالوجی) حیاتیات (بیالوجی) اور فن ریاضی وغیرہ کا خصوصی اضافہ ہوا۔ سب سے زیادہ جن علوم کو ترقی ہوئی وہ طب، ریاضی اور فلکیات ہیں۔

غیروں کا اعتراف

جدید سائنس کی بنیاد اہل اسلام ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔ اور ایسے بہت سے ایجادات و اکتشافات ہیں جن میں اولیت کا سہرا اہلِ یورپ کے سر نہیں بلکہ درحقیقت مسلمانوں کے سر بندھنا ہے۔ (تفصیل کا یہ موقع نہیں)۔ اہلِ اسلام کی اس اولیت اور اُن کے کارناموں کا اعتراف خود مغرب کے بعض نامور فضلاء نے بھی کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر لیبان (مصنف تمدن عرب)، فان کریمر (مصنف مسلمانوں کی صنعت و حرفت) موسیو سیدیو (مصنف تاریخ عرب) اور ڈاکٹر جوزف ہیل (مصنف عربوں کا تمدن)

۲۰؎ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات، از عبدالرحمان خان، ۲۲۸/۱، دہلی

۲۱؎ A Short History of Astronomy, by Arthur Berry, pp. 23-24, New York, 1961

۲۲؎ middle ages جو تقریباً ۶۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک کا درمیانی دور مانا جاتا ہے۔

وغیرہ۔ اور ابھی پچھلے صفحات میں پروفیسر حتی کے بعض اعترافات اور حوالے گزر چکے ہیں اور بعض دیگر حوالے اگلے صفحات میں مذکور ہیں۔

اسپین چونکہ یورپ کا دروازہ تھا اس لئے یہاں کی علمی ترقی کا اثر یورپ کے دیگر ملکوں اور قوموں پر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ فطری طور پر مسلمانوں کے افکار اور ان کی علمی وفنی ترقیوں سے متاثر ہو کر پڑوسی قوموں نے بھی ان کا اثر قبول کرنا شروع کر دیا اور ان کی بلند پایہ تحقیقات و تصنیفات کے تراجم یونانی اور لاطینی زبانوں میں بکثرت ہونے لگے، جو اس دور کی علمی زبانیں تھیں۔ مسلمانوں کے ان علوم وفنون سے واقف ہو کر یورپین قومیں بھی ترقی کے میدان میں آگے بڑھنے لگیں۔ اس طرح بتدریج یورپ کی نشاۃ ثانیہ enaissanc کا دور شروع ہوا جو چودھویں صدی سے سولہویں صدی تک کا عرصہ مانا جاتا ہے۔

حتی نے اس سلسلے میں بہت صفائی کے ساتھ اور کھل کر اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"عربوں نے (قدیم ثقافت کو) قرون وسطیٰ کے یورپ تک پہنچانے میں ایک درمیانی واسطے کا کردار ادا کیا ہے۔ یہ ان کے ذہنی اثرات ہی کا نتیجہ تھا جو مغربی دنیا کی بیداری کا باعث بنا اور بالآخر موجودہ نشاۃ ثانیہ کے لئے راہ ہموار ہوئی۔ قرون وسطیٰ میں انسانی ترقیوں کے لئے کوئی قوم عربوں اور عربی بولنے والی قوموں سے بڑھ کر معاون و مددگار نہیں بن سکی۔"[۲۳]

یہی مصنف ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے:

"مسلم اسپین قرون وسطیٰ میں یورپ کی ذہنی ارتقاء کی تاریخ بنانے

۲۳؎ ہسٹری آف دی عربس، از فلپ کے حتی، ص ۴، لندن، ۱۹۷۷ء

میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ آٹھویں اور تیرھویں صدی کے درمیان، جیسا کہ ہم اس سے پہلے ملاحظہ کر چکے ہیں، عربی بولنے والے ہی پوری دنیا میں تہذیب و تمدن کے مشعل بردار رہے ہیں۔ مزید براں وہی قدیم سائنس اور فلسفہ کی بازیافت کا واسطہ بھی بنے۔ پھر ان (علوم) میں اضافہ کر کے انھیں اس طور پر منتقل کیا کہ (انہی کے باعث) مغربی یورپ کی نشأۃ ثانیہ ممکن ہو سکی۔ اس پورے عمل میں عربی اسپین کا بہت نمایاں حصہ ہے۔[۵۲۴]

نیز ایک اور مقام پر وہ تحریر کرتا ہے:

"تیرھویں صدی کے اختتام تک عربی سائنس اور فلسفہ یورپ منتقل کئے جا چکے تھے۔ اور اسپین کا رول بحیثیت ایک ثالث کے عمل میں آچکا تھا۔[۵۲۵] یہ ذہنی راستہ طلیطلہ کے ابواب سے نکل کر پیرینیز[۵۲۶] سے ہوتے ہوئے پروینس[۵۲۷] اور ایلپین کی گھاٹیوں سے گذرتا ہوا لورین جرمنی اور وسط یورپ پہنچا، جس طرح کہ رود بار انگلستان کو پار کر کے انگلستان میں داخل ہو گیا۔[۵۲۸]

مسلم قوموں کی موجودہ پس ماندگی کے بنیادی اسباب

یہ ایک تلخ مگر حیرت انگیز تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ کی بیداری

---

۵۲۴ ہسٹری آف دی عربس، ص ۵۵۷

۵۲۵ گویا کہ تاریخی اعتبار سے اس کا کردار پورا ہو چکا تھا اور قانون فطرت کے مطابق اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وتلک الایام نداولہا بین الناس۔

۵۲۶ Pyrenees ایک پہاڑ جو اسپین اور فرانس کے درمیان واقع ہے۔

۵۲۷ Provence اور Alpine

۵۲۸ ہسٹری آف دی عربس، ص ۵۸۹

اور اس کا عروج جس رفتار سے ہونے لگا اسی رفتار سے مسلم حکومتوں کا زوال شروع ہو گیا اور اس کے بہت سے تاریخی اسباب و عوامل ہیں۔ مگر یورپ نے اپنے "محسنوں" کا بدلہ اس طرح ادا کیا کہ "مسلم اسپین" کی ۱۴۹۲ء میں جب تباہی کی باری آئی تو اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور مسلمانوں کے تقریباً آٹھ سو سالہ تمدن کو تباہ و تاراج کر دیا گیا۔ تمام کتب خانے اور عظیم الشان علمی و فکری سرمایہ جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ وہ علمی و فکری سرمایہ جو صدہا سال کے غور و فکر اور تحقیق و تجربے کا نتیجہ تھا۔ جو کتابیں نذر آتش کی گئیں ان کی تعداد کا اندازہ دس لاکھ کے قریب ہے[۲۹]۔

بدقسمتی سے اس سے قبل ۶۵۶ھ مطابق ۱۲۵۸ء میں بھی بالکل اسی قسم کا جگر خراش واقعہ پیش آچکا تھا۔ جب کہ ہلاکو خاں کی قیادت میں تاتاریوں کے سیلاب نے بغداد پر حملہ کر کے خلافت اسلامیہ کے چراغ کو گل کر دیا اور پانچ سو سال کے قیمتی علمی سرمائے کو دریائے دجلہ کے حوالے کر دیا۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید کے وقت صرف اس کے قائم کردہ "بیت الحکمۃ" (دنیا کا سب سے پہلا عظیم الشان کتب خانہ اور پبلک لائبریری) میں دس لاکھ کتابیں موجود تھیں[۳۰]۔ امراء اور حکماء کے ذاتی کتب خانے اس کے علاوہ تھے۔ اور یہ دوسری صدی ہجری کی بات ہے۔ ۶۵۶ھ میں کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً بغداد میں کروڑوں کتابیں رہی ہوں گی جو موجودہ دور کی طرح کاغذ اور طباعتی سہولتوں کے حاصل نہ ہونے کے باوجود بہت ہی حیرت انگیز ہے۔ اور یہ واقعہ اس دور کے مسلمانوں کے علمی شغف اور ان کی علمی دلچسپیوں کو ظاہر کر رہا ہے۔

۲۹ے 'مسلمانوں کا عروج و زوال'، از مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ص ۲۰۲، دہلی، ۱۹۶۳ء

۳۰ے 'علوم عرب'، مصنفہ جرجی زیدان، ص ۲۳۶، بحوالہ 'اسلامی کتب خانے'، ص ۷۰

قرون وسطیٰ میں مسلم حکومتوں کا زوال بھی دراصل اسی بنا پر عمل میں آیا کہ اس دور کے حکمرانوں نے باہمی اتفاق و اتحاد کے جذبے کے تحت ملّت اسلامیہ کو مضبوط بنانے اور اقوام عالم کے مقابلے میں خود کو ایک سیسہ پلائی دیوار ثابت کرنے کے بجائے چند دنیاوی اغراض و مقاصد اور بعض قومی لسانی اور جغرافیائی تعصبات کی بنا پر اتحاد ملت کو پارہ پارہ کر دیا (جس طرح کہ موجودہ اسلامی ملکوں کا حال ہے)۔ اس انتشار اور طوائف الملوکی میں علم اور سائنس کی فطری ترقی رک گئی اور علمی جذبات و ولولے سرد پڑ گئے۔ کیونکہ علمی تحقیقات اور سائنسی ترقیاں مالی اعانت اور امراء و حکام کی سرپرستی چاہتے ہیں۔ اس راہ میں تحقیقات و تجربات پر روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے اور سالہا سال تک مسلسل اور انتھک جدو جہد کرنی پڑتی ہے۔ تب کہیں جاکر کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ جیساکہ سائنسی علوم اور ایجادات و اکتشافات کی تاریخ شاہد ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ایک سائنس داں کسی ایک تحقیق پر مسلسل تجربات کرتا ہے مگر اس کو کامیابی نہیں ہوتی مگر اس کے بعد والے سائنس داں اسی تجربے کو آگے بڑھاتے ہیں اور کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح سائنسی تحقیقات و تجربات منظم مسلسل اور مربوط عمل کے مقتضی ہوتے ہیں ورنہ کامیابی مخدوش ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب تک کوئی حکومت مضبوط و مستحکم نہ ہو اور وہ علوم و فنون کی پوری طرح سرپرستی نہ کرے اس میدان میں قابل ذکر ترقی کرنا ناممکن اور محال ہے۔ اور یہ بات صرف قرون وسطیٰ ہی نہیں بلکہ ہر دور پر صادق آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ترقی یافتہ ممالک سائنسی تحقیقات و تجربات پر روپیہ بے تحاشہ صرف کر رہے ہیں تاکہ موجودہ نظریاتی کشمکش کے دور میں وہ دیگر قوموں سے زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکیں اور زیادہ سے

زیادہ مادی قوت و شوکت حاصل کر کے بوقت ضرورت دیگر قوموں پر غالب آسکیں۔

قرون وسطیٰ اور پھر اس کے بعد عالیہ ادوار میں مسلمان فوجی اور سیاسی محاذ پر پسپا ہو کر جو منتشر ہوئے تو ان کا شیرازہ اب تک برابر بکھرا ہوا ہے۔ اور آج اگرچہ اکثر مسلم ممالک نے سیاسی آزادی حاصل کر لی ہے مگر فوجی اور سائنسی میدانوں میں وہ درجۂ صفر پر ہیں۔ ان میدانوں میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان ممالک کے اندر داخلی استحکام پیدا کیا جائے اور امن وامان کو ہر حال میں برقرار رکھا جائے۔ پھر پوری تندہی اور منصوبے کے ساتھ جد وجہد کی جائے اور کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیا جائے۔ ورنہ بہتر نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔

غرض انہی تمام وجوہات کی بنا پر آج مسلمان جدید علوم وفنون یا "علم اسماء" سے پچھڑے ہوئے ہیں۔ ان اسباب وعوامل کو مختصر طور پر دو بڑے عنوانوں میں اس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱ — آزاد اور علم دوست مسلم حکومتوں کے زوال کے باعث ان علوم میں تحقیق وتفتیش اور طالع آزمائی کا ذوق اور جذبہ دلوں سے نکل گیا۔

۲ — اوپر بیان کردہ تاریخی اسباب کے نتیجے میں بالآخر جب دین اور دنیا کی تقسیم عمل میں آئی تو علمائے اسلام نے غالباً دین کی حفاظت کے خیال سے دنیوی علوم سے کنارہ کشی ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

دین اور دنیا کی اس غلط تقسیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ "علم اسماء" کا دیا اپنوں کے بجائے غیروں کے آستانوں پر جلنے لگا۔ اور یہ دوری یہاں تک بڑھی کہ اب ہم اس کی روشنی سے بھی بدکنے اور دور بھاگنے لگے ہیں۔ اس طرح یہ علم اب ہمارے لئے بالکل اجنبی اور "علم غیر" بن گیا ہے۔

مسلم دور کا سرمایہ غیروں کے پاس محفوظ

اس موقع پر میں ایک خاص نقطے کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا علمی سرمایہ اور ان کے کارناموں کا حال مسلم حکومتوں کی تباہی و بربادی کے باعث دنیا والوں کی نظروں سے مستور ہو گیا سوائے بعض خال خال کتابوں کے جو کسی نہ کسی طرح اس عالمگیر تباہی سے بچ گئیں۔ اور پھر یورپ کی ترقی کی وجہ سے بھی دنیا مسلمانوں کے کارناموں کو بھول گئی۔ یعنی جدید علوم و فنون کی برق رفتار ترقیوں نے مسلمانوں کے کارناموں کو ماند کر دیا۔

مگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ اہل اسلام کا علمی دنیا پر احسان عظیم دکھائی دے گا کہ موجودہ علوم و فنون کی ترقی کی بنیاد دراصل اہل اسلام ہی کے علوم و فنون ہیں۔ یورپ کی یہ ترقی ممکن ہی نہ ہوتی اگر مسلمانوں کے علوم و فنون کا ترجمہ عربی سے یونانی، لاطینی اور دیگر یورپین زبانوں میں نہ ہوا ہوتا۔

اس لحاظ سے آج مسلمانوں کے علوم و فنون اور ان کے اصلی کارناموں کو جاننے کا ایک بڑا ماغذ خود یورپین زبانوں میں اہلِ اسلام کا یہ علمی سرمایہ بھی ہے جو دنیائے اسلام کے کتب خانوں کے برعکس تباہ و برباد ہونے سے بچ گیا ہے[۱۳۱]۔ انہی کتابوں کے ذریعہ اہل یورپ نے نہ صرف جدید علوم و

---

۱۳۱ اس لحاظ سے مسلمانوں کے کارناموں سے صحیح واقفیت کیلئے آج یونانی اور لاطینی زبانوں سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ موجودہ مسلم حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کر کے قرون وسطی کے علمی سرمائے کو اکھٹا کرنے اور اسے جدید زبانوں (خصوصاً عربی میں دوبارہ) منتقل کرنے نیز اس کی نشر و اشاعت کے لئے ایک محکمہ قائم کریں۔

فنون حاصل کیے بلکہ غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کے کارناموں کو اپنی طرف منسوب کرنے کی بھی کوشش کی (جیسا کہ اس سلسلے میں عام طور پر مغربی فضلاء کی روش رہی ہے)۔ اور پوری دنیا نے اس کو اپنی لاعلمی کے باعث باور کر لیا۔

قرآن مجید کا تاریخی کارنامہ

اس موقع پر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ یورپ کو سائنس کے میدان میں بامِ عروج تک پہنچنے کے لئے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی قربانی دینی پڑی جو کلیسا (church) اور سائنس کی کش مکش کا طویل اور خونی باب ہے۔ مگر اسلام کی تاریخ اس قسم کی کسی آزمائش اور عبرتناک داستان سے آشنا نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام عیسائیت کی طرح تجربے و مشاہدے کا دشمن اور علم کا گلا گھوٹنے والا نہیں بلکہ علم و تجربے کو پروان چڑھانے والا اور مشاہدے کی ہمت افزائی کرنے والا تھا۔

جیسا کہ واضح کیا جا چکا یورپ کی نشأۃ ثانیہ کی ساری ترقیاں قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے تجربات و مشاہدات اور بلند پایہ تحقیقات کا نتیجہ تھیں۔ اور مسلمانوں کی تمام ترقیاں قرآن حکیم کی انقلابی دعوتِ فکر کا منطقی نتیجہ تھیں، جو یونانی طرزِ فکر سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ لہٰذا مسلمان فکر یونان سے سیراب ہونے کے باوجود ارسطو اور دیگر حکماء کے مقلد جامد نہیں رہے، بلکہ انھوں نے قرآنی فکر اور اس کے منشا کے مطابق بہت جلد تجربات و مشاہدات شروع کر کے جدید سائنس کی داغ بیل ڈالی اور ایک بالکل نئے عہد کا آغاز کیا۔

قرآن حکیم دنیا کا وہ پہلا صحیفہ ہے جو غلط نظریات و مفروضات اور تقلید پرستی کی مذمت کرتے ہوئے نظامِ کائنات سے استدلال کرتا ہے

اور زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، ابر، ہوا، پہاڑ، مختلف حیوانات و نباتات وغیرہ تمام مظاہر فطرت کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کرنے کی مختلف اسالیب میں تاکید کرتا ہے، مثلاً:

اُنْظُرُوْا اِلٰی ثَمَرِہٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِہٖ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ غور سے دیکھو اُس کے پھل کو جب وہ پھلنے اور پکنے لگے۔ یقیناً اس باب میں ایمان لانے والوں کے لئے دلائل و نشانات موجود ہیں۔ (انعام: ۹۹)

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَیَّنّٰھَا لِلنّٰظِرِیْنَ ۝ اور ہم نے آسمان میں بہت سے بروج (کہکشائیں)[۳۲] بنادی ہیں اور بغور دیکھنے والوں کے لئے انہیں مزیّن کردیا ہے۔ (حجر: ۱۶)

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وقف وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وقف وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وقف وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ۝ وقف کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اونٹوں کی تخلیق کس طرح کی گئی ہے؟ اور آسمان کیسے اونچا اٹھایا گیا ہے؟ اور پہاڑ کس طرح مضبوطی سے نصب کئے گئے ہیں؟ اور زمین کس طرح (اس کی پوری گولائی میں) بچھائی گئی ہے؟ (غاشیہ: ۱۷-۲۰)

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط کہدو کہ تم غور سے دیکھو کہ زمین اور اجرام سماوی میں کیا کیا چیزیں موجود ہیں؟ (یونس ۱۰۱)

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ: کہدو کہ زمین میں چل پھر دیکھو تو سہی کہ تخلیق کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ (عنکبوت: ۲۰)

---

[۳۲] بروج سے مراد کہکشائیں ہونے کے دلائل اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

ان تمام آیات میں سب سے زیادہ قابل غور اور مرکزی لفظ "نظر" ہے، جس کے مشتقات انظروا، الناظرین اور افلا ینظرون ہیں۔ "نظر" کے معنی محض دیکھنے کے نہیں ہیں، بلکہ ماہرین لغت اور ائمہ تفسیر کے مطابق غور و فکر کرنے اور "نظر غائر" ڈالنے کے ہیں۔

نَظَرَہ : تأمّلہ بعینہ۔[۳۳] اس شخص نے (فلاں چیز پر) نظر ڈالی یعنی اپنی آنکھ کے ذریعہ اس چیز کا جائزہ لیا۔

الجوھری : النظر تأمل الشئ بالعین۔[۳۴] جوہری نے کہا ہے کہ نظر آنکھ کے ذریعہ غور کرنے یا جائزہ لینے کا نام ہے۔

امام راغب لکھتے ہیں : نظر کے اصل معنی کسی چیز کو دیکھنے یا اس کی (اصلیت) کا ادراک کرنے کے لئے آنکھ یا قوت فکر کو بار بار حرکت دینے (تقلیب) کا نام ہے۔ اور کبھی "نظر" سے مراد غور و فکر اور کسی چیز کی کھود کرید کرنا (مطالعہ و تحقیق) ہوتا ہے۔ اور کبھی اس سے مراد وہ معرفت ہوتی ہے جو غور و فکر کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے محاورہ میں کہا جاتا ہے : "نَظَرْتَ فَلَمْ تَنْظُرْ" : تو نے دیکھا مگر غور نہیں کیا۔ ارشاد باری (قل انظروا ماذا فی السمٰوٰت) میں انظروا کے معنی ہیں تأملوا۔ یعنی غور کرو۔ لفظ نظر کا استعمال عوام کے نزدیک زیادہ تر "رویت بصر" کے لئے ہوتا ہے، جب کہ خواص کے نزدیک اس کا استعمال زیادہ تر بصیرت کے لئے ہوتا ہے۔[۳۵]

یہ محض ائمہ لغت ہی کی تحقیق نہیں ہے بلکہ مفسرین نے بھی اس

۳۳۔ القاموس المحیط، از مجد الدین فیروزآبادی۔

۳۴۔ لسان العرب، ۵/۲۱۵، طبع جدید، بیروت، ۱۹۶۸ء

۳۵۔ مفردات القرآن، از راغب اصفہانی، ص ۴۹۷، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت۔

اس لفظ سے یہی معنی مراد لئے ہیں، چنانچہ اوپر جو آیات نقل کی گئی ہیں ان میں سے سورۂ انعام والی آیت کی تفسیر میں علامہ زمخشری تحریر فرماتے ہیں:

نظر اعتبار واستبصار واستدلال[۳۶]: عبرت و بصیرت اور استدلال کی نظر سے دیکھو۔

مفسر ابو سعود تحریر فرماتے ہیں:

أی انظروا الیہ نظر اعتبار واستبصار اذا أخرج ثمرہ[۳۷]: یعنی جب پھل نمودار ہونے لگے تو اس کو بچشم عبرت و بصیرت دیکھو۔

علامہ رشید رضا مصری تحریر فرماتے ہیں:

ای انظروا نظر تأمل واعتبار[۳۸] یعنی غور و فکر اور عبرت کی نظر سے دیکھو۔

اس لحاظ سے "نظر" محض سرسری طور پر دیکھنے کے نہیں بلکہ غور سے دیکھنے، غور و فکر کرنے، نظر بصیرت ڈالنے اور بچشم عبرت معائنہ کرنے کے ہیں۔ اب پچھلی آیتوں کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ "نظر" کا دائرہ عالم جمادات، عالم نباتات، عالم حیوانات اور عالم افلاک تک تمام مرئی و محسوس چیزوں اور کل موجودات پر محیط ہے۔

یہ قرآن حکیم کی ایک زبردست خصوصیت ہے کہ وہ سلبی اور ایجابی دونوں حیثیتوں سے اپنے متبعین کو خصوصاً اور نوع انسانی کو عموماً موجودات عالم کے مطالعے و مشاہدے پر ابھارتا ہے اور ان مظاہر و ظواہر کی ساخت و پرداخت اور ان کے نظاموں کا منظم مطالعہ کرنے نیز ان اشیا، و حوادث کے علل و اسباب کا پتہ لگا کر ایک مسبب الاسباب ہستی تک پہنچنے کی دعوت

---

۳۶ تفسیر کشاف، ۲/۴۰، مطبوعہ ایران۔

۳۷ تفسیر ابو سعود برحاشیہ تفسیر کبیر، ۴/۲۴۹، مطبع عامرہ مصر، ۱۳۲۴ھ

۳۸ تفسیر المنار، ۷/۶۴۳، دار المعرفہ، بیروت۔

دیتا ہے۔ وہ بار بار اتمام حجت کی خاطر الزامی طور پر کہتا ہے:

اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ ۙ کیا انہوں نے زمین و آسمانوں کی بادشاہت اور اللہ کی پیدا کردہ مخلوقات میں غور نہیں کیا؟ (اعراف: ۱۸۵)

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰہُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ

کیا انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا کہ (پہلے) زمین اور (تمام) اجرام سماوی باہم ملے ہوئے تھے، جن کو ہم نے جدا کر دیا۔ اور پانی ہی سے ہر زندہ چیز کو بنایا۔ تو کیا یہ لوگ (پھر بھی) ایمان نہیں لائیں گے؟ (انبیاء: ۳۰)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ ثُمَّ یُخْرِجُ بِہٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُہٗ ثُمَّ یَہِیْجُ فَتَرٰىہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَجْعَلُہٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ

اے مخاطب کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے بلندی سے پانی برسایا پھر اُس کو زمین کے سوتوں میں داخل کر دیا۔ پھر وہ اُسی پانی کے ذریعہ رنگ برنگی کھیتیاں نکال دیتا ہے۔ پھر وہ کھیتی خشک ہو جاتی ہے جس کو تو زرد ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ پھر وہ اُس کو چورا چورا کر دیتا ہے۔ اس باب میں دانش مندوں کے لئے ایک بڑی جھنجھوڑ دینے والی (خبر) ہے۔

(زمر: ۲۱)

اوپر دو قسم کی آیات نقل کی گئی ہیں قسم اول عملی سائنس (practical science) کی بنیاد ہیں، جن سے سائنسی علوم کی باقاعدہ تدوین عمل میں آتی ہے۔ اور قسم ثانی منکرین و معاندین کے لئے بطور اتمام حجت وارد ہوئی ہیں۔ اس طرح یک بینت دو کاج کے بمصداق قرآن کی نظر میں اس دعوت فکر و تحقیق کے دو بنیادی مقاصد ہیں، جن کی مختصر تشریح اس

طرح کی جا سکتی ہے :

۱۔ اسلام کے بنیادی مقاصد اور اس کے اساسی نظریات و معتقدات خصوصاً توحید، رسالت اور معاد کے اثبات اور ان کی صداقت و حقانیت کے لئے نظام کائنات سے دلائل پیش کرنا، تاکہ ان کی حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آجائے اور کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہ جائے۔ جیساکہ دوسرے مواقع پر اس اصول کی تفصیل اس طرح کی گئی ہے :

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ اور روئے زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں (صحیفۂ فطرت کی شکل میں) موجود ہیں۔ اور خود تمہاری ہستیوں میں بھی۔ کیا تم کو نظر نہیں آتا! (ذاریات : ۲۰-۲۱)

۲۔ اہلِ اسلام کو خصوصیت کے ساتھ تسخیر موجودات کی طرف راغب کرنا یعنی موجودات عالم میں جو طبیعی اور نوعی فوائد — قوانین فطرت کے روپ میں — موجود ہیں ان سے استفادہ کر کے انسانی زندگی کو بہتر بنانے اور دین برحق کے غلبے کے لئے فوجی و عسکری حیثیت سے قوت و شوکت حاصل کرنے کی ترغیب دلانا، تاکہ اس سے خلافت ارض کے دیگر مقاصد پورے ہوں اور اقوام عالم کی اصلاح کا فریضہ بھی انجام پائے۔ بالفاظ دیگر اہل اسلام سائنسی علوم و فنون میں ترقی کر کے اتنی قوت و طاقت بھی حاصل کر لیں کہ ایک حیثیت سے وہ دین الٰہی کو تمام ادیان پر — مادی نقطۂ نظر سے — غالب کر سکیں[۱۳۹] تو دوسری طرف دنیا میں خدائی فوجدار بن کر

---

۱۳۹ غلبۂ دین کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو دلیل و استدلال کے ذریعہ غالب کرنا۔ اور دوسرے مادی و ظاہری حیثیت سے برتری حاصل کرنا۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے یہ دونوں (بقیہ صفحہ ۲۳۳)

عدل و انصاف اور اصلاح عالم کا فریضہ بھی انجام دے سکیں۔ (کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ) اسی وجہ سے بنی آدم کو "علم اسماء" اور "علم تسخیر" سے بھی نوازا گیا ہے۔

علمی ارتقاء کا اصل محرک

ارباب فکر و نظر اس پر حیرت کرتے ہیں کہ اسلامی تاریخ کی ابتداء میں اہل اسلام نے جو بے مثال علمی اور سائنسی ترقی کی اور جس ذہانت اور اعلیٰ دماغی کا ثبوت دیا اُس کا اصل سبب کیا تھا؟ پروفیسر حتّی نے اس کو عربوں کی ذہانت و طباعی کے ساتھ ساتھ کچھ مخفی قوتوں اور صلاحیتوں کی کارفرمائی قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"عرب مسلمانوں نے اپنی معمولی سی سائنس، فلسفہ اور ادب سے (اپنی تحقیقات کا) آغاز کیا۔ مگر چونکہ وہ ریگستان سے اپنے ساتھ ذہنی تحقیق و تجسس کا شوق اور شدید احساس نیز علم کی گرویدگی اور اس سے حریصانہ حد تک رغبت و خواہش اور (بہت سی) مخفی قوتیں اور صلاحیتیں لے کر آئے تھے اس لئے وہ بہت جلد قدیم اور مہذب اقوام کے (علمی خزانوں کے) وارث و جانشین بن گئے، جن پر وہ یا تو غالب آگئے تھے یا جن سے اُن کا سابقہ پڑا تھا۔"[۹۶]

مگر سوال یہ ہے کہ یہ صلاحیت اور اعلیٰ دماغی ان میں کہاں سے آئی اور ان کی مخفی قوتوں کو کس نے بیدار کیا اور انہیں کس نے جلا بخشی؟ بلکہ خود

(بقیہ صفحہ ۲۳۲) پہلو بیک وقت مطلوب ہیں۔ ورنہ خاطر خواہ نتائج نکل نہیں سکتے اور دین برحق علمی اعتبار سے برحق ہونے کے باوجود مادی و عسکری حیثیت سے اپنا دفاع نہیں کر سکے گا جیسا کہ موجودہ حالات شاہد ہیں۔

۹۶۔ ہسٹری آف دی عربس، ص ۳۰۶

یہ مخفی قوتیں کیا تھیں اور تہذیب و تمدن سے عاری ایک تہی مایہ قوم میں اچانک کیسے پیدا ہو گئیں جو صدیوں سے خوابِ غفلت میں پڑی ہوئی تھی؟ کیا اس موقع پر قرآنِ عظیم کے سوا کوئی دوسرا قوی محرک بھی پایا جاتا ہے جس نے اپنی بے شمار آیات کے ذریعہ نہایت درجہ مؤثر اور طاقتور انداز میں ایک سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر کے اس کو مطالعہ فطرت اور اُس کے رازوں کو بے نقاب کرنے پر آمادہ کر دیا! اور علم و تحقیق کی ایسی سچی تڑپ اور لگن پیدا کر دی جس کے باعث وہ تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی خاطر علم و فن کے ہر ہر دروازے کو کھٹکھٹانا شروع کر دیا اور ایک پیاسے کی طرح مختلف سرچشموں پر بے تابانہ ٹوٹ پڑنے لگے[۱]

اس حیثیت سے دیکھا جائے تو قرآنِ عظیم پورے عالمی لٹریچر میں ایک منفرد اور عظیم الشان صحیفہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ قرآن ہی کا عطیہ اور اُس کی زبردست کارفرمائی تھی کہ ریگزارِ عرب کے بدّو اور اونٹ چرانے والے ایک

۱؎ مورخین نے مسلمانوں کے علوم و فنون کی طرف راغب ہونے کے بہت سے اسباب بیان کئے ہیں جو ثانوی درجے کے ہیں۔ اور بعض نے ارسطو سے متعلق مامون کا ایک خواب بھی بیان کیا ہے جو بڑا مضحکہ خیز ہے۔ اور اس پر احمد امین نے بھی تنقید کی ہے (ملاحظہ ہو ضحی الاسلام' ۱/۲۶۸)۔ اصل اور بنیادی سبب یہ تھا کہ قرآنِ عظیم نے فکری و نظریاتی اعتبار سے ان کی ذہن سازی اس انداز میں کر دی تھی اور ان میں روشن دماغی اور وسعت نظری کی ایسی روح بھر دی تھی کہ وہ پورے بین الاقوامی سرمائے علم پر قبضہ کر کے اس میں جدّت و اجتہاد کے نئے گل و گلزار پیدا کر سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہر علم و فن کو انہوں نے ایک متاعِ گرانمایہ کی طرح اپنے سینے سے لگایا اور جہاں سے بھی انہیں علم و حکمت کی بات معلوم ہوئی اس کو حاصل کیا۔ گویا کہ وہ اس کے لئے بالکل تیار اور پوری طرح مستعد تھے بلکہ انتظار میں تھے۔

قلیل عرصے میں انتہائی سرعت اور برق رفتاری کے ساتھ پوری مہذب دنیا پر چھا گئے اور رومی، ایرانی، سُریانی، ہندی اور یونانی علوم اور ثقافتوں کے مالک بن بیٹھے۔ حتّی نے بالکل صحیح اعتراف کیا ہے:

"(عباسی) دور وقائع عالم میں اس حیثیت سے نہایت ممتاز اور نمایاں ہے کہ اس دور نے اسلام کی تاریخ میں ایک مہتم بالشان اور افکار و ثقافت کی پوری تاریخ میں بہت ہی اہم اور وقیع ذہنی بیداری کا مشاہدہ کیا..... صرف چند دہوں میں عرب فضلا نے وہ سب کچھ اپنا لیا جس کو فروغ دینے میں یونانیوں نے صدیاں لگا دی تھیں[۲۴]۔"

قرآن عظیم نے اہل اسلام کے ذہن و فکر پر کتنے گہرے اور لازوال اثرات ڈالے ہیں اس کا اندازہ حسب ذیل دو اقتباسات سے کیجئے۔

۱۔ زکریا بن محمد قزوینی (۱۰۲۳ — ۱۲۸۳ء) اپنی مشہور کتاب "عجائب المخلوقات وغرائب الموجودات[۴۳]" کے مقدمے میں تحریر کرتے ہیں:

۴۲۔ ہسٹری آف دی عربس، ص ۳۰۶ — ۳۰۷

۴۳۔ اس کتاب کا تعارف "المنجد فی الادب والعلوم" (ص ۴۴۳، ۱۹۵۶ء) میں اس طرح کرایا گیا ہے: "یہ کتاب علم طبیعی، سیاست، تاریخ اور ادب کے نیرنگی مباحث کا مجموعہ ہے"۔ مگر ذاتی مطالعے سے معلوم ہوا کہ اگرچہ یہ اپنے دور کی معلومات کے لحاظ سے ایک اہم کتاب ہے مگر اس میں بعض ناقابل اعتبار باتیں بھی موجود ہیں جو محض (غالباً) تفنن طبع کے طور پر جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ زیادہ مستند نظر نہیں آتی۔ مگر اس کے مقابلے علامہ کمال الدین دمیری کی کتاب حیوٰۃ الحیوان الکبری بہت مستند اور جامع ہے۔ بلکہ یہ حیوانات سے متعلق سائنسی معلومات کے ساتھ ساتھ شرعی و فقہی معلومات کا بھی ایک خزینہ اور انسائیکلو پیڈیا ہے (واضح رہے کہ پہلی کتاب دوسری کتاب کے حاشیے پر دو جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔)

"یہیں اللہ تعالیٰ کی مخلوقات و مصنوعات، اس کے عجائب غرائب، اور اس کی صنعت کاریوں میں حسب ارشاد باری تعالیٰ "أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ" ۴۴ غور و فکر میں ڈوبا رہا۔ یہاں پر "نظر" سے مراد محض رویت یا سطحی نظر ڈالنا نہیں ہے، کیونکہ اس خصوصیت میں بہائم بھی انسان کے برابر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے آسمان میں سوائے نیلاہٹ کے اور زمین میں سوائے خاکیت کے کسی دوسری چیز کا مشاہدہ نہیں کیا وہ چوپاؤں میں شامل اور نہایت غفلت میں پڑا ہوا ہے۔ جیساکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا" ۴۵

یہاں پر "نظر" سے مراد معقولات میں تفکر کرنا، محسوسات میں نظر ڈالنا اور ان کی حکمتوں اور ان کے ہیر پھیر کا جائزہ لینا ہے، تاکہ ان مظاہر کے حقائق واضح (اور منکشف) ہو سکیں۔ یہ طریقہ دنیوی لذائذ اور اخروی سعادتوں کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ارنی الأشیاء کما ھی" (اے اللہ مجھے چیزیں اس طرح دکھا دے جس طرح کہ وہ واقعتاً موجود ہیں) اور جیسے جیسے ان اشیاء

---

۴۴ ترجمہ: کیا ان لوگوں نے آسمان کو غور سے نہیں دیکھا جو ان کے اوپر ہے کہ ہم نے اُس کو کس طرح بنایا اور اس کو مزین کیا جب کہ اس میں کسی قسم کا شگاف نہیں ہے۔

۴۵ ترجمہ: ان لوگوں کے دل تو ہیں مگر وہ اُن سے سمجھتے نہیں۔ آنکھیں تو ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ اور ان کے کان تو ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گئے گزرے۔

(کی ساخت و پرداخت میں) گہری نظر ڈالی جائے گی اللہ کی طرف سے اس کی ہدایت، یقین، روشنی اور حقیقت حال میں بھی اضافہ ہوتا جائیگا۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تفکروا فی خلق اللہ" (اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں غور و فکر کرو) معقولات میں غور و فکر وہی کر سکتا ہے جس کو (مختلف) علوم اور ریاضیات میں سوجھ بوجھ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ عمدہ اخلاق اور تہذیب نفس بھی ضروری ہے۔ اگر یہ تمام امور جمع ہو جائیں تو اس شخص کے لئے بصیرت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور وہ ان تمام عجائب کا مشاہدہ کرنے لگ جاتا ہے جن کے ادراک سے دوسرے عاجز ہو چکے ہوں [۴۲]۔"

امام غزالی (۴۵۰ — ۵۰۵ھ مطابق ۱۰۵۸ — ۱۱۱۲ء) اپنی ایک تصنیف کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:

"برادر! خدا تجھ کو حقیقت شناسوں کی توفیق عطا کرے اور دین و دنیا کی فلاح و کامرانی نصیب فرمائے۔ خدا کی معرفت اس کے عجائبات و مصنوعات میں تدبر و تفکر کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور درحقیقت یہی معرفت ایمان و یقین کے ثبات و استحکام کا موجب ہے اور اسی سے ابرار و اتقیا کے منازل و مدارج میں تفاوت ہوتا ہے۔ کیونکہ حقیقی معرفت کا حصول مخلوقات الٰہی میں غور و فکر پر منحصر تھا۔ اس لئے اس کتاب کو ارباب عقول کی رہنمائی اور ان کے استفادے کے لئے لکھا گیا۔ اس میں ان حکمتوں اور مصلحتوں کو بیان کیا گیا ہے جن کی طرف قرآن حکیم نے متعدد جگہ ارشاد فرمایا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے انسان کو عقل سلیم عطا کی، وحی کے ذریعہ اس کی

---

[۴۲] عجائب المخلوقات برحاشیہ حیوۃ الحیوان، ج ۱ ص ۳ — ۴، مطبوعہ مصر۔

رہنمائی فرمائی اور اصحاب نظر اور ارباب عقول کو اپنی مصنوعات میں غور و فکر کی اپنی اپنی استعداد کے مطابق دعوت دی "قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (کہدیجیے کہ تم غور کرو کہ آسمان و زمین میں کیا کیا چیزیں ہیں) "وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ" (اور پانی سے ہم نے ہر زندہ چیز بنائی۔ کیا اب بھی وہ ایمان نہ لائیں گے)۔

اس قسم کی اور بھی متعدد آیات ہیں جن کے معانی میں غور کرنے سے خدا کی معرفت اور حقیقی عظمت کا علم ہوتا ہے جو سعادت و فلاح کا حقیقی سبب ہے اور جس پر انعامات الٰہی کا مدار ہے۔

اس کتاب میں چند ابواب ہیں اور ہر باب میں مخلوقات الٰہی کی تکوینی حکمتوں اور مصلحتوں کو حتی الامکان وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اگر دنیا کی تمام مخلوقات اپنی تمام قوتوں کو صرف کر دے کہ کسی ایک مخلوق الٰہی کی تمام حکمتوں کو بالاستیعاب بیان کرے تو یہ کام نامکمل رہے گا اور سب عاجز ہوں گے[۱]

یہ قرآن کا وہ عظیم اور ہمہ گیر فکری انقلاب تھا کہ اس نے ذہنوں کو اس درجہ متاثر کیا کہ لوگوں کے سوچنے اور غور کرنے کا انداز ہی بدل گیا۔ اُس دور کے ہر علم و فن میں تقریباً یہی چھاپ نظر آتی ہے۔

نیز اس موقعے پر امام غزالی نے مذکورہ بالا تحریر کے آخر میں جو علمی انکشاف کیا ہے اس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ امام صاحب نے صدیوں قبل (نو سو سال پہلے) اتنی سچی اور لازوال حقیقت کیسے بیان کر دی! یہ کلیہ موجودہ سائنس کی ہمہ جہتی ترقیوں کے دور میں بھی پوری طرح صادق آرہا ہے۔ یہ بھی ایک ثبوت ہے قرون وسطی کی علمی ترقیوں کا

---

[۱] الحکمۃ فی مخلوقات اللہ (اردو ترجمہ) ص ۱۸-۱۹ مطبوعہ کراچی۔

کہ اُس دور میں ہمارے سائنس داں تو سائنس داں خود ہمارے علماء اور ائمہ بھی کس کس انداز میں غور و فکر کیا کرتے تھے!

اسی طرح امام صاحب کی اس تحریر سے اسلام کا یہ موقف بھی پوری طرح روشنی میں آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت کا حصول مخلوقاتِ الٰہی میں غور و فکر پر موقوف ہے۔ یعنی ان مخلوقات و موجودات میں جس درجہ گہری نظر کے ساتھ غور و خوض کیا جائے گا اسی قدر معرفتِ الٰہی بھی حاصل ہوگی۔ اسی بنا پر قرونِ وسطیٰ میں اہل اسلام نے اس موضوع پر بکثرت کتابیں لکھیں اور مظاہرِ فطرت اور ان کی حکمتوں اور ان کے نظاموں سے وجودِ باری اور اس کی ربوبیت پر استدلال کیا۔ اس موضوع پر سب سے بہتر اور شاہکار کتاب امام رازی کی تفسیر کبیر ہے جو قرونِ وسطیٰ کے علوم کی گویا کہ ایک جامع انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس بحث سے یہ حقیقت بھی پوری طرح عیاں ہوگئی کہ فطرت و شریعت میں اصلاً کوئی تعارض یا منافات نہیں ہے جیسا کہ دورِ جدید کے بہت سے کوتاہ بینوں کو نظر آتا ہے۔

چند اہم ملاحظات

جیسا کہ عرض کیا جاچکا اسلامی دور سے پہلے عملی سائنس کا وجود نہیں تھا۔ یونانی فکر و فلسفے کا جو کچھ سرمایہ تھا وہ محض نظری اور ظن و تخمین کا مجموعہ تھا۔ یونانی فلاسفہ حکمت و دانش کی باتیں تو بڑی اچھی اچھی کہتے تھے مگر اپنے نظریات و مفروضات کی صحت و صداقت کو ثابت کرنے کے لئے انہیں کسی تجربے یا مشاہدے کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوئی۔ بلکہ اس کے برعکس وہ عمل و تجربے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس طرح ایک اعتبار سے گویا کہ وہ "بے عمل" تھے۔ اس کے مقابلے میں جیسا کہ لاتعداد آیاتِ قرآنی سے ثابت ہوتا ہے وہ عمل اور تجربے پر ابھارتا ہے۔ لہٰذا پورے اعتماد کے

ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام ہی دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے سب سے پہلے موجودات عالم میں غور و فکر اور تحقیق و تجربہ کرنے کی دعوت دی اور عملی و تجرباتی سائنس کی بنیاد ڈالی۔ یہ قرآن کی مثبت اور انقلابی دعوت فکر ہی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی عہد میں اقوام عالم کے باقی ماندہ علمی و فکری سرمائے کو اکھٹا کر کے ان کا ترجمہ کیا گیا اور ان کی تہذیب و تدوین کی گئی۔ پھر ان علوم میں غور و خوض کر کے نئی راہیں نکالی گئیں اور علم کیمیا، طبیعیات، فلکیات، ارضیات، طب، نباتات اور علم ہندسہ و ریاضی وغیرہ جدید علوم و فنون کی داغ بیل ڈال کر انہیں خوب ترقی دی گئی۔

اس موقع پر مشہور مسلم سائنس داں جابر بن حیان (جدید علم کیمیا کے بانی) کا یہ سائنسی اصول آب زر سے لکھنے کے قابل ہے جو تمام جدید سائنسی اور تجرباتی علوم کی جان ہے اور موجودہ تمام سائنسی علوم اسی اصول پر کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ خود اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے:

"کیمیا میں سب سے ضروری شے تجربہ ہے۔ جو شخص اپنے علم کی بنیاد تجربے پر نہیں رکھتا وہ ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔ پس اگر تم کیمیا کا صحیح علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو تجربوں پر انحصار کرو اور صرف اس علم کو صحیح جانو جو تجربے سے ثابت ہو جائے۔ ایک کیمیا داں کی عظمت اس بات میں نہیں ہے کہ اس نے کیا کچھ پڑھا ہے، بلکہ اس بات میں ہے کہ اس نے کیا کچھ تجربے کے ذریعے ثابت کیا ہے[۵۴]"۔

قرون وسطیٰ میں مسلم سائنس دانوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے وہ خلافت ارض کا ایک نمایاں باب ہیں۔ جب تک وہ اس فریضے کی ادائیگی میں مصروف رہے بلا شرکت غیرے وہ زمین کے مالک بنے رہے اور ان کی شان و شوکت اور رعب و دبدبے سے دیگر اقوام متاثر و مرعوب رہیں اور اس میدان میں

---

۵۴ بحوالہ اردو ڈائجسٹ، لاہور، اگست ۱۹۶۳ء

آٹھویں صدی سے تیرھویں صدی تک (بلکہ بعد کی مزید دو صدیوں تک بھی) ان کا کوئی ہمسر اور مقابل نہیں تھا۔ مگر جیسے ہی انھوں نے اس وظیفے کو ترک کیا اور محنت و جفاکشی سے منہ موڑ کر آرام طلبی اور عیش و عشرت کی راہ اختیار کی وہ دیگر اقوام کے ذریعہ مغلوب و مقہور ہو گئے[۹]۔

زوال اسپین (۱۴۹۲ء) اصل میں زوال امت اسلامیہ کی آخری کڑی تھا۔ اس حادثۂ فاجعہ کے بعد ملت اسلامیہ ایسی منتشر اور پراگندہ بلکہ بدحواس ہوئی کہ اس کو پھر سر اٹھانے اور بکھرے ہوئے تنکوں کو جمع کر کے پھر دوبارہ اپنا آشیانہ تعمیر کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

اصل بات یہ ہے کہ سیاسی انحطاط نے مسلمانوں کو مرکزیت سے ہٹا کر ان میں انتشار پیدا کر دیا تھا۔ لہذا سیاسی اعتبار سے مرکز اسلام کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے آج ضروری ہے کہ مادی قوت و طاقت کے اعتبار سے بھی اس کی بنیادوں کو مستحکم کیا جائے۔ بالفاظ دیگر مادی قوت و شوکت کے بغیر سیاسی حیثیت سے استحکام حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور بغیر سیاسی استحکام کے کسی قوم یا ملت کی ذہنی و عقلی اور تخلیقی قوتوں کو بیدار کر کے جمود کو توڑا نہیں جا سکتا اور جدت و اجتہاد کے سوتوں کو پھر سے جاری نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ ہمیں اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار اور خصوصاً عباسی دور کے ہارونی اور مامونی عہد میں نظر آتا ہے جو علمی ترقیوں کا سنہری دور مانا جاتا ہے۔ اور جیسا کہ عصر جدید میں روس، امریکہ اور دیگر بڑے اور ترقی یافتہ ملکوں کا حال ہے کہ ان کی تمام تمدنی و اجتماعی ترقیاں سیاسی استحکام ہی کے باعث عمل میں آسکی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی ملک کو علمی و سائنسی اور تمدنی و اجتماعی اعتبار سے

۹ے اس موقع پر دینی یا روحانی اسباب و علل کی کارفرمائی سے تعرض خارج از بحث ہے۔

ترقی کرنے کے لئے بنیادی طور پر تین چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے:
(۱) سیاسی استحکام (۲) فنی واقفیت (۳) مالی وسائل۔ اس لحاظ سے آج عالم اسلام اگرچہ تیسری چیز۔ اور کسی حد تک دوسری چیز کا بھی مالک ہے لیکن اگر کوشش کی جائے تو پہلی اور دوسری چیز۔ یں بھی بہت جلد دسترس حاصل کرکے اس سلسلے کی خامیوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔ اصل میں تیسری چیز ہی وہ شاہ کلید ہے جس کے ذریعہ ہر چیز حاصل کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ صحیح سمجھ بوجھ کے ساتھ کام کیا جائے۔ اس وقت بعض اسلامی ممالک فنی واقفیت رکھتے ہیں تو بعض مالی وسائل سے مالامال ہیں لہذا یہ دونوں اگر اشتراک باہمی کے اصول پر ایک دوسرے کی مدد کریں تو اس میدان میں خوب ترقی ہو سکتی ہے اور ہمارے اجتماعی مسائل ایک ایک کرکے تمام حل ہو سکتے ہیں۔ اس موضوع پر چھٹے باب میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آٹھویں صدی سے تیرھویں صدی عیسوی تک سائنسی علوم کے میدان میں مسلمانوں کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔ پھر چودھویں اور پندرھویں صدی تک اگرچہ دیگر قوموں میں بھی ان علوم کا شعور اور ان سے وابستگی پیدا ہوگئی تھی تاہم مسلمان ہی اس وقت تک اس میدان میں اصل امام تصور کئے جاتے تھے۔ مگر زوال امت اسلامیہ (زوال اسپین) کے باعث بعد کی صدیوں میں علوم و فنون کا آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ مغرب کی وادیوں میں چمکنے لگا۔ گویا کہ علمی قیادت مشرق سے مغرب منتقل ہوگئی۔ مگر اس واقعہ کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ ہے کہ مغربی قوموں میں ذہنی و فکری بیداری اور علوم و فنون کی ترقی جس رفتار سے ہوتی گئی، مسلمان جو اس سے قبل اس میدان میں ساری دنیا کے امام تھے، اسی رفتار سے پیچھے ہٹتے گئے

حتیٰ کہ ان علوم و فنون ہی سے بے تعلق اور اجنبی بن گئے۔ یہ تدریجی عمل گزشتہ پانچ صدیوں سے برابر جاری رہا جو مکمل پس ماندگی پر منتہی ہوا۔ آج امت اسلامیہ کی اس زبوں حالی کو دیکھ کر ہمارے لئے یہ یقین کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ یہ وہی امت ہے جو کسی دور میں دنیا کی سب سے بہتر اور ترقی یافتہ ملت تھی۔

اب اہل اسلام کو دوبارہ ان علوم کی طرف راغب کرنے اور خلافتِ ارض کے فراموش کردہ منصب عظیم کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک بہت زیادہ مؤثر اور طاقتور دعوت فکر کی ضرورت ہے۔ اور یہ دعوت فکر صرف قرآن عظیم ہی مہیا کر سکتا ہے، جس کی ابدی آیتوں میں بلا کی تاثیر اور بلا کی قوت کشش ہے اور جو اپنے معجزنما حقائق اور سچائیوں کی بنا پر آج بھی بالکل تازہ اور سدابہار معلوم ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کا اپنے پیرووں کو تجربے و مشاہدے اور تسخیر اشیاء کی طرف متوجہ کرنے کے چند اہم اور دو طرفہ مقاصد تھے۔ ان مقاصد کے ذریعہ جہاں ایک طرف اہل اسلام کو موجودات عالم کے آثار و خواص سے آگاہ کر کے مادی اعتبار سے قوت و طاقت حاصل کرنے کی ترغیب دلانا مقصود تھا تو دوسری طرف بنفسہ اسی عمل کے ذریعہ یہ دکھانا بھی مطلوب تھا کہ مشرکین جن مظاہر کائنات کو مقدس یا دیوی دیوتا سمجھے ہوئے ہیں دراصل انہی مظاہر کی "توڑ پھوڑ" یا تسخیر سے وہ قوت و طاقت حاصل ہو سکتی ہے جو اس راہ میں مددگار بن سکے۔ ورنہ بصورت دیگر پوری دنیا "مایا کا جال" بن کر رہ جاتی۔

اس لحاظ سے یہ بھی قرآن حکیم کا ایک تاریخی کارنامہ ہے کہ اس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار یہ صدا بلند کی کہ انسان اب تک جن مظاہر کے تقدس واحترام کا قائل رہا ہے انہی کی تسخیر سے دراصل خلافت ارضی کے لئے قوت و طاقت حاصل کر سکتا ہے اور ان میں اُلوہیت کا کوئی شائبہ

بھی موجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کے سب ایک مسبّب الاسباب کی قدرت در بوبیّت کے مسخّر کردہ نشانات اور اس کے زورِ بازو کا کرشمہ ہیں۔ لہٰذا انسان کو ان سے ڈرنے یا خائف ہونے کے بجائے ان سے استفادہ کر کے مقاصدِ خلافت کی تکمیل کرنی چاہیئے۔

خلاصہ بحث یہ کہ اسلام اور اس کا ابدی صحیفہ آج بھی ملت اسلامیہ کو بالکل اسی طرح بیدار کر کے اس کی رہنمائی کر سکتے ہیں جس طرح کہ وہ اب سے چودہ سو سال پہلے عرب کی سوئی ہوئی قوم کو جھنجوڑ کر ان کی مخفی قوتوں اور خفیہ صلاحیتوں کو ایک عظیم تر کارِ خلافت کے لئے بیدار کیا تھا۔ بلکہ ایک حیثیت سے دیکھا جائے تو آغازِ اسلام کے عربوں اور موجودہ پس ماندہ مسلمانوں کے درمیان یک گونہ مشابہت پائی جا رہی ہے۔ موجودہ دور میں اہلِ اسلام کی عددی کثرت کے باوجود ذہنی و فکری اعتبار سے بظاہر پس ماندگی نظر آتی ہے۔ مگر درحقیقت ان کی مخفی صلاحیتیں اور پوشیدہ ذہنی قوتیں خُفتہ اور سوئی ہوئی ہیں۔ جنہیں چند طاقتور جھٹکوں کے ذریعہ بیدار اور برانگیختہ کرنے کی ضرورت ہے[۵] پھر ہمارا بچھڑا ہوا کارواں بھی علم کے قافلے سے دوبارہ جا ملے گا۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ مذہب سے مکمل برگشتگی کی بنا پر عمل میں آئی تھی۔ کیونکہ عیسائی مذہب اپنی کوتاہ نظری کے باعث مادی اور سائنسی ترقیوں کا

نشہ ۵ یہ جھٹکے قرآن حکیم کے کثرتِ مطالعے سے فراہم ہوں گے، خصوصاً ان آیاتِ کریمہ کے ذریعہ جن میں مظاہرِ فطرت کے مطالعہ اور ان کی تسخیر پر ابھارا گیا ہے۔ ظاہر ہے جو علاج کل صحیح تھا وہی آج بھی صحیح ہوگا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ قرآن کی ان تمام آیات کو جو اس موضوع سے متعلق ہیں اکٹھا کر کے ان کا ترجمہ اور ان کی مختصر تفسیر ایک مجموعے کی شکل میں شائع کی جائے۔

ساتھ نہیں دے سکا۔ بلکہ ان سرگرمیوں کو خلاف مذہب قرار دے کر انہیں رد کرنے کی پوری پوری کوشش کی اور لوگوں کو سخت سزائیں دیں۔ اس غلط رویہ اور غلط ردّ عمل کے باعث جو خوفناک نتائج رونما ہوئے ان میں پورا عالم انسانی آج تک مبتلا ہے۔ مگر اسلام کا معاملہ اس کے بالکل برعکس واقع ہوا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے پیرودں کو مظاہر کائنات کے مطالعے اور اُن کی تسخیر پر آمادہ کرتا ہے بلکہ خود دین و ملت کی حفاظت کے لئے مادی میدان میں ترقی کرنا ضروری قرار دیتا ہے۔

ان تمام ملاحظات سے اُن تمام مورخین و مفکرین کے اس غلط اور بے بنیاد نظریہ کی تردید ہو جاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مذہب قوموں کی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ اور سنگ گراں ہے جو زمانے کی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا[۱۵]۔ یہ بات اسلام جیسے زندہ مذہب پر ہرگز صادق نہیں آتی، چاہے دیگر مذاہب کا جو بھی حال ہو۔

بہر حال ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ مذہب سے برگشتہ ہو کر نہیں بلکہ مذہب اسلام کے ابدی سائے میں اور اسلام ہی کی سربلندی کی خاطر مطلوب و مقصود ہے۔ اسلام ایک ابدی اور عالمگیر مذہب اور ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ وہ محض چند عبادات اور رسوم کا مجموعہ نہیں بلکہ مہد سے لے کر لحد تک زندگی کے تمام طور طریقے سکھاتا ہے۔ وہ بیک وقت دین بھی ہے اور دنیا بھی۔ اور ان دونوں کا ایک جامع اور بے عیب تصور پیش کر کے اپنے پیرودں کی کامل رہنمائی کرتا ہے جس کے پیش کرنے سے اسلام کے سوا بقیہ تمام مذاہب عالم اور اُن کے کل صحیفے عاجز نظر آتے ہیں۔

---

۱۵ ملاحظہ ہو تمدن ہند، از ڈاکٹر لیبان، ترجمہ سید علی بلگرامی، ص ۱۸۲

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک کامل فلسفۂ حیات کا مالک اور ایک زبردست قوت و تحریک بھی رکھتا ہے۔ مگر صدیوں کے عقلی جمود نے اس کو ایک جامد اور غیر متحرک چیز بنا کر رکھ دیا ہے۔ جب تک یہ جمود نہیں ٹوٹے گا صحیح نمود نہیں ہو سکے گی۔

نیز یہ خیال بھی دل سے نکال دینا چاہیئے کہ مسلم قوموں میں ایجاد و اختراع کا مادہ اور تخلیقی صلاحیت نہیں ہے، جیسی کہ آج ہمیں مغربی قوموں میں نظر آتی ہے۔ اگر صحیح خطوط پر کام کیا جائے تو آج بھی ہماری ملّت میں جابر بن حیان، محمد بن خوارزمی، محمد بن زکریا رازی، ابن ہیثم، البیرونی، ابن سینا، ابن نفیس اور ابو حنیفہ دینوری جیسے زبردست سائنس داں اور محققین و موجدین پیدا ہو سکتے ہیں، جن کا مرتبہ گلیلیو، کیپلر، نیوٹن، بنجمن فرینکلن، جان ڈالٹن اور مائیکل فیریڈے وغیرہ وغیرہ سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے بلکہ کئی حیثیتوں سے ان سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

پانچواں باب

خلافتِ ارض اور علماء کی ذمہ داریاں

- اسلام کی روشن فکری
- متکلمین اسلام اور اہل کلیسا
- یونانی عقلیات اور جدید سائنس و فلسفہ
- قرآن اور جدید علم کلام
- دلائل آفاق اور قوانین ربوبیت
- سائنس اور فلسفہ جدیدہ کا نیا آہنگ
- کائنات میں صفات الٰہی کے جلوے
- وحدت الوجود یا وحدت الشہود
- تصوف اور سائنس
- فلسفہ یونان مجموعہ اغلاط
- ابطال ہیولیٰ
- یونانی نظریہ افلاک کا ابطال
- قرآن کا نظریہ سماوات
- کتاب حکمت کے جلوے
- علم الٰہی کی ازلیت کا آفاقی نظارہ
- علماء اور خلافت ارض کی ذمہ داریاں
- علماء اور جدید مسائل
- جدید فلسفے اور تحریکیں
- تہذیب جدید کی ناکامی اور اس کا علاج
- قرآن ہر دور کے لئے فیصلہ کن کتاب
- باطل پرستوں کی بنیادی خصوصیات
- اللہ کی سنت اور قرآن کا معجزہ
- موجودہ چیلنج کا مقابلہ

خلافتِ ارض اور علماء کی ذمہ داریاں

اسلام کی روشن فکری

ساتویں صدی عیسوی فکرِ انسانی کی تاریخ میں ایک عظیم اور انقلابی صدی تھی۔ جب کہ اسلام نے سب سے پہلے نوعِ انسانی کو نظامِ کائنات میں غور و فکر کرنے اور تجربے و مشاہدے کے ذریعہ صحیح نتائج اخذ کرنے کی انوکھی دعوت دی۔ یہ انوکھی اور انقلابی دعوتِ فکر اگرچہ بنیادی طور پر وجودِ باری کے اثبات اور نظامِ ربوبیت کی تنقیح و توضیح کے طور پر تھی۔ مگر اس کے عقلی اور لازمی نتیجے کے طور پر اس سے جہاں ایک طرف علومِ فطرت کا ارتقاء ہوا تو دوسری طرف تمدن اور اس کے مظاہر بھی ترقی کرنے لگے۔

چنانچہ قرآنی منشأ[1] کے مطابق مسلمان بہت جلد اور حیرت انگیز طور پر صرف ایک دو صدیوں میں دنیا کے قدیم علمی سرمائے پر قابض ہو کر اس کو اپنی تہذیب و ثقافت سے ہم آہنگ کیا اور ایک بالکل نئی ثقافت کی بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں کی علم نوازی اور جدید تحقیقات میں انہماک کا سب سے

---

[1] سائنسی علوم و فنون کو ترقی دینے سے متعلق اسلام کا اصل منشا یہ تھا کہ ان علوم کی ترقی کے باعث کائنات کے وہ حقائق اور رازہائے سربستہ پوری وضاحت کے ساتھ کھل کر سامنے آجائیں جن کے باعث اسلام کے بنیادی عقائد و تعلیمات کی تصدیق و تائید ہو سکے اور منکرین و معاندین کو دینی حقائق سے انکار کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے راقم سطور کی دیگر تصنیفات دیکھنی چاہیئے۔

زیادہ روشن پہلو یہ تھا کہ خالص مذہبی حلقوں میں فلسفہ و کلام کے برعکس سائنسی تحقیقات کو کبھی مذہب کے مقابل نہیں سمجھا گیا۔[۵۲] بلکہ وہ ہمیشہ مذہب اور سائنس دونوں کو برابر نبھاتے رہے۔

متکلمین اسلام اور اہل کلیسا

اسلامی دنیا میں یہ صورت حال صدیوں تک اسی طرح برقرار رہی۔ ایک طرف حکماء اور سائنس داں تھے جو نئی نئی تحقیقات اور ایجادات و انکشافات میں منہمک رہے تو دوسری طرف علمائے اسلام کا ایک خاص گروہ تھا جو اُس دور کے "جدید علوم" کے تعلق سے پیدا ہونے والے علمی و فکری مسائل کو سلجھانے اور علمی دنیا کی رہنمائی کرنے میں لگا رہا چنانچہ گروہ اول میں جابر بن حیان، ابونصر الفارابی، الکندی، ثابت بن قرہ، ابراہیم بن سنان، حنین بن اسحاق اور ابن البیطار وغیرہ نظر آتے ہیں تو دوسری طرف گروہ ثانی میں امام ابوالحسن اشعریؒ، امام ابومنصور ماتریدیؒ، امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ وغیرہ بھی دکھائی دیتے ہیں۔

ان ائمہ کرام نے اپنے دور میں دین اسلام کی ابدیت پر اثر انداز ہونے والے مسائل کی تنقیح کرتے ہوئے عقل و نقل کے حدود متعین کئے اور کلامی نقطۂ نظر سے اسلام کا دفاع کر کے اعتقادی فتنوں اور گمراہیوں کا استیصال کر دیا جو ان کا ایک تجدیدی کارنامہ تھا۔

غرض اسلام کے آغاز کے ساتھ ہی دنیا نے پہلی مرتبہ ایک آزادانہ طرز تحقیق اور ایک نئے فکری انقلاب کا نظارہ کیا جس کی مثال ہمیں سابقہ ادوار میں نہیں ملتی۔ مگر بدقسمتی سے مسلم حکومتوں کے زوال کے بعد یہ صورت حال برقرار نہ رہ سکی۔ بلکہ چودھویں اور پندرھویں صدی کے بعد

---

۵۲ ملاحظہ ہو الکلام، از علامہ شبلی نعمانی، ص ۱۱، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۳۰۴ھ

جبکہ مغربی قومیں اسلامی اثرات سے بیدار ہونے لگیں اور ان میں علمی تحقیق کا ذوق پیدا ہونے لگا تو ایک دوسرا تماشہ رونما ہوا۔ عیسائی مذہب اور کلیسا کے پیشواؤں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر مذہب اور سائنس کے بنیادی فرق کو نظر انداز کرکے ان دونوں کو یکساں درجہ دے دیا۔ یعنی مذہب کے اصول جس طرح ناقابل تغیر ہوتے ہیں اسی طرح کائنات سے متعلق بعض نظریات کو ــــ جو ارسطو کے فلسفے اور منطق سے ماخوذ تھے ــــ مذہب میں داخل کرکے انہیں مذہب کا جزو اور غیر متبدل قرار دے دیا۔ جس کے باعث خوفناک نتائج برآمد ہوئے اور اہل علم اور اہل کلیسا کے درمیان کشمکش کا ایک المناک اور خونی سلسلہ چل پڑا جو بالآخر مذہب سے کلمل علٰحدگی پر منتہی ہوا۔ اس طویل اور صدہا سال کی کشمکش کے نتیجے میں موجودہ الحاد و مادیت اور خدا بیزار تہذیب نے جنم لیا جو درحقیقت کلیسا کی ناعاقبت اندیشیوں کا براہ راست اور لازمی نتیجہ تھا۔

اسلام نے ساتویں صدی عیسوی اور اس کے بعد دین اور فطرت کو دو بہنوں کی طرح اکھٹا کرنے اور ان دونوں کو باہم گلے ملانے کا جو بے مثال کارنامہ انجام دیا تھا اُس کو یورپ کے نشاۃ ثانیہ (renaisance) کے دور میں کلیسا کی خود غرضانہ اور دنیا پرستانہ ذہنیت نے بالکل برباد کر دیا اور مذہب کی ترقی کی راہ میں زبردست مشکلات کھڑی کر دیں بلکہ مذہب کی ترقی بالکل مسدود کر دی گئی۔ پھر بڑی مشکل سے اس کو ایک پرسنل معاملہ قرار دے کر اجتماعی زندگی سے بالکل بے دخل کر دیا گیا۔

کلیسا اور سائنس کے درمیان چپقلش کا یہ سلسلہ پندرھویں صدی سے شروع ہوا جو بعد کی صدیوں میں بڑھتے بڑھتے نہایت درجہ شدید ہو گیا۔ لاکھوں بے گناہوں کی گردنیں ماری گئیں اور انہیں آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں مذہب بیزاری کا ایک ہمہ گیر ردعمل شروع ہو گیا۔

مظاہر فطرت اور قوانین فطرت کی توجیہہ اب اس طرح کی جانے لگی کہ کہیں بھی خدا کا وجود یا مذہبی اصولوں کا دخل تسلیم کرنا نہ پڑے۔ یہ لَے یہاں تک بڑھی کہ باقاعدہ اور منظم طور پر انسان اور کائنات کے تعلق سے نئے نئے ملحدانہ اور مادہ پرستانہ فلسفے تراشے جانے لگے اور دین و اخلاق کو ایک ڈھکوسلہ اور کلیسا کی عیاری قرار دیتے ہوئے مذہب کا جوا پوری طرح اپنے کندھوں سے اتار پھینکا گیا۔ مذہب دشمنی کی اس لپیٹ میں سارے مذاہب آگئے اور کسی کو بھی نہیں بخشا گیا۔ گویا یوں سمجھ لیا گیا کہ تمام مذاہب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

یونانی عقلیات اور جدید سائنس و فلسفہ

یہ تو عیسائی مذہب اور کلیسا کا حال تھا۔ مگر افسوس کہ جدید علوم و فنون کے تعلق سے اہل اسلام کا موجودہ رویہ بھی اہلِ کلیسا سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یعنی وہی ارسطو اور اُس کے متبعین کے نظریات کو۔ جو منطق و فلسفے کی شکل میں موجود ہیں ــــ دین کے برابر کا درجہ دے کر ایک متوازی دین بنا دیا اور جدید علوم سے بالکل بے گانہ ہو گئے۔ پھر جدید علوم سے بیگانگی کی بدولت ان علوم کے تعلق سے اور ان کی ترویج و اشاعت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے علمی، فکری، معاشرتی اور تمدنی مسائل و مشکلات سے بھی بے گانگی عمل میں آئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کو بھی ماضی کی نشانی اور فرسودگی کی علامت سمجھا جانے لگا۔ گویا یوں سمجھ لیا گیا کہ اسلام اور مسلمانوں سے ان علوم و مسائل کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے حالانکہ اسلام ایک زندہ اور ابدی مذہب ہے اور ہر دور میں زندگی کے تمام مسائل حل کر سکتا ہے۔ کوتاہی جو کچھ بھی ہے وہ ہماری اپنی ہے اسلام کی نہیں۔

یہ تاریخ کا ایک عجوبہ اور حیرت انگیز امر ہے کہ علمائے اسلام نے

بڑی رد و کد کے بعد یونانی عقلیات (منطق و فلسفے) کو اپنا کر اُس کو گلے تو لگا لیا (جو امام غزالی کی کوششوں کا نتیجہ تھا[۵۳]) مگر جدید سائنس اور جدید علوم سے دور ہی دور رہے۔ حالانکہ قرآن حکیم یونانی فلسفے کی بہ نسبت موجودہ سائنسی علوم سے زیادہ قریب ہے۔ چنانچہ وہ اپنے بیان کردہ عقائد و تعلیمات کی صداقت و حقانیت کے ثبوت کے لئے جگہ جگہ مظاہر کائنات اور ان کے نظاموں سے استدلال کرتا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ تمام سائنسی علوم مظاہر کائنات اور ان کے نظاموں ہی کی تفصیلات کا نام ہے۔

اس لحاظ سے ضرورت ہے کہ آج ہمارے دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کی جائے اور منطق و فلسفے کی کتابوں کو کم سے کم اور محدود کر کے سائنسی علوم کو رائج کیا جائے۔ آج زمانہ فلسفہ کا نہیں بلکہ سائنس کا ہے۔ اور جدید فلسفہ تو سائنسی تحقیقات کو بنیاد بنا کر گفتگو کرتا ہے، قدیم فلسفے کی طرح اس سے چشم پوشی کر کے نہیں۔ چنانچہ تاریخ فلسفہ کا مصنف وَیب لکھتا ہے:

”جن لوگوں کو ہم فلسفۂ یورپ کا بانی کہتے ہیں ان کا حقیقی کارنامہ صرف اس قدر ہے کہ انہوں نے کہانیاں کہنا چھوڑ دیا اور (جب کچھ نہ تھا تو کیا تھا بیان کرنے کا بے سود و لاحاصل کام چھوڑ کر اس کے بجائے خود سے یہ سوال کرنا شروع کیا کہ اس وقت جو دنیا میں چیزیں نظر آتی ہیں یہ درحقیقت کیا ہیں“[۵۴]

---

۵۳ تفصیل کے لئے دیکھئے علم الکلام، از علامہ شبلی نعمانی، ص ۵۰، مطبوعہ آگرہ، نیز حکمائے اسلام، از مولانا عبدالسلام ندوی، ۴۲۲/۱ - ۴۲۳، دارالمصنفین، ۱۹۵۳ء

۵۴ تاریخ فلسفہ، ترجمہ مولوی احسان احمد، ص ۴، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء

قدیم فلسفہ بالکل از کار رفتہ ہو چکا ہے۔ اگر اس کی ضرورت ہے تو صرف اتنی کہ ہمارے قدیم اسلامی لٹریچر سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اور اس کے لئے منطق و فلسفے کی اصطلاحات کا جان لینا کافی ہوگا۔

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ یونانی منطق و فلسفہ اسلامی علوم نہیں ہیں جن کو دانتوں سے پکڑا جائے۔ بلکہ در اصل یہ علوم اسلام ہی کے دفاع کے لئے زمانۂ قدیم میں داخل نصاب کئے گئے تھے۔ ان کی ضرورت اس وقت پیش آئی تھی جب کہ ان کا طوطی بول رہا تھا۔ مگر آج ان عقلی علوم کی جگہ پر سائنسی علوم کا بول بالا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان عقلی علوم کو نظر انداز کر کے جدید علوم سے اپنا رشتہ استوار نہ کیا جائے، جب کہ یہ بات دینی، عقلی اور خود منطقی ہر حیثیت سے صحیح ہے۔ منطق کا مقصد ہی یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ ہمیں خطائے فکری سے بچاتی ہے۔ لہذا منطقی اعتبار ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ جدید علوم و فنون کو اپنایا جائے جو عصر جدید میں زندگی کی علامت اور زندہ قوموں کا نشان قرار پا چکے ہیں اور کوئی قوم انہیں نظر انداز کر کے اپنا وجود ملی برقرار نہیں رکھ سکتی، جیسا کہ پچھلے ابواب کے مباحث سے ثابت ہو چکا ہے۔ لہذا ایسی منطق کس کام کی جو ہمیں بھلے اور برے میں تمیز کرنے سے بھی عاجز کر دے۔

منطق و فلسفہ ـــ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ـــ بقدر ضرورت کافی ہیں۔ ان میں اتنا خوض نہ کیا جائے کہ دوسرے ضروری علوم کا حق مارا جائے۔[۵]

---

[۵] بلکہ زیادہ بہتر ہے کہ ہمارے مدارس میں موجودہ یونیورسٹیوں کے طرز تعلیم کے مطابق بعض علوم کو لازمی اور بعض علوم کو اختیاری رکھا جائے۔ یعنی بنیادی اور ضروری مسائل کی لازمی تعلیم کے بعد بعض فنون کو اختیاری رکھا جائے کہ بعد میں جس کا دل چاہے وہ اپنے پسندیدہ علوم میں تکمیل کر سکے۔

ان از کار رفتہ علوم کو سینے سے لگائے رکھنے میں سوائے دماغ کھپانے اور حیرانی و سرگردانی کے نہ کوئی عقلی خوبی ہے اور نہ دین کی کوئی واقعی خدمت۔ پھر ایسی صورت میں جبکہ منطق و فلسفے کی عملی اعتبار سے کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی۔

قدیم فلسفے کے برعکس جدید فلسفہ الہیٰہ اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس کے مابعد الطبیعی مسائل جدید سائنسی نظریات پر قائم ہیں۔ اور سائنسی نظریات کے تغیر و تبدل کی بنا پر اس کے مسائل میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ جب کہ قدیم فلسفہ ہر حیثیت سے جامد ہے۔ بلکہ مابعد الاجسام، فلکیات اور عنصریات[۱] سے متعلق اس کے اکثر و بیشتر مسائل و مباحث مجموعہ اغلاط ہیں۔ جو محض ظن و تخمین اور وہم و خیال پر مبنی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نظریہ تجربے و مشاہدے کی کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکتا، بلکہ خلاف مشاہدہ اور خلاف حقیقت ثابت ہوتا ہے۔ فکر یونان کی دنیا محض تخیلات و مفروضات پر مبنی ہے، جس میں عقل کو تو خوب مصروف رکھا جاتا ہے مگر ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ لہٰذا جس قدر جلد ہو سکے ان بے فائدہ علوم سے پیچھا چھڑا لینا ہی بہتر ہے۔

دنیائے اسلام کا عقلی ارتقاء دوسری صدی ہجری یا آٹھویں صدی مسیحی سے شروع ہوا۔ جس کے نتیجے میں نئے نئے فکری و اعتقادی مسائل اور فلسفیانہ بحثیں پیدا ہوئیں۔ اور فلاسفہ و متکلمین اسلام کے درمیان طویل نظریاتی کشمکش، مناظرے اور علمی معرکہ آرائیاں برپا ہوگئیں۔ مگر دنیا نے حیرت سے دیکھا کہ وہی علوم جن کو فقہا اور محدثین "علوم باطل" اور "علوم کفریہ" قرار دیتے ہوئے صدیوں تک ان کا مقابلہ کرتے رہے۔ بالآخر امام غزالی کی کوششوں اور کاوشوں کی بدولت پانچویں اور

---

[۱] یہ قدیم طبیعیات کی تین شاخیں ہیں۔

چھٹی صدی ہجری میں ان علوم سے اس حد تک سمجھوتہ اور مصالحت کر لی گئی کہ تمام اسلامی مدارس میں ان کو داخل کر کے ہی چھوڑا گیا اور انہیں اس طرح "اسلامیا لیا گیا" کہ ان کا شمار بھی "اسلامی علوم و فنون" میں ہونے لگا اور ان سے اس قدر محبت ہو گئی کہ اب ان سے جدائی بالکل شاق گزر رہی ہے۔ مگر جس بنیادی ضرورت کی خاطر یہ علوم قرون وسطیٰ میں داخل نصاب کیے گئے تھے اسی بنیادی ضرورت کے تحت آج یہ خارج نصاب کیے جانے کے قابل ہیں۔ ہر دور کا ایک عقلی مزاج ہوتا ہے جس کو ہر حال میں ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ لہٰذا دین برحق کی ابدیت و عالمگیریت کے اثبات اور اس کے مادی غلبے اور تفوق کے اظہار کا تقاضہ ہے کہ جدید علوم و فنون کو اپنایا جائے۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ عقلی علوم دینیات کے نصاب میں کلامی نقطۂ نظر سے داخل کیے گئے تھے، جب کہ دین اسلام کو ان علوم کی طرف سے زبردست چیلنج درپیش تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ان علوم سے آراستہ ہو کر علمائے دین کلامی نقطۂ نظر سے دین متین کا دفاع کریں۔ اب چونکہ ان علوم عقلیہ کی اہمیت ہی باقی نہیں رہی اور ان کا رواج اور چلن بالکل ختم ہو گیا تو پھر ان علوم سے چمٹے رہنا بالکل غیر معقول اور غیر فطری بات ہو گی۔ اس کے برعکس آج چونکہ علوم جدیدہ کا چیلنج درپیش ہے اس لئے ضروری ہے کہ موجودہ صورت حال کو بدلتے ہوئے نئے ہتھیاروں سے اپنے آپ کو مسلح کیا جائے تاکہ عصر جدید میں دین برحق کا دفاع صحیح اور بہتر طور پر کیا جا سکے۔

قرآن اور جدید علم کلام

اس لحاظ سے آج ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھنے اور جدید علم کلام کو مدوّن کرنے کی ضرورت ہے، جو (قدیم علم کلام کے برعکس) تمامتر قرآن حکیم

سے ماخوذ ہو گا۔ قرآن حکیم ہی وہ ابدی و سرمدی صحیفہ خداوندی ہے جس میں اس کے پیروؤں کو جدید علم کلام کے تمام اصول تفصیل کے ساتھ سمجھائے گئے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ فکری و نظریاتی اعتبار سے گمراہ قوموں اور گمراہ فلسفوں کا رد و ابطال کیا جا سکے۔ قیامت تک وقوع میں آنے والی جتنی بھی فکری و نظریاتی گمراہیاں، غلط عقیدے اور مہمل فلسفے وجود میں آ سکتے ہیں ان سب پر ایک عجیب و غریب اور اعجازی انداز میں قدغن لگائی گئی ہے اور ایک ایک فکری لغزش کا حال کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں غور و فکر اور تفکر و تدبر کی تاکید کی گئی ہے۔

مگر یہ فائدہ صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ ہم نہ صرف سائنسی علوم کو زیر بحث لائیں بلکہ موجودہ گمراہ قوموں اور ان کے غلط نظریات اور فلسفوں کا بھی جائزہ لیں[۵۴] کلامی نقطۂ نظر سے سائنسی علوم دراصل ہمارے اور دیگر قوموں کے درمیان افہام و تفہیم کے لئے "اصول موضوعہ" کا کام دیتے ہیں، جو اپنے غیر جانبدارانہ رویہ کی وجہ سے علم انسانی کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں[۵۵] علم مناظرہ کا یہ اصول ہے کہ طرفین کے

---

۵۴ جدید فلسفہ اور ملحدین کے افکار و آراء جو مختلف خود ساختہ نظاموں اور "ازموں" کی شکل میں نوع انسانی کو "تھپکیاں اور لوریاں" دے دے کر سلا رہے ہیں۔

۵۵ مثلاً مشہور جرمن مسلم محمد اسد "اسلام دوراہے پر" میں تحریر کرتے ہیں:

"علم بجائے خود نہ مغرب کا ہے نہ مشرق کا۔ وہ ایسا ہی عالم گیر ہے جیسے کہ حقائق عالم گیر ہیں لیکن جس نقطۂ نظر سے علم کو دیکھا جاتا ہے اور پیش کیا جاتا ہے اس کا انداز ہر قوم کی ذہنی فطرت کی مناسبت سے مختلف ہے۔ حیاتیات یا طبیعیات یا نباتیات من حیثہ نہ مادہ پرستانہ ہیں نہ روحانی۔ ان کا تعلق حقائق کے جمع کرنے، مشاہدہ کرنے اور تشریح کرنے سے ہے۔" (ترجمہ رحم علی ہاشمی، ص ۹۴، دہلی، ۱۹۶۸ء)

درمیان گفتگو کے لئے کوئی بنیاد ہونی چاہیئے، جو دونوں کے درمیان تسلیم شدہ ہو۔ ان بنیادی اور مسلم باتوں کو اُصول موضوعہ یا اصول متعارفہ کہا جاتا ہے۔

اس طرح سائنسی علوم یا "علم اسماء" اور اس کے دریافت شدہ قوانین فطرت (جو دراصل نظام ربوبیت ہی کی تفصیلات ہیں) آج ہمارے اور گمراہ قوموں اور فرقوں کے درمیان بہترین اُصول موضوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کو بنیاد بنا کر ہم نہ صرف کائنات سے متعلق غلط نتائج اور غلط افکار و آراء کی تردید کر سکتے ہیں بلکہ قرآن کی صداقت و حقانیت بھی بخوبی ظاہر کر سکتے ہیں۔ یہی وہ مقصد عظیم ہے جس کی بناء پر قرآن حکیم میں نظام فطرت سے تعرض کیا گیا ہے اور سیکڑوں آیتیں مختلف پیرایوں میں اور مختلف ضمنی مقاصد کے تحت لائی گئی ہیں۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝

اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں (بے شمار) نشانیاں موجود ہیں۔ اور خود تمہاری ہستیوں میں بھی، کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا؟ (ذاریات: ۲۰-۲۱)

ان نشانیوں سے مراد وجود باری کے دلائل و شواہد ہیں جو روئے زمین پر عالم جمادات، عالم نباتات اور عالم حیوانات کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں اور "انفس"، نفس کی جمع ہے، جس کے معنی ذات اور ہستی کے ہیں۔ اس سے مراد انسان کے جسمانی اور نفسیاتی احوال و کوائف ہیں، جن میں وجود باری کی شہادتیں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے یہ آیات کریمہ علم جمادات (جیالوجی) علم نباتات (باٹنی)، علم حیوانات (زوالوجی)، علم طب (میڈیسن) اور علم نفسیات (سائیکالوجی) وغیرہ تمام علوم پر محیط ہیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَی الْاَرْضِ

سُطِحَتْ ○ فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ○ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اونٹوں کی تخلیق کس طرح کی گئی ہے؟ اور آسمان کس طرح اونچا اٹھایا گیا ہے؟ اور پہاڑ کس طرح نصب کئے گئے؟ اور زمین کس طرح (اس کی پوری گولائی میں) بچھائی گئی ہے؟ تم ان منکرین کو ان کائناتی حقائق کے ذریعے) یاددہانی کرادو۔ تمہارا کام تو صرف یاد دہانی کرا دینا ہی ہے۔

(غاشیہ: ۱۷-۲۱)

ان آیات کریمہ میں اونٹوں کا نام صرف اہل عرب کی رعایت سے لایا گیا ہے۔ اصل میں یہاں پر اونٹوں کا تذکرہ جس انداز میں کیا گیا ہے اور جس اسلوب میں ان کی ساخت و پرداخت پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے اس سے خود بخود دیگر حیوانات کے تقابلی مطالعے کا بھی اشارہ نکلتا ہے جو علم حیوانات (بیالوجی) کی اصل بنیاد ہے "سَمَاء" کے تحت تمام اجرام سماوی یعنی فلکیات کا مطالعہ آجاتا ہے۔ جبال اور ارض کی ہیئت ترکیبی سے واقفیت کے لئے پورے طبیعی جغرافیہ (physical geography) کا مطالعہ ضروری قرار پاتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ان علوم سے کماحقہ واقفیت کے بغیر نہ تو ان آیات کریمہ کی صحیح تفسیر ہو سکتی ہے اور نہ نوع انسانی پر اتمام حجت، جو " فذكر انما انت مذكر" (انہیں یاد دلادو تم تو صرف یاد دلانے والے ہی ہو) یعنی تمہارا منصب صرف تذکیر (یاددہانی) اور تنبیہ و انتباہ ہے، کے مطابق اہل اسلام پر عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ خطاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے پوری امت محمدیہ سے ہے جو قیامت تک تمام ادوار پر حاوی رہے گا کہ وہ اپنے دور کے طبیعی علوم اور معلومات کا جائزہ لے کر اس سلسلے کے آفاقی یا سائنٹفک دلائل کی تدوین کریں تاکہ وہ منکرین و معاندین کی رہنمائی یا ان پر اتمام حجت کا باعث بن سکیں۔

یہاں پر نمونے کے طور پر محض انہی دو آیات کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ورنہ قرآن حکیم اس قسم کی آیتوں سے بھرا ہوا ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ عصر جدید کی بے انتہا ترقی کے باعث تمام علوم و فنون پوری طرح مدوّن ہو کر ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ اگر اب بھی ہم قرآنی مقصد و منشا کے مطابق ان علوم سے فائدہ اُٹھا کر دین برحق کی برتری ثابت نہ کریں تو اس سے بڑھ کر محرومی اور کیا ہو سکتی ہے! ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ تمام جدید علوم و فنون کا جائزہ لے کر قرآن عظیم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نوع انسانی کی رہنمائی یا اس پر اتمام حجت کر دیں۔ یہی جدید علم کلام یا قرآنی علم کلام ہو گا۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط (لوگوں کو) اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ دانش مندی اور اچھی موعظت کے ساتھ اور ان سے بہترین طریقے سے مباحثہ کرو۔ (النحل: ۱۲۵)

دلائل آفاق اور قوانین ربوبیت

اس موقع پر ایک بہت بڑی اور بنیادی غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ عام طور پر مذہبی حلقوں میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ موجودہ سائنسی علوم محض چند بدلتے ہوئے نظریات یا "افکار پریشاں" کا نام ہے، جن کی بنیاد پر کتاب اللہ کی تفسیر کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور احتیاط کا تقاضا ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر میں اس قسم کے علوم کو داخل نہ کیا جائے مبادا کہ آگے چل کر یہ نظریات بدل جائیں اور کتاب اللہ کی ابدیت پر کوئی حرف آجائے!

یہ خیال بادی النظر میں تو بہت معقول اور وزنی معلوم ہوتا ہے مگر

دراصل یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے، جس کو کیا عالم اور کیا عامی ہر ایک ــــ اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کئے بغیر ــــ محض قلت فکر کی بنا پر اور بے سوچے سمجھے دہرائے چلا جا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ بذات خود بہت بڑی دانش مندی کا ثبوت دے رہا ہے۔ حالانکہ یہ طرز فکر دراصل حقائق سے چشم پوشی اور سہل انگاری کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں نظام کائنات سے متعلق تقریباً ساڑھے سات سو آیات موجود ہیں[۵۹]، جن کا بنیادی مقصد انسان، خدا اور کائنات کے باہمی تعلقات کو واضح کرنا اور اس سلسلے میں منکرین و معاندین اور خدا بیزار لوگوں کے غلط اور بے بنیاد نظریات و مفروضات کی اصلاح کرنی ہے۔ اسی لئے جگہ جگہ مظاہر کائنات اور ان کے حیرت انگیز نظاموں میں غور و فکر کرکے منکرین خدا کے خلاف سائنٹفک دلائل و شواہد کا استنباط کرلے کی تاکید کی گئی ہے، جن کو قرآن کی زبان میں دلائل آفاق (جو انسان کے چاروں طرف مختلف مظاہر کے روپ میں پھیلے ہوئے ہیں) اور دلائل انفس (خود انسان کے اپنے جسمانی و نفسیاتی احوال سے متعلق) کا نام دیا گیا ہے۔ ان دلائل و بینات یا آفاقی و انفسی شواہد سے عبرت و بصیرت حاصل نہ کرنے والوں کو بہائم اور چوپاؤں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جیسا کہ تفصیلات پچھلے ابواب میں گزر چکیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آفاقی و انفسی دلائل و شواہد کا یہ استنباط کس کے ذمے ہے؟ قرآن حکیم کے بنیادی مقصد اور اس کی روح کے مطابق منکرین حق پر یہ اتمام حجت کون کرے گا؟ اقوام عالم کی فکری و نظریاتی گمراہیاں کیسے دور ہو سکیں گی؟ کیا قرآن حکیم کا پیغام پورے عالم انسانی کو پہنچانا

---

۵۹ ملاحظہ ہو کتاب "القرآن والعلوم العصریۃ" از شیخ طنطاوی جوہری، ص ۴۳، مصر، ۱۹۵۱ء

ضروری نہیں ہے؟ کیا اس کا پیغام قیامت تک تمام ادوار اور تمام خطہ ہائے ارض کے لیئے عام نہیں ہے؟ کیا اس کے ابدی دلائل و براہین جدید ذہن و فکر کو مطمئن نہیں کر سکتے؟ بالفاظ دیگر قرآن حکیم کے دلائل آیا صرف عوام کے لیئے ہیں یا خاصان علم کے لیئے بھی؟ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ان دلائل و شواہد کا استنباط جدید علوم و فنون کی مدد کے بغیر ممکن بھی ہو سکتا ہے؟ نیز کیا موجودہ علوم و فنون سے مدد لیئے بغیر ہم موجودہ ارباب فن پر اتمام حجت کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ جب تک علوم و فنون کی گہرائیوں میں غوطہ زنی نہ کی جائے جدید ذہن و دماغ کی تسلّی کا سامان فراہم نہیں ہو سکتا[1] اور موجودہ استدلالی اور عقل پرست ذہن کو مطمئن کر کے ان کے قلوب کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اور جب تک یہ فکری معرکہ سر نہ کیا جائے عملی حیثیت سے کوئی صالح انقلاب برپا نہیں کیا جا سکے گا۔ کیونکہ کوئی بھی ہمہ گیر فکری انقلاب اس وقت تک برپا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اربابِ دانش اور اہلِ فن کو علمی و استدلالی حیثیت سے زیر نہ کر لیا جائے اور وہ "حق" کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دیں۔ ظاہر ہے کہ دانش ور طبقے کا اپنے اپنے حلقوں میں عوامی ذہن و فکر پر بہت گہرا اثر رہتا ہے۔ لہٰذا دانش ور طبقے کو زیر کر لینا گویا کہ علمی حیثیت سے میدان سر کر لینا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم کو جدید سے جدید تر ہر قسم کے "ہتھیاروں" سے پوری طرح مسلّح کر دیا گیا ہے۔ تاکہ اہل اسلام ہر دور میں حسب ضرورت ان سے کام لیں اور صحیح سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کریں۔ مگر جب ہمارے "اسلحہ خانے" میں ہر قسم کے جدید ترین ہتھیار موجود ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ موجودہ راکٹوں

---

[1] اسی طرح خود قرآن حکیم کی گہرائیوں میں بھی ڈوب جانے کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم میں جتنی گہری نظر ڈالیئے اُس کے اسرار اتنے کھلتے نظر آئیں گے۔

اور میزائلوں کا مقابلہ تیروں اور تلواروں سے کرنا عقل و دانائی سے بعید تر ہوگا۔

بنیادی سوال پھر بھی باقی رہ گیا۔ وہ یہ کہ سائنسی علوم و مسائل کی "مُبیّنہ تغیر پذیری" کا حل کیا ہے ؟ تو یہ کوئی ایسا مشکل اور پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے جس سے ہم اس قدر پریشان اور ہراساں ہو جائیں کہ محض ایک مفروضے کی بنیاد پر کتاب اللہ کی ساڑھے سات سو آیات کی تفسیر کرنا "شجر ممنوعہ" سمجھ کر چھوڑ دیں۔ اصل بات یہ ہے ــ جیسا کہ سائنسی علوم اور اُن کے ایجادات و اکتشافات کی تاریخ شاہد ہے ــ کسی چیز کے متعلق انسانی علم ابتداءً محدود ہوتا ہے۔ پھر جیسے جیسے مشاہدات و تجربات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اس کے متعدد پہلو واضح اور تفصیلی معلومات حاصل ہوتے جاتے ہیں۔ مگر نکتے کی بات یہ ہے کہ نئے نئے اکتشافات کے باعث سابقہ معلومات کلیتاً یا یکسر باطل نہیں ہو جاتیں (خصوصاً جبکہ وہ نظریاتی امور سے متعلق نہ ہوں بلکہ ان کا تعلق تجرباتی و مشاہداتی امور سے ہو)۔ بلکہ ان معلومات و مسائل کے چند نئے پہلو یا نئے اجزاء و عوامل اور اُن کی کارکردگیوں کا مزید علم حاصل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تحقیق و تجربے سے سب سے پہلے صرف چند عناصر (elements) کا علم ہوا۔ پھر مزید تجربے کے بعد چند مزید عناصر معلوم ہوئے، حتیٰ کہ ان کی تعداد ۹۲ تک جا پہنچی۔[۱۱] شروع میں یہ خیال تھا کہ وہ ناقابل تقسیم ہیں۔ مگر بعد میں مزید تجربات سے معلوم ہوا کہ ہر ایٹم (ہائیڈروجن سے لے کر یورینیم تک تمام کے تمام) تین قسم کے اجزاء سے مرکب ہیں، جن کو الکٹران، پروٹان اور نیوٹران کا

---

[۱۱] یعنی قدرتی عناصر کی اور اگر غیر قدرتی یا مصنوعی عناصر کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان کی تعداد اس وقت ۱۰۵ تک جا پہنچی ہے ملاحظہ ہو کتاب: Asimov's Guid to Science, Vol. 1, p. 234, Pelican books, England, 1979.

نام دیا گیا پھر معلوم ہوا کہ پروٹان اور نیوٹران باہم ایک مرکزے کی شکل میں ملے ہوئے ہیں اور الکٹران ان کے گرد بڑی تیزی کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ ایٹم کے اس مرکزے (پروٹان اور نیوٹران کے مجموعے) کے متعلق ابتداءً خیال تھا کہ وہ ناقابل تحلیل ہے۔ مگر مختلف ترکیبوں کو آزمانے کے بعد بالآخر عمل فزشن[2] (ایٹم کے مرکزے کو توڑنے کا ایک بہت ہی پیچیدہ عمل) کے ذریعے جب اس کو توڑا گیا تو اس سے ایک ایسی ہیبت ناک اور دیو ہیکل توانائی خارج ہوئی جو آج ایٹمی قوت یا جوہری توانائی کے نام سے مشہور ہے۔ ایٹم بم ایٹم کے مرکزے میں چھپی ہوئی اسی دل ہلا دینے والی قوت کو مجتمع کرنے کا نام ہے۔

اب یہاں پر قابل غور بات یہ ہے کہ نئے نئے عناصر کی دریافت کے باعث سابق میں دریافت شدہ عناصر کا وجود باطل نہیں ہو گیا۔ جس طرح کہ خود ایٹم کے اندرونی اجزا کی دریافت سے ان عناصر کے وجود پر کوئی حرف نہیں آسکا۔ پھر اسی طرح الکٹران، پروٹان اور نیوٹران کی کارکردگیوں اور ان کی تفصیلات کے منکشف ہونے کے باعث سابقہ معلومات و تفصیلات کسی بھی طرح باطل نہیں ہو گئیں۔ بلکہ صرف اتنا ہی کہا جائے گا کہ پہلے ان اجزا و عناصر سے متعلق انسانی علم اجمالی اور مختصر تھا مگر بعد کی تحقیقات و تجربات کی وجہ سے وہ مفصل اور وسیع ہو گیا۔ اسی پر دوسرے تمام تجرباتی علوم کو بھی قیاس کر لیجیے۔

اس سے یہ کلیہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ علم انسانی یا علوم سائنس کی وہ بنیادی معلومات کبھی نہیں بدلتیں جو تجربے و مشاہدے میں ایک بار پوری طرح ثابت ہو جائیں اور بار بار کے تجربوں سے ہمیشہ ان سے

---

[2] fission

یکساں نتائج برآمد ہوتے ہوں۔ مثلاً ہائیڈروجن کے دو ایٹموں اور آکسیجن کے ایک ایٹم کو کیمیاوی طور پر ملانے سے پانی کا ایک سالمہ وجود میں آتا ہے۔ اور پانی کے سالمے کی کیمیاوی تحلیل سے پھر وہی مفرد عناصر برآمد ہوتے ہیں۔ یہ ایک قانونِ قدرت (لا آف نیچر)[۱۳] یا قانون ربوبیت ہے جو آج بھی صحیح ہے اور آئندہ بھی ہر دور میں قیامت تک صحیح رہیگا۔ یہی حال دیگر تمام قوانین قدرت یا ربانی ضوابط کا ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۞ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اُس کا ایک (طبیعی) ضابطہ مقرر کر دیا۔ (فرقان : ۲)

ایک سادہ سی مثال لیجیے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ آگ جلاتی ہے اور پانی آگ بجھاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں ایک لمحے کے لئے بھی ہمیں شک نہیں ہوتا۔ اسی قسم کے حقائق کو قوانین قدرت کہا جاتا ہے۔ اور اس قسم کے قوانین کا دائرہ بہت وسیع ہے جیسا کہ پیہم تجربات و مشاہدات سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً حیوانی زندگی کا انحصار آکسیجن پر ہے۔ کوئی جاندار پانی کے بغیر زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ تمام جاندار ایک حیاتیاتی مادے (پروٹوپلازم یا تخمایہ) سے مرکب ہیں۔ پروٹوپلازم کا تقریباً ستر فیصد حصہ پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ کائنات کی تمام اشیا متعدد عناصر سے مرکب ہیں۔ مثلاً آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن اور کاربن وغیرہ۔ غرض یہ پوری کائنات نہایت درجہ منضبط قوانین کے مجموعے کا نام ہے اور یہاں پر انتشار، بدنظمی اور لاقانونیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ؟

سائنسی نظریات میں ردّ و بدل یا تبدیلی جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ ان

۱۳۔ law of nature

ثابت شدہ طبیعی قوانین اور بنیادی اصولوں میں نہیں بلکہ اُن مفروضات میں ہوتی ہے جو یا تو ابھی زیر مشاہدہ ہوں یا جن میں کسی رکاوٹ کے باعث سرے سے کوئی تجربہ و مشاہدہ ہی ممکن نہ ہو۔ اصل میں کوئی بھی سائنس داں اور کوئی بھی عالم طبیعیات مختلف اشیائے عالم میں ربط و تعلق اور توجیہہ و تاویل کے لحاظ سے بعض نظریات و مفروضات قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے خواہ ان کے متعلق اُس کو تفصیلی علم حاصل ہو یا نہ ہو۔ دنیائے سائنس میں تغیر و تبدل جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ عموماً اسی قسم کے نظریات و مفروضات میں ہوتا ہے۔ فلکیات (اس میں خصوصاً آغاز کائنات سے متعلق نظریات) ارضیات (جیالوجی) اور نظریہ ارتقاء وغیرہ کے اکثر مسائل و مباحث اسی باب سے متعلق ہیں۔ اس کے بالمقابل طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات (سوائے آغاز حیات اور روح اور اس کے مظاہر سے متعلق مضمون کے) اکثر مباحث تجرباتی و مشاہداتی ہونے کی بنا پر قابل استدلال ہیں[۱۴]۔ ان علوم اور ان کے مباحث میں غور و فکر کرنے اور ان کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد انسان کے اندر اتنی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی بنیاد پر وہ خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اُسے کن امور سے استدلال کرنا چاہیے[۱۵]۔

۱۴؎ اسی بنا پر قرآن حکیم تجربے و مشاہدے پر زور دیتا ہے۔ جیسا کہ تفصیلات پچھلے ابواب میں گزر چکیں۔ کہ کائنات کی تمام چیزوں کا نہایت درجہ باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تاکہ وہ تمام قوانین ربوبیت منکشف ہو جائیں جن کے باعث قرآن حکیم کے ابدی و سرمدی بیانات کا اثبات اور علم الٰہی کی قدامت کا پوری طرح نظارہ ہو جاتا ہو۔

۱۵؎ اس موضوع پر میں نے اپنی ایک دوسری کتاب (وجود باری اور قیامت کے شواہد دنیا کے بنا تا ہیں) میں تفصیلی بحث کی ہے اور قرآن و کائنات کے حقائق میں تطبیق دینے کے لئے بہت سے اصول و کلیات وضع کرنے کی کوشش کی ہے، جن کی حیثیت جدید تفسیری اصول و ضوابط کی سی ہے۔ اور جدید علم کلام کی تدوین کے لئے انشاء اللہ یہ رہنما اصول ثابت ہو سکتے ہیں۔

قرآن حکیم میں مختلف علوم و فنون کے حقائق یا فکری نتائج — جو اصل مغز اور جوہر کی حیثیت رکھتے ہیں — بالکل معجزانہ انداز میں مذکور ہیں۔ جو موجودہ دور کی عقلیت کے مطابق ذہن سازی کے لئے مثبت اور بنیادی رول ادا کر سکتے ہیں۔ ان حقائق کو سمجھنے کے لئے لازمی طور پر جدید سے جدید متعلقہ علوم کی جزئیات کو بھی زیر بحث لانا پڑے گا، جس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ مثلاً قرآن میں مذکور ہے کہ نباتات میں بھی قانون زوجیت پایا جاتا ہے۔ یعنی حیوانات کی طرح پیڑ پودوں میں بھی نر و مادہ پائے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو علی وجہ البصیرت سمجھنے اور متعلقہ مسائل کی تنقیح کیلئے حیاتیات (بیالوجی) کے بہت سے مباحث بھی چھیڑنے پڑتے ہیں۔ اب ممکن ہے کہ بعض جزئیات میں — جو نظری حیثیت رکھتے ہوں — آئندہ چل کر کوئی تبدیلی واقع ہو جائے۔ مگر یہ حقیقت کہ تمام نباتات زوج زوج ہوتے ہیں اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ یہی حال دیگر تمام حقائق و معارف کا بھی ہے۔ اب یہ کتنی بڑی نادانی ہو گی کہ ہم ایک موہوم سے خدشے کی بناء پر اس قسم کی آیات کی سائنٹفک نقطۂ نظر سے تفسیر کرنا ہی چھوڑ دیں۔ گویا کہ قرآن مجید کے پانچویں ایک حصے کو مہمل قرار دیدیں[۱۱]۔ العیاذ باللہ!

غرض انہی تمام مسائل و مباحث کے جاننے کا نام "علم اسماء" ہے

۱۱۔ قرآن حکیم کے علوم خمسہ میں سے ایک مستقل علم نظام کائنات سے متعلق بھی ہے، جس کو شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب "الفوز الکبیر" میں "التذکیر بآلاء اللہ" کا نام دیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں یا مظاہر کائنات کے ذریعہ تذکیر و انتباہ۔ شاہ صاحب کی تصریح کے مطابق قرآن کے بنیادی علوم پنجگانہ یہ ہیں۔ (۱) علم احکام (۲) علم مخاصمہ (۳) مظاہر کائنات کے ذریعہ تذکیر و انتباہ (۴) صحیفہ تاریخ کے ذریعہ تذکیر و انتباہ (۵) علم آخرت۔

اور اس کی تحصیل علمائے اسلام کے لئے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتی ہے[۱]۔ علماء کی ایک جماعت ہمیشہ اور ہر دور میں بلکہ ہر ملک و قوم میں اس فرض کفایہ کی ادائیگی کے لئے تیار رہنی چاہیئے۔ ورنہ وہ عنداللہ قابل مواخذہ ہوں گے اور اُن کا کوئی بھی عذر قیامت کے دن مسموع نہیں ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے کے تمام امور اور تمام مسائل کو کھول کھول کر اپنے آخری اور ابدی صحیفے میں بیان کر دیتے ہیں۔

ہمارے علماء کا فرض ہے کہ وہ ان علوم کی تحصیل کر کے قرآنی منشا و مقصد کے مطابق عالم انسانی کی ہدایت و رہنمائی کا سامان فراہم کریں۔ قرآن حکیم میں ان علوم و مسائل کا تذکرہ بھی دراصل قرآن عظیم کی وسیع ہدایت و رہنمائی ہی کے ایک حصے کے طور پر ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ان علوم سے خدا پرستی کے اثبات کے لئے سائنٹفک دلائل و شواہد فراہم کرنا مقصود ہے۔ یعنی مادہ پرست اور خدا بیزار لوگ نظام کائنات سے متعلق جن حقائق اور واضح نتائج سے آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں یا تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے جن منطقی دلائل کا سامنا کرنے سے جی چراتے ہیں ایسے تمام مواقع پر انہیں متنبہ کرتے ہوئے متعلقہ شواہد کی نشاندہی کرنا اور منکرین حق کی علمی کمزوریوں کو واضح کرنا۔ یہ بھی "معروف و منکر" کے مقتضاء کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ "یأمرون بالمعروف

---

[۱] امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ان تمام علوم و فنون کی تحصیل کو فرض کفایہ قرار دیا ہے جن کے عدم وجود کے باعث اجتماعی حیثیت سے کوئی خرابی لازم آتی ہو۔ موصوف کی کتاب سے ایک طویل اقتباس اس کتاب کے چھٹے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔ نیز اسی طرح امام ابن تیمیہؒ نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے کہ جدید علوم و مسائل میں مہارت حاصل کر کے زمانے کے مزاج کے مطابق کتاب و سنت کی تشریح و تفہیم کرنا تبلیغ دین میں داخل ہے۔ اور یہ علمائے امت کے لئے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ تفصیل اسی باب میں آگے آرہی ہے۔

ویَنھَون عن المنکر" (وہ معروف کا حکم کرتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں)
کے وسیع مفہوم میں یہ شق بھی داخل سمجھی جائے گی۔

غرض قرآن حکیم میں ان علوم کا تذکرہ بھی دراصل اس کی ابدی اور عالمگیر رہنمائی ہی کا ایک حصہ ہے اس سے الگ نہیں۔ ظاہر بینوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کو بھلا انسانی علوم سے کیا واسطہ! وہ سمجھتے ہیں کہ سائنسی علوم نظام شریعت کے مغائر ہیں۔ حالانکہ یہ سائنسی علوم جو بادیٔ النظر میں انسانی علوم معلوم ہوتے ہیں دراصل محض انسانی علوم نہیں ہیں بلکہ نظامِ کائنات اور نظامِ ربوبیت کی توضیح وتفصیل کرنے والے ہیں[۵۱۸] کائنات میں جتنی بھی اشیا ہیں سب کی سب خداوند کریم ہی کی پیدا کردہ ہیں۔ اور انسانی علوم کی بنیاد بھی یہی مخلوقات الٰہی ہیں۔ لہذا ان علوم کی تحقیق وتفتیش سے مخلوقات الٰہی کا تفصیلی علم حاصل ہوتا ہے جو نظام ربوبیت کو سمجھنے کی بنیاد ہے۔ اور جب تک انسان نظامِ ربوبیت کو صحیح طور پر سمجھ نہ لے وہ "ربّ العٰلمین" (تمام جہانوں کے رب اور پروردگار) کی صحیح معرفت بھی حاصل نہیں کر سکتا جو کہ اصل مقصود ہے۔

یہ ایک بعید از قیاس بات ہو گی اگر ہم یوں تصور کر لیں کہ مظاہر کائنات

---

۵۱۸ سائنسی علوم ــ جیسا کہ اہلِ بصیرت کی رائے ہے ــ اپنی ماہیت کے اعتبار سے پوری طرح سیکولر اور غیر جانبدار ہیں۔ ہر ایک ان کی جس طرح چاہتا ہے تشریح کرتا ہے اور ان کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے نظام کائنات کے معمے حل نہیں ہوتے اور مادّیین مظاہر کائنات کے درمیان بین السطور بھٹکتے رہتے ہیں جب کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان مختلف ومتضاد نظاموں اور ان کے تمام ظاہری وباطنی علل واسباب کی مکمل اور تشفی بخش تشریح وتوجیہہ ہو جاتی ہے اور کہیں بھی کوئی رخنہ یا شگاف باقی نہیں رہتا۔

اور اُن کے نظامات کسی بھی درجہ میں نظامت شریعت کے مخالف واقع ہوئے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نصوص قرآنی کے مطابق مظاہر کائنات کے تمام ضوابط بنانے والا خالق عالم جل شانہ ہی ہے۔ اُسی نے ایک ایٹم سے لیکر ایک نظام شمسی تک تمام مظاہر کی تخلیق کی اور ان کے طبیعی ضوابط مقرر کئے۔ اور اسی علیم و خبیر اور ہمہ داں و ہمہ بیں ہستی نے نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنا کلام بھی نازل فرمایا۔ لہٰذا ان دونوں میں تعارض و تضاد کس طرح ہو سکتا ہے!

امام ولی اللہ دہلوی ؒ (۱۱۱۴ھ — ۱۱۷۶ھ) نے قرآن حکیم کے تمام مضامین و مندرجات کو بنیادی طور پر پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ جن میں سے ایک "التذکیر بآلاء اللہ" بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں جو مظاہر کائنات یا مخلوقات الٰہی (حیوانات و نباتات اور جمادات و افلاک) کی شکل میں صفحۂ ارض اور سمائے دنیا میں بکھری ہوئی ہیں، اُن کے ذریعہ یاد دہانی اور سبق آموزی۔ اس تصریح کے مطابق غور فرمایئے یہ موضوع قرآن حکیم کا ایک مستقل موضوع اور اس کے علوم و معارف کا پانچواں ایک حصہ ہے۔ کیا ہم اتنے بڑے حصے کو نظر انداز کر سکتے ہیں!

حاصل یہ کہ نظام کائنات اور نظام ربوبیت سے متعلق ہر نیا انکشاف قرآن حکیم کی ابدی صداقتوں کو اُجاگر کرنے والا اور اُس کے لافانی نقوش واسرار کو بے نقاب کرنے والا ہوگا، جب کہ ہم لغت، نحو اور تمام صحیح تفسیری اصولوں سے کام لے کر آیات الٰہی کی صحیح تفسیر کریں[۹]۔ اس طرح تمام صحیح اصولوں کو کام میں لا کر جب پوری ذمہ داری کے ساتھ اُس کی تفسیر کی جائے گی تو پھر

---

۹ نہ کہ فتنہ و فساد برپا کرنے کی غرض سے اُس کی آیات میں توڑ مروڑ اور من مانی تاویلات کر کے، جیسا کہ عصر جدید کے متجددین کا خاصہ ہے۔

اُس کے غلط ہو جانے یا کتاب اللہ پر حرف آجانے کا کوئی خدشہ باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ یہ کوشش محمود و مستحسن ہوگی اور عند اللہ قابل اجر بھی۔ آج بہت سے تشنگانِ علم اس قسم کی صحیح تفسیروں کا تقاضہ و مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ وقت کی بہت بڑی ضرورت اور ایک بہت بڑا خلا ہے جس کو پورا کرنا عصر حاضر کا ایک کارنامہ ہوگا۔

الٓرٰ تف کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ الف، لام، را۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں (علمی اعتبار سے) محکم کی گئی ہیں[۲۰] پھر اُن کی تفصیل ایک حکیم اور باخبر ہستی کی جانب سے کی گئی ہے۔ (ھود : ۱)

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ع اللہ نے زمین اور آسمانوں کو

---

۲۰ یعنی اصول صحیحہ کی رُو سے اُن کا مفہوم کبھی غلط ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور کائنات کے حقائق ان سے کبھی متصادم نہیں ہو سکتے کیونکہ ان دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ چنانچہ چودہ سو سال کی تاریخ میں آج تک اس قسم کے تعارض و تضاد کی کوئی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکی۔ یہ بھی نوع انسانی کے لئے ایک چیلنج ہے۔ یہ اس بات کا قطعی اور فیصلہ کن ثبوت ہے کہ لازوال سچائیوں سے لبریز یہ کتاب حکمت بھی اُسی حکیم و خبیر ہستی کی جانب سے ہے جس نے اس رنگارنگ صحیفۂ فطرت کی تخلیق کی ہے۔ ورنہ ان دونوں میں اس قدر توافق اور مکمل ہم آہنگی ہرگز نہ پائی جاتی۔

اور دوسری حیثیت سے زمانہ خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ بن جائے اس کے شرعی و اخلاقی احکام و ضوابط از کار رفتہ یا آؤٹ آف ڈیٹ نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اُن کی اہمیت و افادیت ہر دور میں منطق صحیح کی رو سے مسلم رہے گی۔

حکمت و مطابقت[۲۱] کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس باب میں اہل ایمان کے لئے ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ (عنکبوت : ۴۴)

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (اے محمدؐ!) ہم نے آپ پر وہ کتاب اتار دی ہے جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والی ہے۔ اور وہ (ان ابدی حقائق کی بدولت) فرمانبرداروں کے لئے ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے[۲۲]۔ (نحل : ۸۹)

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ اور ارض و سما کا کوئی راز (سربستہ) ایسا نہیں ہے جو (اس) کتاب روشن میں موجود نہ ہوں (نحل : ۷۵)

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ہم نے تمہارے پاس ایک ایسی کتاب بھیج دی ہے جس میں تمہارا تذکرہ (داستان) موجود ہے۔ (انبیاء : ۱۰)

۲۱؎ امام راغب لکھتے ہیں کہ لفظ "الحق" کی اصل مطابقت و موافقت ہے۔ اور جب اس کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر ہو تو اس کا مطلب ہوگا وہ ذات جو بتقاضائے حکمت اشیاء کو وجود میں لائے۔ اسی طرح ہر اس چیز کو بھی "حق" کہا جاتا ہے جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق پیدا کی گئی ہو (ملخص از المفردات فی غریب القرآن)

۲۲؎ یہاں پر ہدایت، رحمت اور بشریٰ کے الفاظ ہماری ذہن سازی کے لئے نہایت درجہ اہمیت رکھتے ہیں جو "تبیان" سے متعلق ہیں۔ گویا کہ قرآن حکیم کو ہر قسم کی معلومات سے آراستہ کرنے کے یہ تین مقاصد ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ بھی ہدایت ہی کی خاطر ہے کہ اہل اسلام منشا خداوندی کے مطابق نوع انسانی کی صحیح رہنمائی کر کے اس کی رحمت اور خوشخبری کے مستحق بنیں۔

أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ تو کیا میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کو حکم مان لوں! حالانکہ اُسی نے اس کتاب کو تمہارے پاس تفصیل کے ساتھ بھیجا ہے۔ (انعام: ۱۱۴)

تَبٰرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر فرقان (فیصلہ کن کتاب) نازل کی تاکہ وہ سارے جہان کو متنبہ کر سکے۔

(فرقان: ۱)

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ (لوگو) تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے روشن دلیلیں آچکی ہیں۔ پس اب جس نے بصارت (کھلی آنکھوں) سے کام لیا وہ فائدہ میں رہا اور جو (جان بوجھ کر) اندھا بنا وہ زیاں کار ہوا۔ (انعام: ۱۰۵)

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْ أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ؕ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ ہم عنقریب ان (منکرین حق) کو اپنے نشانات و دلائل دکھا دیں گے، ان کے گرد و نواح میں بھی اور خود ان کی اپنی ہستیوں میں بھی، تاآنکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ (کلام) برحق ہے۔ کیا یہ بات ان (کی تسلی و تشفی) کے لئے کافی نہیں ہے کہ تیرا رب (اس عالم آب و گل کی) ہر چیز سے واقف ہے؟ (حٰم سجدہ: ۵۳)

اس قسم کی اگر تمام آیات کو اکھٹا کیا جائے تو فکر و نظر کے بہت سے گوشے اُجاگر ہو جاتے ہیں اور ہر شبہ کا کافی و شافی جواب مل جاتا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا (وہی ہے جس نے تمہارے پاس اس کتاب کو تفصیل کے ساتھ بھیج دیا ہے: انعام ۱۱۴)

سائنس اور فلسفۂ جدیدہ کا نیا آہنگ

تصوریت یا وحدۃ الشہود

جیسا کہ عرض کیا جا چکا فلسفۂ جدیدہ کی بنیاد جدید سائنس کے مسلمہ حقائق اور نظریات پر ہے اور سائنسی نظریات میں ترمیم و اضافے کے ساتھ ساتھ جدید فلسفے کے مسائل و مباحث بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جدید سائنس نے چونکہ مادیت materialism اور میکانیت machanism کے بے بنیاد نظریات کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے[۲۳] اس لئے اب جدید سائنس اور فلسفۂ جدیدہ کا آہنگ "تصوریت"[۲۴] یا ایک "ہمہ گیر کائناتی ذہن قرار پاتا ہے۔

۲۳ؔ تمام فلسفیانہ نظریات اصولی اعتبار سے چار مذاہب (اسکول آف تھاٹ) میں تقسیم کئے گئے ہیں جو یہ ہیں: (۱) ثنویت یا دوئی (۲) تصوریت یا روحیت (۳) مادیت۔ اور (۴) ارتیابیت۔ ان میں سے اول الذکر دو براہ راست یا بالواسطہ مذہب کے مؤید و حامی ہیں۔ تیسرا معاند ہے اور چوتھا نہ دوست ہے اور نہ دشمن۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے "مذہب و عقلیات" از مولانا عبدالباری ندوی)

۲۴ؔ نظریہ تصوریت کو سمجھنے کے لئے نظریہ ثنویت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اور ثنویت (DUALISM) نام ہے اس چیز کا کہ کائنات میں دو بالکل مختلف اور دو متضاد چیزیں پائی جاتی ہیں یعنی جسم اور روح یا مادہ اور عقل و شعور۔ تمام مذاہب کی تعلیمات کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ اور ارسطو کا بھی یہی نظریہ ہے۔ اس کے برعکس تصوریت (idelism) کا نظریہ یہ ہے کہ اصل الاصول صرف ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے روح یا عقل یا ذہن، باقی تمام عالم جسمانیات اسی کا پرتو ہیں۔ اور مادیات کا مستقل وجود ایک قسم کا فریب ہے۔ دور قدیم میں فلاطون اسی کا داعی تھا جبکہ دور جدید میں اسپنوزا (Spinoza) لائبنیز (Leibnitz) برکلے (Berkeley) شیلنگ

←

اس طرح آج یہ دونوں روحانیت کے اثبات میں مذہب کے مؤید اور اس کے حامی نظر آتے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب نیوٹن نے قانون تجاذب کو دریافت کیا تو مادہ پرستوں کو نظام کائنات کی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے توجیہہ کرنے کیلئے بظاہر ایک قوی بنیاد مل گئی اور وہ یہ سمجھے کہ اس قانون کی دریافت کے بعد عالم طبیعی اور عالم حیاتیاتی کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تحریر فرماتے ہیں:

"جب نیوٹن نے سترھویں صدی میں قانون تجاذب کا انکشاف کیا اور علم حرکت کی تدوین کی تو ان قوانین کا اطلاق نہ صرف روئے زمین پر پیش آنے والے واقعات پر کیا گیا بلکہ نظام شمسی کے سیاروں اور دوسرے مظاہر پر بھی اس کو وسعت دی گئی۔ فرانس کے مشہور ریاضی داں لاپلاس نے تو یہاں تک کہدیا کہ اس کائنات کی میکانکس ایک ہی ہو سکتی ہے اور اس

(بقیہ ص ۲۷۳) (Schelling) ہیگل (Hegel) اور برگسان (Bergsan) وغیرہ سب اس کے ہمنوا اور مؤید ہیں۔ مذہب میں صوفیہ اور ارباب باطن سے ان قائلین تصوریت کے ڈانڈے اس قدر مل جاتے ہیں کہ صرف حال اور قال کا پردہ رہ جاتا ہے۔ (ماخوذ از مذہب و عقلیات، ص ۱۱)

واضح رہے کہ قرآنی عقائد و تعلیمات کے مطابق "وحدت الوجود" کے بے بنیاد نظریہ کی صحت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں البتہ "وحدت الشہود" کا اثبات اس حیثیت سے ہوتا ہے کہ قرآن حکیم میں صفات الٰہی سے متعلق جتنے بھی دعوے کیے گئے ہیں ان کا ثبوت مشاہداتی طور پر اس عالم رنگ و بو میں موجود ہے جو سائنسی علوم کے تفصیلی مطالعے سے حاصل ہوتا ہے، جبکہ وہ قرآن حکیم کی ہدایات کے مطابق کیا جائے اور ان دونوں میں تطبیق دی جائے۔ لہٰذا اس موقع پر مجھے اسی نقطۂ نظر کا اثبات کرنا مقصود ہے۔

میکانکس کو نیوٹن نے دریافت کر لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ اب اس کے بعد طبیعی سائنس میں کسی کے لئے کچھ کرنا باقی نہیں رہا۔ ۱۹ ویں صدی میں اس میکانکس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو گئیں کہ نہ صرف طبیعی سائنس بلکہ حیاتیاتی علوم میں بھی اس کا اطلاق کیا جانے لگا۔ اور انسانی اعضاء بلکہ دماغ کے افعال کی توجیہہ بھی میکانی اصول پر ہونے لگی اور یہ سمجھا جانے لگا کہ جس سائنس کی بنیاد اس میکانی اصول پر نہ ہو وہ باضابطہ سائنس ہی نہیں ہو سکتی"[۲۵]

ایک طرف تو یہ کوشش ہو رہی تھی اور دوسری طرف چند دیگر سائنس دانوں ہی کے تجربات و تحقیقات کی بدولت ایسے نتائج برآمد ہوئے کہ مذکورہ بالا مادہ پرستانہ نظریات کا قلع قمع ہو گیا اور یہ ذہنیت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ چنانچہ ڈاکٹر موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، عین اسی زمانے میں پے در پے چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہل گئیں اور علم طبیعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا۔ مادہ و توانائی، ذرہ اور موج، جوہر اور عنصر، زماں و مکاں اور علت و معلول جیسے بنیادی تصور ہی سرے سے بدل گئے اور خود قوانین قدرت کا بھی ایک نیا مفہوم لیا جانے لگا۔ ان تغیرات نے نیوٹن اور میکسول کی طبیعیات کی بجائے اس جدید طبیعیات کی تشکیل کی جس کی بنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی ہے"[۲۶]

انیسویں صدی کی طبیعیات میں مادہ اور توانائی ایک دوسرے کے

---

۲۵ "مذہب اور سائنس" (مقدمہ) ص ۳۶، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۱۹۷۱ء

۲۶ ایضاً ص ۳۶ ــ ۳۷

متضاد تصور کیے جاتے تھے۔ جدید طبیعیات میں مادہ اور توانائی کا یہ اختلاف ختم ہوگیا اور تجربوں سے ثابت ہوگیا کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں۔ یعنی مادے کو توانائی میں اور توانائی کو مادے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

"بیسویں صدی کے آغاز یعنی سن ۱۹۰۰ء میں پلانک (Planck) نے کوانٹم (Quantum) کا انکشاف کیا اور بتایا کہ توانائی اور مادی نظام کی حالتوں میں تبدیلی مسلسل نہیں بلکہ ایک خاص قلیل ترین مقدار یعنی کوانٹم کے اضعاف (multiples) کے متناسب ہوتی ہے۔ اس انکشاف کے بعد قدیم ترین زمانے سے طبیعی کائنات میں تغیر و تبدل کے مسلسل اور تدریجی ہونے کا جو تصور چلا آرہا تھا وہ ختم ہوگیا اور اس کی وجہ سے نیوٹن کی میکانکس میں ایک غیر معمولی انقلاب رونما ہوا۔"[۵۲۷]

آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت (relativity) نے زمان و مکاں کے تمام قدیم تصورات کو بدل کر رکھ دیا اور علت و معلول سے متعلق جبریت کا نظریہ بھی باطل ہوگیا۔ چنانچہ خود سائنس دانوں کو ہتھیار ڈالتے ہوئے سائنس کے حدود نئے سرے سے متعین کرنے پڑے۔

"سائنس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ مظاہر فطرت کی اصلی اور آخری ماہیت اور حقیقت معلوم کرے بلکہ سائنس کا کام صرف یہ ہے کہ ان اشیاء اور مظاہر میں باہمی ربط و تعلق کا پتہ چلائے۔ ڈیراک نے مثال کے طور پر یہ کہا کہ سائنس میں یہ سوال کرنا بے معنی ہے کہ برق کی حقیقت یا ماہیت کیا ہے بلکہ صحیح سوال یہ ہوگا کہ قوت برق کا عمل کیا ہے۔"[۵۲۸]

---

۵۲۷ ایضاً ص ۲۷ – ۲۸

۵۲۸ ایضاً ص ۴۴ – ۴۵

طبیعی علوم کی انہی ترقیوں کی بدولت مادیت و دہریت اور جبر و تعین کا دور اب ختم ہو چکا ہے اور تمام جدید فلاسفہ مثلاً ہائی زن برگ، سرجیمز جینز، سرآرتھر ایڈنگٹن اور وہائٹ ہڈ وغیرہ کا اس بنیادی نقطۂ نظر پر تقریباً اتفاق ہو چکا ہے کہ ہماری اس کائنات میں مادیت کے بجائے بنیادی طور پر "تصوریت" یا "ذہنیت" پائی جاتی ہے اور ایک "ہمہ گیر آفاقی ذہن" (universal mind) کا اثبات ہوتا ہے۔[۲۹]

فلسفۂ تصوریت کی وہ صدا جو مشہور فلسفی برکلے (۱۶۸۵-۱۷۵۳ء) نے روحانیت کے اثبات میں اب سے کوئی دو ڈھائی سو سال پہلے بلند کی تھی آج جدید سائنس اس کی تائید کر رہی ہے اور تمام جدید فلاسفہ اس کو چاروناچار ماننے پر مجبور نظر آرہے ہیں۔ وحدت کائنات یا کائنات کے ایک یونٹ ہونے کا یہی وہ آفاقی تصور ہے جو توحید باری تعالےٰ اور ایک واجب الوجود ہستی کے اثبات کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اسی کا نام شاید تصوف کی اصطلاح میں "وحدت الشہود" ہے جو کم از کم سائنٹفک نقطۂ نظر سے ایک وجدانی اور مشاہداتی چیز ہے۔ یعنی جو شخص مذہبی نقطۂ نظر سے ایک ذات والاصفات اور فوق الطبیعی ہستی کے وجود کا قائل ہو اس کے لئے مظاہر کائنات اور اُن کے تفصیلی و گہرے علم و مطالعے سے اس ذات برتر کے وجود اور اس کی صفات عالیہ و صفات کمالیہ کا نظارہ بالکل عین الیقین اور حق الیقین کے درجے میں ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وحدۃ الشہود یا توحیدِ شہودی کو کماحقہٗ سائنٹفک نقطۂ نظر سے سمجھنے کے لئے جدید سائنس کا مطالعہ ضروری ہے۔ اور یہ حاصل ہے قرآن اور سائنس کے مطالعے کا جو کہ مقصد المقاصد ہے۔

---

[۲۹] تفصیل کے لئے دیکھئے مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب "مذہب اور سائنس"۔

کائنات میں صفات الٰہی کے جلوے

اصل میں مظاہر فطرت کے گہرے مطالعے و تجزیے سے مادہ اور روح کے درمیانی فاصلے کم سے کم اور ان کے درمیان حائل شدہ پردے ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ تصور میں ایک ہی چیز دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور وہ ہے ایک عظیم اور پر جلال ہستی کی کارفرمائی اور اس کی ربوبیت و الوہیت کے آفاقی جلوے جو ایک ننھے سے ایٹم سے لے کر ایک بڑے سے بڑے جرم فلکی تک ہر چیز میں جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ اب آپ اس کا نام "وحدت الشہود" رکھ لیجیے، یا مظاہر کائنات میں ربوبیت والوہیت کا آفاقی اور ہمہ گیر مشاہدہ دونوں کا ماحصل ایک ہی رہے گا۔ قرآن حکیم نے جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت اور اس کی دیگر جن صفات کے اثبات کی خاطر مظاہر فطرت اور ان کے نظاموں کا مطالعہ کرنے کی جو دعوت دی ہے اس کا اصل مقصد یہی ہے۔ وہ پورے جزم اور یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک ہی رب اور ایک ہی الٰہ ہے اور ہر طرف اسی کی کارفرمائیاں اور جلوے بکھرے ہوئے ہیں مثلاً:

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ٥ وہی ہے جو رحم (مادر) میں تمہاری صورت گری جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ (نرالے اور حیرتناک افعال والا) موجود نہیں ہے۔ وہی (ہر چیز پر) غالب اور حکمت والا ہے۔ (آل عمران : ٦)

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ٥ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ٥ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز سے

خوب واقف ہے۔ یہی ہے اللہ تمہارا رب، جس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ موجود نہیں ہے۔ ہر چیز کا وہی پیدا کرنے والا ہے پس تم اُسی کی عبادت کرو۔ اور ہر چیز اُسی کے حوالے ہے۔ (الانعام : ۱۰۱ ـ ۱۰۲)

اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں جہاں پر کائنات کے مختلف مظاہر اور ان کے نظاموں کا تذکرہ کرنے کے بعد خصوصیت کے ساتھ ربوبیت والوہیت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور سورۂ انعام کی جو آیتیں اوپر نقل کی گئی ہیں ان سے قبل عالم سماوی اور عالم ارضی سے تعلق رکھنے والی مختلف چیزوں مثلاً چاند، سورج، ستارے، رات، دن، بر و بحر اور خصوصیت کے ساتھ نباتات اور ان کے چند خصوصی مظاہر کا ایک جامع تذکرہ آگیا ہے۔ پھر اس کے بعد اوپر کی آیات مذکور ہیں۔ اس سیاق و سباق میں ربوبیت والوہیت کے تذکرے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام نظاموں کے بیان کرنے سے اصل مقصود نوعِ انسانی کے ذہن و دماغ میں ربوبیت والوہیت کی حقیقت کو اتار دینا ہے۔

چنانچہ لغوی اعتبار سے "اللہ" کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ یہ اَلِہَ یا اَلَہُ (باب سمع) سے مشتق ہے۔ یعنی وہ ہستی جس کی حقیقت و معرفت میں عقلِ انسانی حیران و سرگرداں ہو جائے۔[۹۳] امام راغب تحریر فرماتے ہیں:

"اور کہا گیا ہے کہ یہ لفظ اَلِہَ سے مشتق ہے۔ یعنی حیران ہونے کے معنی میں۔ اور یہ وجہ اشتقاق امیر المؤمنین (حضرت علیؓ) کے اس قول کی بنا پر ہے کہ "اس ذاتِ برتر کی ------ توصیف سے تمام بہترین صفات اور تمام زبانوں کے الفاظ بھی عاجز اور ناکافی ہیں"۔ اور یہ اسی بنا پر ہے کہ بندہ جب باری تعالیٰ کی صفات میں غور کرتا ہے تو وہ حیران و سرگرداں

ملاحظہ ہو سیرت النبی، از علامہ سید سلیمان ندوی، ۴/۵۰۵،

ہوتا ہے۔ اسی بنا پر مروی ہے، تفکروا فی آلاء اللہ ولا تفکروا فی اللہ" یعنی اللہ کی کرشمہ سازیوں (اس کی صفات کمالیہ) میں غور کرو اور اللہ کی ذات میں غور مت کرو۔[۱۳۱]

اس لحاظ سے "لا الہ الا ھو" کے معنی یہ ہوئے کہ اس پوری کائنات اور کل عالم رنگ و بو میں ایک ہی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جس کے افعال حد درجہ نرالے اور حیرتناک ہیں اور جن کی اصل حقیقت و ماہیت کے سمجھنے سے عہد قدیم ہی کے نہیں بلکہ عہد جدید کے تمام انسان ــ اپنی ہمہ جہتی تمام علمی ترقیوں کے باوجود ـــ عاجز و درماندہ ہیں، جیسا کہ تفصیلات پہلے باب میں گزر چکیں۔ آپ مظاہر عالم کا طبیعی (physical) کیمیاوی (chemical) عضویاتی (morphological) فعلیاتی (physiological) تشریحی (anotomical) طبّی (medical) اور نفسیاتی (psychological) کسی بھی حیثیت سے جائزہ لیجیے آپ کو یہ ایک اٹوٹ کلیہ نظر آئے گا۔ گویا کہ ہر حیثیت سے یہ اس عالم آب و گل کی ایک مسلّمہ اور ناقابل تردید حقیقت ہے جس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

اسی طرح تمام صفات الٰہیہ کا جب اس قدر تفصیلی طور پر مطالعہ کیا جائے تو مجموعی اعتبار سے ان صفات کمالیہ کا ایک واضح تصور مجسم شکل میں ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔ پھر ہماری نظریں جس چیز پر بھی پڑیں گی اس کی ظاہریت کے خول کو توڑتے ہوئے ان صفات عالیہ پر مرکوز ہو جائیں گی۔ گویا کہ ہم ان ظاہری مظاہر کو نہیں بلکہ ان مظاہر میں پیوستہ کمالات الٰہی کے جمال نیر انی کو دیکھ رہے ہیں اور اس کے آفاقی جلوؤں کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

۱۳۱۔ المفردات فی غریب القرآن، ص ۲۱

اس مطالعے و مشاہدے سے جو ایمان حاصل ہوتا ہے وہ محض علمی اور نظریاتی نہیں رہتا بلکہ وہ مشاہداتی ہونے کی بنا پر وجدانی اور جذباتی بن جاتا ہے۔ گویا کہ بندہ عین الیقین اور حق الیقین کی منزل تک پہنچ چکتا ہے۔ یہ بندے کی منزل مقصود اور اس کی معراج ہے جس کے حصول کے بعد اس کو کارزارِ حیات میں بہکنے یا مظاہر فطرت کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کا موقع ہی باقی نہیں رہتا۔ بلکہ وہ زندگی کی ہر منزل اور تمام نشیب و فراز میں برہان الٰہی کی روشنی میں چلتا ہے اور "نور الٰہی" اس پر سایہ فگن رہتا ہے، بشرطیکہ یہ مطالعہ و مشاہدہ صحیح اور خداپرستانہ نقطۂ نظر سے اور قرآن حکیم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کیا جائے۔ ورنہ دنیا میں کتنے ایسے سائنس داں اور ماہرین علوم طبیعی موجود ہیں جو ان علوم میں ماہر ہونے کے باوجود بالکل کورے اور اندھے بہرے بنے ہوئے ہیں۔

وحدت الوجود یا وحدت الشہود

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی چند صفات عالیہ کا بیان اس طرح کیا گیا ہے:
هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وہی سب سے پہلے، سب سے آخر، سب سے ظاہر اور سب سے چھپا ہوا ہے۔ (حدید: ۳)

اس کی تشریح میں علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں۔ "(دنیا کی) ہر چیز کا ایک اول، ایک آخر، ایک ظاہر اور ایک باطن ہوتا ہے، یہاں تک کہ ایک لحظے اور ایک نفس کا بھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی اولیت اس کی قدامت ہے، اُس کی آخریت اُس کا دوام اور بقا ہے، اُس کا ظاہر ہونا اُس کی عظمت و برتری ہے، اور اس کا پوشیدہ ہونا اُس کا قرب اور ہر چیز کا احاطہ ہے۔[۳۲]

۳۲؎ طریق الہجرتین و باب السعادتین، ص ۳۸ — ۳۶، مطبوعہ قطر،

ظاہر اور باطن کا ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے حیرت انگیز صفات و کمالات کے باعث ہر چیز میں ظاہری و باطنی ہر اعتبار سے نمایاں نظر آتا ہے۔ یعنی کسی بھی چیز کے ظاہر و باطن میں اُسی کے کمالات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، خواہ ایک بڑے سے بڑا نظام شمسی ہو یا ایک ننھا سا جوہر یا ایٹم۔ حتیٰ کہ ظاہری آنکھوں کو نظر نہ آنے والے ایٹم کا بھی اگر سینہ چیرا جائے تو اس میں بھی اُس کے خالق کے کمالات کی ایک پوری دنیا نظر آتی ہے جس کا کلّی احاطہ کرنے سے انسانی علم و دانش عاجز و بے بس دکھائی دیتے ہیں۔

ایک دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ وہ ایک حیثیت سے بالکل ظاہر ہے گویا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، اور دوسری حیثیت سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ حد درجہ پوشیدہ اور مخفی ہے، گویا کہ کسی آنکھ کو نظر ہی نہیں آتا۔

بہر حال آپ صحیفۂ فطرت میں جدھر بھی نظر ڈالئے آپ کو اس کے خالق و صانع ہی کی صفات کمالیہ کے نقوش دکھائی دیں گے اور اسی کی ربوبیت والوہیت تمام مظاہر پر محیط نظر آئے گی۔ گویا کہ اوراق فطرت کی حیثیت محض کٹھ پتلیوں جیسی ہے اور ان کے پس پردہ شاہد حقیقی جلوہ افروز ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ خالق کا ظہور نمایاں اور مخلوقات کا ظہور غیر نمایاں اور دھندلا سا ہے۔ گویا کہ یہ سب کسی ڈرامے کے عارضی اور غیر مستقل کرداروں کی طرح پردۂ سیمیں پر تھوڑی دیر کے لئے نظر آتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔

مگر اس بحث سے مادہ یا جسمانیات کا انکار لازم نہیں آتا، جیسا کہ فلسفہ تصوریت کے قائلین نیز اہل باطن وغیرہ نے اپنی انتہا پسندی میں اختیار کیا ہے۔ اسی طرح اس موقع پر وحدۃ الوجود کے قائلین کی بھی کسی

بھی درجے میں تائید نہیں نکلتی کیونکہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ غالی "وجودیوں" کا دعویٰ اور عقیدہ ہے کہ اس پورے عالم رنگ و بو میں صرف ایک ہی وجود ہے۔ حجر و شجر، آب و خاک، مرغ و ماہی اور جن و بشر وغیرہ تمام مظاہر اسی وجود واحد کے مختلف روپ ہیں۔ اور مؤمن و مشرک، نیک و بد، عادل و جابر اور اچھے اور بُرے سب اس میں برابر ہیں۔ اور اپنے ان مہمل عقائد کی تائید میں قرآن اور حدیث سے (عجیب اور اوچھے انداز میں) تاویل کرتے ہیں[۳۳]

نیز ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ہر وقت کھلے بندوں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اس سے انبیاء ہی کی طرح فیض رسانی پاتے ہیں اور ان میں سے بعض تو مرتبے میں اپنے آپ کو انبیاء سے بھی افضل سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ان میں سے بعضوں کا ادعا ہے کہ وہ ولایت و معرفت کے مقامات طے کر لینے کے بعد شرعی قیود اور پابندیوں سے بھی آزاد ہو چکے ہیں[۳۴]

رویت باری کے سلسلے میں کتاب الٰہی میں صاف مذکور ہے کہ (اس عالم ناسوت میں) کسی بھی طرح باری تعالیٰ کا مشاہدہ حاسہ بصر کے ذریعہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ اور اس پر تمام علمائے اہل سنت کا اتفاق ہے[۳۵]

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ وہ بڑا ہی باریک بین اور باخبر ہے۔

(انعام : ۱۰۴)

۳۳ھ تفسیر المنار، ۹/۱۳۲، دار المعرفۃ، بیروت،

۳۴ھ ایضاً، ۹/۱۳۱ ـــ ۱۳۲

۳۵ھ ایضاً، ۹/۱۴۹

مگر "وجودی" حضرات کہتے ہیں چونکہ وجود واحد ہے، جس کے مظاہر مختلف ہیں اس لئے یہاں بھی رویت ثابت ہوتی ہے اور رائی ومرئی (دیکھنے والا اور دیکھا جانے والا) دونوں ایک ہی ہیں۔ یعنی رب عین بندہ ہے اور بندہ عین رب۔ اللہ خود اپنے آپ کو اپنے بندوں اور دیگر مخلوقات کی شکل میں دکھاتا ہے۔ یہ ان لوگوں کا تناقض و ہذیان ہے جو بدیہی طور پر باطل ہے۔[۵۳۶]

اس سلسلے میں علامہ رشید رضا نے "فتوحات مکیہ" سے ابن عربی کی ایک طویل عبارت بھی نقل کی ہے جس میں بڑا تعارض و تضاد پایا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا موصوف ایک ہی سانس میں تائید بھی کر رہے ہیں اور تردید بھی۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ملاحظہ فرمائیے:

وان نحن لم نزل فما نری الا انفسنا فیہ وصورنا وقدرنا ومنزلتنا نعلی کل حال مارأیناہ، وقد نتوسع فنقول قد رأیناہ ونصدق کما انہ لو قلنا رأینا الانسان صدقنا فی أن نقول رأینا من مضی من الناس و من بقی ومن فی زماننا من کونہم انساناً لا من حیث شخصیۃ کل انسان ولما کان العالم أجمعہ واحادہ علی صورۃ حق ورأینا الحق فقد رأینا وصدقنا: ہم ہمیشہ اپنے آپ کو، اپنی صورتوں کو اور اپنی قدر و منزلت کو اس میں برابر دیکھتے رہتے ہیں (اس طرح) ہم کسی بھی حال میں اس کو دیکھ نہیں سکتے۔ اور تھوڑی سی وسعت کے ساتھ ہم کہیں گے کہ ہم اُس کو دیکھ چکے ہیں اور ہم سچ کہتے ہیں۔ جس طرح کہ اگر ہم یوں کہیں کہ ہم نے انسان کو دیکھا تو ہم نے اس بارے میں سچ کہا کہ ہم نے دیکھا اس شخص کو جو گزر گیا اور اُس کو بھی جو باقی ہے اور جو ہمارے زمانے میں ہے، اپنے

---

۵۳۶ ایضاً ۱۶۷/۹

انسان ہونے کی حیثیت سے نہ کہ ہر انسان کی شخصیت ہونے کے لحاظ سے۔ اور چونکہ تمام عالم اور اس کے پرزے حق (تعالیٰ) کی صورت میں ہیں اور ہم نے حق کو دیکھ لیا ہے تو ہم نے ضرور دیکھ لیا ہے اور ہم سچ کہتے ہیں[۳۷]

یہ عجیب و غریب اور مغالطہ انگیز کلام نظر آتا ہے۔ اصل میں یہ "ہمہ اوست" کے فلسفیانہ عقیدے کی ترجمانی ہے۔ چنانچہ اس سے مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے "لا الٰہ الا اللہ" کو "لا موجود الا اللہ" قرار دے دیا گیا[۳۸] جو کتاب و سنت اور عربی لغت و ادب سب کے خلاف اور من مانی تاویل ہے۔ شیعہ حضرات بھی قرآنی نصوص کی اسی طرح اوچھی اور بے سروپا تاویل کرتے ہیں۔ آخر ہم انہیں کس بنیاد پر گمراہ قرار دیں؟ اصول تو سب کے لئے ایک ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ فلسفے کی راہ سے آیا ہے اور محققین کی نظر میں یہ ایک کشفی[۳۹] و اشراقی[۴۰] چیز ہے، جو کتاب و سنت سے

۳۷ے فتوحات مکیہ، باب ۱۱ بحوالہ تفسیر المنار ۹/۱۶۸

۳۸ے ملاحظہ ہو کتاب "وحدت الوجود" از بحر العلوم عبد العلی انصاری، ص ۵۶، دہلی، ۱۹۷۱ء

۳۹ے "لغۃً" کشف کے معنیٰ کھولنے یا کسی حقیقت کو واضح کرنے کے ہیں۔ فلسفہ و تصوف کی اصطلاح میں اس سے مراد سکر و سرمستی کے ایسے لمحے ہیں جب کسی شخص کی محدود "انا" پھیل کر غیر محدود "انا" سے اپنا رشتہ استوار کر لیتی ہے اور عجیب و غریب حقائق و کیفیات سے دوچار ہوتی ہے۔" (عقلیات ابن تیمیہ، از مولانا محمد حنیف ندوی، ص ۲۴۳، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور)

۴۰ے اس تحریک کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حق اور یقین کی دریافت کے لئے حواس، عقل، علم، قیاس، استقرار، برہان و استدلال قطعاً مفید نہیں۔

(بقیہ ص ۲۸۶ پر)

ماخوذ ہونے کے بجائے محض ذاتی مشاہدات اور کشف وغیرہ پر مبنی ہے جو شرعاً قابل حجت نہیں ہو سکتا بلکہ صراحتہً کتاب و سنت کے مغایر ہے۔ چنانچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس بارے میں بڑی وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

" مسئلہ وحدت الوجود میں شیخ اکبر (ابن عربی) اور شیخ مجدد (حضرت مجدد الف ثانی) کا جو اختلاف ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ اور دونوں بزرگوں کی تحقیق ذاتی مشاہدہ اور کشف پر مبنی ہے[۱۴۵]"

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں: " درحقیقت جیسا کہ حضرت مجدد نے لکھا ہے انسان کی قوت عقلی ہو یا قوت روحانی، کوئی قوت اس کے حواس اور خارجی موثرات کے اثر سے بالکلیہ آزاد نہیں۔ اس کے ماحول، اس کے افکار و عقائد اور ان مقدمات کا جو اس کے یا اس کی جماعت اور قوم کے نزدیک مسلم ہیں، اس کی تحقیقات اور مشاہدات پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشراقیوں کو اپنے کشف و مشاہدے میں بہت سے یونانی اور مصری اوہام و خیالات کی تائید نظر آتی تھی۔ اور مسلمان اشراقیوں کو فلسفہ یونان کے بہت سے مفروضات حقیقت بن کر نظر آتے تھے۔

(بقیہ ص ۲۸۵) حصول صداقت کے لئے مشاہدہ شرط ہے۔ اور یہ مشاہدہ صرف نور باطن اور اندرونی حاسّہ کو بیدار کر لے سے ممکن ہے جو ماورائے طبیعیات کا اسی طرح ادراک کرتا ہے جس طرح یہ ظاہری آنکھیں ظاہری چیزوں کا ادراک کرتی ہیں۔ اور یہ حاسّہ اُسی وقت بیدار ہو سکتا ہے جب مادیت کو بالکل فنا اور حواس ظاہری کو مردہ کر دیا جائے۔ حقائق کی تحصیل (اس طرح) نفس کشی اور مراقبہ اور تفکر سے پیدا ہوتی ہے" (مذہب و تمدن از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۵، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء)

۱۴۵ مذہب و تمدن، ص ۳۳، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء

وہ "عقول"[۴۲] کا مشاہدہ کرتے تھے اور عقل اول سے بعض اوقات ان کا مکالمہ اور مصافحہ ہوتا تھا"[۴۳]

کشف و مشاہدہ اگرچہ شرعاً ناجائز یا ممنوع نہیں ہے بشرطیکہ وہ کتاب وسنت کے مغائر نہ ہو اور شرعی حدود کے اندر اور نصوص دین کی تشریح و تعبیر میں ضمنی حیثیت رکھتا ہو۔ مگر چونکہ بعض صوفیہ نے غلو اور تجاوز سے کام لیتے ہوئے اس کو اولیت دیدی اور قرآن و حدیث کو ثانوی درجہ دیتے ہوئے ان کے نصوص میں طرح طرح کی تاویلیں شروع کر دیں تو علامہ ابن تیمیہؒ نے ان پر تنقید کرتے ہوئے بہت صحیح اصول بیان فرمایا ہے۔

" محدث[۴۴] کو اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام و تحدیث کی نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تاہم اس کے لئے ضروری ہے کہ ان چیزوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لے، اس لئے کہ صوفی کبھی مقام عصمت پر فائز نہیں ہوتا۔ جیساکہ ابوالحسن شاذلی نے تصریح کی ہے

---

۴۲ عقول عشرہ جو یونانی فلسفے میں واجب الوجود ذات ہی کی طرح قدیم اور مستقل بالذات ہستیاں تسلیم کی جاتی ہیں، جنہوں نے افلاک تسعہ کو جنم دیا۔ گویا کہ یہ ۱۹ "معززین" ہیں جو "کارکنان قضا و قدر" کہلاتے ہیں۔

۴۳ مذہب و تمدن، ص ۳۵۔

۴۴ محدث وہ غیر نبی ہوتا ہے جس کے دل میں عالم بالا سے براہ راست کوئی بات ڈالی جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ تحریر فرماتے ہیں: "محدث عالم ملکوت کے بعض علمی خزانوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور وہاں سے وہ علوم حاصل کرتا ہے جو حق تعالیٰ اس کو فراہم کرتا ہے، تاکہ وہ نبی صلعم کی شریعت بنے اور بنی آدم کی اصلاح کا باعث ہو ــــ یہ بات شاہ صاحب نے خاص کر حضرت عمرؓ کے بارے میں تحریر فرمائی ہے۔ جن کے الہامات وحی کے موافق ہوا کرتے تھے ملاحظہ ہو: حجۃ البالغہ، ۹۳/۲، رشیدیہ دہلی۔

کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب وسنّت کی عصمت کا ذمہ تو لیا ہے کشوف و الہامات کی عصمت کا نہیں لیا[۴۵]

انہی تمام وجوہات کی بنا پر امام ابن تیمیہ ابن عربی پر شدید جرح و تنقید کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ یہ فلسفہ زدہ لوگ اپنے اولیا ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بلاواسطہ اللہ تعالیٰ سے فیض یاب ہوتے ہیں اور (اس بنا پر) وہ اپنے آپ کو نبی سے بھی افضل تصور کرتے ہیں[۴۶]۔

اسی طرح موصوف اس سلسلے کے ایک دوسرے سرکردہ اور کٹر "وجودی" تلمسانی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: "جب ان کے سامنے نصوص پڑھی گئی تو ان سے کہا گیا کہ تمہاری یہ کتاب تو قرآن کے مخالف ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ قرآن تو پورے کا پورا شرک ہے اور توحید تو ہمارے کلام میں پائی جاتی ہے۔ پھر ان سے کہا گیا کہ جب وجود واحد ہے تو پھر بیوی حلال اور بہن حرام کیوں ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک تو سب حلال ہے لیکن ان محجوبوں نے کہا کہ حرام ہے تو ہم نے کہا ہاں تم پر حرام ہے[۴۷]۔"

قرآن حکیم منصوص اور محکم طور پر بیان کرتا ہے کہ اس عالم ناسوت میں کسی بشر کے لئے ذات باری تعالیٰ کا مشاہدہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اللہ سے یہ درخواست کی کہ "رَبِّ اَرِنِی" اے میرے پروردگار مجھے اپنی زیارت کرا دیجئے" تو جواب میں ارشاد ہوا کہ لَن تَرَانِی "آپ ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے۔" ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ

---

[۴۵] عقلیات ابن تیمیہ، از مولانا محمد حنیف ندوی، ص ۳۵۰، لاہور

[۴۶] الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطان، ص ۱۱۳، دار افتاء ریاض

[۴۷] ایضاً ص ۱۲۲

علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب یہ جواب ملتا ہے تو پھر اور کسی جن و بشر کی کیا مجال ہے۔[۵۴۸]

مگر اس کے باوجود جب حضرت موسیٰؑ نے رویت پر اصرار کیا اور باری تعالیٰ نے ایک پہاڑ پر اپنی تجلی ظاہر فرمائی تو نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کو دیکھ نہ سکے اور محض ظہور تجلی ہی کے باعث بے ہوش ہو گئے۔

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ

پس جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلّی فرمائی تو اُس کے پرخچے اڑ گئے اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ (اعراف : ۱۴۳)

اس بنا پر "شہودیوں" کا نظریہ اور عقیدہ یہ ہے کہ اس عالمِ ناسوت میں رویت باری تو کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔ ہاں البتہ "رب اپنے بندۂ مومن کے لئے دنیا میں (اُس کی رہنمائی کے لئے) غیر کامل (ایک ہلکے درجے کی تجلّی رذاتی نہیں بلکہ صفاتی) فرماتا ہے۔ اور آخرت میں کامل تجلّی فرمائے گا پس اس تجلی کے باعث بندہ اپنے رب کے ماسویٰ خود کو اور ہر چیز کو فانی سمجھتا ہے۔ (گویا کہ) اُس ذات واحد کے سوا کسی دوسرے (کے جمال نیرانی) کا مشاہدہ ہی نہیں کر رہا ہے۔ اور وہ اس کو محض اپنی آنکھ سے نہیں بلکہ اپنی پوری روح مدرکہ کے ذریعہ دیکھ رہا ہے۔[۵۴۹]

چنانچہ علامہ ابن قیمؒ "مدارج السالکین" میں تحریر فرماتے ہیں :

"ان کے نزدیک نور کشف ہی شہود کا مبدا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ (صفاتِ عالیہ) کے معانی کی تجلیات ہیں جو قلب پر ظاہر ہوتی ہیں اور اس کی تاریکی کو روشنی سے منور کر دیتی ہیں۔ اور اس طرح کشف کا

---

۵۴۸ تفسیر معارف القرآن، از مفتی محمد شفیع، ۳/ ۱۱۴، دیوبند

۵۴۹ تفسیر المنار، ۹/ ۱۶۷

حجاب دور ہو جاتا ہے۔ جب تمہارا یہ حال ہو جائے تو پھر تم کسی غیر کی جانب توجہ نہ کر سکو گے اور تمہارے قدم ڈگمگا نہیں سکیں گے ...... اس کے نورِ ذات کی کوئی شے متحمل نہیں ہو سکتی[۵۰]۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے (اور مخلوق کے درمیان) حجاب کو دور کر دے تو پھر پورا عالم تہ و بالا ہو جائے جس طرح کہ پہاڑ اس کی تجلی کے باعث ریزہ ریزہ ہو گیا۔

ایک حدیث میں مذکور ہے: "اللہ تعالیٰ سوتا نہیں ہے، اور سونا اس کے لائق نہیں ہے[۵۱]۔ وہ (بندوں کی روزی کے) میزان کو کبھی جھکاتا ہے تو کبھی اٹھا دیتا ہے۔ اُس کی بارگاہ میں رات کا عمل دن سے پہلے اور دن کا عمل رات سے پہلے پیش کیا جاتا ہے۔ اُس کا حجاب نور ہے (نور کے پردے میں رہتا ہے) اگر وہ اس پردے کو کھول دے تو اس کے چہرے کی شعاعیں ہر اس مخلوق کو جلا کر خاکستر کر دیں گی جہاں تک اس کی نگاہ جائے[۵۲]۔

اس حدیث کو نقل کر کے موصوف تحریر فرماتے ہیں: "پس اسلام بندے کے لئے نور ہے۔ اور ایمان بھی بندے کے لئے نور ہے جو پہلے سے

۵۰۔ یعنی بندے پر جو تجلی ہو گی وہ اُس کے صفاتی نور کی ہو گی نہ کہ اس کی ذاتی نور کی کیونکہ اس کا نورِ صفاتی اسی کے نورِ ذاتی سے نسبتاً ہلکا ہونے کی بنا پر انسان اس کا تحمل کر لے گا، جبکہ وہ نورِ ذاتی کا تحمل کسی بھی طرح نہیں کر سکتا۔ خود سورج بطور ایک مثال ہمارے سامنے موجود ہے، جو اس کی مخلوقات کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ مگر بایں ہمہ ہم اُس کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتے، تو پھر اس کے خالق و مالک کے نور اور اس کی تجلیات کی تاب کہاں سے لا سکتے ہیں؟

۵۱۔ کیونکہ سونا وہ ہے جس کو اعضاء و جوارح کی مصروفیت کے باعث تھکاوٹ محسوس ہوتی ہو۔ پھر چونکہ وہ پوری کائنات کا نگران و نگہبان ہے لہذا اگر وہ سو جائے تو پھر پوری کائنات منتشر و پراگندہ ہو جائے اور تمام اجرام سماوی باہم ٹکرا کر فنا ہو جائیں۔ (لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ: اُس کو نہ تو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند ــــ بقرہ: ۲۵۵)

۵۲۔ صحیح مسلم کتاب الایمان، ۱/۱۶۲، مرتبہ محمد فواد عبدالباقی، دارالافتاء ریاض، ۱۹۸۰ء

زیادہ قوی ہے۔ اور احسان (تزکیہ نفس) بھی اس کے لئے نور ہے جو ان دونوں سے زیادہ قوی ہے۔ لہذا اسلام، ایمان اور احسان [۵۳] تینوں جب جمع ہو جائیں اور اللہ کے درمیان رکاوٹ بننے والے حجابات زائل ہو جائیں تو قلب و جوارح اس نور سے بھر جاتے ہیں (نہ کہ اس نور سے جو اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے) کیونکہ اس کی صفات مخلوقات کی کسی بھی چیز میں حلول نہیں کرتیں، جس طرح کہ خود مخلوقات اس میں حلول نہیں کرتے۔ لہذا خالق مخلوق سے اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے بالکل جدا ہے۔ نہ تو ان دونوں میں کوئی (مادی جسمانی حیثیت سے) اتحاد ہے، نہ حلول ہے اور نہ کسی قسم کا ملاپ۔ تعالی اللہ عن ذلک کلہ علواً کبیراً [۵۴]

حاصل یہ کہ اس عالم رنگ و بو میں رویت باری تعالیٰ کا مشاہدہ قرآن حکیم

---

۵۳ یہ دین اسلام کے تین مختلف مدارج اور اس کے شعبے ہیں، اسلام محض احکام کی بجا آوری کا نام ہے خواہ عقیدہ و ایمان کمزور رہے یا قوی۔ ایمان شک کے مقابل ہے۔ یعنی جن جن باتوں کو عقیدت کے لحاظ سے ماننا اور تسلیم کرنا ضروری ہے ان پر پوری طرح یقین کرنے کا نام ایمان ہے۔ اور احسان یہ ہے کہ وہ ایمان کی طرح محض عقلی و استدلالی نہ ہے بلکہ وجدانی و مشاہداتی بن جائے۔ جیسا کہ حدیث جبریل میں آیا ہے: "ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک" (تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم اتنا تصور ضرور کر لو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے) اس لحاظ سے احسان عبودیت کا اعلیٰ مرتبہ اور بندۂ مومن کی معراج ہے جو حاصل مقصود ہے۔ اور یہ رتبہ انبیائے کرام کے بعد اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں ہی کو حاصل ہوتا ہے جو اس کے مقرب اور صدیقین کہلاتے ہیں۔ یہ اسلامی تصوف کی صحیح غرض و غایت ہے جس کو قرآن و حدیث کی اصطلاح میں "احسان" کہا جاتا ہے۔

۵۴ مدارج السالکین، شرح منازل السائرین بحوالہ تفسیر المنار ۹/ ۱۶۹ — ۱۷۰

کے واضح نصوص کی بنا پر ممکن نہیں ہے۔ اور یہ حقائق قرآن کے محکمات میں سے ہیں۔ ان کا انکار نصوص قرآنیہ اور محکمات کا انکار ہوگا، جس کے بعد حجت و استدلال کیلئے مزید کوئی چیز باقی نہیں رہ جائے گی۔ اور جیسا کہ یہ بھی اچھی طرح واضح ہوگیا کہ رویت و مشاہدہ جو کچھ بھی ہوگا وہ صرف باری تعالیٰ کی صفات یا اس کے کمالات کا ہوگا، جن کی تجلیوں سے صفحات فطرت اور اُس کے اوراق روشن و تابناک نظر آرہے ہیں۔ گویا کہ ایک ایک پتے اور ایک ایک بوٹے پر خلاق فطرت کی صنعت و کاری گری کے نقوش ثبت ہیں۔ اور یہ نقوش حسب ذیل عظیم آیات قرآنی کے مطابق نظام تخلیق، نظام تسویہ، نظام تقدیر اور نظامِ ہدایت کی شکل میں مرتسم ہیں جن کے مجموعے کو "نظام ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۝ پاکی بیان کیجئے اپنے رب برتر کی جس نے (تمام مخلوقات کو) پیدا کیا پھر (ان میں سے ہر ایک کے اعضائے جسمانی کو) درست کیا۔ اور وہ جس نے (تمام موجودات عالم کے طبیعی ضوابط) مقرر کئے اور (ان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے ضابطے کے مطابق چلنے کی) توفیق بخشی۔ (اعلیٰ : ۱-۳)

سائنسی علوم کے ذریعے جن نظامہائے فطرت کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہ درحقیقت ربوبیت کے انہی چار بنیادی ضوابط (تخلیق و تسویہ اور تقدیر و ہدایت) کی تشریح و توجیہ ہے[۵۵]۔ مظاہر کائنات کو قرآنی نقطہ نظر سے دیکھنے کے گویا یہ چار پیمانے ہیں جن کے تفصیلی جائزے سے تمام صفات الٰہی کی تنقیح اس طرح ہوجاتی ہے گویا کہ وہ ہمارے سامنے مجسم و متشکل طور پر موجود ہیں۔ اور قرآن عظیم نوع انسانی سے اسی چیز کے مطالعے

---

۵۵ اس موضوع پر تفصیل نیز ان آیات کریمہ کی مفصل تشریح و تفسیر کیلئے راقم سطور کا مقالہ "قرآن مجید اور بیالوجی" دیکھنا چاہیئے۔

و مشاہدے کا مطالبہ کرتا ہے جو کہ گو ہر مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات اور کل موجودات کا خالق، مُسوّی، مُقدِّر اور ھادی ہے، نہ کہ خود ان موجودات کے اندر گھسا ہوا یا مختلف شکلوں اور رنگوں میں ظہور پانے والا۔ وہ ان اشیا، اور موجودات سے بالکل الگ تھلگ ہے جیسا کہ قرآن حکیم کی سیکڑوں بلکہ بے شمار آیتوں سے واضح ہوتا ہے۔ نیز اس کے مانند کوئی شئے نہیں ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے :-

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ : اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی شئے اس جیسی اور اُس کے مثل ہے ہی نہیں تو پھر موجودات عالم ہی کو خدا کا وجود قرار دینا بے دلیل و بے سند اور عقلاً سخت محال ہے۔ خالق ہمیشہ خالق رہے گا اور مخلوق ہمیشہ مخلوق۔ اور یہ بات عقلاً ناممکن ہے کہ ایک شئے خود ہی اپنی خالق، خود ہی اپنی مُسوّی، خود ہی اپنی مُقدِّر اور خود ہی اپنی ھادی آپ ہو۔ جب کہ قرآن حکیم میں اس پر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ بلکہ قرآنِ حکیم کی تمام آیات خالق و مخلوق کی وحدت کے بجائے ان کی دوئی اور ثنویت پر دلالت کر رہی ہیں۔ تفصیل کے لئے تو ایک دفتر چاہیے۔ لہٰذا اس موقع پر اتنی ہی وضاحت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

تصوف اور سائنس

یہ موضوع ختم کرنے سے پہلے ایک غلط فہمی دور کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ سائنس اور تصوف دونوں ایک درجے کی چیزیں نہیں ہیں، جن کو میں نے اس موقع پر گلے ملا لے اور دونوں کو یک جا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اصل میں دونوں کا بنیادی مقصد متحد ہے اور وہ ہے حقیقت کی تلاش۔ اور موجودہ دور میں تجدید و اصلاح

کے لیے مختلف مگر صحیح نقطہ ہائے نظر کو ایک عظیم تر مقصد کی خاطر اکٹھا کر دینا ضروری ہے تاکہ باہمی غلط فہمیاں دور ہوں اور فاصلے کم سے کم تر رہ جائیں۔

سائنس اور تصوف کی منزل ـــــ اپنی اصل غرض و غایت کے اعتبار سے ـــــ ایک ہے مگر طریقے جدا جدا ہیں۔ وہ "شہود" جو تصوف کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور وہ "شہود" جو سائنس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے ان دونوں میں مقصد کا اشتراک ہونے کے باوجود ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلا کشفی و اشراقی ہے جب کہ دوسرا علمی و استدلالی، البتہ دونوں وجدانی ضرور ہیں۔ اور محنت بھی دونوں طریقوں میں خوب کرنی پڑتی ہے۔ پہلے طریقے میں مجاہدہ اور نفس کشی کے ذریعے تو دوسرے طریقے میں "علم اسماء" کی اعلیٰ تحصیل اور اس میں رسوخ پانے کے ذریعے بہت خوش نصیب ہوں گے وہ لوگ جن کی ان دونوں طریقوں میں تکمیل ہو جائے، جو نور علیٰ نور کے مصداق ہوں گے۔ موجودہ دور میں نوع انسانی کی عموماً اور امت مسلمہ کی خصوصاً صحیح رہنمائی اور اصلاح حال کے لیے ان دونوں طریقوں کا جامع یا کم از کم ان کے کوچوں کا رمز شناس ہونا ضروری ہے۔ اور اسی طریقے سے دنیائے تصوف کی موجودہ بہت سی خرابیوں کا علاج بھی ممکن ہو سکتا ہے۔

بہرحال اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے کہ تصوف اصولی حیثیت سے بہت مفید بلکہ ضروری و ناگزیر ہے۔ کیونکہ وہ دین کی تکمیل کا ایک شعبہ ہے۔ مگر اس کو فلسفیانہ اثرات سے پاک ہو کر کتاب و سنت کی خالص بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے۔ اور جو چیز شریعت کی ضد یا اس کے مغائر ہو وہ تصوف نہیں بلکہ گمراہی ہے۔

"تصوف شریعت سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں بلکہ حقیقتاً وہ شریعت کا خادم ہے۔ تصوف نام ہے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کا جس کے

باعث انسانی اخلاق و اعمال درست ہوتے ہیں اور برائیوں کا خاتمہ ہوتا ہے تصوف کا منتہائے مقصود سوزِ جگر کو جلا دینا اور "عشق" کی آگ کو بھڑکانا ہے۔ جس کی بدولت ہنگامہ ہائے وجود میں حُسنِ اخلاق کے سوتے پھوٹتے ہیں، محبت و مروت اور امن و امان کے شگوفے نمودار ہوتے ہیں۔ بقول اقبال ؎

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات [56]

اس سلسلے میں غلط فہمیاں جو کچھ بھی ہیں وہ لفظ "تصوف" سے ہیں۔ اگر ہم بجائے تصوف کے "تزکیہ"، یا "احسان" کی اصطلاح اختیار کرلیں تو پھر جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔

فلسفۂ یونان مجموعۂ اغلاط

ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کے دل و دماغ پر فلسفۂ یونان کی ہیبت چھائی ہوئی تھی اور بہت سے لوگوں کے نزدیک تو ان کا مرتبہ وحی و الہام سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ اس کے توڑ کے لئے اہل اسلام نے اس کو اپنایا اور کلامی نقطۂ نظر سے اسے داخل نصاب کیا۔ مگر اس کا زمانہ اب لد چکا ہے لیکن ہم اس سے برابر چمٹے ہوئے ہیں۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یونانی فلسفے کے جو مسائل اب تک ہمارے ذہنوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے غلط اور بے بنیاد ہونے کی حقیقت پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈال دی جائے اور فکر و نظر کی دنیا میں جو عظیم انقلابات رونما ہوگئے ہیں ان کا ایک مختصر خاکہ بھی پیش کر دیا جائے تاکہ ہمارے علماء کو اپنے منصب و کردار کے پہچاننے اور "خلافت ارض" کے تعلق سے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں سہولت رہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے علماء اور دانشور جدید سے جدید تر تمام فکری و نظریاتی تبدیلیوں سے غافل اور بے پرواہ ہو کر اب تک برابر ارسطو اور اس کے ہمنواؤں کے سُر میں اپنا سُر

---

۵۶ ملخص از "اسرارِ نبوت" ص ۲۵ - ۲۶، از مصنف کتاب ہذا۔ مطبوعہ فرقانیہ اکیڈمی بنگلور ۱۹۷۲ء

ملائے جا رہے ہیں۔ اور انہیں کوئی خبر نہیں ہے کہ افکار کی دنیا میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں اور دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔

ابطال ہیولیٰ

مثال کے طور پر بیسویں صدی کے آغاز تک تمام فلسفیانہ مسائل کی بنیاد اس نظریئے پر تھی کہ "مادہ" غیر فانی ہے۔ مگر جدید سائنس نے جب یہ ثابت کر دیا کہ مادہ (matter) نہ صرف فانی ہے بلکہ توانائی (energy) ہی کی دوسری شکل ہے[57] تو اس نظریہ کی بنیاد پر جتنے بھی مسائل — قدیم اور جدید فلسفوں میں گھڑے گئے تھے وہ سب کے سب باطل ہو گئے۔ مگر ہمارے علماء ان جدید تحقیقات و اکتشافات سے بے خبر ہو کر اب تک برابر اثبات "ہیولیٰ"[58] اور ابطال

---

[57] جدید نظریئے کے مطابق مادہ "منجمد توانائی" کا دوسرا نام ہے۔

[58] قدیم فلاسفہ ہیولیٰ (مادہ) کو ازلی وابدی اور غیر فانی قرار دیتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ اجزاء (جواہر فردہ) سے مرکب نہیں ہے بلکہ چھوٹے بڑے تمام اجسام صرف دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہیں: ایک ہیولیٰ اور دوسرے صورت نوعیہ۔ گویا کہ ان کی نظر میں ہر جسم متصل واحد ہوتا ہے۔ یعنی وہ اپنی جگہ پر گویا ایک مکمل یونٹ ہوتا ہے جو اجزا کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے جب کسی چیز کے دو ٹکڑے کئے جائیں تو اس نظریئے کے مطابق کہا جائے گا کہ جس چیز نے تقسیم قبول کی ہے وہ صرف ہیولیٰ نے قبول کی ہے کسی اور چیز نے نہیں۔ اس طرح صورت شکل کی تبدیلیوں کے باعث ہیولیٰ کا محض قالب بدلتا رہتا ہے یعنی مختلف تبدیلیوں کے باوجود وہ ہر شکل وصورت میں بے کم وکاست اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے۔ مثلاً اگر لکڑی جلائی جائے تو جو ہیولیٰ پہلے لکڑی کی شکل میں تھا اس نے اب راکھ کی شکل اختیار کر لی۔ گویا کہ ہیولیٰ ختم نہیں ہوا بلکہ اس نے صرف اپنے قالب کو بدل لیا ہے۔ یہی نظریہ مادے کے غیر فانی ہونے کی بھی دلیل رہا ہے۔ بہر حال ہیولیٰ کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے: "وہ جوہر جو بالذات اتصال وانفصال کے قابل ہو۔"

" اجزائے لا یتجزیٰ "[59] یا جواہر فردہ کی بے کار اور لاطائل بحثوں میں اُلجھے ہوئے ہیں اور ان کی تعلیم و تدریس سے اب تک ہمارے عربی و اسلامی مدارس کو چھٹکارا نہیں مل سکا ہے۔ حالانکہ سائنٹفک نقطۂ نظر سے ہیولیٰ اور جزو لا یتجزیٰ دونوں سے متعلق نظریات غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ جزو لا یتجزیٰ یا جوہر فرد کی تعریف میں متکلمین اگر یہ قید نہ لگاتے کہ وہ قطعی، کسری، وہمی اور فرضی کسی[60] بھی حیثیت سے ناقابلِ تقسیم ہے تو یقیناً ان کا نظریہ آج صحیح ہوتا۔ مگر پھر بھی مجموعی اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ متکلمین کا نظریہ مفرد عناصر (elements) کی حد تک آج بھی صحیح ہے جن کی تعداد آج ۹۲ ہے اور جن سے کائنات کی تمام اشیاء مرکب ہیں۔ البتہ ایٹم کی مزید تقسیم کے لحاظ سے (الکٹران، پروٹان اور نیوٹران کی دریافت کے بعد) یہ نظریہ غلط ہو جاتا ہے۔ مگر اس موقع پر یہ حقیقت ملحوظ رہنی چاہیئے کہ ایٹم کی مزید تقسیم سے کوئی ایٹم، ایٹم نہیں رہتا بلکہ وہ چند برقی اجزا کا مجموعہ بن جاتا ہے[61] کیونکہ تمام عناصر میں بنیادی طور پر الکٹرانوں، پروٹانوں اور

---

[59] یہ جزو لا یتجزیٰ کی جمع ہے یعنی مادے کا وہ آخری چھوٹے سے چھوٹا ذرہ جو اپنی مزید تقسیم قبول نہ کرے اس کو جوہر فرد بھی کہتے ہیں جس کی جمع جواہر فردہ ہے۔

[60] ملاحظہ ہو قدیم فلسفے کی کتاب "میبذی" ص ۱۰، مطبوعہ رحیمیہ دیوبند۔

ان اصطلاحات کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو ان اجزاء کو کاٹ کر تقسیم کیا جا سکتا ہے نہ وہ ٹوٹ پھوٹ کر منقسم ہو سکتے ہیں اور نہ فرضی و وہمی اعتبار سے ان کی تقسیم عمل میں آ سکتی ہے۔

[61] ایٹم کو توڑ کر پھر دوبارہ ایٹم نہیں بنایا جا سکتا۔ اصطلاح میں مادہ جس چیز کا نام ہے وہ صرف ایٹموں یا عناصر کا نام ہے۔ ہر مفرد عنصر کی اپنی ایک علیحدہ خصوصیت ہوتی ہے جو اس کو (اس کے مرکزے کو) توڑ دینے کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور وہ بجلی کے چند ذرات کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے مثلاً آکسیجن یا کاربن کے مرکزے کو توڑ دیا جائے تو پھر آکسیجن آکسیجن نہیں رہتا اور کاربن کاربن نہیں کہلاتا۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے کیمیاوی تعامل سے پانی کا جو سالمہ (MOLECULE) وجود میں آتا ہے ان کے مرکزوں کو توڑ دینے کے بعد پھر ان سے پانی کا سالمہ دوبارہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ یہی حال دیگر تمام عناصر اور سالموں کا ہے اور اس میں بہت بڑی حکمت ربانی کارفرما نظر آتی ہے۔

نیوٹرانون کا متحدہ نظام پایا جاتا ہے۔ الکٹرانوں میں منفی برقی چارج ہوتا ہے اور پروٹانوں میں مثبت برقی چارج، جب کہ نیوٹران بے چارج کے ذرات ہوتے ہیں۔ اس طرح ایٹم کے یہ اندرونی اجزا اپنی اصل ہیئت و ماہیت کے اعتبار سے غیر مادی ہیں۔

اسی طرح نہ صرف ایٹم بلکہ ایٹم کے اجزار بھی مزید تقسیم ہو گئے۔ چنانچہ جدید ترین تحقیق کے مطابق ایٹم کے مرکزے (nucleus) سے تین قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں جن کو الفا شعاعیں (alpha rays) بیٹا شعاعیں (beta rays) اور گاما شعاعیں (gamma rays) کہا جاتا ہے۔ الفا شعاعیں دو پروٹانوں اور دو نیوٹرانوں کے مجموعے کو کہتے ہیں[۶۲] جو تابکار عناصر[۶۳] (radioactive elements) سے خارج ہوتے ہیں[۶۴] بیٹا شعاعیں الیکٹرانوں کو کہا جاتا ہے۔ مگر یہ وہ الکٹران نہیں ہیں جو ایٹم کے مرکزے کے گرد چکر لگاتے ہیں بلکہ وہ جوہری مرکزے کے اندر تحلیل شدہ نیوٹرانوں سے (ٹوٹ لوٹ کر) نکلتے ہیں۔[۶۵] یہ شعاعیں الفا شعاعوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ خارج ہوتی ہیں اور بعض حالات میں ان کی رفتار روشنی کی رفتار کا ۹۸ فیصد ہوتی ہے[۶۶]۔ جب کہ روشنی کی رفتار ۲۸۱ و ۱۸۶ میل فی سکنڈ ہے۔ اور گاما شعاعیں برقی مقناطیسی لہروں (electromagnetic radiation) کو کہا جاتا ہے[۶۷] جو ایٹموں کے

---

[۶۲] ایٹم آپ کا خادم، ص ۱۶۴، مطبوعہ انڈین اکیڈمی نئی دہلی۔

[۶۳] سیسہ (Lead: ایٹمی نمبر ۸۲) کے بعد یورینیم (ایٹمی نمبر ۹۲) تک جتنے بھی درمیانی عناصر ہیں سب تابکار عناصر کہلاتے ہیں۔ جن سے یہ شعاعیں مسلسل خارج ہوتی رہتی ہیں۔

[۶۴] اے ڈکشنری آف سائنس ص ۱۸، پنگوئن بکس، لندن، ۱۹۷۷ء

[۶۵] ایٹم آپ کا خادم، ص ۱۶۵ [۶۶] اے ڈکشنری آف سائنس، ص ۴۶

[۶۷] ایٹم کی کہانی ص ۷۷، مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ۔ نئی دہلی۔

مرکزوں سے نکلتی ہیں۔ مگر وہ ذرّات نہیں ہیں[۶۸]۔ بلکہ کوانٹم یونٹوں کے مطابق خارج ہونے والے فوٹان (photons) ہوتے ہیں[۶۹]۔

ان شعاعوں کی دریافت کے بعد مادے کے غیر فانی ہونے کا نظریہ باطل ہوگیا۔ کیونکہ یہ شعاعیں ایٹموں کے مرکزوں سے مسلسل ٹوٹ ٹوٹ کر کائنات کی نامعلوم وسعتوں میں گم ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح ان شعاعوں کو دریافت کرنے کے بعد "ہیولیٰ" کا بے بنیاد نظریہ بھی باطل اور وہ ساری دلیلیں بھی مردود قرار پاتی ہیں جو قدیم فلاسفہ نے جزو لا یتجزیٰ کے بطلان پر قائم کی تھیں مثلاً کسی جزو کو دو اجزا کے درمیان یا دو اجزا کے ملتقی پر فرض کر کے یہ سوال کرنا کہ آیا یہ جزو دونوں اجزا کے درمیان گھرا ہوا اور ان دونوں سے ملا ہوا ہے یا نہیں؟ اگر ملا ہوا ہے تو تقسیم ثابت ہوگئی۔ اور اگر نہیں ملا ہوا ہے تو گویا وسط وسط نہیں رہا جو محال ہے۔ وغیرہ وغیرہ[۷۰]۔ تو اب جیسا کہ تجربے و مشاہدے سے ثابت ہوگیا کہ کم از کم گاما شعاعیں ایسے اجزا یا ذرّات نہیں ہیں جن کو دو اجزا کے درمیان یا دو اجزا کے ملتقیٰ پر فرض کرنے کا سوال پیدا ہو، بلکہ وہ تو برقی مقناطیسی لہریں ہیں۔ اب ان لہروں کو ملتقیٰ پر رکھنے اور انہیں مزید تقسیم کرنے کا مسئلہ ہی خارج از بحث[۷۱] ہے۔ کیونکہ وہ درحقیقت نہ مادہ ہے اور نہ مادی اجزا کا مجموعہ۔ ان لہروں پر اجزا کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔

حاصل یہ کہ اس مسئلے میں فلسفۂ یونان اور متکلمین دونوں کا مسلک غلط

---

۶۸ ایٹم آپ کا خادم، ص ۱۶۹ ۶۹ اے ڈکشنری آف سائنس، ص ۱۶۲

۷۰ تفصیل کے لئے دیکھئے قدیم فلسفہ کی کتابیں ہدایۃ الحکمۃ اور میبذی وغیرہ۔

۷۱ اگر دورِ قدیم میں عقل سے کام لیا جاتا تو بالکل اسی کے مشابہ دھوئیں یا بھاپ کی مثال دی جا سکتی تھی جو کسی مادے کو جلانے یا گرم کرنے کے باعث اس سے خارج ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ مادے ہی کا جزو ہیں۔

ہے مگر ایک حیثیت سے متکلمین کا مسلک تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ قابلِ اعتبار اور حقیقت واقعہ کے عین مطابق ہے، جب کہ فلسفۂ یونان کا مسلک غلط در غلط بلکہ بالکل مہمل ہے۔

یونانی نظریۂ افلاک کا ابطال

قدیم فلاسفہ کا ایک گروہ ہماری زمین کو کائنات کا مرکز قرار دیتے ہوئے سات سیّاروں کو ـ جن میں ہمارا سورج بھی داخل ہے۔ کُرّوی شکل کے سات افلاک میں جڑے ہوئے مانتا ہے[۲ئے] نیز وہ کہتا ہے کہ یہی افلاک گردش کرتے ہیں اور زمین ان کے درمیان ساکن ہے۔[۳ئے] اسی طرح ان فلاسفہ کا نظریہ ہے کہ یہ افلاک ایک کے اوپر ایک پیاز کے چھلکوں کی طرح تہہ بہ تہہ ہیں اور اپنا ٹھوس جسم رکھتے ہیں۔ مگر وہ شیشے کی طرح شفّاف ہیں۔ جن کے پار دیکھا جا سکتا ہے۔ ان سات کے علاوہ دو مزید افلاک ہیں۔ آٹھویں کو "فلک البروج" یا "فلک ثوابت"، اور نویں کو "فلک اطلس" یا "فلک الافلاک" یا فلک اعظم" بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ تمام ستارے (سات سیّاروں کے علاوہ) آٹھویں فلک میں جڑے ہوئے ہیں اور افلاک چونکہ شفّاف ہیں اس لئے وہ سب ہم کو پہلے فلک میں جڑے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔ اور نواں فلک محدد جہات ہے اور وہ تمام

۲ئے انہی سات افلاک یا سات سیّاروں کو بعض علمار نے سات آسمان قرار دے دیا ہے۔ ملاحظہ ہو قدیم فلکیات کی کتاب "تصریح"، ص ۸، مطبوعہ رحیمیہ دیوبند۔

یہ سات سیّارے حسب ذیل ہیں: (۱) چاند (۲) عطارد (۳) زہرہ (۴) آفتاب (۵) مریخ (۶) مشتری (۷) زُحل۔ ان میں سے چاند ہماری زمین سے سب سے زیادہ قریب ہے پھر اس کے بعد عطارد، پھر زہرہ، پھر سورج، پھر مریخ پھر مشتری اور پھر زُحل ہیں۔ (شرح چغمینی، ص ۲۲)

۳ئے شرح چغمینی ص ۲۰، مطبوعہ رحیمیہ۔ دیوبند۔

(افلاک د) اجسام کو محیط ہے اور اس کے ماوراء کوئی چیز نہیں ہے نہ کسی قسم کا خلا اور نہ ملا[۷۴] (یعنی خالی اور بھرتی جگہ) اور یہ غیر مکوکب یعنی غیر مخلوق ہے[۷۵] یہ تمام افلاک و ثوابت گردش کرتے ہوئے دن رات میں ایک چکر پورا کر لیتے ہیں۔ اور یہ اجرام متحرک بالارادہ ہیں۔

انہی افلاک سبعہ کو ہمارے بعض علماء نے سات آسمان (سبع سماوات) قرار دیتے ہوئے بقیہ دو افلاک کو عرش اور کرسی کے نام سے موسوم کر دیا ہے[۷۶] اور ہندوستان کے اکثر عربی مدارس میں آج تک اسی کی تعلیم و تدریس ہو رہی ہے فلسفۂ یونان کے یہ تمام مسائل و مباحث آج علم و تحقیق کی روشنی میں اوہام و خرافات اور باطل افسانے معلوم ہوتے ہیں۔

نیز اسی طرح ان افلاک کی ساخت و پرداخت کے بارے میں یہ نظریہ بلکہ عقیدہ ہے کہ وہ مختلف اجسام و طبائع سے مرکب نہیں ہیں[۷۷] اور یہ شق عناصر کو بھی شامل ہے[۷۸] یعنی افلاک کا مادہ کسی بھی حیثیت سے ہماری زمین کے مادے سے مشابہ نہیں ہے۔

---

[۷۴] ایضاً ص ۲۳ [۷۵] تصریح (شرح تشریح الافلاک) ص ۶۰ رحیمیہ دیوبند۔

یعنی قدیم اور غیر فانی ہے۔ جو خرق و التیام کو قبول نہیں کرتا۔ اور تمام افلاک کے بارے میں بھی یہی نظریہ ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں: "افلاطون اور ارسطو وغیرہ کا یہ مذہب ہے کہ آسمان سخت اور ٹھوس ہیں اور وہ کسی طرح ٹوٹ یا پھٹ نہیں سکتے۔ اس کے ساتھ ان میں روح اور عقل ہے اور ان کی روح اور عقل ہم سے بہ مدارج اعلیٰ اور افضل ہے۔ تمام عالم کا انتظام انہی کے دست قدرت میں ہے اور دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے انہی کے اشاروں سے ہوتا ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں شعراء جو ہر موقع پر آسمان کے ظلم و ستم کا دکھڑا روتے ہیں، یہ محض شاعری نہیں بلکہ اس قدیم یونانی خیالات کا پرتو ہے۔ آسمانوں کے عاقل اور صاحب روح ہونے پر یونانیوں کا استدلال یہ ہے کہ آسمان دوری حرکت کرتا ہے یعنی گھومتا اور چکر لگاتا ہے۔ اور جو چیز دوری حرکت کرتی ہے وہ صاحب عقل و شعور ہوتی ہے" (مقالات شبلی، ۷/۳۲-۳۳، اعظم گڑھ ۱۹۶۵ء) [۷۶] تصریح، ص ۷

[۷۷] چنانچہ فلسفے کی بنیادی کتاب "ہدایۃ الحکمۃ" میں ہے: "ان الفلک بسیط أی لم یترکب من أجسام مختلفۃ الطبائع"

[۷۸] ملاحظہ ہو "ہدایۃ الحکمۃ" کی شرح میبذی، ص ۶۸، مطبوعہ دیوبند۔

اور اسی بنا پر وہ کون و فساد اور خرق والتیام کو قبول نہیں کرتا[۷۹]۔ یعنی اُن کے اجزا نہ تو (ٹوٹ پھوٹ کر) الگ ہو سکتے ہیں اور نہ (ایک بار ٹوٹ جانے کے بعد دوبارہ) جڑ سکتے ہیں[۸۰]۔ ان نظریات کی صحت پر جو دلائل پیش کئے گئے ہیں، وہ حد درجہ مضحکہ خیز ہیں جو محض قیاسی گھوڑے دوڑانے کے مترادف ہے۔

قرآن کا نظریہ سماوات

جدید نظریات و تحقیقات کے مطابق "افلاک" کوئی چیز نہیں ہیں۔ اس موقع پر یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ قرآنی نظریہ سماوات اور فلاسفۂ یونان کے نظریہ افلاک میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور تحقیقات جدیدہ کی رُو سے فلاسفۂ یونان کے نظریات کا ابطال اور قرآنی نظریات کا اثبات ہوتا ہے۔ تفصیل کے لئے تو ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔ لہٰذا اس موقع پر محض اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جدید فلکیات (astronomy) کی رُو سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہماری کائنات سبع سیارات (سات سیاروں) اور تسعہ افلاک (نو افلاک) میں محدود نہیں بلکہ اربوں کھربوں اور لاتعداد ستاروں اور سیاروں کا مجموعہ ہے اور یہ تمام اجرام سماوی بے کراں خلاؤں میں بغیر کسی سہارے کے تیرتے پھر رہے ہیں۔ اور ان کا مادہ بھی وہی ہے جو ہمارے کُرۂ ارض اور نظامِ شمسی[۸۱] کا مادہ

۷۹؎ ان الفلك لا يقبل الكون والفساد والخرق والالتيام۔
(هداية الحكمة)

۸۰؎ میبذی، ص ۷۷۔

۸۱؎ قدیم فلکیات میں زمین کو مرکز قرار دیا گیا تھا۔ جب کہ جدید فلکیات میں سورج کو مرکز قرار دیتے ہوئے زمین کو ایک تابع سیارہ قرار دیا گیا ہے۔

اصل میں تمام اجرام سماوی کی تخلیق ایک مشترک کہکشانی مادے سے عمل میں آئی ہے جس کو قرآن حکیم "دُخان" (دھوئیں) کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور جدید سائنس اس قرآنی بیان پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے کہتی ہے کہ پوری کائنات ابتداءً گیس (G A S) کی حالت میں تھی۔

یونانی فلسفے کا یہ نظریہ بھی غلط اور باطل ہے کہ اجرام سماوی متحرک بالارادہ ہوتے ہیں[۸۹]۔ یہ تمام نظریات بطلیموسی[۹۰] دور کی نشانی اور یادگار ہیں جن کو خود قرون وسطیٰ میں مسلم محققین اور سائنس دانوں نے بہ دلائل غلط ثابت کیا ہے۔ اور متکلمین اسلام نے ان بے بنیاد نظریات کو مردود قرار دیا ہے۔ چنانچہ امام غزالی اپنی معرکۃ الآرا کتاب "تہافت الفلاسفہ" میں فلسفۂ یونان اور اس کے مسائل پر تنقید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وانھم یحکمون بظن وتخمین من غیر تحقیق ویقین: یہ لوگ بغیر کسی تحقیق یا یقین کے محض ظن وتخمین کے باعث فیصلہ کر دیتے ہیں۔

اسی طرح موصوف اپنی ایک دوسری مشہور کتاب "مقاصد الفلاسفہ" میں فلسفۂ یونان اور اس کی شاخوں پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

فلسفے کی چار قسمیں ہیں: ریاضیات، منطقیات، طبیعیات، الٰہیات۔ جن میں ریاضیات بالکل عقل کے مخالف نہیں اس لئے ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ

---

۸۹ ان الفلك متحرك بالارادة (هداية الحكمة)

۹۰ "بطلیموس (Ptolemy) مشہور یونانی ہیئت داں جو اسکندریہ میں دوسری صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اس کی شہرت کا باعث اس کی وہ زبردست کتاب ہے جو "المجسطی" (Almagest) کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کتاب یونانی فلکیات کے بارے میں معلومات کا سب سے بڑا ماخذ تھی جو (عرصہ دراز تک) قرون وسطیٰ کے اذہان پر چھائی رہی"۔
(اے شارٹ ہسٹری آف اسٹرانمی، از آرتھر بیری، ص ۶۲، نیویارک ۱۹۶۱ء)

الہیات میں فلسفیوں کے اکثر عقائد حق کے خلاف ہیں اور ان میں صحیح بات بہت کم ہے۔ منطقیات کا اکثر حصہ بھی صحیح ہے اور اس میں غلطی بہت کم ہے۔ طبیعیات میں حق و باطل دونوں مخلوط ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں کون غالب ہے۔ اور کون مغلوب ہے۔[۹۱]

امام صاحب کے دور میں سائنس نے چونکہ اتنی زیادہ ترقی نہیں کی تھی[۹۲] اس لئے وہ اپنے دور کی "طبیعیات" کے متعلق کوئی واضح اور دوٹوک فیصلہ نہیں فرما سکے۔ اگر موصوف آج موجود ہوتے تو عجب نہیں کہ یونانی طبیعیات کے مہمل اور از کار رفتہ ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیتے۔

بہرحال جدید تحقیقات و انکشافات کی بدولت جہاں ایک طرف یونانی سائنس اور فلسفے کے نظریات، مردود قرار پاتے ہیں تو دوسری طرف قرآنی بیانات و تصریحات پوری طرح اُجاگر ہو جاتی ہیں۔ اور اس کی صداقت و حقانیت اور اس کا علمی و تاریخی اعجاز کُھل کر سامنے آجاتا ہے کہ اس نے یہ تمام انکشافات اس دور میں کئے تھے جب کہ عوام تو عوام اس دور کے عقلا اور دانشور تک نہ جانے کن جہالتوں میں مبتلا تھے۔ مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں۔

---

[۹۱] حکمائے اسلام، از مولانا عبدالسلام ندوی، ۱/۱۴۴-۱۴۵، اعظم گڈھ، ۱۹۵۳ء

[۹۲] دورِ قدیم میں سائنس اور فلسفہ دونوں مخلوط تھے۔ جن کو دورِ جدید میں الگ الگ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں: "یونان میں فلسفہ ایک مجموعے کا نام تھا۔ جس میں طبیعیات، عنصریات، فلکیات، الٰہیات، مابعد الطبیعہ سب کچھ شامل تھا۔ لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصے کر دیئے۔ جو مسائل مشاہدہ اور تجربے کی بنا پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے ان کو سائنس کا لقب دیا (اور) جو مسائل تجربہ و مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے ان کا نام فلسفہ رکھا۔" (الکلام، ص ۶، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۳۴۰ھ)۔

سورۂ انبیاء میں پہلے زمین اور اس کے متعلقات کا ذکر کرنے کے بعد چاند اور سورج کا تذکرہ کیا گیا۔ اور پھر فرمایا گیا کہ یہ اجرام سب کے سب (خلاؤں میں) تیر رہے ہیں۔

وَجَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَهُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ○ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ○

اور ہم نے زمین میں (توازن قائم کرنے کے لئے) پہاڑ بنائے تاکہ وہ لوگوں کو لے کر ڈھل نہ جائے۔ اور ہم نے اس میں کشادہ راستے بنائے تاکہ وہ (اپنے مطلوبہ مقامات کو) پاسکیں، اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت[۹۳] بنادیا ہے۔ اور یہ لوگ اس کی نشانیوں سے رُوگردانی کر رہے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے رات دن اور آفتاب و ماہتاب کو پیدا کیا ہے۔ یہ سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں (انبیاء: ۳۱-۳۳)

یہاں پر "فلک" سے مُراد یونانی نظریئے کے مطابق ٹھوس، مجسم اور دَوری حرکت کرنے والا مستدیر فلک نہیں بلکہ ایک فرضی دائرہ مراد[۹۴] ہے، جیسا کہ

۹۳ھ یہ "سمائے دنیا" کی چھت کا تذکرہ ہے۔ اسی کے اندر ستارے و سیارے اور تمام کہکشائیں (galaxies) جن کی تعداد اربوں تک ہے سب کی سب واقع ہیں (اس سلسلے میں بعض دلائل اگلے صفحات میں مذکور ہیں)۔ یہ چھت یونانی نظریات کے برعکس غیر شفاف (opaque) ہوگی۔ جیسا کہ معراج سے متعلق حدیثوں سے واضح ہوتا ہے۔ اس چھت کی حقیقت اگرچہ آج سائنٹفک نقطۂ نظر سے مستور ہے مگر کوئی وجہ نہیں ہے کہ زمانہ مستقبل میں اس کا انکشاف نہ ہو جائے۔ تمام حقائق ابھی سائنس کی دسترس میں کہاں آئے ہیں! ۹۴ھ لغت کی رو سے فلک کسی بھی چیز کے گول دائرے کو کہتے ہیں (فلك كل شيء مستدارہ و معظمہ: کسی چیز کا فلک اس کا گول اور بڑا حصہ ہے اسی بنا پر سمندر کی گول اور مچلتی ہوئی موج کو بھی (باقی اگلے صفحہ پر)

جدید سائنس کا نظریہ ہے۔ ورنہ پھر تیرنے کا مفہوم بالکل بے معنی ہو جائے گا۔ اور تیرنے یا گردش کرنے والے ان اجرام میں خود ہمارا کرۂ ارض بھی شامل ہے جس کا تذکرہ اس موقع پر انتہائی بلیغ اسلوب میں موجود ہے۔

زمین کی حرکت حسب ذیل آیت کریمہ سے بھی ثابت ہوتی ہے:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۚ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ اور تم پہاڑوں کو ٹھہرے ہوئے گمان کرتے ہو حالانکہ وہ بادلوں کی سی تیزی سے گزر رہے ہیں۔ یہ اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو استحکام بخشا۔ (نمل: ۸۸)

جدید تحقیقات کے مطابق جتنے بھی ستارے (stars) سیّارے (planets) اور کہکشائیں (galaxies) دریافت ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ سب سمائے دنیا یا آسمان اوّل کا حصہ ہیں۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ: اور ہم نے قریبی آسمان (آسمان اوّل) کو چراغوں سے آراستہ کر دیا ہے۔ (مُلک: ۵)

چراغوں سے مُراد ہر قسم کے ستارے اور سیّارے ہیں جو دُور سے روشن چراغوں یا قندیلوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) فلک کہا جاتا ہے۔ و فلك البحر: موجه المستدير المتردد۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص حضرت ابن مسعودؓ کے پاس آ کر عرض کیا "انی تركت فرسك كانه يدور في فلك"، میں نے آپ کے گھوڑے کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ گویا وہ ایک فلک (دائرے) میں گھوم رہا ہے۔ (لسان العرب، ابن منظور، ۱/۴۷، بیروت، ۱۹۶۸ء)

یہ فلک کا اصل مفہوم ہے جو کلام عرب میں رائج تھا مگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ جب یونانی علوم عباسی دور میں ترجمہ ہو کر عربی میں منتقل ہوئے تو اس وقت "یونانی آسمانوں" کی تعبیر کے لئے عربی میں نہ جانے کیوں فلک ہی کی اصطلاح اختیار کر لی گئی، جس کی وجہ سے بعد کے ادوار میں یہ اشتباہ پیدا ہو گیا کہ یونانی فلک اور قرآنی فلک گویا ایک ہی چیز ہے۔ حالانکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ ۙ ہم نے قریبی آسمان کو ستاروں سے رونق بخشی ہے۔ [۹۵] (صافات : ٦)

دُور بینوں (telescope) کے ذریعہ وسیع اور لمبے کراں خلاؤں میں لاکھوں کروڑوں اور اربوں نوری سال (light year) کے فاصلے پر نظر آنے والی کہکشائیں بھی دراصل ستاروں ہی کے مجموعے ہیں۔ اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک ایک کہکشاں میں کم ازکم ایک کھرب ستارے (ہمارے سورج جیسے) ہوسکتے ہیں۔ قرآن حکیم کی تصریح کے مطابق یہ تمام کہکشائیں بھی سمائے دنیا ہی کا حصہ ہیں۔ کیونکہ ستاروں کے ان جُھرمٹوں کو وہ "بروج" سے تعبیر کرتا ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۙ اور یقیناً ہم نے آسمان میں (بہت سے) بُروج بنا دیئے ہیں اور انہیں بنظرِ غائر دیکھنے والوں کے لئے سنوار دیا ہے (حجر: ١٦)

بروج سے مُراد جس طرح مشہور بارہ بروج ہوسکتے ہیں [۹۶] اسی طرح اس سے مُراد کہکشائیں بھی ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ یہ سب ستاروں ہی کے جھرمٹے اور ان کے مجموعے ہیں۔ یہاں پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کے شروع میں "لقد" کے ذریعہ تاکیدی بیان ہے۔ اور پھر "الناظرین" کا لفظ لایا گیا ہے نظر کے معنی محض دیکھنا نہیں بلکہ بہ نظرِ غائر یا بنظرِ تامّل دیکھنا اور آنکھ کے ذریعہ غور وفکر کرنا بھی ہے [۹۷] لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ دُور بینوں سے نظر آنے والے

---

[۹۵] اس میں رَدّ ہے فلسفۂ یونان کا جو تمام ستاروں کو آٹھویں فلک میں جڑا ہوا مانتے ہیں۔ [۹۶] بروج بُرج کی جمع ہے، جس کے معنی محل ہے۔ اسی وجہ سے ستاروں (کے مجموعے) کو بروج کہا گیا کیونکہ یہ ان کی مخصوص منزلیں ہوتی ہیں (المفردات فی غریب القرآن ص۔ ۴۱)

[۹۷] اس کی تفصیل اور ائمہ لغت وتفسیر کے اقوال تیسرے باب میں گذر چکے ہیں۔

ستاروں کے ان "شہروں" یا "کائناتی جزیروں"[۹۸] پر بروج کا اطلاق نہ ہو سکے۔

پھر دوسری حقیقت یہ ہے کہ ان تمام آیات میں "السَّمَاءَ" اور "السَّمَاءَ الدُّنیا" کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ سبع سماوات (سات آسمانوں) کے الفاظ نہیں لائے گئے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ دُوربینوں سے نظر آنے والے یہ تمام بروج اور کہکشائیں محض سمائے دُنیا یا آسمان اوّل کا حصّہ ہیں۔ اور اس قسم کے چھ آسمان اور ہیں جو "سمائے دنیا" سے پرے واقع ہیں۔ اور وہ چونکہ انسانی آنکھوں سے مستور ہیں اس لئے ان کی اصل حقیقت کا علم صرف خدا وند جل و علا ہی کو ہو سکتا ہے۔[۹۹] مگر جہاں تک ان کے وجود کا سوال ہے اس سے کم از کم اہل ایمان کو انکار نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ معراج سے متعلق حدیثیں اس مسئلے پر بخوبی روشنی ڈال رہی ہیں۔ چنانچہ معراج کے موقع پر حضرت جبرئیلؑ سرورِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر ایک ایک کر کے ساتوں آسمانوں تک پہنچے اور ہر ایک کا دروازہ کھلوایا۔ اس موقع پر قابل غور بات یہ ہے کہ جبرئیلؑ سے ہر جگہ یہی پوچھا گیا کہ آپ کون ہیں اور آپ کے ساتھ کون ہے؟ اس مکالمے سے بھی یونانی نظریہ کے مطابق افلاک کے شفّاف (شیشے کی طرح) ہونے کا نظریہ غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ جن کا نظریہ یہ ہے کہ آٹھویں فلک کے ستارے بقیہ افلاک سے گزرتے اور انہیں پار کرتے ہوئے ہم کو پہلے فلک

---

[۹۸] یعنی islands of universe ، دُوربینوں کے ذریعہ ان کہکشاؤں کی بہت واضح تصاویر اُتاری جا چکی ہیں۔ چونکہ وسیع اور لمبے کراں خلاؤں میں ان کہکشاؤں کی حیثیت کسی بڑے سمندر کے درمیان چھوٹے چھوٹے جزیروں یا دھبّوں جیسی ہے۔ اس لئے انہیں "کائناتی جزیروں" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

[۹۹] یہ تصوّر بھی یونانی تصوّر کے مغائر ہے جو "فلک الافلاک" کے اس پار کسی قسم کے "خلا یا مَلا" (خالی یا بھرتی جگہ) کے ناممکن ہونے کا مدعی ہے۔ اور اس بے بنیاد نظریہ کی صحت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

پر دکھائی پڑتے ہیں بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آسمان شفاف نہیں بلکہ غیر شفاف (OPAQUE) ہے جس کے آر پار دیکھنا ممکن نہیں ہے۔

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا : اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا ہے (انبیاء ۳۲)

وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ۚ وَحِفْظًا ط اور ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا اور (اس کو ہر طرح سے) محفوظ کر دیا ہے (حم سجدہ ۱۲:)

اس طرح اسلامی نظریہ سماوات اور یونانی نظریہ افلاک میں کھلا ہوا تناقض و تضاد موجود ہے اور ان دونوں میں تطبیق کسی بھی طرح ممکن نہیں ہو سکتی۔ حیرت ہے کہ ہمارے علماء اور بعض متکلمین نے (جو فلسفۂ یونان سے متاثر اور مرعوب تھے) ان واضح براہین کو نظر انداز کر کے تمام یونانی نظریات کو اسلامی نظریات ثابت کر دینے میں اپنا سارا زور صرف کر دیا۔ حالانکہ قرآن حکیم نے مظاہر کائنات میں غور و فکر اور مشاہدہ کی دعوت اسی بنا پر دی تھی کہ رویت و مشاہدہ کے صحیح اصولوں کے باعث یونانی نظریات کی غلطیاں بھی واضح ہو جائیں جو بلا سند و بلا دلیل فرض کر لئے گئے تھے۔ اور دوسری حیثیت سے نظامِ کائنات کے وہ حقائق منظر عام پر آئیں جن سے دین کی ابدی صداقتوں کا اثبات ہوتا ہو۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ فلسفۂ یونان سے متاثر علماء نے یونانی نظریات پر "ایمان" لا کر قرآن اور حدیث میں تاویلات شروع کر دیں۔ حالانکہ ضروری تھا کہ یونانی افکار و نظریات کو کتاب و سنت کی "نصوص" (واضح بیانات) پر پیش کرتے اور جو چیز مخالف نظر آتی اس کو رد کر دیتے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا جیسا کہ بہت سے مسلم فلاسفہ اور فلسفہ زدہ علماء نے معراجِ جسمانی کا انکار محض اس بنا پر کر دیا کہ وہ اپنے خود ساختہ افلاک میں "خرق و التیام" اور درز و شگاف وغیرہ کو محال سمجھتے تھے اور جیسا کہ وہ اپنے خانہ ساز "کرۂ نار"[۵] سے گزرنا

---

۵ یونانی نظریے کے مطابق کرۂ ہوائی یا کرۂ باد کے اوپر کرۂ نار پایا جاتا ہے (تصریح، ص ۱۰) اس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا ورنہ جل کر خاک ہو جائے گا۔

اور اس کو پار کرنا بھی محال تصور کرتے تھے۔ اور انہی نظریات و تصورات کی بنا پر موجودہ دور کے بہت سے علماء خلائی پروازوں کے ذریعہ چاند اور دیگر سیاروں تک رسائی کو سخت ناممکن اور محال سمجھتے ہیں اور ایک حیثیت سے وہ اس قسم کی کوشش اور جدوجہد کو خدا کی خدائی میں دخل دینے کے برابر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی خلا بازوں نے جب ۱۹۶۹ء میں جب پہلی بار کرۂ قمر پر کامیابی کے ساتھ قدم رکھا تو مذہبی حلقوں میں ایک کہرام مچ گیا۔ اور تقریباً ہر جگہ اس واقعہ کا انکار کر کے مزید تضحیک کا سامان پیدا کیا گیا۔[۱]

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم ایک حیثیت سے یونانی فکر و فلسفے کی بھی تردید کر رہا ہے۔ اور اس کی غلطیوں کو تجربے و مشاہدے کے ذریعہ واضح کر دینا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ نوع انسانی کو تجربے و مشاہدے پر ابھارتا ہے۔ تاکہ ان دونوں کا طرز ہائے فکر کھل کر سامنے آجائے اور یونانی افکار کی غلطیاں اجاگر ہو جائیں۔ جس دور میں قرآن نازل ہوا اس وقت مسلمان یونانی فکر و فلسفے سے اگرچہ ناآشنا تھے مگر قرآن حکیم چونکہ ایک دائمی اور عالمگیر صحیفہ ہے اس لئے اس میں حفظ ماتقدم کے طور پر فکرِ یونان کے مقابلے کا سامان پہلے ہی رکھ دیا گیا تھا، جس طرح کہ موجودہ دور کے مقابلے کا سامان بھی اس میں پوری طرح موجود ہے۔

دورِ عباسیہ میں جب یونانی علوم کا خوب چرچا ہوا تو اہلِ اسلام کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ علومِ یونان کا شیفتہ اور انہیں ہر قسم کی تنقید سے بالاتر — ان علوم کی دقیقہ سنجیوں کی بنا پر — سمجھنے لگا۔ مگر دوسرا گروہ جو قرآنی سرچشمے سے سیراب اور اس کی روح سے آشنا تھا اس پر ان علوم کا جادو

---

[۱] اس موضوع پر راقم سطور کی پہلی کتاب "چاند کی تسخیر قرآن کے نظر میں" دیکھنی چاہیے۔ جو فرقانیہ اکیڈمی بنگلور سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔

نہ چل سکا اور اس نے ہمیشہ ان علوم پر تنقید کی اور ان کے مسائل کی غلطیوں کا پردہ چاک کیا۔ ان میں امام غزالی، امام رازی اور امام ابن تیمیہ پیش پیش ہیں۔

غرض اس تشریح و تفصیل سے جدید فلکیات اور قرآنی نظریۂ سماوات کے سلسلے میں درپیش تمام شکوک و شبہات اور تمام اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں اور قرآن حکیم کی دیگر تمام آیات کی تشریح و توجیہہ اس نقطۂ نظر سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اور کسی بھی قسم کی پیچیدگی باقی نہیں رہتی۔ اس موضوع پر راقم سطور کی ایک مفصل کتاب زیرِ ترتیب ہے جس میں قرآن حکیم کی متعلقہ تمام آیتوں کا احاطہ کر کے ان کی تفسیر کرنے اور مختلف آیتوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ ہیں:

قُرْآناً عَرَبِیّاً غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ : فصیح اور غیر پیچیدہ قرآن،

تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ : یہ واضح اور روشن کتاب کی آیات ہیں،

تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ : یہ پُر حکمت کتاب کی آیات ہیں،

کی خوبیاں اور گلکاریاں کہ ان میں جس قدر زیادہ غور و فکر سے کام لیا جائے اسی قدر ان کے اسرار و معارف کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر اس کتابِ حکمت میں تفکر و تدبّر کی تاکید کی گئی ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں! (محمد: ۲۴)

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ ط وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافاً کَثِیْراً ۰ تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی جانب سے ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا۔ (نساء: ۸۲)

کتابِ حکمت کے جلوے اور منکرین پر اتمام حجت

قرآن حکیم کے مذکورۂ بالا تمام بیانات اگرچہ بالکل واضح ہیں اور لفظی و معنوی اعتبار سے ان میں کوئی تعقید یا پیچیدگی نہیں ہے۔ مگر ان کا ایک خاص طرز و اسلوب اور ایک خاص موقع و محل ہے، جس کو ملحوظ نہ رکھنے کے باعث اکثر و بیشتر ان کے مفہوم کو سمجھنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شرعی آیات و احکام کے برعکس تکوینی (نیچرل) اُمور کا بیان زیادہ تر اشاروں کنایوں کی زبان میں ہے۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ شرعی اُمور میں تو ہر دَور میں وضاحت و تفصیل کی یکساں ضرورت رہتی ہے۔ تاکہ لوگوں کو اپنے معاملاتِ زندگی کے سمجھنے میں کسی قسم کا اشتباہ نہ رہے۔ اس کے برعکس تکوینی یا نیچرل اُمور و معاملات کا حال مختلف ہے۔ کیونکہ ان اُمور کا تعلق دین کے بنیادی احکام و مسائل سے نہ ہونے کی بنا پر ہر زمانے میں ان کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی، بلکہ ان کی حاجت مخصوص اَدوار اور مخصوص حالات میں پیش آتی ہے۔ اس لئے ایسے معاملات ذرا مبہم طور پر بیان کئے جاتے ہیں تاکہ وقت آنے پر ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔ اس طرح قیامت تک ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اس کتاب حکمت کے نئے نئے پہلو اُجاگر ہوتے رہیں گے۔

دوسری بات یہ کہ ان تکوینی (natural) اُمور و مسائل کا ہر دور کے علوم سے نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اور یہ معمولی اور سطحی غور و فکر کے ذریعہ واضح نہیں ہو سکتے۔ بلکہ علوم و فنون کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنی پڑتی ہے، تب کہیں جا کر ٹھوس اور پائیدار نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر اہل اسلام میں ان اُمور و مسائل پر غور و فکر کرنے والی ایک مخصوص جماعت کا ہونا بہت ضروری ہے۔

غرض اوپر کے صفحات میں جن حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے وہ خدائی

منصوبے کے مطابق اشاروں کنایوں کی زبان میں مذکور ہیں۔ تاکہ چودہ سو سال قبل کے سائنسی حقائق سے نابلد معاشرے کو قرآنی آیات کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری بھی نہ رہے اور وقت آنے پر یہ اشارات دقیق اور معنی خیز بھی بن جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں قرآن حکیم نے نظام کائنات سے متعلق غلط خیالات و نظریات کی پوری طرح کھل کر تردید نہیں کی بلکہ ایک حکیمانہ اور دانشمندانہ اسلوب اختیار کیا، تاکہ لوگوں کو کسی قسم کی دشواری نہ پیش آئے یا وہ کسی اور قسم کی غلط فہمی میں نہ پڑ جائیں۔ نیز اس میں یہ حکمت بھی ملحوظ تھی کہ قرآن حکیم کا جو اصل موضوع تعمیر اخلاق اور درس انسانیت ہے اس سے ہٹ کر اس کے متبعین کو اس دور کے غیر ترقی یافتہ معاشرے کے لئے قرآن کے ان نئے دعووں کی تفہیم کرانا اور ان کا ثبوت فراہم کرنا مشکل ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ منکرین اسلام فوراً یہ اعتراض کرتے اور کہتے کہ قرآن تو ایسے حقائق کا ادعا کر رہا ہے جو مروّجہ نظریات کے خلاف ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے ماننے والے پہلے ان دعووں کا ثبوت پیش کریں اور یہی اصول مابعد کے تمام ادوار میں بھی صادق آتا ہے۔

اس موقع پر یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ قیامت اور حشر و نشر وغیرہ کے متعلق جو دعوے اسلام کے ہیں وہ دوسری قسم کے ہیں۔ جو تمام انبیائے کرام اور تمام مذاہب کی متفقہ تعلیم کے مطابق ہے۔ یعنی ایک دن یہ سارا سلسلۂ وجود درہم برہم ہو جائے گا۔ اور تمام انسانوں اور دیگر ذی عقل مخلوق (جنّات) کا محاسبہ کر کے ان کے اچھے بُرے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

یہ بنیادی عقائد اور تصوراتِ دین اگرچہ لوگوں کے مروّجہ علوم و فنون اور ان کے افکار و نظریات سے خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں مگر انہی کا اثبات اصل مقصود ہے۔ اور اسی غرض و غایت کے لئے انبیائے کرامؑ کی تشریف آوری ہوئی تھی۔ اور جدید سے جدید تر علوم و فنون کی ترقیوں کی روشنی میں یہ اور زیادہ نکھر جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں قرآن حکیم کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ دین کے ان بنیادی عقائد و تصورات کو وہ علمی پیشین گوئیوں کے روپ میں پیش کرتا ہے گویا کہ وہ صحیفۂ فطرت کے ثابت شدہ اور کائناتی حقائق ہیں جو علوم و فنون کی ترقی کے باعث مستقبل میں قطعی و یقینی حیثیت سے علمی حقائق کے روپ میں منکشف ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے نظام کائنات میں غور و فکر کی تاکید کی ہے تاکہ نئے نئے انکشافات کے باعث توحید، رسالت، قیامت اور حشر و نشر وغیرہ تمام عقائد خالص سائنٹفک نقطۂ نظر سے بھی برحق اور دو اور دو چار کی طرح بالکل واضح اور منقح ہو جائیں۔ جن کے ملاحظے کے بعد پھر کسی کے لئے ان حقائق کا انکار کرنے کی مجال باقی نہ رہ جائے

چونکہ قرآن حکیم کسی انسان کا بنایا ہوا کلام نہیں۔ بلکہ اس عظیم ہستی کی جانب سے اتارا ہوا ہے جس نے خود ان تمام مظاہر اور پوری کائنات کی تخلیق کی ہے۔ اسی بنا پر اس میں کائنات کی مشنری سے متعلق ایک ایک پرزے کی تفصیل درج ہے، جو اگرچہ ہے تو اشاروں کنایوں ہی کی زبان میں مگر متعلقہ علوم کی ترقی کے باعث اس کے تمام اشارات و کنایات واضح اور اس کی تشبیہات و استعارات حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اسی بنا پر ارشاد ہوا ہے:

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط کہدو کہ اس کتاب کو اس (ہمہ دان و ہمہ بین) ہستی نے اتارا ہے جو ارض و سماوات کے (تمام) بھیدوں کا جاننے والا ہے۔ (فرقان: ۶)

اگر یہ انسانی کلام ہوتا تو پھر ناممکن تھا کہ اس میں اس قدر یقین آور اور لازوال کلیات درج ہوتے اور وہ صدیوں سے اب تک جدید سے جدید تر تمام علمی تحقیقات و انکشافات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا! جب کہ انسانی نظریات کی بنیاد پر جو کتابیں تصنیف کی گئی تھیں وہ سب کی سب داستان پارینہ اور

اوراقِ پریشاں قرار پاچکیں !!! کیا یہ قرآن عظیم کی صداقت اور اس کا حیرت انگیز علمی اعجاز نہیں ہے ؟ قرآن حکیم کا یہ ناقابلِ تردید اعجاز ہی اس کے من جانب اللہ ہونے کی روشن اور فیصلہ کن دلیل ہے۔

اس سے یہ حقیقت بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اشارے اور کنائے اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتے جب تک کہ متعلقہ علوم کی ترقی نہ ہو جائے۔ مگر اس حقیقت سے ناواقف لوگ یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ "مسلمان تو علوم کی ترقی ہو چکنے کے بعد کہتے ہیں کہ اس کا ذکر ہمارے قرآن میں موجود ہے، یہ بات وہ پہلے نہیں کہتے" اصل میں یہ حکیمانہ اور دنیا کی تاریخ میں حد درجہ انوکھا طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا کہ خدائی منصوبے کے مطابق علوم و فنون کی ترقی ہو چکنے کے بعد نوع انسانی کی رہنمائی متعلقہ علوم میں بھی ہو جائے۔ اور اس کے سامنے متعلقہ مسائل میں قرآنی نقطۂ نظر ــ خدا پرستانہ حیثیت سے ــ واضح ہو جائے تاکہ وہ کسی بھی حیثیت سے بھٹکنے اور غلط راہوں پر نکلنے نہ پائیں۔ گویا کہ قرآن عظیم انسانوں کو ہر طرح سے اپنے "مضبوط شکنجوں" میں جکڑے رہنا چاہتا ہے۔ یہی اس کی اصل رہنمائی اور سب سے بڑا کمال ہے۔

اس بحث سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہم صرف اپنے دَور کے احوال و کوائف، اصول و نظریات اور تحقیقات و انکشافات کے پابند ہیں۔ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ قرآن موجودہ دَور کے علوم و فنون اور تحقیقات سے متعلق کیا کہتا ہے ؟ پھر ہم کو تمام صحیح اصولوں سے کام لے کر قرآن اور جدید علوم کا تقابل کر کے نوعِ انسانی کی فکری و نظریاتی اعتبار سے رہنمائی کرنی ہے اور اس کے عظیم ترین وصف "فرقان" ہونے کی حیثیت سے ان علوم و فنون کے کھرے کھوٹے کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کر دینا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے :

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ٥ بلاشبہ

ہم نے تمہارے پاس ایک ایسی کتاب بھیج دی ہے جس میں تمہارا تذکرہ موجود ہے[۱۰۲] کیا تم نہیں سمجھتے؟ (انبیاء : ۱۰)

ہم کو اس سے بالکل بحث نہیں ہے کہ آئندہ دور میں کیا ہوگا اور علوم و فنون کون سا رُخ اختیار کریں گے، کون سے مسائل باقی رہیں گے اور کون سے فنا ہو جائیں گے؟ ہم تو صرف اپنے دور کے علوم و مسائل کے پابند ہیں مستقبل کے بارے میں سوچنا ہمارا کام نہیں ہے۔ کیونکہ ہم کو اس بارے میں جزئی یا کلّی علم نہیں ہے۔ اس لئے یہ بات تکلیف مالا یطاق کی قبیل سے ہوگی۔ آئندہ جب حالات بدل جائیں گے اور نئے نئے علوم و فنون رائج ہو جائیں گے تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ اپنے کلام برحق کی تائید اور دین ابدی کی نصرت و حمایت کے لئے ایسے بندوں کو ضرور اٹھائے گا جو اُس دور کی عقلیت کے مطابق اس دَور کی رہنمائی کرسکیں۔ اور علم کلام کے نئے نئے اور بہتر سے بہتر اُصول منضبط کر کے ہر قسم کی غلط فہمیوں اور شکوک و شبہات کا پردہ چاک کرسکیں۔ لہٰذا زمانہ مستقبل کے تعلق سے خواہ مخواہ پریشان ہو کر موجودہ علوم و فنون سے کنارہ کشی اختیار کر لینا دانشمندی سے بعید تر ہوگا۔

---

۱۰۲ " فیہ ذکرکم" (اس میں تمہارا تذکرہ موجود ہے) کی تفسیر میں مفسر ابوالسعودؒ نے بہت بہترین بات تحریر فرمائی ہے کہ اس سے مراد چند شکلیں یہ ہوسکتی ہیں: (۱) اس میں تمہاری عزت و شہرت کا بیان موجود ہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا "وانہ لذکرلک ولقومک"، (اس میں تمہارا اور تمہاری قوم کا ذکر ہے۔ (۲) کہا گیا ہے کہ تمہارے دینی و دنیوی اُمور کا بیان موجود ہے۔ (۳) کہا گیا ہے کہ اس میں ان تمام چیزوں کا بیان موجود ہے جو تمہارے مکارمِ اخلاق کے لئے ضروری ہوں (۴) اور کہا گیا ہے کہ اس میں وعظ و نصیحت (اور تنبیہ و انتباہ) کا سامان موجود ہے اور نظم کلام کے لحاظ سے بھی سب سے زیادہ بہتر ہے۔ (تفسیر ابوالسعود، برحاشیہ تفسیر کبیر جلد ۷ ص ۷۳ — ۷۴)۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ یہ وہ زبردست (اور بے نظیر) کتاب ہے جس میں باطل (غیر واقعی بات) نہ آگے سے در آسکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔ کیونکہ یہ حکمت اور خوبیوں والی ہستی کی جانب سے اتاری گئی ہے (حٰم سجدہ: ۴۱-۴۲)

یعنی اس میں جھوٹ اور خلاف واقعہ بات نہ ماضی میں جگہ پا سکی ہے اور نہ مستقبل میں جگہ پا سکتی ہے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ اور ہم نے اس (قرآن) کو راستی کے ساتھ اُتارا ہے اور وہ (بالکل) راستی ہی کے ساتھ اترا ہے۔ (اور اسی بنا پر) ہم نے آپ کو محض بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔
(بنی اسرائیل: ۱۰۵)

یعنی وہ جو اُمور بیان کرتا ہے اور جن اُصول وضوابط کی تعلیم دیتا ہے وہ بالکل واضح اور صداقت سے بھرپور ہیں۔ اور اس میں ہر قسم کی خوشخبریوں اور تنبیہ و انتباہ کا سامان جمع کر دیا ہے اور ہمارا کام یہ ہے کہ ہم عصری علوم وفنون کی روشنی میں ان دونوں رُخوں کو پوری وضاحت کے ساتھ نوعِ انسانی کے سامنے پیش کر دیں۔

علمِ الٰہی کی ازلیت کا آفاقی نظارہ

مذکورہ بالا مباحث کی تنقیح میں ضمناً ایک دوسری بحث پیدا ہوتی ہے اور ایک بہت بڑی حقیقت پر سے پردہ اُٹھ جاتا ہے۔ وہ ہے علمِ الٰہی کی ازلیت اور کُلّی و جزئی ہر حیثیت سے اس کے علم کا کائنات کی پوری مشری اور کل کائنات پر محیط ہونے کا آفاقی اور ایمان افروز نظارہ، جس کے ملاحظے سے بہت سے فلاسفہ کے بے بنیاد نظریات کا رد اور بہت سے باطل مذاہب کی جہالت مآبیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فلاسفہ کا عقیدہ تھا کہ

اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہیں ہے[۱۰۳]۔ اور مذاہب اسلامیہ میں روافض اور فرقہ قدریہ کا عقیدہ یہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اشیاء کی تخلیق سے قبل ان کا علم نہیں ہو سکتا[۱۰۴]۔

مسئلۂ علم الٰہیات و کلامیات کے اُن اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے جن کے سلجھانے میں انسانی عقل و دانش حیران و سرگرداں رہی ہے مگر خالص فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اُلجھی ہوئی ڈور کا سرا اب تک ہاتھ نہیں آسکا ہے۔ ہاں اسلامی نقطۂ نظر سے عقائد و کلام کی کتابوں میں جو مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام جزئیات و کلیات اور موجودات و معدومات کا علم بکمال درجہ حاصل ہے[۱۰۵]۔ اس کا قطعی ثبوت قرآن مجید میں موجود ہے۔ اور اس کا آفاقی نظارہ ہمیں قرآن حکیم کو سائنٹفک نقطۂ نظر سے (سائنسی علوم کی روشنی میں) سمجھنے کے بعد یقینی طور پر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوقات عالم کا خالق ہے۔ اور اسی نے اپنے کلام برحق کی صداقت و حقانیت کے ثبوت کے طور پر اپنی مخلوقات کے تمام احوال اور کائنات کی مشنری کے ایک ایک پرزے کی ساخت و پرداخت سے متعلق تفصیلی معلومات محض اپنے علم ازلی کی بنا پر پہلے ہی سے ایک منصوبے کے مطابق اپنے کلام میں درج کر دی ہیں۔ اب قرآن اور سائنسی علوم کے تقابلی مطالعے سے یہ تمام صداقتیں اور سچائیاں ایک ایک کر کے ظاہر و باہر ہو جاتی ہیں۔ اور علم الٰہی کی ازلیت اور اس کے احاطۂ جزئیات کا حال پوری طرح روشن اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پچھلے اور اگلے تمام ابواب میں اس قسم کے جتنے بھی حقائق منکشف کئے گئے ہیں ان سب سے بنیادی طور پر یہ ہمہ گیر اور عالمگیر سچائی پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے اور اگر کوشش

۱۰۳؎ شرح عقائد النسفی، از ملا سعد الدین تفتازانی، ص ۴۳ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ۔

۱۰۴؎ شرح فقہ اکبر، از ملا علی قاری، ص ۱۸ مطبع مجیدی کانپور ۱۳۴۵ھ

۱۰۵؎ ایضاً ص ۱۸

کی جائے تو خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب وجود میں آسکتی ہے۔

اسی طرح کتب عقائد و کلام میں اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات ازلیہ اور صفات کمالیہ[۱۰۶] سے متعلق جو طویل بحثیں فلسفیانہ موشگافیوں سے ہٹ کر موجود ہیں ان سب کا اثبات بھی آج قرآن حکیم کے ذریعہ اور سائنسی علوم کی روشنی میں بہت بہتر بلکہ مشاہداتی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہمارے علماء کو سائنسی علوم کی یہ افادیت اور قرآن حکیم کا یہ اہم اور حیرت ناک پہلو بھی مد نظر رکھنا چاہیئے تاکہ عالم انسانی کو قرآن حکیم کی ابدی و سرمدی صداقتوں سے آگاہ کر کے اس کو اس سرچشمۂ ہدایت کی طرف لایا جا سکے۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ○ کیا وہی بے خبر رہ سکتا ہے جس نے (تمام مخلوقات کو) پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ بہت باریک بین اور بڑا ہی باخبر ہے۔ (ملک: ۱۴)

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ○ اور اسی کے پاس ہیں غیب کی کنجیاں۔ جن کو بجز اس کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اور وہ بر و بحر میں جو کچھ ہے سب کو جانتا ہے اور جو پتّا بھی (کسی درخت کا) گرتا ہے وہ اس کو جانتا ہے۔ اور زمین کی تاریکیوں میں پایا جانے والا کوئی دانہ اور کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں ہے جو کتاب روشن میں درج نہ ہو۔ (انعام: ۵۹)

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ط وہ جانتا ہے ان تمام چیزوں کو جو آسمان سے اترتی ہیں (مثلاً

---

[۱۰۶] صفات کمالی اللہ تعالیٰ کی ان (ازلی) صفات کو کہا جاتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و بزرگی اور کاملیت ظاہر ہوتی ہو۔ جیسے وحدانیت، وجود، علم اور قدرت وغیرہ۔ (ماخوذ از سیرت النبی، ۴/ ۵۱۰)۔

کاسنانی شعاعیں اور شہاب ثاقب وغیرہ) اور (پھر) آسمان میں چڑھتی ہیں۔ (سبا: ۲)

عٰلِمُ الْغَیْبِ ۚ لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝ وہ غیب (تمام پوشیدہ چیزوں) کا جاننے والا ہے۔ اس (کی نظروں) سے زمین اور اجرام سماوی میں موجود کوئی رتی سی چیز (جیسے ایک اٹیم[۶۶]) یا اس سے چھوٹی (ایٹمی ذرات اور شعاعیں وغیرہ) یا اس سے بڑی (جیسے سالمات، غرض کوئی بھی چیز اس کے علم سے) غائب نہیں ہو سکتی۔ (بلکہ ان تمام مظاہر کا حال) ایک کھلی کتاب میں مندرج ہے۔ (سبا: ۳)

ترمذی کی ایک حدیث میں قرآن حکیم کی جو جامع اور حیرت انگیز صفات بیان کی گئی ہیں وہ آج بالکل مطابق واقعہ نظر آتی ہیں:

فیہ بنأ ما کان قبلکم، وخبر ما بعدکم، وحکم ما بینکم، ھو الفصل لیس بالھزل، من ترکہ من جبار قصمہ اللہ، ومن ابتغی الھدی فی غیرہ أضل اللہ، وھو حبل اللہ المتین، وھو الذکر الحکیم، وھو الصراط المستقیم، ھو الذی لا تزیغ بہ الأھواء، ولا تلتبس بہ الألسنۃ، ولا یشبع منہ العلماء، ولا یخلق علی کثرۃ الرد، ولا تنقضی عجائبہ، ھو الذی لم تنتہ الجن اذ سمعتہ حتی قالوا انا سمعنا قرآنا عجبا یھدی الی الرشد، من قال بہ صدق، ومن عمل بہ أجر، ومن حکم بہ عدل، ومن دعا الیہ ھدی الی صراط مستقیم۔[۶۸]

---

[۶۶] اس آیت کریمہ اور ان الفاظ کے معانی و مطالب پر تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو تیسرے باب میں "ایٹم اور قرآن" کی بحث۔

[۶۸] جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل القرآن، جلد دوم، مطبوعہ مصر۔

قرآن میں تمہارے دور سے پہلے کی خبریں بھی ہیں اور تمہارے دَور کے بعد کے واقعات بھی۔ وہ تمہارے تمام) باہمی معاملات (واختلافات) میں حاکم ہے۔ وہ (ہر معاملے میں) قولِ فیصل ہے۔ کوئی ہنسی نداق نہیں جس نے تکبر کی بنا پر قرآن کو چھوڑا اللہ نے اس کو ہلاک کیا اور جس نے اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا ذریعۂ ہدایت اختیار کرنا چاہا تو اللہ نے اس کو گمراہ کیا۔ وہ اللہ کی مضبوط رسّی ہے۔ وہ حکمت والا تذکرہ ہے۔ وہ سیدھا راستہ ہے۔ وہ ایسا کلام ہے کہ خواہشات کو بے قابو ہونے نہیں دیتا ۔ وہ ایسا کلام ہے کہ انسانی زبانیں اس سے مبل نہیں کھاتیں۔ علمار کی طبیعت اس سے سیرنہیں ہوتی ۔ وہ کثرتِ تلاوت سے پُرانا نہیں ہوتا۔ اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ یہ وہی کلام ہے کہ جب جنّوں نے اس کو سُنا تو انہیں کہے بغیر چارہ نہ رہا کہ "ہم نے ایک نہایت ہی عجیب قرآن سُنا ہے جو ہدایت کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے" (اب) جس نے بھی قرآن کے مطابق کہا سچ کہا۔ جس نے اس پر عمل کیا ثواب پایا جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا اور جس نے اس کی طرف لوگوں کو بلایا اس نے صراطِ مستقیم کی دعوت دی"

اس حدیث شریف کے مطابق قرآن حکیم کی جو علمی خبریں آج علومِ جدیدہ کی روشنی میں ہم پر منکشف ہو رہی ہیں وہ نہ صرف قرآن کی بلکہ خود اس حدیث شریف کی حقّانیت کا بھی ایک ثبوت بہم پہنچا رہی ہیں۔ ان علمی خبروں کے ملاحظے سے بالکل یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم قرآن حکیم کے روپ میں علمِ الٰہی کی ازلیت و آفاقیت کی ایک "ٹیلی وژن فلم" دیکھ رہے ہیں جس میں صحیفۂ فطرت کے نقش و نگار، اس کی رنگا رنگیاں اور اس کے تمام چھوٹے بڑے مظاہر ایک خاص انداز میں درج ہیں۔ اور ان کی "سیرتوں" کے تمام بنیادی نکات کا اصولی طور پر احاطہ

کر لیا گیا ہے۔ اس طرح کہ کوئی معمولی سے معمولی چیز اور کوئی ادنیٰ سا مظہر قدرت بھی درج ہونے سے چھوٹ نہیں سکا ہے۔ مگر اس کی ایک خاص زبان اور ایک خاص اسلوب ہے جس کو سمجھنے کی ضرورت ہے جیسا کہ خود اس حدیث میں اشارہ موجود ہے۔ (ولا تلتبس بہ الالسنۃ: انسانی زبانیں اس سے میل نہیں کھاتیں۔) اس اسلوب کو سمجھ لینا ہی دراصل قرآن کی "شاہ کلید"، یا master key کو پالینا ہے جس کے ذریعہ اس کے تمام ... بند دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور اسرار و معارف کی بارش ہونے لگ جاتی ہے۔

غرض قرآن حکیم کا یہ ایک زبردست علمی اور تاریخی اعجاز ہے اور اس کی صداقت و حقانیت کا ایک یقین آور اور فیصلہ کُن ثبوت ہے کہ چودہ سو سال قبل ایک اُمّی — فداہ ابی واُمّی — کی زبان حقیقت بیان سے جو دعوے کرائے گئے تھے وہ آج علم اور تحقیق کی روشنی میں نہ صرف صحیح اور برحق ثابت ہو رہے ہیں بلکہ ایک ہمہ داں وہمہ بین ہستی — جلّ جلالہٗ — کے وجود کی بھی ناقابل انکار شہادت فراہم کر رہے ہیں جس کا علم ازلی اور محیط بالجزئیات ہے۔ وہ کائنات کے ایک ایک ذرے اور ایک ایک ایٹم اور اس کے اندر واقع تمام اجزا اور ان کی کارفرمائیوں سے پوری طرح واقف اور باخبر ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ (اے مخاطب) کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی تمام چیزوں سے واقف ہے؟ (مجادلہ: ۷)

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ اس نے (اس عالم رنگ و بو کی) ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے۔ (انعام: ۱۰۱)۔

اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۝ ہاں جان لو کہ وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے (حم سجدہ: ۵۴)

علماء اور خلافتِ ارض کی ذمہ داریاں

اصل بحث فلسفۂ یونان اور اس کے غلط نظریات کی چل رہی تھی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ہمارے علماء کا وہ طبقہ جو فلسفۂ یونان کا شیفتہ اور اس کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے علم و تحقیق کی ان ساری تبدیلیوں سے ناواقف رہ کر اب تک "جزو لا یتجزیٰ" کے وجود و عدم وجود اور "افلاک سبعہ و تسعہ" کی بے کار اور مہمل بحثوں بلکہ فرضی و وہمی مسائل میں اُلجھا ہوا ہے۔ جن سے نہ تو دین کا کوئی فائدہ ہے اور نہ دُنیا کا۔ لے دے کے ان کی اہمیت قرون وسطیٰ میں محض کلامی حیثیت سے تھی۔ مگر آج وہ بھی باقی نہیں رہ گئی۔ بلکہ ان فرضی و وہمی علوم کی جگہ آج جدید فلسفہ، جدید منطق[۱] اور تجرباتی علوم نے لے لی ہے۔ اور موجودہ دور کی عقلیات کا توڑ کرنے کے لئے جدید فلسفہ اور سائنسی علوم کا مطالعہ ضروری ہے نہ کہ قدیم اور از کار رفتہ یونانی عقلیات کا۔

یونانی فلسفہ جہاں بھی گیا اس نے جھگڑے فسادات پیدا کئے، خواہ وہ اسلامی دور میں ہو یا یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں۔ یونانی فلسفہ اپنے اصل مزاج کے اعتبار سے جمود یا "بے عملی" کی تعلیم دیتا ہے۔ مسلمانوں میں اس نے اعتقادی حیثیت سے تفرقہ ڈالا۔ فرقے پیدا کئے اور ایک کو دوسرے سے لڑایا۔ یہی کام یورپ میں ایک دوسرے طریقے سے کیا گیا اور لاکھوں آدمی کلیسا کے ظلم و ستم کا شکار بنے۔ ارسطو کے فلسفے اور اس کے نظریات کا انکار کرنے والوں کو سولی پر چڑھایا اور زندہ جلایا گیا۔ یہ ایسی کہانی ہے جس کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

---

[۱] استقرائی منطق جو تمام تجرباتی علوم کی جان اور رُوحِ قرآن کے عین مطابق ہے۔

اس کے برعکس تجربی علوم مفید، ضروری اور حرکت پیدا کرنے والے ہیں۔
جن کی طرف رہنمائی — جیسا کہ تفصیلات پچھلے ابواب میں گزر چکیں۔ قرآن حکیم نے
کی۔ اور قرون وسطیٰ میں ان کی ترقی ہوئی اور موجودہ دور میں وہ منتہائے
کمال تک پہنچ گئے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارے علماء اور ارباب فکر کے لئے ضروری
ہے کہ ان جامد اور غیر متحرک علوم — جو تجربے و مشاہدے کے دشمن اور
ہر قسم کی "بے عملیوں" نیز جھگڑے فسادات کی علامت ہیں — کو ترک
کر کے حقیقی اور افادی علوم کو اختیار کریں۔ جن کے ذریعہ قرآن حکیم کی صداقت و
حقانیت بھی ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ درحقیقت قرآن حکیم نے خود اپنی صداقت و
سچائی کے اثبات ہی کے لئے تجرباتی علوم کی ترقی کی دعوت دی تھی تاکہ
قرآن حکیم کا اصل معجزہ ظاہر ہو اور نوع انسانی کے سامنے وہ ایک
فیصلہ کن کلام کی حیثیت سے آئے اور اس کے لئے حجت و برہان بن جائے۔

مذکورۂ بالا مباحث سے بخوبی واضح ہو گیا کہ یونانی فکر و فلسفہ اپنے
مزاج اور ماہیت کے اعتبار سے تجربی علوم سے یکسر مختلف ہے بلکہ ان
دونوں میں ایک طرح سے تعارض و تضاد پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
جب تک مسلمان ارسطو کی منطق و فلسفے سے چمٹے رہے انہوں نے سائنسی
اور مادی میدان میں کوئی ترقی نہیں کی مگر جیسے ہی انہوں نے قرآنی فکر
اور اس کی دعوت کے مطابق تجربے و مشاہدے کو رہنما بنایا، ان پر
نئے نئے حقائق منکشف ہوئے۔ یہی حال یورپ کے دورِ احیاء یا نشاۃ
ثانیہ کا بھی ہے۔ جب تک ارسطو کی منطق و فلسفہ اور اس کے نظریات کو —
جن سے کلیسا چمٹا ہوا تھا — رد نہیں کیا گیا، جدید علوم و فنون کی ترقی
عمل میں نہیں آسکی اور وہ ایجادات و اکتشافات — جن سے آج ہم متمتع
ہو رہے ہیں — معرض وجود میں نہیں آسکے۔ یہی حقیقت آج بھی صادق
آتی ہے۔ جب تک ہم یونانی حکمت و فلسفے کو سینے سے لگائے رکھیں

گے — جیساکہ آج ہمارے اکثر ہندوستانی مدارس کا خاصہ ہے — ہم خلافتِ ارض کے میدان میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکیں گے کیونکہ جیساکہ عرض کیا جا چکا ان عقلی علوم کا مزاج ہی بنیادی طور پر جمود کی تعلیم دینا اور زندگی کے میدان اور اس کے ہنگاموں سے دُور رکھنا ہے۔ اور پھر یہ کوئی الہامی علوم بھی نہیں ہیں کہ ہم انہیں اس قدر ضروری اور اہم قرار دیتے ہوئے انہیں عملاً دینی علوم کے برابر کا درجہ دے دیں۔

فلسفۂ یونان چونکہ محض نظری ہے اور عملی دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے، اس بنا پر وہ تجربات و مشاہدات کی رُو سے واقع ہونے والے تمام تغیرات و انقلابات سے بے پَروا ہوکر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ سے قائم رکھے ہوئے ہے اور اس سلسلے میں اسے نہ تو قرونِ وسطیٰ کے کے مسلم سائنسدانوں کے تجربات و تحقیقات کے نتیجہ میں رُونما ہونے والی فکری و نظری تبدیلیوں کی کچھ پرواہ ہے اور نہ عصر جدید کے علمی تغیرات و انقلابات سے چنداں پریشانی! بلکہ اس کے افکار و نظریات جس طرح ہزاروں سال قبل درخورِ اعتنا سمجھے جاتے تھے، اسی طرح بلکہ شاید اس سے کچھ زیادہ قطعیت کے ساتھ آج بھی مسلّم اور ناقابلِ تردید — بعض مخصوص حلقوں میں — سمجھے جا رہے ہیں۔ زمین اپنی جگہ سے ہل سکتی ہے اور آسمان اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے مگر ان "پیمبرانِ یونان" کے اقوال میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یونانی افکار پر یہ فریفتگی بلکہ "ثابت قدمی" شاید اس بنا پر ہو کہ سائنسی علوم ان کی نظر میں چونکہ ارتقا پذیر ہیں اسلئے وہ قابلِ اعتنا نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس یونانی افکار میں چونکہ "ارتقا" کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے گویا وہ اس قابل ہیں کہ ان پر ثابت قدم رہا جائے اور ان پر مداومت کی جائے۔ اور عجب نہیں کہ کسی کے ذہن میں یہ تصور بھی ہو کہ علم کا مسافر ہو سکتا ہے کہ تھک کر پھر کسی وقت اسی

منزل کی طرف لوٹ آئے جہاں پر فکرِ یونان "پڑاؤ" ڈالے ہوئے ہے۔

اسلام نے منصب خلافت کی وضاحت اور اس کی ذمہ داریوں کے فرائض نہایت خوبی کے ساتھ بیان کئے تھے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ علمائے اسلام کا ایک بڑا طبقہ اس منصب عظیم کو سمجھنے اور اس کی وضاحت کرنے میں — نادانستہ طور پر — ناکام رہا ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام اپنے کردار کی ادائیگی میں ہرگز ناکام نہیں رہا بلکہ اس کے پیرو اور اس کے ماننے والے ناکام رہے ہیں۔ اور علمار کی اس ناکامی میں — میرے ناقص علم کی رُو سے — یونانی منطق و فلسفے نے تاریخی رول ادا کیا ہے۔ مسلمان علمار یونان کے نظری علوم میں غلو کی حد تک کچھ اس طرح منہمک ہو گئے اور انہیں اپنے سر پر اس طرح بٹھا لیا کہ تجرباتی علوم — وہ علوم طبیعی و حیاتیاتی جن میں کمال حاصل کر کے یورپ زمین کی مادی خلافت پر قابض ہو گیا — سے بالکل غافل ہو گئے اور خلافت ارض کے اصل مقصد کو فراموش کر دیا۔ علامہ اقبال نے بجا طور پر فرمایا ہے:

"یونانی فلسفے نے مفکرینِ اسلام کے مطمحِ نظر میں اگرچہ بہت کچھ وسعت پیدا کر دی تھی مگر بحیثیت مجموعی قرآن مجید میں ان کی بصیرت محدود ہو کر رہ گئی۔"[۱۱]

یورپ نے ارسطو کی عقلیات کو رد کر کے سائنس اور مادیات میں اتنی ترقی کر لی کہ وہ ان کے بل بوتے پر تمام اقوام عالم پر غالب آ گیا اور پوری دُنیا کو زیر کر بیٹھا۔ مگر مشرقی ممالک اب تک ان "اوراق پریشان" کو سینے سے لگائے ہوئے ذلت و نکبت اور غلامی کی تصویر مجسم بنے ہوئے "علم اسمار" میں برتر و فائق قوموں کے وارث بنے جا رہے ہیں

۱۱؎ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۵، مطبوعہ لاہور۔

اور حال یہ ہو گیا ہے کہ "اُف" تک کہنے کی بھی مجال باقی نہیں رہ گئی ہے۔ پانی سر سے بہت اونچا ہو گیا ہے لہٰذا اب ہم کو پوری طرح ہوش میں آجانا چاہیئے۔ ہم "خیالات و مفروضات" کی دنیا میں کچھ اس طرح کھو گئے ہیں کہ ہمیں بالکل کوئی خبر نہیں ہے کہ ہمارے گرد و پیش عملی دنیا میں کیا کیا انقلابات و تغیرات واقع ہو چکے ہیں۔ گویا کہ یونان کی "خیالی دنیا" ہمیں اب تک "واقعاتی دنیا" میں قدم رکھنے سے روکے ہوئے ہے۔ مگر جب تک ہم اس خیالی دنیا کے طلسم سے باہر نکل کر واقعات کی دُنیا میں قدم نہیں رکھتے ہم کسی بھی چیز کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے جائزہ نہیں لے سکتے۔ اور خلافت ارض کے میدان میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتے۔

لہٰذا ہماری دینی، ملّی اور قومی غیرت کا تقاضا ہے کہ ہم اس ناگفتہ بہ اور اندوہناک صورتِ حال کو بدلیں۔ جدید علوم و فنون کے اپنانے سے نہ صرف ہماری قومی و ملّی زندگی کی کایا پلٹ سکتی ہے بلکہ بین الاقوامی حیثیت سے بھی ہماری شان و شوکت اور ہمارے قومی و ملّی وقار میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ نیز فکری و نظریاتی اعتبار سے اتنے سارے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو شمار سے بھی باہر ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہماری ملّت کے ارباب حل و عقد پوری ہوش مندی اور دیانت داری کے ساتھ ان مسائل پر غور و فکر کر کے موجودہ تاریخ کے مشکل اور نازک ترین لمحات میں ملّتِ اسلامیہ کی صحیح اور بر وقت رہنمائی کریں۔ اس وقت بین الاقوامی اعتبار سے اُمت مُسلمہ جن ناگفتہ بہ حالات سے گزر رہی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ ہمارا ایک ایک قدم صحیح لائنوں اور صحیح سمتوں کی طرف اُٹھے۔ یہ وقت تاریخ نگاری کا نہیں بلکہ تاریخ سازی کا ہے اور ہماری ذرا سی بھی چوک اور کوئی بھی غلط فیصلہ کھیانک اور تباہ کن نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ اور ہم خیالات کی دُنیا میں رہ کر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا محض خواب ہی

خواب دیکھتے رہ جائیں گے۔ لہذا ہمارے اربابِ ملّت کا فرض ہے کہ وہ فکری و نظریاتی اعتبار سے قوم و ملّت کی صحیح رہنمائی فرمائیں۔ تاکہ گرداب میں پھنسی ہوئی کشتی پار لگے۔ ورنہ پوری ملت کا خون ناحق اس کے ناخداؤں کی گردن پر ہوگا اور وہ خدا کے نزدیک جواب دہ ہوں گے۔ لہذا ہمارے علمائے کرام کو منفی رَوّیہ ترک کر کے مثبت رویہ اپنانا ہوگا۔ یہ بہت بڑی اور بھاری ذمّہ داری ہے بلکہ ایک بہت بڑا اور کٹھن امتحان اور ایک زبردست چیلنج ہے۔ جس کا پوری ہوشمندی اور بیدار مغزی کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیئے۔

عُلمار اور جدید مسائل

علومِ جدیدہ سے علمار کی دُوری اور بے گانگی کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جدید علوم کی نشو ونما اور ان کی ترویج واشاعت کے باعث معاشرہ جن نئے نئے علمی، فکری اور معاشرتی و تمدنی مسائل و مشکلات سے دوچار ہوتا ہے، ان سے بھی مکمل بے گانگی عمل میں آئی۔ اور اور یہ تصوّر عام ہو گیا کہ اب علمار کو ان علوم اور ان مسائل سے کسی بھی قسم کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن کے مقاصد اور اس کے عالمگیر نظریات کے مطابق ضروری تھا اور ہے کہ وہ انسانی معاشرے کے ایک ایک "پوئنٹ" میں گھستے اور اس کے ایک ایک رگ و ریشے سے واقف ہوکر اپنا فریضہ "معروف و منکر"[1] ادا کرتے۔ معروف و منکر محض

---

[1] معروف کے لغوی معنیٰ ہیں "جانا پہچانا"، یعنی ہر وہ (قول یا) فعل جس کو عقل و نقل اچھا اور قابلِ تحسین قرار دیں۔ اسی طرح منکر کے لغوی معنی ہیں "غیر جانا پہچانا"، یا "نا شناس"، یعنی وہ (قول یا) فعل جس کو عقل ونقل بُرا اور قبیح سمجھیں۔ (ماخوذ از المفردات فی غریب القرآن)۔

چند رسوم یا رواجات کی تلقین کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ انسانی افکار و نظریات، اُس کے فلسفوں اور اس کی تمام تحریکوں کا جائزہ لے کر کھرے کھوٹے کو الگ کرنا اور صحیح و سقیم کا حال ان کے وسیع مفہوم کے مطابق عقل و نقل کی روشنی میں پوری وضاحت کے ساتھ کر کے ان کے نشیب و فراز اور عواقب و نتائج سے پوری نوعِ انسانی کو آگاہ اور متنبہ کرنا۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا

بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر فرقان (حق و باطل میں تمیز کرنے والی فیصلہ کن کتاب) نازل کی تاکہ وہ سارے جہاں کو متنبہ کر سکے۔ (فرقان: ۱)

اس لحاظ سے معاشرہ کی اصلاح اور گمراہ کن فلسفوں اور تحریکوں کے ابطال کے لئے ان فلسفوں اور جدید علوم و مسائل سے واقفیت نہ صرف ضروری ہے بلکہ فرض کفایہ ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ (۶۶۱-۷۲۸ھ) نے اس مسئلہ میں کہ غیر منقولی مسائل میں خوض جائز ہے یا نہیں، نیز یہ کہ اگر جائز ہے تو اس کے ضروری اور واجب ہونے کی کوئی دلیل ہے بھی یا نہیں؟ تحریر فرمایا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے ہیں اس پر مجمل اور عمومی اور عمومی طور پر ایمان لانا سب پر واجب ہے، مگر اس کی تفصیلی معرفت حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ اور یہ شق دین کی تبلیغ میں داخل ہے۔ اسی طرح یہ بات قرآن کے تدبر اور اس کے فہم، کتاب و حکمت کے علم اور اس کی حفاظت خیر اور معروف کی طرف بلانے، منکرات سے روکنے اور راہِ خداوندی کی طرف حکمت و موعظت اور بہترین مجادلے و مباحثے کے ذریعہ دعوت دینے وغیرہ تمام اُمور میں داخل و شامل ہے، جس کو

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لئے واجب قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان تمام حیثیتوں سے یہ علم واجب کفایہ[۱۱۲] ہے[۱۱۳]۔

ظاہر ہے کہ اگر علماء اور دین الٰہی کے رمز شناس ہی اس کوچے سے ہٹ جائیں تو پھر اصلاح عالم کا فریضہ کون ادا کر سکے گا؟ لہٰذا ہر دور میں علماء پر یہ فریضہ ایک فرض کفایہ کے طور پر عائد رہتا ہے کہ وہ اپنے دور کے تمام غلط اور بے بنیاد افکار و خیالات اور گمراہ کن تحریکوں نیز خدا بیزار فلسفوں اور دیگر عملی و اعتقادی مفاسد کا پوری باریک بینی کے ساتھ جائزہ لے کر "کتاب حکمت" کی روشنی میں ان کا علمی تجزیہ کریں۔ پھر ان مفاسد کو نمایاں اور خدائی ہدایت و رہنمائی کو واضح کر کے عالم انسانی کی فکری و نظریاتی اعتبار سے صحیح رہنمائی کریں۔ یہ ہے علمائے اسلام کا صحیح مقام اور ان کا صحیح منصب۔

جدید فلسفے اور تحریکیں

آج اسلام کو جس قسم کے ہمہ گیر و عالمگیر فکری و نظریاتی چیلنج کا سامنا ہے۔ اس قدر ہمہ گیر و عالمگیر چیلنج سے اس سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

---

[۱۱۲] فقہی اعتبار سے شرعی احکام فرض، واجب، سنّت اور مندوب (یا مستحب) میں منقسم ہیں۔ فرض اور واجب کی تعریف میں تھوڑا سا فرق ہے مگر یہ دونوں وہ ہیں جن کی ادائیگی ہر حال میں ضروری ہو۔ اور ان میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں: فرض عین اور فرض کفایہ، اسی طرح واجب عین اور واجب کفایہ۔ فرض عین اور واجب عین وہ احکام ہیں جن کی ادائیگی اُمّت کے ہر ہر فرد پر ضروری ہو۔ اس کے برعکس فرض کفایہ اور واجب کفایہ وہ ہیں کہ اگر کچھ افراد ان کو ادا کر دیں تو بقیہ افراد کے ذمے سے یہ فریضہ ساقط ہو جائے۔

[۱۱۳] موافقہ صریح المعقول لصحیح المنقول، برحاشیہ منہاج السنۃ ۱/۳۳، مطبوعہ ریاض۔

ایک طرف سائنسی علوم و فنون کی غلط اور مادہ پرستانہ نقطہ نظر سے تشریح و توجیہہ کی جاتی ہے[۱۱۴] تو دوسری طرف ان غلط رجحانات و توجیہات کی بنیاد پر مختلف قسم کے منظم فلسفے اور تحریکیں منظر عام پر آرہی ہیں۔ اور ان تمام کا بنیادی خمیر الحاد و لادینیت ہے۔ یہ تمام فلسفے اور تحریکیں خوشنما نعروں اور دلفریب لیبلوں کے سہارے پورے عالمِ انسانی پر تھوپے اور لادے جا رہے ہیں۔ اور پورا عالمِ انسانی آج مادیت کے ان ,, دلاویز نغموں اور کھلونوں " کے سہارے کشاں کشاں ,, موت کی وادی " کی طرف بڑھ رہا ہے۔

ایک طرف تہذیب جدید کے وہ علمبردار ہیں جو تہذیب کے نام پر ہر ,, معروف " کو مٹا کر ہر قسم کے منکر کو فروغ دینا چاہتے ہیں، دوسری طرف یہودیوں کی خُفیہ اور عالمگیر تحریک ہے جو یہودیت و صیہونیت کے غلبے و تسلط کی خاطر ہر قسم کی اخلاق سوزی اور عریانیت و فحاشی کو مختلف فلسفوں اور اور ازموں کے نام پر ترقی دے رہی ہے[۱۱۵] تیسری طرف اشتراکیت اور کمیونزم ہے جو پورے عالم کو اپنے چنگل میں لے کر اس کو وسیع ترین ,, جبری کیمپوں " میں

---

[۱۱۴] صفحاتِ گذشتہ میں بخوبی واضح کیا جا چکا ہے کہ سائنسی اور تجرباتی علوم اصلاً غیر جانبدار ہیں مگر مادہ پرست ان کی تشریح (اپنے نظریات کے مطابق) کرتے ہیں۔ اور بحث کا رُخ جس طرف چاہتے ہیں موڑ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے موحّد اور خدا پرست سائنسداں بھی ہیں جو ان سے صحیح نتائج اخذ کرتے ہوئے ایک ذات برتر کے وجود کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس طرح ہمارا مقابلہ اصلاً ان علوم سے نہیں بلکہ ان غلط رجحانات سے ہے جو اُن کائناتی حقائق " کو غلط رُخ پر لے جانا چاہتے ہیں۔

[۱۱۵] چنانچہ مختلف مادی فلسفوں کو فروغ دینے اور دنیا میں عالمگیر گمراہی پھیلانے میں یہودیوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مثال کے طور پر ڈاروِن کے نظریۂ ارتقا کو اپنانے اور پھیلانے میں یہودیوں کا بہت بڑا حصہ ہے جنہوں نے اس کو اپنے اغراض و (باقی اگلے صفحہ پر)

تبدیل کر دینے کے درپے ہے۔ کمیونزم کے زیر اثر ممالک کو چھوڑ کر بقیہ تمام ممالک کے فکری حالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ ہر جگہ ایک عجیب قسم کی "بے فکری" یا بے مقصدیت کا دور دورہ پایا جاتا ہے۔ یہ موجودہ الحاد ولادینیت کا عالمگیر "تحفہ" ہے، جو اس نے نوع انسانی کو دیا ہے کہ اس نے اس کا مقصدِ زندگی چھین کر اس کو نِرا حیوان بنا دیا۔

تہذیب جدید کے علمبرداروں نے کلیسا (church) اور عیسائیت کی ضد میں مذہب سے بغاوت کر کے روح اور اس کے مظاہر کو سمجھنے میں سخت ٹھوکر کھائی اور مادہ اور اس کے مظاہر ہی کو سب کچھ قرار دے کر انسان کو اخلاقی قیود سے بالکل آزاد کر دیا۔ جس کے نتیجے میں عیاشیوں اور خرمستیوں کے نئے نئے طریقے سوچے گئے۔ اور عشرت کدوں کو نئے سرے سے اس طرح آراستہ

(بقیہ پچھلے صفحے کا) مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنایا (ملاحظہ ہو، صراع مع الملاحدۃ ص ۲۲۱، از عبدالرحمٰن حسن حبنکہ المیدانی، مطبوعہ دمشق، ۱۹۷۴ء)

اسی طرح نظریۂ اشتراکیت کا بانی کارل مارکس، فلسفۂ جنسیت کے نام سے حیوانی شہوت کو فروغ دینے والا فرائڈ اور اجتماعیات کا مادہ پرستانہ فلسفہ پیش کرنے والا ڈرکائیم یہ تینوں یہودی تھے۔ جنہوں نے مختلف میدانوں میں کام کر کے مذہب و اخلاق کے نقوش کُھرچ کر پھینکنے کی راہ میں بنیادی رول ادا کیا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب "انسانی زندگی میں جمود و ارتقاء"، ترجمہ از ساجد الرحمان، مطبوعہ لاہور۔ نیز ملاحظہ ہو۔ "الشیوعیۃ ولیدۃ الصہیونیۃ"، از احمد عبدالغفور عطار، مطبوعہ ضیداء بیروت)۔

اسی طرح یہودیت وصیہونیت کے اصل عزائم اور ان کی عالمگیر خفیہ تحریک سے واقفیت کے لئے دیکھئے:

۱- مؤامرۃ الصہیونیۃ علی العالم، از احمد عبدالغفور عطار، مطبوعہ مکہ مکرمہ

۲- بروتوکولات صہیون، ترجمہ از عبدالغفور عطار، مطبوعہ مکہ مکرمہ

۳- الیہود والجریمۃ، عبدالمنصف محمود، المجلس الاعلیٰ للشؤون الاسلامیۃ قاہرہ

۴- حقیقۃ الماسونیۃ، محمد علی زعبی، دار الحربیۃ۔ بیروت

کیا گیا کہ حیوانیت کے سابقہ تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔

یہ فلسفے، یہ "ازم" اور یہ مختلف قسم کی تحریکیں آج عالم اسلام سمیت پورے اقوام عالم کے ذہن و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔ اور ہمیں انہی تمام ملحدانہ اور مادہ پرستانہ افکار و نظریات سے سابقہ پڑا ہے۔ ہمارے نونہالوں کو بچانے اور نئی نسل کو اس "نارِ فرنگ" سے باہر نکالنے کے لئے محض شور و غوغا کرنا یا اسلام اور اخلاق کی دہائی دینا کافی نہیں ہے۔ کیونکہ آج قدریں بدل گئی ہیں۔ اور ہر چیز کا معیار تبدیل ہو گیا ہے۔ موجودہ دَور خالص عقلی اور استدلالی دَور ہے اور آج کے ذہن و دماغ کو وہی چیز مطمئن کر سکتی ہے جو موجودہ دَور کے عقلی معیار اور مزاج کے مطابق ہو۔ زمانے کے مزاج کو نہ پہچانتے ہوئے محض پرانے ہتھیاروں سے مقابلہ آرائی کی کوشش کرنا ایک عبث اور بے سُود فعل ہو گا۔ بلکہ بعض حالات میں نقصان دہ بھی۔

بہرحال آج ہم کو جن فتنوں، ازموں اور مادی تحریکوں کا سامنا ہے ان میں سے چند خاص خاص حسب ذیل ہیں:-

۱ــ مادیت : materialism، یعنی اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ صرف مادہ ہی مادہ ہے۔ کسی دوسری قوت یا طاقت کا قطعاً کوئی وجود نہیں ہے اور یہ خود اپنی علت آپ ہے۔

۲۔ فطرت پرستی : naturalism، یہ عقیدہ کہ تمام حقائق "قوانین فطرت" کے ماتحت وجود میں آئے ہیں۔ یہ بھی مادیت ہی کا دوسرا نام ہے۔

۳۔ تشکیک : scepticism، یعنی کسی بھی عقیدے کے متعلق شک کرنا اور شکوک و شبہات پیش کرنا۔

۴ــ لاادریت : agnosticism، یہ اعتقاد کہ خدا یا دوسری غیر مادی چیزوں کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے (یہ نہ تو مذہب کا مؤید ہے اور نہ اس کا مخالف۔ اور یہ آج کل کے اکثر سائنس دانوں کا مقبول ترین نظریہ ہے)۔

۵۔ عقل پرستی : intellectualism ، یہ نظریہ کہ علم بیشتر عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

۶۔ عقلیت : rationalism ، یہ نظریہ کہ علم صحیح کی بنا عقل پر ہونی چاہیئے۔

۷۔ خود رائیت : egoism ، یعنی فلسفۂ خود غرضی یا انانیت۔

۸۔ مذہب انسانیت : humanism ، فلسفہ انسانیت جس کی رُو سے انسان کی ذات کائنات کا مرکز ہے۔ اس لئے، بجائے عالمِ آخرت یا عالم طبیعی کے محض انسانی فلاح و بہبود کی کوشش کرنی چاہیئے۔

۹۔ آزاد روی : liberalism ، یعنی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی ہر حیثیت سے بے قیدی اور روشن خیالی۔

۱۰۔ افادیت : utiliterianism ، یہ اُصول کہ جو کام اپنے لئے مفید ہو وہی اچھا ہے۔

۱۱۔ لذتیت : spicurenism ، یہ اصول کہ جس چیز سے لذت حاصل نہ ہو اس کا وجود بے کار ہے۔

۱۲۔ ڈاروینیت : darwinism ، یعنی انسان اور دیگر تمام انواعِ حیات کا ظہور ایک سادہ قسم کے جاندار (امیبا) سے بتدریج "انتخاب طبیعی" اور "بقائے اصلح" وغیرہ قوانین کے ذریعہ ہوا ہے، نہ کہ کسی خلّاق ہستی کے ذریعہ۔[116]

---

[116] "قاموسِ معلومات" کے ایک مقالہ نگار ای ڈبلو، ایف ٹاملن (E. W. F Tomlin) نے نظریۂ ارتقاء کی تردید میں مفصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "معالجۂ دماغی کے ماہر کارل اسٹیرن کے بیان کے مطابق نوع انسانی کے لئے جن تین سب سے بڑی دھمکیوں یا تہدیدات کا سامنا ہے ان میں سے ایک نظریۂ ارتقا بھی ہے اور بقیہ دو ہیں مارکسزم اور فرائڈ ازم"۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اگنورنس، ص ۲۲۸، آکسفورڈ، ۱۹۷۸ء)
اس موقع پر مذکورہ نمبر ۱۲ سے ۱۶ تک کے نظریات سے تفصیلی (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیئے)

۱۳ - میگڈوگل کا نظریہ جبلت ، یہ نظریہ کہ انسان کی ساری فطرت اس کی حیوانی جبلتوں پر مشتمل ہے اور اس کی حیوانی جبلتیں ہی اس کے تمام افعال کی قوت محرکہ ہیں۔ (اس نظریہ کا تعلق نفسیات سے ہے) -

۱۴- فرائڈ کا نظریہ جنسیت ، یہ نظریہ کہ انسان کو عمل پر ابھارنے والا محرک دراصل اس کا جذبہ شہوانی ہوتا ہے گویا کہ وہ ایک مغلوب الشہوت حیوان کی طرح ہے (اس کا تعلق بھی نفسیات یعنی سائیکالوجی سے ہے[۱۱۷]

۱۵ - ایڈلر کا نظریہ حبّ تفوّق۔ اس کا تعلق بھی نفسیات سے ہے۔ یعنی یہ نظریہ کہ انسان کے لئے کام کا اصل محرک جذبہ شہوانی نہیں بلکہ جذبۂ تفوّق ہے۔ یعنی وہ دوسروں سے فائق و برتر ہونا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ ایک خود پرست

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) واقفیت کے لئے دیکھئے ڈاکٹر رفیع الدین کی کتاب "قرآن اور علم جدید"۔ دیگر فلسفیانہ نظریات سے واقفیت کے لئے فلسفہ جدیدہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ ڈاکٹر رفیع الدین نے نظریہ ارتقا کو الحاد و دہریت کے تمام فلسفوں کی اصل جڑ بنیاد قرار دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے: "سچ بات تو یہ ہے کہ مغرب کے فلسفیوں میں لامذہبیت اور دہریت کا جس قدر مواد اس وقت موجود ہے وہ ڈارون ہی کے نظریہ کی پیداوار ہے۔ یہ کلیہ بالخصوص کارل مارکس۔ میکڈوگل۔ فرائڈ۔ ایڈلر اور میکیاولی کے نظریات پر حاوی ہے۔" (قرآن اور علم جدید ص ۱۰۰، لاہور ۱۹۵۹ء)

[۱۱۷] یہ نظریہ کتنا مقبول اور معاشرے میں کتنی گہرائیوں کے ساتھ پیوست ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین تحریر کرتے ہیں، "فرائڈ کا نظریہ مغرب کی یونیورسٹیوں میں نصاب تعلیم کا جزو ہے۔ نفسیات جدید کے نام سے اس پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور دن رات لکھی جا رہی ہیں۔ اس نظریہ کی اشاعت نے مغرب میں جنسی تعلقات کی ان پابندیوں کو، جو مذہب یا سماج نے عائد کر رکھی تھیں بہت ڈھیلا کر دیا ہے۔ وہاں اب یہ خیال عام ہے کہ یہ پابندیاں مضر صحت ہیں، دماغی امراض پیدا کرتی ہیں اور ان سے چمٹے رہنا ایک خطرناک قسم کی قدامت پسندی ہے۔" (حوالہ مذکور ص ۲۰)

حیوان ہے۔

۱۶۔ اشتراکیت : communism، یعنی انفرادی ملکیت کے برعکس ہر قسم کے مال و دولت اور جائیداد وغیرہ کے بارے میں مشترکہ ملکیت کا نظریہ۔

۱۷۔ انفرادیت: individualism، عمرانیات یا سماجیات (سوشیالوجی) کا وہ نظریہ جس کی رُو سے افراد کو عمل کی آزادی ہونی چاہیئے۔ (یہ غیر اشتراکی ملکوں کا نعرہ ہے)۔

۱۸۔ فلسفۂ قومیت : nationalism، یعنی لسانی، تہذیبی اور جغرافیائی بنیادوں پر ہر قوم کو خود حکومتی کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔

۱۹۔ جمہوریت : democracy، یہ حق کہ سبھی لوگ مل کر یہ فیصلہ کریں کہ عوامی دلچسپی کے معاملات کیا ہیں اور ان کے سلسلے میں کیا کیا جانا چاہیئے؟

۲۰۔ لادینیت : secularism، یعنی حکومت و ریاست کے تمام معاملات میں مذہبی بنیادوں کو نظر انداز کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ یا آزادانہ روّیہ اختیار کرنا۔

اس قسم کے بہت سے فلسفے اور تحریکیں ہیں اور ان تمام کے تذکرے و تبصرے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ بہر حال یہی وہ تمام مادی فلسفے و نظریے ہیں جو موجودہ عالمگیر الحاد و لادینیت کا خمیر یا اس کے اجزاء و عناصر ہیں۔ ان ازموں اور تحریکوں کو بعض علمی اور سائنسی نظریات کا ـــ غلط انداز میں سہارا لے کر فلسفیانہ رنگ دے دیا گیا ہے۔ گویا کہ یہ فلسفے حقیقت واقعہ کے عین مطابق ہیں۔ حالانکہ علم صحیح اور منطق صحیح کی رُو سے یہ تمام فلسفے اور تحریکیں من گھڑت اور بے سر و پا نظر آتی ہیں۔

مگر آج جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ذہن و دماغ پر یہ تمام فلسفے اور ازم اپنی ظاہری چمک دمک، خوش نمائی اور بظاہر نظر آنے والی سطحی اور نام نہاد

"عقلیت و منطقیت"، کی بنا پر پوری طرح حملہ آور ہو چکے ہیں۔ اور وہ ان افکار و نظریات سے گویا کہ مسحور ہے۔ گویا کہ ایک عالمگیر ذہنی ارتداد پیدا ہو گیا ہے۔ اور خود عالمِ اسلام بھی اس ذہنی و فکری ارتداد کی لہروں سے محفوظ نہیں ہے۔ اس لئے ہم سب کو پہلے خود اپنے گھر کی فکر کرنی چاہیئے۔

موجودہ معاشرے میں جتنی بھی تہذیبی بُرائیاں اور اخلاقی مفاسد نظر آرہے ہیں وہ سب انہی فلسفوں کے برگ و بار اور ثمرات و حاصلات ہیں۔ لہذا موجودہ اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو ختم کرنے کے لئے ان فلسفوں پر تیشہ چلانا اور انہیں بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنا ناگزیر ہو گا۔ ورنہ جب تک یہ جڑیں اور بنیادیں باقی رہیں گی اُن سے برگ و بار بھی نمودار ہوتے رہیں گے۔

یہ خرابیاں اس لئے پیدا ہوئیں کہ عقل و نقل کے حدود کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اور یہ نکتہ فراموش کر دیا گیا کہ عقل اگرچہ کتنی ہی تیز اور باریک بین کیوں نہ ہو وہ مجرد طور پر فوق الطبیعی اُمور کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اور انسان کو کوئی ضابطۂ حیات مہیّا نہیں کر سکتی۔ مشہور فلسفی بیکن کا کہنا ہے کہ فلسفہ، مذہب اور سائنس کی سرحدیں جدا جدا ہیں ان میں خلط مبحث نہیں کرنا چاہیئے۔[۱۱۸] اور عقل کے حدود متعین کرنے میں زمانۂ حال کے نامور فلسفی کانٹ (۱۷۲۴ – ۱۸۰۴ء) نے نہایت قابل قدر کام کیا ہے اور ایک ایسا تنقیدی فلسفہ مرتب کر ڈالا ہے جو اس سلسلے میں نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب کا نام ہی "تنقید عقل محض"[۱۱۹]، ہے جو شہرہ آفاق حیثیت رکھتی ہے۔

---

۱۱۸ ملاحظہ ہو "تاریخ فلسفہ جدید" از ڈاکٹر ہیرلڈ ہوفڈنگ، ۱/۲۳۴ مطبوعہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد، ۱۹۳۱ء

۱۱۹ Critique of Pure Reason، اس کتاب کا اُردو ترجمہ انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) سے شائع ہو چکا ہے۔

غرض ان فلسفوں کی ترویج و اشاعت اس لئے ممکن ہوسکی کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے دور میں عیسائی مذہب علم و تمدن کا ساتھ دینے اور انہیں فطری طریقوں اور تقاضوں کے مطابق پروان چڑھانے میں قطعاً ناکام رہا۔ بلکہ اس کے منفی اور مخالفانہ روّیہ کے باعث مذہب سے بغاوت اور کنارہ کشی وجود میں آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ دانش نے مذہب کو ایک ڈھکوسلہ قرار دے کر اس کا جُوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا اور معاشرتی تمدنی، اور اجتماعی غرض زندگی کے تمام مسائل میں آزادانہ طور پر غور و خوض کرنے لگے اور ان تمام مسائل و مشکلات کا حل مادی نقطہ نظر سے نکالا جانے لگا۔ یہ ہے ان فلسفوں اور ازموں کے نشو و نما اور عروج پانے کا صحیح پس منظر۔

تہذیبِ جدید کی ناکامی اور اُس کا علاج

لیکن سوال یہ ہے کہ ان فلسفوں اور اِزموں نے دنیائے انسانیت کو کیا دیا اور کون سے تمدنی و اجتماعی مسائل حل کر دیئے؟ ہاں اگر کچھ دیا ہے تو مایوسی، بے چینی، خود غرضی، عیاشی، رقابت اور بے مقصدیت دی ہے اور قسم ہا قسم کے معاشرتی، قومی، لسانی، صوبائی اور بین الاقوامی جھگڑے فسادات پیدا کیے ہیں جن کے بوجھ سے انسانیت کراہ رہی ہے۔

کوئی بھی فلسفہ اور نظام کائنات کے معمّوں کو کھول نہیں سکا اور خدا اور بندے کے درمیان حقیقی تعلقات کی گُتھیوں کو سُلجھا نہیں سکا۔ جس طرح کہ خود سائنسی علوم انسان اور کائنات کے درمیان کوئی صحیح رشتہ دریافت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

یہ مختلف فلسفے کیا ہیں؟ ایک دوسرے کی تردید کرنے والے، تعارض و تضاد کا مجموعہ اور متصادم نظریات کا معجون مرکب ہیں۔ زندگی کے اصل

مسائل کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اور انسانیت کے دکھوں کا مداوا تلاش نہیں کیا۔ بلکہ سب کے سب لاطائل مسائل و مفروضات، لہو و لعب اور کھیل تماشوں میں اُلجھے ہوئے کام و دہن اور بطن و فرج ہی کو منتہائے مقصود و تصور کئے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر الکسس کیرل تہذیب جدید کی ناکامی اور موجودہ معاشرے سے اس کی عدم مطابقت پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے:

"جدید تمدن اس لئے بہت مشکل ہو گیا ہے کہ وہ ہمارے مزاج کے موافق نہیں ہے۔ اور ہماری حقیقی، فطرت کا لحاظ کئے بغیر اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ یہ تمدن سائنس دانوں کے خیالی منصوبوں اور لوگوں کی دلی خواہشوں موہوم خیالوں، نظریوں اور آرزوؤں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگرچہ یہ تمدن ہماری کوششوں سے بنا ہے تاہم وہ ہماری وضع قطع اور شکل و صورت کے مطابق نہیں ہے[۱۲۰]۔"

تہذیب جدید کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب اس کے مذکورۂ بالا غلط اور متضاد فلسفے ہیں۔ جن کو ہٹائے بغیر معاشرے کا سدھار نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ کام ہو تو کیوں کر؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ جدید علوم وفنون کو مادہ پرستوں اور دہریوں کے قبضے سے نکال نہ لیا جائے۔ بالفاظِ دیگر ان غلط فلسفوں اور گمراہ کن ازموں کا صحیح مقابلہ اور استیصال کرنے اور صحیح نتائج پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے علوم سائنس اور علومِ جدیدہ کو "مسلمان" بنایا جائے اور ان کی تشریح و توجیہہ خدا پرستانہ

---

[۱۲۰] نامعلوم انسان، ترجمہ از پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری ایم۔ اے، ص ۳۳، مطبوعہ، مدراس یونیورسٹی، ۱۳۵۳ء

نقطہ نظر سے اس طرح کی جائے کہ انسان اور کائنات کے تعلق سے تمام طبیعی (نیچرل) اور مابعد الطبیعی (سوپر نیچرل) مسائل حل ہو جائیں[۱۲۱] اور اس سے موجودہ عقلی و استدلالی ذہن مطمئن ہو جائے۔ اس عظیم اور تجدیدی عمل کے ذریعہ مادیت کے تمام قلعے مسمار ہو جائیں گے۔ مگر یہ کام اس وقت تک انجام نہیں پاسکتا جب تک کہ ان "غیر جانب دار علوم" کو غیروں کے تسلط اور چنگل سے چھڑا کر انہیں اپنی تولیت میں نہ لے لیا جائے۔ اور ہم ان علوم کو اس وقت تک اپنی تولیت میں نہیں لے سکتے جب تک کہ ہم ان پر پوری طرح قابض نہ ہو جائیں۔ بالفاظ دیگر جب تک ہم ان علوم کے صحیح معنی میں دانش بن کر پھر سے علمی سیادت اور درجۂ امامت حاصل نہ کر لیں ہم علمی اعتبار سے کوئی ٹھوس اور پائیدار مرتبہ اقوام عالم کے درمیان حاصل نہیں کر سکتے اور بغیر اس عمل کے کوئی ہمہ گیر فکری انقلاب لانا ممکن نہیں ہے۔ یہی خلافتِ ارض کا بنیادی فلسفہ اور اس کا پیغام ہے کہ جب تک اس کے روحانی اور مادی دونوں حصّوں کو اکٹھا نہیں کیا جاتا اس راہ میں ٹھوس اور مثبت کامیابی ممکن نہیں ہو سکتی۔

درحقیقت یہ ملحدانہ فلسفے اور نظامات اس لئے پیدا ہوئے کہ معاشرے پر مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ان کو مظاہر فطرت اور ان کے نظاموں کی من مانی تاویلات کرنے کا موقع مل گیا۔ اور بالآخر تہذیب کے نام پر "بدتہذیبی" کے وہ وہ گل کھلے جن کے خوفناک نتائج سے آج ہم سب دوچار ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے غلط رجحانات کو روکنے اور فکر انسانی کو صحیح رُخ پر ڈالنے کے لئے ایک بہت زیادہ موثر اور طاقتور عامل کی ضرورت ہے۔ اور یہ طاقتور عامل سوائے دین و مذہب کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور آج

---

[۱۲۱] یعنی ان کی تشفی بخش توجیہ ہو جائے جو عقل و ذہن کو مطمئن کر سکے۔

روئے زمین پر سوائے اسلام کے کسی بھی مذہب میں اتنی استعداد اور دم خم ہی نہیں ہے کہ دین اور فطرت کے صحیح حدود قائم کر کے معاشرے کو مختلف میدانوں میں ترقی کی راہ پر ڈالے۔ اور اس کے ذہن و دماغ کو قابو میں رکھے۔ یہ صرف قرآن عظیم ہی کی ایک زبردست خصوصیت ہے کہ وہ آج بھی یہ رہبرانہ کردار پوری کامیابی کے ساتھ اور احسن طریقے پر ادا کر کے نہ صرف پوری ملّتِ اسلامیہ بلکہ سارے عالم انسانی کو قابو میں رکھنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔

قرآن ہر دور کے لئے فیصلہ کن کلام

امام ابن تیمیہؒ اپنی بے نظیر کتاب "موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول" (جو عقل و نقل کے حدود و شرائط اور ان دونوں کے درمیان معارضے و محاکمے کے سلسلے میں ایک عجیب و غریب کتاب ہے) میں اس مسئلے میں کہ "غیر منقول چیزوں میں خوض جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو اس کے وجوب کے کیا دلائل ہیں؟" قرآن و حدیث کے بہت سے نصوص پیش کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ ان تمام نصوص کی تفصیلات کتاب و سنّت میں تلاش و تفحص اور بحث و استقرار کے بعد ان مسائل کے جاننے کے سلسلے میں واضح ہو جائیں گے۔ لہٰذا جو شخص بھی انہیں کتاب و سنّت میں تلاش کرے گا وہ انہی قطعی نصوص کی شکل میں پا لے گا جو کہ غایت درجہ ہدایت، وضاحت اور شفا ہوں گی۔ اور یہ بات دو چیزوں سے متعلق ہے: (۱) کتاب و سنت کے معانی کی معرفت (۲) ان الفاظ کے معانی کی معرفت جن کو اختلاف پیدا کرنے والے لوگ بولتے اور استعمال کرتے ہیں[۱۲۲] اس طرح جب ان

---

[۱۲۲] اس سے مراد گمراہ فرقوں کی اصطلاحات ہیں۔

دونوں اقوال (معانی قرآن اور معانی اہل خوض) کے درمیان مقابلہ و موازنہ کیا جائے گا تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائیگی کہ کتاب الٰہی لوگوں کے مختلف اقوال (یا اختلافات باہمی) کے درمیان ایک حاکم یا جج کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۖ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ پہلے تمام لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (جب ان میں اختلاف باہمی پیدا ہو گیا) تو اللہ نے پیغمبروں کو بشارت سنانے اور متنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ وہ (کتاب) لوگوں کے اختلافات کے درمیان فیصلہ کرسکے (بقرہ: ۲۱۳)

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللهِ ۭ اور جس چیز میں بھی تم اختلاف کرو اس کا فیصلہ اللہ ہی کے سپرد ہے۔ (شوریٰ: ۱۰)

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ۧ اگر تم کسی معاملے میں اختلاف کر بیٹھو تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ اگر تم اللہ اور آخرت پر یقین رکھتے ہو۔ یہ بہتر بات اور اچھا انجام ہے۔ (نساء: ۵۹)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝[۱۲۳] کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعوے کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر نازل کی

---

[۱۲۳] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول، برحاشیہ منہاج السنۃ، ۱/۴۹-۵۰، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ، الریاض۔

گئی ہے اور اس کتاب پر بھی جو تم سے پہلے نازل کی گئی ہے (مگر اس دعوے کے باوجود) وہ چاہتے ہیں کہ اپنے مقدمے کو طاغوت (غیر اللہ) کے پاس لے جائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس (طاغوت) کا انکار کریں (لیکن) شیطان ان کو بھٹکا کر بہت دُور لے جانا چاہتا ہے۔ (النساء ۶۰)

حاصل یہ کہ قرآن حکیم مطلقاً حجّت ہے اور جب کبھی کتاب و سنّت کے نصوص اور مدعیانِ علم و حکمت کے اقوال کے درمیان مقابلہ کیا جائے گا تو اس سے نہ صرف کتاب حکمت کی برتری ظاہر ہو جائے گی بلکہ "اختلاف الناس" کے درمیان محاکمہ بھی ہو جائے گا۔

یہ آیتیں صرف فقہی و شرعی اُمور ہی سے متعلق نہیں ہیں بلکہ ان کا دائرہ تمام نظریاتی اُمور تک وسیع ہے جیسا کہ خصوصیت کے ساتھ پہلی آیت اس مسئلے کی عمومیت پر روشنی ڈال رہی ہے کہ انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ نوعِ انسانی کے باہمی نظریاتی اختلافات دُور ہوں۔ اسی بنا پر امام موصوف نے اس آیت کریمہ کو سب سے پہلے ذکر فرمایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم ایک ایسا حیرت انگیز سرچشمہ علم و عرفان ہے کہ اس میں ہر دور کی رہنمائی کے تعلق سے کافی وشافی جوابات اور ہر قسم کے فکری و اجتماعی مسائل اور نوع انسانی کے باہمی اختلافات کا حل موجود ہے اس کی آیات سے علوم و معارف کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ متعین فکری پیمانوں سے ہٹ کر وسیع بنیادوں پر اس کی ابدی آیات میں غور کیا جائے۔ حکمت قرآن کا اصل اعجاز اس کے حیرت انگیز سیاق وسباق اور نظم کلام میں پوشیدہ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس کے نظم کلام میں غور و فکر کے باعث مشکل سے مشکل تمام عصری مسائل حل ہو جاتے ہیں اور وہ ایک زندہ اور ابدی کلام نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر دور میں اس کے عجائبُ اسرار ظاہر ہوتے رہیں گے اور اسی اعتبار سے اس کی نئی نئی تفسیریں بھی وجود

یں آتی رہیں گی۔ مگر کوئی بھی تفسیر کبھی مکمل نہ ہو سکے گی۔ بلکہ ہر دور میں ایک نئی تفسیر کی ضرورت باقی رہے گی۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ کہدو کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے۔ میرے رب کی باتوں کے (لکھے جانے) کے لئے تب بھی میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم ہو جائے گا اگرچہ ہم اس کی مدد کے لئے اسی جیسا ایک اور سمندر لے آئیں۔ (کہف ۱۰۹)

صحف سماوی میں حجم کے اعتبار سے اس چھوٹی اور مختصر ترین کتاب میں وہ تمام علوم و معارف ودلیعت کر دیئے گئے ہیں جن سے نوع انسانی کا قیامت تک سابقہ پڑ سکتا ہے۔ بلکہ ان کے مسائل و مشکلات کا جواب بھی مہیا ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے دنیا کی پوری تاریخ میں یہ واحد اور بے مثال کتاب ہے جو چودہ سو سال سے ایک حرف یا ایک زیر زبر کی تبدیلی کے بغیر نہ صرف پوری طرح محفوظ ہے بلکہ وہ تمام اقوام عالم اور ان کے تمام علوم و فنون کی بھی ایک مختصر ترین انسائیکلوپیڈیا ہے۔ غیر مسلم تو غیر مسلم بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے مسلمان بھی اس نظریہ کی صحت میں شک کرتے ہیں، جو ان کی اپنی کوتاہ بینی اور کوتاہ فہمی کی دلیل ہے۔ اصل میں یہ مسئلہ علم الٰہی سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن حکیم چونکہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ کلام الٰہی ہے جو علم الٰہی کا پرتو ہے۔ اور علم الٰہی ماضی، حال اور مستقبل تمام زمانوں کو محیط ہے۔ اور اس کے علم ازلی سے نہ صرف مظاہر عالم کی ساخت و پرداخت سے متعلق تفصیلات بلکہ خود نوع انسانی کے انفرادی و اجتماعی احوال و کوائف سے متعلق کوئی بھی جزئیہ اور کلیہ پوشیدہ نہیں ہے۔ ورنہ ہزاروں سال قبل ان احوال و کوائف کی اس درجہ باریک بینی کے ساتھ پیش خبری نہ کی جاتی۔ اور موجودہ واقعات و حوادث صحیفۂ خداوندی کی تصدیق و تائید

نہ کرتے۔

قرآن حکیم جیسے ابدی صحیفے کو ایک جامد اور غیر متحرک کلام تصور کرنا نہ صرف کوتاہ فہمی اور بے بصیرتی ہے بلکہ یہ نہایت درجہ بے اصل اور واہیات بات ہے۔ گویا کہ وہ بھی دیگر از کار رفتہ صحف سماوی کی طرح عارضی اور موقت صحیفہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر اعتبار سے ایک مکمل اور زندہ صحیفہ ہے جو زندہ اور پیش پا افتادہ مسائل سے بحث کرتا ہے۔ جو اس کے من جانب اللہ ہونے کی قطعی اور یقینی دلیل ہے۔ اس اعتبار سے حسب ذیل آیاتِ کریمہ ہر دور میں اپنی عمومیت و قطعیت پر دلالت کرتی رہیں گی۔

اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت ایک دین کے پسند کیا۔ (مائدہ: ۳)

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ : بلاشبہ قرآن ایسے طریقے کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔ (بنی اسرائیل: ۹)

هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ج یہ پوری نوع انسانی کے لئے رہنما ہے اور اس میں ہدایت اور (حق و باطل میں) تفریق کرنے والے دلائل موجود ہیں۔ (بقرہ: ۱۸۵)

هٰذَا كِتٰبُنَا یَنْطِقُ عَلَیْكُمْ بِالْحَقِّ ط یہ ہماری کتاب ہے جو تمہارے روبرو ٹھیک ٹھیک بول رہی ہے (یعنی ہر دور کے احوال و کوائف پر پوری طرح منطبق ہو رہی ہے۔ (جاثیہ: ۲۹)

لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ ط وَ اللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ہ یقیناً ہم نے ایسی نشانیاں اُتاری ہیں جو پوری طرح (متعلقہ مسائل کی) وضاحت کرنے والی ہیں اور اللہ جس کو چاہتا ہے (اس وضاحت کے

مطابق) صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے۔ (نور : ۴۶)

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ج وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ؁
یقیناً ہم نے تمہارے پاس روشن دلائل بھیج دئے ہیں جن کا انکار محض بدکردار لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ (البقرہ : ۹۹)

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ط وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ لا مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ؁ اور اس طرح ہم نے اس قرآن کو (ہر دور کے لئے) ایک واضح فیصلہ بنا کر اُتارا ہے (لہٰذا) علم (الٰہی) کے آ چکنے کے بعد اگر تم نے (اس علم اور فیصلے کو ترک کر کے) لوگوں کی خواہشات (باطل افکار و آراء) کی پیروی کی تو خدا کی جانب سے تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہ ہو گا۔ (رعد : ۳۷)

باطل پرستوں کی بنیادی خصوصیات

اس آیت کریمہ میں لفظ "اھواء" خاص طور پر قابل غور ہے جو اصل میں غیر خدائی نظاموں اور باطل فلسفیانہ افکار و آراء کی ایک مشترکہ خصوصیت کا انکشاف کرتے ہوئے ان کے اصل عزائم کو واضح کر رہا ہے۔ اصل میں ان باطل فلسفوں اور نظاموں کے پیچھے سوائے خود غرضیوں، اپنے ذاتی اغراض و مقاصد اور اپنی خواہشات نفسانی کی تکمیل کے سوا کوئی دوسرا اعلیٰ و ارفع مقصد کارفرما نہیں ہوتا، چاہے وہ کمیونزم اور سوشلزم ہو یا ڈاروِنزم اور فرائڈازم وغیرہ وغیرہ۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ مگر جو کوئی ان افکار و آراء کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے تجزیہ کرے گا وہ بہر حال اس نتیجے تک پہنچے گا۔ کلام الٰہی کی بلاغت اور اس کا کمال ملاحظہ ہو کہ محض ایک لفظ کے ذریعہ تمام غیر خدائی فلسفوں اور کُل افکار و آراء کی بنیادی روح کھینچ کر رکھ دی! یہ ہوتی ہیں کلام الٰہی کی اعجاز آفرینیاں!

پھر اس آیت کریمہ میں رسول کے واسطے سے پوری امت محمدیہ سے خطاب ہے کہ اگر تم نے خدائی علم اور فیصلے کو ترک کر کے کسی بھی وقت اور کسی بھی زمانے میں باطل افکار و آرا اور باطل نظاموں سے متاثر و مرعوب اور ان کے علمبردار بن گئے تو پھر اللہ کے نزدیک تم سے بڑھ کر بے سہارا اور زیاں کار کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس تمام واضح دلائل و براہین آ چکے ہیں۔

جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر خصوصیت کے ساتھ یہود کے بارے میں (تحویل قبلہ کے موقع پر) ارشاد فرمایا گیا:۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اور اگر تم نے ان کے خواہشات کی پیروی کی، تمہارے پاس علم آ چکنے کے بعد، تو اس وقت تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا۔ (بقرہ: ۱۴۵)

یہ باطل پرست لوگ یا موجودہ دور کی اصطلاح کے مطابق مختلف خودساختہ تہذیبوں اور نظاموں کے علمبردار اپنے خودغرضانہ اغراض و مقاصد کو فروغ دینے اور اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اتنے اندھے ہو جاتے ہیں کہ وہ تمام خدائی نشانات و دلائل سے اعراض کرتے ہوئے آنکھیں موند لیتے ہیں۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: اور تم ایسے لوگوں کے باطل خیالات کی پیروی مت کرنا جو ہماری (شرعی و تکوینی ہر قسم کی) نشانیوں کو جھٹلا چکے ہیں۔ (انعام: ۱۰۵)

قرآن حکیم کا کمال ملاحظہ ہو کہ وہ ہر دور کے منکرین کی نفسیات اور ان کے ذہنی احوال و کوائف کے مشترکہ بنیادی نکات کی نشان دہی (بہت واضح الفاظ میں) کر دیتا ہے جو ہر دور میں یکساں طور پر صادق آ سکتے ہیں۔ گویا کہ منکرین و معاندین اور خدا بیزار لوگوں کی ذہنیت ہمیشہ ایک اور یکساں رہتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیات جس طرح دورِ رسالت میں صادق

آسکتی تھیں اسی طرح آج بھی صادق آتی ہیں اور قیامت تک ہر دور میں صادق آتی رہیں گی۔

اللہ کی سنت اور قرآن کا معجزہ

بہرحال اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہ سنت رہی ہے کہ کسی بھی دور میں جب باطل پرستوں کا غلبہ ہو جاتا ہے تو پھر ان کے استیصال کے لئے وہ حق کا اثبات اپنے ابدی کلمات کے ذریعہ فرما دیتا ہے، ورنہ پھر دنیا فتنہ و فساد سے بھر جائے اور تمام انسان خطرے اور ہلاکت میں پڑ جائیں۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ؕ (اور اگر دین) حق ان لوگوں کے (نفسانی) خیالات و خواہشات کی پیروی کرنے لگ جائے (یعنی اثبات حق سے خاموش رہ جائے) تو پھر زمین و آسمانوں اور ان کی مخلوقات (کا نظام) بگڑ جائے۔ (اسی بنا پر) ہم ان کے پاس ان کی داستان لے آئے ہیں۔ مگر وہ اپنی ہی داستان سے منہ موڑ رہے ہیں۔ (مومنون: ۷۱)

یہاں پر "ذکرھم" کے الفاظ بہت اہم اور معنی خیز ہیں، جو باطل نظاموں کے ابطال کے سلسلے میں ربانی حکمت اور اس کے فلسفے پر بہ خوبی روشنی ڈال رہے ہیں۔ اس سے مراد جیسا کہ پچھلے صفحات میں تفصیل گذر چکی اقوام عالم کے علوم و فنون، ان کے قومی و ملی خصائص اور ان کے ذہنی و نفسیاتی احوال و کوائف کا تذکرہ ہے۔ چونکہ ہر قوم اپنے ہی علوم و فنون اور قومی و ملی خصائص سے آشنا ہوتی ہے۔ اور اس معاملے میں وہ خود کو دیگر تمام اقوام سے برتر سمجھتی ہے۔ گویا کہ اس کو اپنی احساس برتری کا دعویٰ رہتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس لے جا غرور و پندار کو توڑنے کے لئے ہر دور میں

اللہ تعالیٰ کی جانب سے کچھ مخصوص واقعات یا نشانیاں آفاقی و انفسی دلائل کے رُوپ میں ظاہر ہوں جن کی وجہ سے اس کا سارا غرور خاک میں مل جائے، ان کی غلط بیانیوں اور کذب و افترا کا پردہ چاک ہو جائے۔ اور دین الٰہی کی ابدیت کی حقیقت پوری طرح کھُل کر سامنے آجائے۔ جیسا کہ ہمیں ابتدائے آفرینش سے لے کر خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام کی سیرتوں اور ان کے واقعات، نیز ان کے اور ان کی قوموں کے درمیان معرکہ آرائیوں کے سلسلے میں نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی فیصلے اور سنّت کے مطابق کس طرح فرعون کے مقابلے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو ایسا معجزہ دیا جو فرعونی قوم کے فن (سحر) سے ملتا جلتا تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو کس طرح ایسے معجزات عطا کئے گئے جو ان کے دور کے فنون سے مطابقت رکھنے والے تھے۔ اور اسی طرح عربوں کے مقابلے کے لئے کس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا معجزہ دیا گیا جس نے حقیقتاً ان سب لوگوں کو گونگا بنا دیا جو اپنے مقابلے میں ساری دنیا کے گونگی (غیر فصیح) ہونے کے مدعی تھے۔

اور موجودہ دَور میں یہ سنّت الٰہی اس طرح پوری ہو گی کہ عصر جدید کی عقلیت و ذہنیت کا غرور ٹوٹ جائے گا اور اس کے علوم و فنون کی برتری کا طِلسم چھٹ جائے گا، جب کہ جدید انسان خدائی وحی و الہام اور اس کے کلام برتر کی عظمت و جلال کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی شکست و ریخت تسلیم کرلے گا۔ اور اس کو بطور ایک ضابطۂ حیات قبول کرتے ہوئے اس کے آگے گھٹنے ٹیک دے گا۔ کیونکہ اس کی ابدی و آفاقی سچائیوں اور اس کی معجزانہ ہدایت و رہنمائی کا مسلسل انکار ناممکن اور محال ہے اور وہ یوم مسعود جلد یا بہ دیر انشاءاللہ ضرور آکر رہے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کا ایک روپ نہیں ہے بلکہ اس کے کئی روپ اور کئی چہرے ہیں اور وہ ہر دَور کے تقاضے کے مطابق ایک نیا چہرہ لے کر

عالم انسانی کے سامنے آتا ہے اور ساری دُنیا کو حیران و ششدر کر دیتا ہے۔ وہ جس طرح اپنے فصیح و بلیغ کلام ہونے کی حیثیت سے ایک معجزہ ہے (جس نے عربوں کی زبان دانی کے غرور کو پاش پاش کر دیا تھا) اسی طرح وہ نوعِ انسانی کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات اور بے عیب دستور العمل مہیا کرنے کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے۔ (اور اس قسم کے کسی دوسرے دستورِ حیات کا نظارہ چشمِ فلک نے اب تک نہیں کیا ہے) ۔ اسی طرح وہ اپنے دلیل و استدلال کی قوت اور حجّت و برہان ہونے کی حیثیت سے بھی ایک مکمل مجموعہ ہے جس میں قیامت تک پیش آنے والے ہر قسم کے نفسیاتی احوال کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، خواہ زمانہ کتنا ہی ترقی یافتہ (advanced) کیوں نہ ہو جائے ۔ اسی طرح اس میں وہ تمام علوم و فنون اور ان کے بنیادی نکات بھی ودیعت کر دیئے گئے ہیں جو اثباتِ حق اور ابطالِ باطل کی راہ میں اقوامِ عالم کے خلاف فیصلہ کن مقام رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر کسی بھی دور میں عصری علوم و فنون کے مطالعے اور جائزے کے بعد جب قرآن عظیم کا مطالعہ کیا جائے گا تو ایسا معلوم ہو گا کہ گویا اس میں اپنے ہی دور کی داستان موجود ہے ۔ اور ہم اپنے ہی احوال و کوائف کا مطالعہ کر رہے ہیں ۔ اس اعتبار سے قرآن عظیم ایک آئینہ صافی ہے جس میں ہر دور والوں کو اپنا ہی چہرہ نظر آتا رہے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنے چہرے کے "داغ دھبے" بھی نمایاں ہوتے جائیں گے۔ یہ ہے قرآن کا صحیح اور عظیم الشان معجزہ اور اس کی بے مثال رہنمائی جو اس کے سب سے بڑے وصف "فرقان" ہونے کے عین مطابق ہے۔

اس طرح آپ کسی بھی اعتبار سے اس عظیم الشان اور انوکھی و حیرت انگیز کتاب حکمت میں ۔ جو دنیا کی پوری تاریخ میں اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ غور فرمایئے تو آپ اس کو ہر لحاظ سے جامع اور مکمل پائیں گے، اس طرح کہ پھر اس کی موجودگی میں کسی دوسرے صحیفے یا کتاب سے راہِ ہدایت حاصل

کرنے کی ضرورت قطعاً باقی نہیں رہے گی۔

موجودہ چیلنج کا مقابلہ

بات کچھ طویل ہوگئی۔ بہرحال ایک طرف تو یہ مادی فلسفے اور نظریات ہیں جن سے آج ہم کو نبرد آزمائی کرنی ہے تو دوسری طرف جدید فقہی، تمدنی اور عائلی و معاشرتی مسائل ہیں جن کا اسلامی اور فقہی نقطۂ نظر سے حل تلاش کر کے اسلام کو ایک کامل اور ابدی دین — عملی و واقعاتی نقطۂ نظر سے بھی — ثابت کرنا ہے۔ مثال کے طور پر اب سے چند سال پہلے جب امریکی خلا باز پہلی مرتبہ سرزمین چاند پر پہنچے تو اس وقت خیالات کی دنیا میں ایک انتشار برپا ہو گیا۔ اور طرح طرح کے فکری و اعتقادی سوالات پیدا ہو گئے۔ اسی طرح آج کل "ٹیسٹ ٹیوب بے بی" اور مصنوعی حمل وغیرہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل نے علمی حلقوں کو خاصا حیران کر دیا ہے کہ اس کے نتیجے میں واقع ہونے والے نسلی، نسبی اور وراثتی مشکلات اور پیچیدگیوں کو کیوں کر حل کیا جائے؟ نیز اسی طرح انسانی اعضاء کی پیوندکاری، بیمہ، انشورنس، غیر سودی بنکاری، رویتِ ہلال کے مسائل و مشکلات اور بہت سے جدید عائلی مسائل جو وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے ہیں، ان تمام مسائل میں کوئی متفقہ موقف اختیار کر کے امتِ مسلمہ کو فکری انتشار سے بچانا ضروری ہے۔ مگر ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اسلامی علوم کے علاوہ خود متعلقہ علوم اور ان کے مسائل کی گہرائیوں میں بھی غوطہ زنی کرنی ضروری ہے ورنہ سطحی غور و فکر سے یہ مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

اس طرح آج دینِ اسلام کے علمبرداروں کو مختلف میدانوں میں چومکھی لڑائی لڑنی ہے۔ مگر اس عظیم کام کے آغاز کے لئے ہم کو سب سے پہلے حکمتِ قرآن کو ایک مکمل فلسفیانہ رنگ میں پیش کرنا ضروری ہے جس میں دین کے تمام اجزا و ارکان کی تشریح و توجیہہ موجودہ عقلیت و ذہنیت کے مطابق

موزوں طریقے پر مکمل ہو جائے۔ اور وہ اپنے ابدی ولازوال سچائیوں کے بدولت بنیادی طور پر اس غلط اور بے بنیاد نظریئے کی بیخ کنی کر دے کہ اسلام بھی دیگر مذاہب کی طرح ایک پرانا اور فرسودہ نظریۂ حیات ہے یا وہ آج کے حالات اور جدید معاشرے پر منطبق نہیں ہو سکتا اور یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ نہ صرف ہر حال میں عالم انسانی کی ہر حیثیت سے پوری پوری رہنمائی کر سکتا ہے بلکہ موجودہ باطل فلسفوں کا بھی پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے۔
غرض موجودہ دنیا کی علمی و فکری سیادت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے فلسفۂ حیات کی تشریح و توجیہہ اس طرح کریں کہ علمی و آفاقی دلائل کی روشنی میں نہ صرف اسلامی افکار و نظریات، اس کے اقدار اور اس کے نظام حیات کی موجودہ تمام نظاموں پر برتری ثابت ہو جائے بلکہ تمام جدید فلسفے اور نظریات اس کے مقابلے میں مہمل اور افکار پریشاں (یا اضغاث احلام) نظر آنے لگیں۔

مگر اس فکری قیادت کی مکمل بازیافت اور اسلامی نظام حیات کے نفاذ کے لئے مادی میدان میں بھی تمہاری کامیابی ضروری ہو گی کیونکہ محض خالی خولی فلسفوں سے بھی کام نہیں چل سکتا۔ اور خود فلسفہ بھی — اپنے صحیح معنی اور معیار کے اعتبار سے — بغیر مادی کامیابی کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ فلسفہ ہمیشہ احساسِ برتری کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور احساس برتری پیدا کرنے کے لئے مادی میدان میں بھی ہماری کامیابی ضروری ہے جو ہمارے انجنوں کے لئے گویا کہ پٹرول کا کام دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم میں احساس برتری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اُس کی فکری قوتیں — علمی و مادی دونوں حیثیتوں سے — بیدار ہونے اور ذہنی گرہیں کھلنے لگ جاتی ہیں اور تخلیق واجتہاد کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ذہنی ارتقار اور تحقیق و اکتشاف میں تقدم و برتری حاصل

کرنے کے لئے مادی حیثیت سے بھی تقدم و برتری حاصل کرنا ضروری ہے۔ ورنہ پس ماندگی اور احساس کمتری میں مبتلا کوئی قوم کوئی تخلیقی کارنامہ انجام نہیں دے سکتی جیسا کہ قرون وسطیٰ اور موجودہ دور کے احوال شاہد ہیں۔

ان بنیادی اقدامات کے بغیر کوئی ہمہ گیر ذہنی و فکری انقلاب لانا مشکل ہے اور اس قسم کے ذہنی و فکری انقلاب کے بغیر عالم انسانی کی مکمل اصلاح کبھی نہیں ہو سکتی۔

حاصل بحث یہ ہے کہ آج ہم کو بنیادی طور پر بیک وقت دو میدانوں میں کام کرنے اور ان میں خصوصی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ ہر ممکن طریقے سے سائنسی علوم کو ترقی دے کر صنعت اور ٹکنالوجی کے میدان میں مسلم معاشرے کو آگے بڑھانا اور اُسے صف اوّل کی ترقی قوموں میں لا کھڑا کرنا۔

۲۔ سائنسی علوم کی ترقی اور ان کی ترویج و اشاعت سے پیدا ہونے والے فکری، معاشرتی اور تمدنی مسائل و مشکلات کا حل تلاش کرنا۔

پہلا فریضہ خصوصیت کے ساتھ ماہرین سائنس پر عائد ہوتا ہے اور دوسرا فریضہ خصوصیت کے ساتھ علمائے اسلام پر۔ اس دوسرے فریضے کی صحیح ادائیگی ہی کے باعث — ان مسائل کی تنقیح کے ضمن میں "معروف فکر" کے نئے نئے پہلو واضح ہوتے جائیں گے، جن کے ذریعہ نوع انسانی کی بخوبی اور مؤثر طور پر رہنمائی ہوتی رہے گی۔

منصب خلافت کا یہ وہ اعلیٰ مقام اور بلند نصب العین ہے جو کسی بھی وقت ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہونا چاہیئے۔ جب تک یہ منصب عظیم حاصل نہ ہو گا درجۂ امامت بھی — دنیا کی علمی و فکری سیادت — مکمل طور پر کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ اللہ کی عجیب و غریب حکمت ہے کہ اس نے اس عالم رنگ و بو میں دو قسم کے

علوم کا سلسلہ جاری فرمایا۔ ایک وہ علم جس کو انسان اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہے اور دوسرے وہ جس کو انسان اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتا۔ علم اول کو انسان کی عقل پر اعتماد کرتے ہوئے چند بنیادی اصولوں کے ساتھ اس کی فہم و بصیرت پر چھوڑ دیا۔ اور علم ثانی کو اپنے چند مخصوص بندوں کے ذریعہ پہنچایا گیا جن کو اصطلاح میں انبیاء اور رسل کہا جاتا ہے۔ اب علم اول، جو مشاہدات و تجربات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ حیرت انگیز طور پر علم ثانی (علم شریعت) کا مؤید و معاون بلکہ خادم اور حاشیہ بردار نظر آتا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ علم ثانی برحق اور من جانب اللہ ہے۔ ورنہ ہزاروں سال بعد کی تحقیقات جو بالکل آزادانہ طور پر کی گئی ہیں اس علم کی تصدیق و تائید کبھی نہ کرتیں۔

یہ ہے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور فطرت و شریعت کے باب میں اس کی انوکھی منصوبہ بندی جو نوع انسانی پر اتمام حجت کے لئے بہت زیادہ مؤثر اور بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے کسی ایک جگہ یا کسی ایک موقع پر بھی نظام فطرت کی مذمت نہیں کی۔ اور اس کو خلاف دین یا خلاف شریعت قرار نہیں دیا۔ بلکہ دین اور فطرت کے صحیح حدود و قیود متعین کر کے تجرباتی علوم میں تحقیق و تفتیش کرنے اور مادی میدانوں میں آگے بڑھنے کی پوری پوری آزادی دے دی۔ وہ دیگر مذاہب کی طرح رہبانیت اور ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا۔ اور مادہ اور روح کی تفریق کو جائز نہیں سمجھتا بلکہ وہ مادیات و روحانیات کا انتہائی کامیاب سنگم اور ان دونوں کی آمیزشوں کا ایک دلآویز مرقع ہے۔ اور الف سے یاء تک اس کی تمام تعلیمات میں یہ پہلو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت و شریعت میں کوئی تعارض و تضاد نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہوئے اور ایک ہی مبدء فیض کی جانب سے

جاری شدہ ہیں۔ کائنات اور اس کے مظاہر بھی اللہ تعالیٰ ہی کے پیدا کردہ ہیں اور دین و شریعت کا نظام بھی اسی کی طرف سے جاری کردہ ہے۔ لہٰذا ان دونوں میں تصادم کس طرح ہو سکتا ہے؟[۱۲۴] مگر یہ بنیادی حقیقت کلیسائی علمبرداروں کی نظر سے پوشیدہ رہ گئی۔ جس کے باعث کلیسا اور سائنس کے علمبرداروں کے درمیان معرکہ آرائیوں کا وہ طویل اور تاریخی سلسلہ چل پڑا جو بالآخر مذہب کی مکمل شکست پر منتہی ہوا۔ لیکن یہ تاریخ اب پھر دوبارہ کبھی نہیں دُہرائی جانی چاہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ عیسائی مذہب کی شکست و ریخت محض اس کی ناقص تعلیمات اور اس کے ارباب فکر کی بد اندیشی کا نتیجہ تھی۔ عیسائی مذہب میں اتنا دم خم ہی نہیں تھا کہ وہ زمانے کی تبدیلیوں کا ساتھ دیتا اور بدلے ہوئے حالات میں اپنے حاملین کی کوئی واضح رہنمائی کرتا۔ یہ صرف اسلام اور قرآن عظیم کی خصوصیت ہے کہ وہ قیامت تک ہر دور میں اور ہر قسم کے حالات کے تحت اپنے حاملین کی صحیح اور کامل رہنمائی کرنے کی زبردست

---

[۱۲۴] علامہ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں: "صحیح اور بیّن عقلی دلیلیں نیز ضروری فطری علوم مذہبی معتقدات اور تعلیمات انبیاء کے عین موافق ہیں نہ کہ ان کے مخالف۔"

ان الأدلة العقلية الصحيحة البينة التى لا ريب فيها، بل العلوم الفطرية الضرورية توافق ما اخبرت به الرسل لا تخالفه۔

(موافقة صريح المعقول لصحيح المنقول، ص ۹۶، مطبوعہ ریاض)۔

موجودہ دور کے حکیم ہربرٹ اسپنسر نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ "علم طبیعی دین سے نہیں ٹکراتا بلکہ ان دونوں کا تال میل ایک دوسرے کی تائید و توثیق اور قوت کا باعث ہے۔"

(ملاحظہ ہو تفسیر الجواہر ۱/۲۸، طبع اوّل)

صلاحیت رکھتا ہے۔ اس حیثیت سے دیکھئے تو وہ آج بھی ایک زندہ اور ابدی مذہب اور زندہ و مکمل صحیفۂ ہدایت نظر آتا ہے۔

اس لحاظ سے علمائے اسلام پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ عصر جدید کے تمام علوم و فنون کو کھنگال ڈالیں اور اس بات کا نہایت درجہ بصیرت اور دیدہ وری کے ساتھ جائزہ لیں کہ یہ علوم و فنون دین برحق کی کس حیثیت سے تصدیق و تائید کر رہے ہیں اور موجودہ الحاد و لادینیت کے استیصال کے لئے ان سے کس درجہ قیمتی مدد مل سکتی ہے!

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تجرباتی علوم و فنون دین برحق کے خادم اور اس کے حاشیہ بردار ہیں۔ ہمیں ان سے خوف کھانے یا دحشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ انہیں پوری طرح اپنا کر فکری و نظریاتی اعتبار سے عالم انسانی کی صحیح اور بروقت رہنمائی کرنی ہے۔

چھٹا باب ٦

خلافتِ ارض اور مُسلم حکومتوں کے فرائض

- فتنہ و فساد کی روک تھام
- ملک و ملت کا دفاع اسلام کی نظر میں
- جدید اسلحہ کی تیاری
- جنگی تیاری کے لئے جنگی صنعتوں کا قیام ناگزیر
- ایٹم بم کی حُرمت پر قرآن کا فتویٰ
- ایک عبرت اور ایک خوشخبری
- خلافت اسلامیہ اور عالم اسلام کا اِتّحاد
- خلافتِ ارض اور جہاد فی سبیل اللہ
- حاصل بحث اور کتاب کا مرکزی نکتہ
- انفاق اور قوموں کا عروج و زوال
- قارون کا عبرت انگیز واقعہ
- اسلام اور کمیونزم
- طبقۂ اولی الأمر کی ذمہ داری
- خلافت کا منصب علمی اور منصب مادی
- منصوبہ بندی کی اہمیت
- ایک مغضوب و معتوب قوم کی مثال
- خلافت ارض اور سنّت الٰہی
- خلافت ارض کی شرائط
- لوہا اور قوموں کا عروج و زوال
- کیا سائنسی و صنعتی علوم کی تحصیل فرض ہے؟
- کون سی جماعت غالب رہے گی؟

چھٹا باب

خلافتِ ارض اور مسلم حکومتوں کے فرائض

فتنہ و فساد کی روک تھام

پچھلے مباحث کا خلاصۃ الخلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کائنات اور اس کے مظاہر کا علم عطا فرمایا تاکہ وہ ان مظاہر کو اچھی طرح پہچان لے اور ان سے صحیح تعارف حاصل کر کے ہر ایک سے اس کے مرتبے اور مقام کے مطابق برتاؤ کرے اور دوسری حیثیت سے ان مظاہر میں ودیعت شدہ نعمتوں اور پوشیدہ فوائد سے بھی بخوبی مستفید ہو کر خلافت ارض کے مقاصد اور اس کے تقاضوں کو پورا کرے۔

خلافتِ ارض کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد فکری و نظریاتی اعتبار سے عالم انسانی کی رہنمائی کرنا اور دنیا میں امن و امان قائم کرنا بھی ہے۔ درحقیقت "اصلاح عالم" کی دو شکلیں ہیں:

۱۔ نظریاتی اعتبار سے دلیل و استدلال اور حجت و برہان کی زبان میں کلام کر کے اقوام عالم کو قائل کرانا اور ان کی گمراہیوں پر متنبہ کر کے عقلی و استدلالی حیثیت سے ان پر اتمام حجت کرنا۔

۲۔ بدامنی اور فتنہ و فساد کی صورت میں — جب کہ نظریات محض نظریات نہ رہیں بلکہ وہ تشدد اور فتنے کی شکل اختیار کر لیں — تلوار کے ذریعہ ان کی اصلاح کرنا۔ بالفاظ دیگر بوقت ضرورت فتنہ و فساد کی روک تھام اسلحہ کے ذریعہ کرنا۔

اگر آغازِ اسلام اور خصوصاً دورِ رسالت اور خلافت راشدہ کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ اسلام کی ترویج و اشاعت میں

اس کی حکمت عملی ان ہی دو باتوں پر مشتمل رہی ہے او ن دور کی تمام جنگیں دفاعی نقطہ نظر سے اور فتنہ و فساد کی روک تھام کے لئے لڑی گئی تھیں۔ مگر مخالفین اسلام نے مشہور کر دیا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ حالانکہ اسلام جیسے پرامن اور انسانیت نواز مذہب پر یہ سراسر بہتان ہے جیسا کہ پچھلے ابواب کے تمام مباحث سے یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ اسلام سراسر ایک علمی و عقلی مذہب ہے جو ہمیشہ دلیل و استدلال اور حجت و برہان کو مقدم رکھتا ہے۔ اور تلوار اٹھانے کی اجازت صرف اسی وقت دیتا ہے جب کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ ہو۔ اور اسی حد تک دیتا ہے جس حد تک کہ فتنہ و فساد دب جائے اور کم سے کم خونریزی عمل میں آئے۔ یعنی انسانی معاشرے میں جو فاسد مواد ہو وہ نکل جائے اور جو چیز انسانیت کا ناسور بن چکی ہو اس کو کاٹ کر پھینک دیا جائے تاکہ معاشرے کا سدھار عمل میں آ سکے۔ اس اقدام کے بغیر دنیا میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا اور اللہ کے بندوں کو چین و سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم نے فلسفۂ اجتماعیات کے اس بنیادی اور اہم ترین اصول پر اپنے مخصوص انداز میں اس طرح روشنی ڈالی ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اور اگر اللہ (اقوام عالم میں اپنی مصلحتوں کی بنا پر) ایک دوسرے کی مدافعت نہ کرتا تو خانقاہیں، مدرسے عبادت خانے اور مسجدیں — جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب ڈھا دئے گئے ہوتے اور اللہ ضرور ان کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں (کیونکہ) اللہ طاقتور اور زبردست ہے۔ (حج : ۴۰)

اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ غالب اور زبردست

ہے۔ اس لئے وہ اپنے دین متین کو بھی غالب اور زبردست دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ نزاکت اور کشمکش کے وقت اس کے دین ابدی کا پھریرا بلند کرنے والوں کو سربکف ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ دین کا دفاع اور اپنی تہذیب و تمدّن کا بچاؤ مشکل ہو جائے گا۔ نیز یہ کہ نظریاتی اعتبار سے جو ملّت اصلاحِ عالم کی دعویدار ہو اس کو سب سے پہلے خود اپنے آپ کو مضبوط اور قوی بنانا پڑے گا۔ اس سیاق میں " ولینصرن اللہ من ینصرہ " (اور اللہ اُسی کی مدد کرتا ہے جو خود اس کی مدد کرے) کا یہی مطلب ہے۔

غرض اسلام عقلی و نظریاتی اور پُرامن طور پر تبلیغ کا قائل ہے۔ دُنیا کے دیگر متشدّدانہ فلسفوں (مثلاً کمیونزم) کی طرح وہ زبردستی اپنے نظریات کو تھوپنے اور بے جا قتل و غارتگری کا قائل نہیں۔ اور جنگ کی اجازت صرف اسی وقت دیتا ہے جب کہ اپنی تہذیب و تمدّن کو خطرہ لاحق ہو یا امن عالم کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ اس اعتبار سے آج روئے زمین پر اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو پُرامن بقائے باہم[۱] کا قولاً اور فعلاً ہر اعتبار سے صحیح طور پر قائل ہے۔

بہرحال آج دین اسلام کی نصرت اور اس کے صحیح دفاع کے صرف دو طریقے ہیں:

۱۔ علمی و عقلی اور نظریاتی اعتبار سے دین اسلام کی صحیح تبلیغ جو

---

[۱] یہ روسی کمیونزم کا نعرہ ہے جو محض ایک کھوکھلا دعویٰ ہے اور عملی دُنیا میں اس کا کوئی وجود دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے برعکس روسی کمیونزم ماضی قریب میں رومانیہ، ہنگری، چیکوسلواکیہ اور اب افغانستان میں اپنی جارحیت پوری طرح ثابت کر کے خود اپنے اس نظریئے " پُرامن بقائے باہم " کو تار تار کر چکا ہے۔ اور اب پولینڈ اور دیگر ممالک میں مداخلت کر کے انہیں غلام بنانے کی فکر میں کوشاں ہے۔

عصر جدید کی ضرورتوں اور اس کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ اس کا پہلا مرحلہ فکر و نظر کی اصلاح کے لئے سب سے پہلے "قرآنی علم کلام" کی تدوین ہے جس کی ضرورت اور طریقۂ کار کے متعلق پچھلے صفحات میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

۲۔ مگر جب "پُرامن بقائے باہم" کو خطرہ لاحق ہو جائے تو اس وقت ہتھیار سنبھال کر میدان میں آجانا چاہیئے۔

ملک و ملّت کا دفاع اسلام کی نظر میں

یہی وجہ ہے کہ اہلِ اسلام کو عالمی سیاست کے مطابق فوجی و عسکری اعتبار سے اپنے آپ کو مسلح کرنے اور مخالفینِ اسلام کی ریشہ دوانیوں سے ہمیشہ چوکنا اور چوکس رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ اور تم لوگ اپنی مقدور بھر قوت اور گھوڑوں کا پڑاؤ (ہر وقت) تیار رکھو جس کے ذریعہ تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھا سکو اور ان قوموں پر بھی جن کو تم (اِس وقت) نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے (جن سے تمہارا سابقہ مستقبل میں پڑنے والا ہے) اور اللہ کی راہ میں (سامان جنگ کی تیاری پر) جو کچھ تم خرچ کرو گے (اس کا بدلہ) تم کو پورا ملے گا۔ اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا۔ (الانفال: ۶۰)

قرآن حکیم میں ہر دَور کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں گھوڑوں کا لفظ دَورِ قدیم کی رعایت سے لایا گیا ہے اور مابعد کے ادوار کی رعایت سے "قوۃ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے مُراد ہر قسم کی قوّت اور جدید سے جدید تر سامانِ جنگ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح "عدو اللہ و عدوکم"

سے مراد دورِ نزول کے منکرینِ حق اور دشمنانِ اسلام ہیں۔ اور " وآخرین من دونہم " سے مراد مابعد کی اقوام۔ " ترھبون بہ عدو اللہ " (تاکہ تم اللہ کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھا سکو۔) یہ مقصد عسکریت، فلسفۂ جنگ، خلافتِ ارض کی غرض و غایت اور امن عالم کی بنیادی اینٹ ہے۔ یعنی محض اس رعب و دبدبے ہی کی بدولت تمہیں امن و امان اور چین وسکون حاصل ہو سکتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کمزوری کی بدولت ہر قوم اور ہر ملک دبانے اور حق مارنے لگ جائے گا۔ کیونکہ عسکری اعتبار سے قوموں کی کمزوری ان کی موت کے مترادف ہوتی ہے۔

یہ آیت کریمہ بیک وقت نہ صرف حتی المقدور جنگ کی تیاری اور اس راہ میں انفاق کی ترغیب وتحریص دلا رہی ہیں بلکہ خلافت ارض کا فلسفہ بھی سمجھاتے ہوئے اور مستقبل کے بارے میں کچھ پیش گوئیاں کرتے ہوئے اپنے متبعین کو چالاک دشمنوں سے چوکنا اور ہوشیار رہنے کی تلقین بھی کر رہی ہے جو ہمیشہ مسلم مملکتوں کو دزدیدہ نگاہوں سے تاکا کرتے ہیں، جیساکہ تاریخ اسلام شاہد ہے۔ خلافت ارض کے تعلق سے اس آیت کریمہ میں ہمارے لئے بہت سے اسباق وبصائر ودیعت کر دیئے گئے۔ جن کی تھوڑی سی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

جدید اسلحہ کی تیاری

اس آیت کریمہ کا منشا جیساکہ ظاہر ہو رہا ہے " فتنوں " کو کچلنے اور باطل سے نبرد آزمائی کے لئے بہتر سے بہتر ہتھیاروں کی تیاری ہے۔ آج تیر کمان، تلوار اور نیزے کا دور نہیں رہا۔ بلکہ بندوق، مشین گن اور ٹینکوں کا دور بھی بہت بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے۔ اب راکٹ، میزائل، ایٹم بم ہائیڈروجن بم، نیوٹران بم، جراثیمی بم اور خلائی سیاروں کا دور ہے۔

اب انسان خلا میں بیٹھ کر جنگ کرنے اور اجرام سماوی میں فوجی چھاؤنیاں قائم کرنے کی فکر میں ہے تاکہ وہ اپنا دفاع مضبوط کر کے ایک ہی وار میں اپنے دشمنوں کا صفایا کر سکے۔

لہٰذا اقوام عالم کو قابو میں رکھنے کے لئے جدید سے جدید تر ہتھیاروں سے لیس ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر "تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ" کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اور یہ مقصد "بھیک" کے چند ہتھیاروں کو جمع کر لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے بذات خود محنت اور جد و جہد کرنے اور خود کفیل بننے کی ضرورت ہے۔

یہ آیت کریمہ دنیائے اسلام کو صاف طور پر متنبہ کر رہی ہے کہ اہل اسلام ہمیشہ چوکنا اور حالتِ جنگ میں رہیں ورنہ غفلت اور بے خبری کی صورت میں وہ اچانک حملوں کا توڑ اور صحیح دفاع نہیں کر سکیں گے۔

آغاز اسلام میں چونکہ صحابۂ کرام قرآن حکیم کے رمز شناس تھے اور اس کی حکمتوں کو بخوبی سمجھتے تھے۔ اس بنا پر وہ فوجی و عسکری اعتبار سے ہمیشہ چوکنا اور ہوشیار رہا کرتے تھے۔ چنانچہ فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضؓ (المتوفی ۴۳ھ) نے اس موقع پر جب کہ ملک مصر پوری طرح فتح ہو چلا تھا اور مسلمانوں کے لئے بظاہر کسی قسم کے خطرے کی کوئی بات نہیں تھی، اہل اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے جو بات فرمائی تھی وہ ہمیشہ ..... تمام مسلمانوں کے یاد رکھنے کی ہے۔ جو ایک زرین اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرمایا: "انتم فی رباط دائم"[۱] (یاد رکھو کہ تم ہمیشہ پہرے پر ہو)۔ یعنی تمہیں ہمیشہ اپنے دشمنوں سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

اور تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلمانوں کو جو بھی ملکی نقصانات ہوئے اور

۱۔

اسلامی حکومتوں پر جو زوال وادبار طاری ہوا ہے وہ اسی زرّین اصول کو فراموش کر دینے کے باعث ہے۔ چنانچہ سلطنت عباسیہ، مسلم اندلس، ملتِ اسلامیہ ہند دولت عثمانیہ کے عروج وزوال اور خصوصیت کے ساتھ ان کے آخری ادوار کے حالات اور خود عرب اسرائیل جنگوں کا جائزہ لیجئے تو آپ کو اس ربانی صداقت کی قدر وقیمت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

بہر حال تاریخ شاہد ہے کہ مسلم حکومتوں کا رعب اور دبدبہ — ان کے عروج کے زمانے میں — جب تک اقوامِ عالم پر چھایا رہا خلافت اسلامیہ بھی برقرار رہی اور دُنیا میں امن وامان بھی قائم رہا۔ یعنی ان کی رواداری، عدم تعصّب اور وسیع المشربی کی بنا پر وہ نہ صرف اپنے ماتحت رہنے والی غیر مسلم رعایا کے جان ومال کے محافظ تھے بلکہ وہ اپنے ماتحت رہنے والے حلیف قوموں اور ملکوں کے بھی محافظ تھے۔ مگر خلافت اسلامیہ کے زوال کے ساتھ ہی روئے زمین پر طوائف الملوکی پھیل گئی اور ظلم وعدوان کا بازار گرم ہو گیا۔ یہ بھی ایک نقصان عظیم ہے جس سے عالمِ انسانی ملتِ اسلامیہ کے زوال کے باعث دوچار ہوا۔

ہماری اس کھوئی ہوئی شان وشوکت کو دوبارہ حاصل کرنے اور دنیا میں پھر سے امن وامان کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم خلافت ارض کی ذمہ داریوں کو پہچانیں اور فوجی وعسکری حیثیت سے خود کو قوی اور طاقتور بنانے کی کوشش کریں۔ یہ بات خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ اس وقت دُنیا میں جتنی بھی صنعتیں کام کر رہی ہیں ان سب میں فوجی وعسکری نوعیت کی صنعتیں غالباً سب سے زیادہ اور اوّل نمبر پر ہیں[۳]۔ مثلاً مختلف قسم کی رائفلیں، مشین گنیں، توپ، ٹینک، قسم ہا قسم کا گولہ بارود، ہوائی جہاز،

---

[۳] پھر اس کے بعد مختلف قسم کی ادویات کی صنعتوں کا نمبر آتا ہے۔

راڈر، راکٹ، مزائیل، مختلف قسم کے بم اور ایٹمی اسلحہ وغیرہ۔ اور اندازہ یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کے دیگر عسکری ساز و سامان اور کل پرزوں کی تیاری کے لئے ہزاروں صنعتیں کام کر رہی ہوں گی۔ آج دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک کا حال یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے سائنسی اور صنعتی علوم کو جنگی ضروریات اور دفاعی اشیاء کی تیاری کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لہذا انہوں نے ان تمام علوم کو پوری قوت کے ساتھ فوجی طاقت کے حصول کی راہ میں جھونک دیا ہے۔ اور لاکھوں آدمی دن رات ان مقاصد کے کے حصول میں پوری تندہی کے ساتھ مصروف ہیں۔ چنانچہ امریکہ کے صرف ایک خلائی صنعت کے ادارہ "ناسا" (NASA)[1] میں کام کرنے والے سائنس دانوں انجنیروں اور دیگر افراد کی تعداد بارہ لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس سے آپ دیگر صنعتوں اور ان کے پھیلاؤ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمیں خصوصیت کے ساتھ جاپانی قوم سے سبق سیکھنا چاہیئے، جس نے دوسری جنگ عظیم میں اپنا سب کچھ برباد کر دینے کے باوجود ہمت نہیں ہاری بلکہ تن، من، دھن، کی بازی لگا کر صرف ایک ربع صدی میں نہ صرف دُنیا کے صفِ اوّل کے صنعتی ممالک میں شامل ہو گئی بلکہ بہت سے ترقی یافتہ ممالک کو بھی پیچھے چھوڑ گئی۔ یہ معجزہ آخر کس طرح ظہور میں آیا؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ مسلسل محنت، جفاکشی اور مقصد سے لگن کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ماہرین عسکریات کا کہنا ہے کہ ایک اچھی فوج تیار کرنے کے لئے جہاں ایک طرف بہترین اسلحہ کی ضرورت پڑتی ہے تو دوسری طرف عددی طاقت اور بہترین تنظیم بھی ضروری ہوتی ہے تاکہ وہ ہر قسم کے حالات سے نپٹ سکے۔ اس لحاظ سے اگر مختلف مسلم ممالک کے درمیان تال میل اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو اس سے دو طرفہ بلکہ کثیر طرفہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور ضرورت

---

[1] NATIONAL AERONATICAL AND SPACE ADMINSTRATION

پڑنے پر ایک دوسرے کی امداد و اعانت بھی ہو سکتی ہے۔ آج عالمِ اسلام کی عددی قوت ایک ارب کے لگ بھگ ہے۔ اگر پورا عالمِ اسلام متحد ہو جائے تو ایک ایسی عظیم الشّان قوت عالمِ وجود میں آجائے گی جو پورے عالم کو تہ و بالا کر سکتی ہے۔ اور دُنیا کی ہر سیاست پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ مسلم ممالک کی حیثیت اس وقت وہ کھوئی ہوئی بھیڑوں، یا کتاب کے منتشر اوراق کی طرح ہے۔ جب تک ان کے درمیان اتحادِ اسلامی (Pan-Islamism) عمل میں نہیں آتا ہمارے ملّی و اجتماعی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ ہم کو قرآن کا یہ سبق ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے:

وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝

اور یہ تمہاری امت ایک ہی اُمّت ہے۔ اور میں تم سب کا رب ہوں۔ لہٰذا تم مجھ سے ہی ڈرتے رہو۔ (مومنون : ۵۲)

جنگی تیاری کے لئے جنگی صنعتوں کا قیام ناگزیر

اس وقت دنیا کے نقشے پر چالیس سے زیادہ مسلم حکومتوں کا وجود پایا جاتا ہے۔ مگر سب کی سب فوجی و عسکری نقطۂ نظر سے کمزور اور اسلحہ کے معاملے میں بڑی قوموں کی دست نگر ہیں۔ یہ حقیقت میں سزا ہے اس بات کی کہ وہ "علم اسماء" اور "تسخیر اشیاء" کے میدان میں پیچھے کیوں رہ گئیں!

طاقت کے اعتبار سے "قومی کمزوری" حقیقتاً قومی موت ہے اور یہ قانون فطری، شرعی، تاریخی اور سیاسی ہر اعتبار سے صحیح ہے۔ یہ صحیفۂ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ کمزور قومیں اس کائنات گیتی میں زیادہ دنوں تک قومی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ بلکہ وہ جلد یا بدیر یا تو غالب اور طاقتور قوموں کا لقمۂ تر بن جاتی ہیں یا پھر اُن پر ذلت و مسکنت طاری ہو جاتی ہے۔

لہٰذا مقصدِ خلافت اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلمان قومیں "تسخیر اشیاء" کے میدان میں خود آگے نہ بڑھیں اور "مادہ" بس

ودیعت شدہ قوتوں کو زیر کر کے ان کا صحیح استعمال نہ سیکھ لیں۔ اس وقت مسلم حکومتوں کے پاس وسائل کا ایک انبار موجود ہے۔ اگر وہ صحیح سمجھ بوجھ سے کام لے کر تسخیر اشیاء یعنی سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں اتر جائیں تو بہت جلد دنیا کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔ اور موجودہ صورتِ حال بدل سکتی ہے۔

اس وقت عرب ممالک کو خصوصیت کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس کرتے ہوئے جو دولت اللہ نے انہیں دے رکھی ہے اس کا صحیح استعمال کرنا چاہیئے۔ عرب ممالک آج اس پوزیشن میں ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو خلافت ارض کی از سرِ نو تشکیل و تعمیر میں ایک مؤثر، فعال اور مثبت رول ادا کر سکتے ہیں اور پوری مسلم دنیا ان کے اقدامات کی تائید کے لئے ان کی پشت پناہ بن سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت (پندرھویں صدی میں) دنیائے اسلام کو ایک فیصلہ کن مرحلے اور بہت نازک امتحان میں کھڑا کر دیا ہے۔

اس مقصد عظیم کے حصول کے لئے محض چند کانفرنسیں منعقد کرا دینے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہو گا جب تک کہ ایک ٹھوس پروگرام بنا کر مثبت طور پر کام شروع نہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے سائنسی تعلیم کو عام کرنے، سائنسی مراکز اور صنعتیں قائم کرنے کی طرف فوری توجہ کرنی چاہیئے۔

اس وقت عرب ممالک کا کثیر سرمایہ یورپ اور امریکہ کے بنکوں میں "بند" پڑا ہوا ہے۔ یا اس کا فائدہ غیر قوموں کو پہنچ رہا ہے[۵]۔ اگر وہ اس سرمائے سے

---

۵ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق اس سرمائے سے جو سود حاصل ہو رہا ہے وہ مشنری اداروں کو تبلیغِ مسیحیت کی خاطر دیا جا رہا ہے۔ کیونکہ عرب ممالک شرعاً سود لینے کے روادار نہیں ہیں اور اصل رقم یعنی راس المال سے یورپین تجارتوں اور صنعتوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے اس طرح ہم اپنے سرمائے سے مغرب کو ہر اعتبار سے فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ کیا یہ ایک عجیب بات نہیں ہے!

اپنے یا دوسرے مسلم ملکوں میں جدید صنعتیں قائم کریں تو اس کے نتیجے میں خود اُن کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ اور ترقی پذیر مسلم ملکوں کا بھی بھلا ہو گا ، جو فنّی (technical) اعتبار سے کچھ نہ کچھ معلومات تو رکھتے ہیں مگر سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

عرب ملکوں کو ایران اور امریکہ کے حالیہ واقعات سے سبق لینا چاہیئے کہ ضرورت پڑنے پر دنیا کی یہ بڑی اور حریص طاقتیں کمزور قوموں کا سرمایہ ہڑپ کر جانے سے بھی نہیں ہچکچاتیں، بلکہ اس کو منجمد کر کے ان کو مفلس و قلاش کر سکتی ہیں۔ لہٰذا عربوں کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہیئے کہ وہ سرمایہ ۔ جس کو وہ "محفوظ" سمجھتے ہیں ۔ کس کام کا جو بوقت ضرورت یا آڑے وقت میں نہ تو خود ان کے کام آئے اور نہ اس سے دنیائے اسلام کا کوئی بھلا ہو!

ان تمام وجوہات کی بنا پر ضروری ہے کہ مسلم ممالک حسب ذیل اُمور پر توجہ مبذول فرمائیں:

۱۔ فوری طور پر مسلم ممالک میں سائنسی اور صنعتی (industrial) تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے سائنسی تحقیقات کے ادارے، مراکز اور سائنسی و فنی تعلیم کے لئے خصوصی درسگاہیں[۶۵] زیادہ سے زیادہ تعداد میں قائم کئے جائیں اور عوام کو سائنسی و صنعتی تعلیم کے حصول کی مؤثر انداز میں ترغیب دی جائے اور سائنسی معلومات کو عام کرنے اور ان کو مقبول بنانے کے لئے کثرت کے ساتھ لٹریچر (اپنی قومی اور مادری زبانوں میں) شائع کیا جائے۔ یہ عمل دیگر سارے اقدامات کے لئے ایک بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ مسلم ممالک میں مختلف مصنوعات اور جنگی اوزار تیار کرنے کے لئے فوری طور پر ضروری اور اہم صنعتیں قائم کی جائیں۔ پھر رفتہ رفتہ تمام آلات و

---

[۶۵] یعنی پالی ٹکنک اور انجنیرنگ کالج وغیرہ۔

اور ازحتی المقدور خود ہی تیار کرنے کی کوشش کی جائے۔

۳۔ مسلم ممالک کی ایک مشترکہ تجارتی منڈی (کامن مارکٹ) ہونا چاہیئے، جس کے ذریعہ ایک دوسرے کی ضروریات آپس میں بخوبی پوری ہوسکتی ہوں۔

۴۔ صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے اپنے خام مال اور خام اشیاء کا تبادلہ جہاں تک ممکن ہو آپس میں ہی کر لینا چاہیئے۔ بلکہ زیادہ بہتر ہوگا کہ جہاں پر خام مال پیدا ہوتا ہو اسی ملک میں اس کی صنعتیں قائم کی جائیں۔

۵۔ جو ممالک فنی اور ٹکنیکل حیثیت سے جانکاری رکھتے ہیں وہ آگے بڑھ کر (صنعتی ترقی میں) خام مال تیار کرنے والوں کی مدد کریں اور جو مالدار ممالک ہیں وہ ان صنعتوں کی ترقی میں سرمایہ لگائیں۔ اس طرح سہ گونہ فوائد ہوسکتے ہیں۔ اور اس اقدام میں ایک ارب مسلمانوں کے معاشی فوائد بھی چھپے ہوئے ہیں۔

ان اقدامات کے ذریعہ حاصل ہونے والے بعض اہم ترین فوائد یہ ہیں:

۱۔ مسلم ممالک میں سائنسی اور صنعتی تعلیم کو فروغ حاصل ہوگا۔ جس کے نتیجے میں ایک عام بیداری پیدا ہوگی اور علمی تحقیقات واکتشافات کا ملکہ پیدا ہونے لگے گا جو رفتہ رفتہ انہیں ترقی یافتہ قوموں کی صف میں لا کھڑا کرے گا۔

۲۔ مسلم ممالک اپنی ضروریات میں خود کفیل ہو جائیں گے اور ترقی یافتہ قوموں پر انحصار کم ہو جائے گا۔

۳۔ مسلم ممالک میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ جو اپنی قومی بقاء اور تحفظ کے لئے بہت ضروری ہے۔

۴۔ مسلم ممالک سے جہالت اور بے روزگاری دور ہو جائے گی۔

۵۔ مسلم ممالک میں حقیقی اتحاد کی بنیاد پڑ جائے گی اور وہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی اور مددگار سمجھنے لگیں گے اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔ جو کہ ”انما المؤمنون اخوۃ“ (تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں)

کا فطری اور ایمانی مظاہرہ ہوگا۔ کیونکہ دینی اور ایمانی رشتہ سب رشتوں سے زیادہ قوی تر ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد ہیں۔ بہر حال جتنی جلد ہو سکے ان اقدامات کے ذریعہ بڑی طاقتوں کے چنگل سے آزاد ہو کر ہم کو اپنے پیروں پر خود کھڑے ہونا چاہیئے، ورنہ دین الٰہی کے غلبے اور اس کی سربلندی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اپنی بنیادی ضرورتوں میں دوسروں کی محتاج بنی رہنے والی اور کاسۂ گدائی دراز کرنے والی قوم دُنیا میں کبھی غلبہ واقتدار کا خواب نہیں دیکھ سکتی۔ مسلم ممالک کو اللہ نے اس قدر قدرتی وسائل سے مالا مال کیا ہے اور اتنی بہترین جغرافیائی پوزیشن عطا کی ہے کہ وہ اس راہ میں بہت کچھ بلکہ جو چاہے کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ ایک مرکزی آئیڈیالوجی کے تحت باہم متفق ومتحد ہو جائیں۔ اب یہ مرکزی آئیڈیالوجی اور اتحاد باہمی کا بنیادی اور مرکزی ستون سوائے دین الٰہی یا وحدت کلمہ کے اور کیا ہو سکتا ہے! اسی میں دنیائے اسلام کی تمام دینی و دُنیوی بھلائیاں مضمر ہیں اور اسی وحدت کلمہ کے باعث وہ متحد اور سرخرو ہو سکتے ہیں۔

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ تم ہی سربلند رہو گے اگر تم پورے مومن رہے (آل عمران: ۱۳۹)

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ: اور عزت وبڑائی صرف اللہ کے لئے اس کے رسول کے لئے اور اہل ایمان کے لئے ہے۔ (منافقون: ۸)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط یقیناً اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدل لیں۔ (رعد: ۱۱)

ایٹم بم کی حرمت پر قرآن کا فتویٰ

اگر مسلمان علوم وفنون کے باب میں امام ہوتے تو وہ منشائے الٰہی کے مطابق

"تسخیر اشیاء" کا صرف افادی پہلو مدنظر رکھتے اور اس کے مضر اور ہلاکت خیز پہلوؤں سے گریز و اجتناب کرتے۔ آج حال یہ ہے کہ دنیا کی جنگ باز قومیں دنیائے انسانیت پر جوہری اور جراثیمی جنگ مسلط کر کے تمام انسانوں کو موت کی نیند سلا دینے کے درپے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ علم اسماء "صالح" ہاتھوں سے نکل کر "غیر صالح" ہاتھوں میں پڑ گیا۔ اور انہیں قابو میں رکھنے والی کوئی مؤثر قوت باقی نہیں رہی۔ جب معاشرے پر مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو اس کا خطرناک نتیجہ وہی نکلا جس کو لامحالہ نکلنا چاہیئے تھا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی برتر ہستی کے سامنے جوابدہی کا تصور ہی ذہنوں سے نکل گیا تو انسان تمام بندھنوں سے آزاد ہو گیا۔

یہ موجودہ جنگ باز انسانوں کی بہت خطرناک روش ہے جو خود ان کے لئے پیام موت کی حیثیت رکھتی ہے اور انسان کا پورا مستقبل بھیانک اور تاریک نظر آتا ہے۔* یہ دراصل عالم انسانی کا ایک بہت بڑا اور زبردست نقصان ہے جو زوال ملّت اسلامیہ کے بعد کے ادوار میں (قرون وسطیٰ کے بعد) پیش آیا۔ اور اب قیادت کے اس خلا کو پُر کرنا بظاہر بہت مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن جہاں تک دین ابدی کی فکری قیادت کا تعلق ہے وہ اس مسئلہ پر بھی پوری طرح عالم انسانی کی رہنمائی کر کے ایسے خطوط متعین کرتا ہے جن سے معاشرہ کی تعمیر ہوتی ہو اور ان تمام غلط رجحانات پر بندش لگاتا ہے جو معاشرے کی تخریب کا باعث ہوں! اور یہ تمام خصوصیات ایک زندہ مذہب اور زندہ کتاب ہی کی ہو سکتی ہیں کہ وہ ہر حال میں عالم انسانی کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بہر حال جن آیات میں موجودات کائنات کی تسخیر کا ذکر کیا گیا ہے ان ہی میں یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ ظاہری اور باطنی تمام نعمتوں کا استعمال نوع انسانی کے فائدے اور بنی آدم کی بہبودی کے طور پر ہونا چاہیئے۔ مثلاً:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ

وَ اَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا زمین اور اجرام سماوی میں جو کچھ بھی ہے سب کچھ اللہ نے تمہارے (فائدے کے) لئے مسخّر کر دیا ہے۔ اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی (تمام) نعمتیں پوری کر دی ہیں! (لقمان: ۲۰)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے۔ اور کشتیاں بھی اسی کے حکم سے سمندر میں چلتی ہیں! (حج: ۶۵)

وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝ اور اس نے تمہاری (بہبودی) کے لئے ارض و سماوات کی تمام چیزوں کو رام کر دیا ہے (یہ سب) اسی کی جانب سے (بطور تحفہ) ہیں۔ یقیناً ان امور میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے دلائل موجود ہیں۔ (جاثیہ: ۱۳)

یہ اصول یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن حکیم میں بعض احکام لفظاً مذکور ہیں۔ اور بعض معنوی اعتبار سے، جو غور و فکر کے باعث واضح ہوتے ہیں۔ اور اس طرح قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔ اور اس قسم کے مسائل کے استنباط میں بنیادی طور پر دو باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ ایک تو عقلی حیثیت سے ان دلائل کا وزن ہو اور دوسرے وہ روحِ شریعت سے مطابقت رکھنے والے ہوں۔ یعنی عقل و نقل دونوں کی نظر میں وہ قابلِ تحسین ہوں۔ اس اعتبار سے آیات بالا میں غور کیا جائے تو ہماری رہنمائی بہت سے جدید مسائل میں بھی ہو جاتی ہے۔ اور ہمیں تسلی بخش جوابات مل جاتے ہیں۔

دوسرے باب کے مباحث میں ظاہری اور باطنی نعمتوں کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ باطنی نعمتوں کے تحت مادہ اور

توانائی کے وہ تمام اسرار آجاتے ہیں جن سے انسان آج فائدہ اٹھاکر بحر و بر کی تسخیر کر رہا ہے جیسے برق، بھاپ اور ایٹمی توانائی وغیرہ۔ اب اس موقع پر غور فرمائیے اوپر کی تمام آیات میں "لَکُمْ" کا لفظ[۵۲] لایا گیا ہے۔ اس میں "لام" عربی زبان و ادب کے قواعد کے اعتبار سے "غایت" یا مقصد کے لئے ہے۔ اس طرح یہ لفظ عربی ادب میں عموماً افادیت اور حصولِ منفعت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل لفظ "علیٰ"[۵۳] ہے جو نقصان اور ضرر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے ارشاد باری ہے:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط۔ جو کچھ اس نے کمایا اس کا فائدہ اسی کو ہو گا اور جو کچھ اس نے کیا اس کا وبال (بھی) اسی پر ہو گا۔ (بقرہ: ۲۸۶)

یہ عربی زبان کی انتہا درجے کی اختصار پسندی کا ایک نمونہ ہے۔ غرض اس لحاظ سے ان آیات کا مطلب یہ ہوا کہ "تسخیر اشیاء" میں دنیائے انسانیت کا فائدہ اور تعمیری پہلو مدنظر رہنا چاہیئے۔ پھر لفظ "نعمت" کا مفہوم بھی یہی ہے کہ وہ نوع انسانی کے لئے زحمت یا مصیبت نہ بنے بلکہ وہ خدائے رحمان کا عطیہ ہونے کی حیثیت سے ہر حال میں اس کی رحمت و رافت کا مظہر رہے۔

اس لحاظ سے اسلام کی نظر میں جوہری بموں، نیپام بموں، جراثیمی بموں اور دیگر ایٹمی اسلحہ کا استعمال بہت برا فعل اور سخت گناہ ہے۔ جو عالم انسانی کی تباہی و بربادی کا باعث تو ہے ہی مگر بے گناہ اور معصوم انسانوں کی بھی

---

[۵۲] یہ ایک مرکب لفظ ہے جو دو الفاظ سے مل کر بنا ہے: لَ + کُم۔ اس میں پہلا لفظ (لام) ایک حرف جر (preposition) ہے اور دوسرا لفظ (کم) ضمیر متصل ہے۔ اس مرکب لفظ کے معنی ہوئے "تمہارے لئے"۔

[۵۳] یہ بھی ایک حرف جر ہے۔ جو "پر" یا "اوپر" کے معنی میں آتا ہے۔

ہلاکت کا باعث ہے۔ تمام بنی نوع انسان اسلامی نقطۂ نظر، عیال اللہ" (اللہ کا کنبہ) ہیں لہذا وہ ان کی بلا وجہ اور بغیر کسی گناہ کے تباہی و بربادی کی اجازت نہیں دیتا۔

اسلام کی نظر میں ہر انسانی جان قیمتی اور قابل احترام ہے بلکہ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ کسی انسان کو ــ کسی جان کے عوض یا بغیر کسی فساد کے ــ بلا وجہ مارنا اور خواہ مخواہ قتل کرنا گویا کہ ساری انسانیت کو قتل کر دینا ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط جس نے کسی شخص کو جان کے بدلے یا بغیر فساد کے جو زمین میں (اس شخص سے پھیلا) ہو قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ (مائدہ : ۳۲)

دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ــ ۱۹۴۵ء) میں امریکہ نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر صرف ایک ایک ایٹم بم گرا کر جو خوفناک تباہی مچائی تھی اور لاکھوں بے گناہوں کو سالہا سال تک جس جسمانی اذیت اور کرب میں مبتلا کر دیا تھا اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں[۹]۔ اس قسم کی عالمگیر تباہی، بے گناہ انسانوں کو آن کی آن میں موت کی نیند سُلا دینا، شہروں کو کھنڈروں میں تبدیل کر دینا اور نسل کشی بہت ہی معیوب اور سخت گناہ کا فعل ہے، جس کی قرآن حکیم کھل کر اور بہت واضح انداز میں مذمت کرتا ہے۔

---

[۹] یہ دونوں شہر تقریباً ایک ایک لاکھ کی آبادی والے تھے جو پوری طرح تباہ و برباد ہو گئے اور پوری آبادی تہس نہس ہو کر رہ گئی۔ مستند رپورٹ کے مطابق: "ہیروشیما میں اسّی ہزار شہری تیس ہزار فوجی ہلاک ہوئے اور چودہ ہزار اشخاص لاپتہ ہو گئے۔ نیز دس ہزار اشخاص شدید طور پر اور تیس ہزار افراد معمولی طور پر زخمی ہوئے۔" (ایٹم کی کہانی، ص ۱۰۵)۔ یہ زخمی سالہا سال تک ہسپتالوں میں زیر علاج رہے جن کی جسمانی حالت بالکل ناکارہ ہو کر رہ گئی تھی۔

وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ط وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ اور جب وہ برسرِ اقتدار آجاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے اور کھیتی اور نسل کو تباہ کر دے[ؔا] حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ (بقرہ : ۲۰۵)

یہ ہوا اس مسئلے کا نظریاتی حیثیت سے ایک مختصر جائزہ۔ مگر عملی حیثیت سے اور عملی دنیا میں اس وقت ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دنیا کے دیگر ممالک ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح ہیں اور فوجی لحاظ سے کمتر قوموں اور خصوصاً اسلامی ممالک کو۔ بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر۔ دھمکاتے رہتے ہیں تو کیا مسلم ممالک کو بھی "طاقت کا توازن" برقرار رکھنے کے لئے ایٹمی ہتھیار تیار کرنا چاہیئے ؟

ماہرین کا کہنا ہے کہ جب کسی ملک کے پاس ایسا ہتھیار موجود ہو جس سے دوسرا ملک محروم ہو تو وقت پڑنے پر پہلا ملک دوسرے ملک کے خلاف وہ ہتھیار ضرور استعمال کرے گا۔ مگر جب دوسرا ملک بھی اسی قسم کے ہتھیار سے مسلح ہو تو پھر پہلا ملک اس کے استعمال سے احتراز کرے گا۔ چنانچہ امریکہ نے دوسری جنگ عظیم میں جاپان کے خلاف ایٹم بم اسی وجہ سے استعمال کیا کہ جاپان اس قوت سے محروم تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو ایٹم بموں کی تباہی کو دیکھ کر جاپان کے ہوش اڑ گئے اور فوراً اس نے گھٹنے ٹیک دیئے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عقل و منطق کا تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک بھی اپنے دفاع کی خاطر ایٹمی ہتھیار تیار کریں۔ مگر جب دینی و شرعی نصوص کی

ؔا قرآنی الفاظ میں بڑی لچک ہوتی ہے اور وہ جدید سے جدید تر قسم کے مفہوم کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ "کھیتی اور نسل کی تباہی" یا قابلِ کاشت زمینوں اور انسانی نسلوں کو برباد کر دینے کا جو وسیع مفہوم آج پایا جا رہا ہے وہ اس آیت کریمہ کے مفہوم کے عین مطابق ہے۔

طرف نظر جاتی ہے تو اس کی قباحت بالکل واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اب یہ فقہائے امت کا کام ہے کہ وہ تمام نصوص کو سامنے رکھ کر غور کریں کہ آیا "الضرورات تبیح المحظورات" کے کلیئے کی رُو سے کم سے کم "طاقت کا توازن" برقرار رکھنے اور اس کی تیاری کی حد تک اس کا جواز نکل سکتا ہے یا نہیں؟

ایک عبرت اور ایک خوش خبری

یہ عجیب بات ہے کہ آج روئے زمین پر مسلمانوں کی تعداد کم و بیش ایک ارب ہے اور دنیا کے نقشے پر چالیس سے زیادہ مسلم حکومتیں سر پر آرا نظر آتی ہیں۔ ان میں سے بعض ممالک تیل کی دولت اور دیگر قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کی بنا پر نہایت درجہ خوش حال ہیں بلکہ دنیا بھر کی جائیدادوں کو خرید رہے ہیں۔ مگر حیرت کا مقام ہے کہ اس کے باوجود حقیقت کے اعتبار سے مسلمانوں کا کوئی مقام نہیں ہے اور دنیا کا کوئی بھی بڑا ملک انہیں خاطر میں نہیں لاتا۔ بڑی طاقتیں جو چاہتی ہیں وہی ہوتا ہے اور ان کی کوئی بھی بات نہیں چلتی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت فلسطین اور افغانستان وغیرہ کے حالات ہیں۔ آخر کیا بات ہے کہ اقوام عالم کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب و دبدبہ قائم ہونا تو درکنار کوئی انہیں شمار اور گنتی میں بھی نہیں لاتا۔ حالانکہ حدیث شریف میں جن خصائص نبوت محمدی صلعم[1] کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک دشمنوں پر رعب اور دبدبہ بھی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں مذکور ہے:

عن جابر بن عبد الله الأنصاري قال، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أُعطيت خمساً لم يعطهن أحد قبلي. كان كل نبي يبعث الى قومه خاصة، وبعثت الى كل أحمر وأسود، و

---

[1] یعنی دیگر انبیاء پر رسول اللہ صلعم کی امتیازی خصوصیات۔

احلت لی الغنائم، ولم تحل لاحد قبلی۔ وجعلت لی الارض طیبۃ طہوراً ومسجداً۔ فایما رجل ادرکتہ الصلوٰۃ صلی حیث کان۔ ونصرت بالرعب بین یدی مسیرۃ شہر واعطیت الشفاعۃ۔

حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی دوسرے (پیغمبر) کو نہیں دی گئیں: (۱) ہر نبی کی بعثت اپنی قوم کے لئے مخصوص تھی۔ اور میری بعثت تمام سیاہ وسپید (اقوام) کے لئے ہے۔ (۲) میرے لئے غنیمت کا مال حلال کر دیا گیا ہے۔ جو مجھ سے پہلے کسی دوسرے نبی کے لئے حلال نہیں تھا۔ (۳) میرے لئے پوری زمین پاک اور سجدہ گاہ بنا دی گئی ہے۔ لہٰذا جس شخص کے لئے جہاں کہیں بھی (سفر وحضر میں) نماز کا وقت آجائے وہ وہیں پر نماز پڑھ لے (۴) اور مجھے وہ رعب دیا گیا ہے جو ایک ماہ کی مسافت تک کارگر ہو سکتا ہے (۵) اور مجھے شفاعت (کا حق) دیا گیا ہے۔[۱۲]

اس چوتھی خصوصیت کے الفاظ یہ ہیں: "وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ بَيْنَ يَدَيْ مَسِيرَةَ شَهْرٍ" اس کی تشریح میں علامہ محمد طاہر پٹنی تحریر فرماتے ہیں: الرعب: الخوف والفزع، فقد اوقع اللہ الخوف فی اعدائہ فخافوہ من مسیرۃ شہر وفزعوا منہ[۱۳] یعنی رعب کے معنی خوف اور گھبراہٹ کے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ آپ کے دشمنوں کے دلوں میں ڈال دے گا لہٰذا وہ آپ سے ایک مہینے کی راہ سے خوف اور گھبراہٹ محسوس کرنے لگیں گے۔"

اس سے مراد متعین طور پر ایک ماہ کی مسافت مقصود نہیں بلکہ اصل

---

[۱۲] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، ۱/ ۳۷۰ — ۳۷۱ دار الافتاء ریاض۔

[۱۳] مجمع بحار الانوار، ۲/ ۳۳۹، طبع حیدرآباد، ۱۹۷۰ء

ہیں اس کی شدت و ہیبت کا احساس دلانا مقصود معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال سوال یہ ہے کہ آج دشمنوں کے دلوں میں یہ خوف اور گھبراہٹ یا مسلمانوں کا رعب و دبدبہ باقی کیوں نہیں رہا۔ جب کہ وہ آپ کے توسط سے آپ کی امت کے خصائص میں سے ہے۔ یہ ایک بہت اہم سوال ہے اور اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہم نے دین سے روگردانی تو کی ہی ہے مگر دین کی اصل حقیقت و ماہیت کے سمجھنے میں بھی روگردانی و اعراض سے کام لیا ہے۔ اگر دین کو اس کے وسیع تناظر یا اس کے صحیح منظر و پس منظر میں دیکھتے تو حقیقت ہم پر پوری طرح واضح اور روشن ہو جاتی کہ دین کے شعائر اور ان کے دفاع کے لئے بھی بہت زیادہ دور اندیشی اور تمام مادی وسائل اور منصوبوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہم اگر رسول اکرم صلعم کی سیرت طیبہ میں غور کریں تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ آپ جس طرح ایک بہترین ہادی و رہنما اور شارع و قاضی — دینی و شرعی اعتبار سے — تھے۔ اسی طرح آپ دنیوی اعتبار سے بھی ایک بہترین مدبر، دور اندیش، سیاست دان اور عظیم فوجی جرنل بھی تھے۔ چنانچہ حالات کی نزاکتوں اور تقاضوں کے لحاظ سے آپ حسب ضرورت اپنی کمان اور ڈپلومیسی[۱۴] کا رُخ متعین کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہمیں خصوصیت کے ساتھ جنگ اُحد، جنگ خندق اور صلح حدیبیہ کے موقع پر نظر آتا ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

بہر حال یہ رعب و دبدبہ — جو خصائص نبوت محمدیہ میں سے ہے — اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب کہ دین کی حقیقت اور اس کی ہمہ گیری کو سمجھا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لئے عملی اقدامات کئے جائیں۔ اس

---

[۱۴] موجودہ دور کی گندہ ڈپلومیسی نہیں جس میں جائز و ناجائز کی تمیز بالکل نہیں کی جاتی۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب تدبر و ہوشیاری اور بیدار مغزی ہے۔ مگر اس مفہوم کی صحیح ادائیگی کسی دوسرے لفظ کے ذریعہ مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔

لحاظ سے مادی ذرائع و وسائل کے حصول اور ان کی کارفرمائی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دینی اقدار سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ جب تک مادی حیثیت سے بھی خود کو طاقتور نہ کیا جائے دشمنوں پر رعب طاری نہیں ہو سکتا اور کائنات کی تسخیر عمل میں نہیں آسکتی۔ جس کی پیشین گوئی مسلم شریف کے اس باب کی ایک دوسری حدیث میں اس طرح کی گئی ہے:

"حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں جامع کلمات کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔ مجھے رعب عطا کیا گیا ہے۔ اور جب کہ میں سو رہا تھا زمین کے خزانوں کی کنجیاں لائی گئیں اور میرے سامنے رکھ دی گئیں۔ ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلعم تو رخصت ہو گئے اور تم ان خزانوں کو نکال رہے ہو۔"[۱۵]

اس حدیث میں فَوُضِعَتْ بَیْنَ یَدَیَّ "(یہ کنجیاں میرے سامنے رکھ دی گئیں) کے الفاظ ہیں اور ایک دوسری حدیث میں فَوُضِعَتْ فِی یَدَیَّ "(میرے ہاتھوں پر رکھ دی گئیں)[۱۶] کے الفاظ موجود ہیں مگر دونوں کا حاصل ایک ہے۔

یہ پیشین گوئیاں اگرچہ صحابہ کرامؓ کے دور میں ایک حد تک پوری ہو چکی ہیں[۱۷]، جب کہ انہوں نے قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو پاش پاش کر کے اس دور کے خزائن ارضی پر قبضہ کر لیا تھا مگر عمومی اعتبار سے دیکھا جائے[۱۸] تو یہ بات

---

۱۵ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، ۱/۳۷۱-۳۷۲، مطبوعہ ریاض ۱۶ ایضاً ۱/۳۷۲

۱۷ ملاحظہ ہو مسلم کی شرح نووی برحاشیہ صحیح مسلم مطبوعہ رشیدیہ دہلی، ۱/۱۹۹

۱۸ ان احادیث میں "خزائن الارض" کے الفاظ مذکور ہیں۔ اگر اس پیش خبری کا دائرہ صرف صحابہ کرام ہی کے دور تک محدود رکھا جائے تو "الارض" سے مراد ایک معہود ذہنی کے طور پر محض ایک مخصوص خطۂ زمین ہی ہو سکتا ہے، جب کہ وسیع معنی میں (بطور استغراق) اس سے پورا کرۂ ارض بھی مراد ہو سکتا ہے۔

قیامت تک ہر دور میں صادق آسکتی ہے۔ اس اعتبار سے یہاں پر ان دونوں فقروں:
(۱) مجھے رعب عطا کیا گیا ہے اور (۲) زمین کی کنجیاں میرے ہاتھوں پر رکھ دی گئی ہیں،
کے درمیان گہرا ربط و تعلق نظر آتا ہے۔ جس کی ترتیب یوں ہو گی:

۱۔ رعب و دبدبہ قائم کرنے کے لئے خود کو طاقتور بنانا ضروری ہے۔
۲۔ خود کو طاقتور بنانے کے لئے مادی آلات و وسائل سے بھی خود کو لیس کرنا ضروری ہے۔
۳۔ مادی آلات و وسائل میں ترقی ہی کے باعث ممالک فتح ہوتے ہیں اور سائنسی نقطۂ نظر سے "خزائن ارض" ہاتھ آتے ہیں۔

اس رعب و دبدبہ کے اُٹھ جانے کے باعث آج ملّت اسلامیہ کی جو ذلت و خواری دُنیا بھر میں ہو رہی ہے اس پر تبصرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ حالات آج ہر شخص اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں صراحتاً اس کی بھی پیش خبری حیرت انگیز طور پر ان الفاظ میں ملتی ہے:

"ثوبانؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ قریب ہے کہ (تمام) قومیں تم پر (متحدہ طور پر) ٹوٹ پڑیں جس طرح کہ کھانا کھانے والے برتن پر ٹوٹ پڑتے ہیں کسی نے پوچھا کہ کیا اُس وقت ہم تعداد میں کم ہوں گے؟ تو آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ تم اس وقت بہت زیادہ تعداد میں ہو گے۔ لیکن تم جھاگ (غُثَا) کی طرح ہو گے جس طرح کہ سیلاب کی وجہ سے (پانی کے اوپر جھاگ آجاتا ہے)۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا خوف دُور کر دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری (وَھْن) ڈال دے گا۔ پوچھنے والے نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلعم وہ کمزوری کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ دنیا کی محبّت اور موت سے کراہت"[19]

یہاں پر دو چیزیں ہو گئیں: ایک تو دشمنوں کے دلوں سے ہمارا خوف یا

---

[19] ابو داؤد، کتاب الملاحم ۴/۴۸۳ — ۴۸۴ دار الحدیث حمص، سوریہ، ۱۹۷۳ء

رعب و دبدبے کا جاتا رہنا اور دوسرے خود ہمارے دلوں میں "وَھَن" (دین کی محبّت کے مقابلے میں دنیا کی محبّت اور اس سے پیار) پیدا ہو جانے کے باعث ان میں اغیار کا خوف داخل ہو جانا۔ گویا کہ ترتیب معکوس ہو گئی اور مقصد ہی اُلٹ گیا۔ لہذا اب جب تک کہ پھر دوبارہ موجودہ حالت معکوس نہیں ہوتی ہمارے حالات بھی معمول پر نہیں آسکتے۔ بالفاظ دیگر جب تک کہ موجودہ مسلمانوں کے دلوں سے "وھن" دور نہیں ہوگا اغیار کے دلوں میں ان کا "رعب" بھی داخل نہیں ہو سکتا۔ ایک چیز نکلے گی تو دوسری چیز داخل ہو گی۔ یہ ہمارے زوال وادبار کے اسباب و محرکات کی بالکل صحیح صحیح نشان دہی ہے جو اس حدیث شریف میں ایک اعجازی انداز میں اور محض ایک لفظ کے ذریعہ نقاب کشائی کر دی گئی ہے۔ گویا کہ وہ ہم کو موجودہ طوفانی بھنور سے باہر نکلنے کا راستہ بھی بتا رہی ہے۔

لہذا ہمیں دوبارہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے اپنے تمام ذاتی اغراض و مقاصد اور تمام دنیوی خواہشات کو ترک کر کے نیز نسلی، قومی، لسانی اور جغرافیائی ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہو کر محض دین الہٰی کی سربلندی اور رضائے الہٰی کے حصول کی خاطر جدوجہد کرنی چاہیئے تب کامیابی ہمارے قدم چومے گی، نصرت الہٰی شاملِ حال ہو گی اور اغیار کے دلوں میں اللہ ہمارا رعب و دبدبہ بھی ڈال دے گا۔ اور صلے کے طور پر ہم کو دنیا بھی عطا کرے گا۔ مگر دنیا اصل مقصود نہ رہے۔

احادیث ہی کی پیش گوئی کے مطابق اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے ذریعہ ایک ایسا وقت بھی ضرور آنے والا ہے جب کہ روئے زمین پر کوئی کچا پکا مکان ایسا موجود نہ رہے گا جس میں اسلام فاتحانہ طریقے سے داخل نہ ہو چکا ہو اور ہر کوئی اسلام کے غلبے کو محسوس طور پر تسلیم کرتے ہوئے اپنا سر نیاز نہ جھکا دے۔

لا یبقی علی ظہر الارض بیت مَدَرٍ ولا وَبَرٍ الا ادخلہ کلمۃ الاسلام بعز عزیز و ذل ذلیل أما یعزھم فیجعلہم من أھلھا أو یذلھم فیدینون لھا۔ قلت فیکون الدین

کلہ للہ۔[20]

روئے زمین پر کچا یا پکا ایسا کوئی مکان باقی نہ رہے گا جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمے کو داخل نہ فرما دے، خواہ کسی آبرومند کے لئے آبرومندانہ طور پر یا کسی بے آبرو کے لئے ذلت و خواری کے طور پر۔ (حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ) اس طرح پورا دین اللہ کا ہو جائے گا۔

یعنی اللہ تعالیٰ عزت و آبرو اس طور پر عطا کرے گا کہ وہ اسلام قبول کر لے یا ذلیل و خوار اس طرح بنائے گا کہ وہ اس کے اطاعت گزار اور باج گزار بن جائیں۔ چنانچہ اس حدیث کی شرح میں مُلّا علی قاری فرماتے ہیں: "بعز عزیز" سے مراد وہ لوگ ہیں جو برضا و رغبت بغیر جنگ و جدال کے اسلام قبول کر لیں گے اور "ذل ذلیل" سے مُراد وہ لوگ ہوں گے جو اسلام تو نہیں قبول کریں گے مگر طوعاً و کرھاً ذمّی بن کر جزیہ ادا کریں گے۔ یا جنگ کر کے قید و بند کی تکالیف جھیلیں گے اور یہ حدیث اس آیت کریمہ سے ماخوذ ہے: "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ"۔ (وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت (کاملہ) اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔ اگرچہ مشرک اس کو ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔) اور کہا گیا ہے کہ یہ بات آخر زمانے میں پوری ہو گی"۔[21]

ان تمام حدیثوں کا حاصل یہ ہے کہ ہماری اصل منزل مادی اور روحانی دونوں حیثیتوں سے اسلام کا غلبہ و تفوق اور دین حق کی کامل سربلندی ہے۔ اس طور پر کہ دنیا کی تمام قومیں اور تمام گھرانے اسلام کے غلبے کو طوعاً و کرھاً تسلیم کر لیں اور

---

[20] مسند احمد، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الایمان، ص ۱۶۔ مطبع مجیدی کانپور

[21] ملخص از مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، ۱/۹۸-۹۹، مطبوعہ بمبئی۔

اس کے سامنے پوری طرح ہتھیار ڈال دیں۔ اب یہ اسلامی مملکتوں کے سربراہوں اور ذمہ داروں کے سوچنے کی بات ہے کہ وہ اس مقصد عظیم کو حاصل کرنے کے لئے کس طور پر کام کریں اور مسلم معاشرے کو کن خطوط پر چلائیں! مگر اتنی بات نوٹ ہے کہ جب تک مسلم معاشروں کے درمیان بنیادی خرابی (وھن) موجود رہے گا مسلم معاشرہ صحیح اور مثبت خطوط پر ہرگز آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اور جب تک یہ "وھن" دُور نہ ہو گا اسلام کا رعب و دبدبہ قائم نہیں ہو سکے گا اور جب تک یہ رعب و دبدبہ قائم نہ ہوا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی حیثیت ایک خواب پریشاں کی سی رہے گی۔

دین اسلام کے اس عالمگیر اور ہمہ گیر غلبے و استیلا کے لئے ضروری ہے کہ دنیا بھر کے تمام مسلم ممالک مل کر متفقہ اور متحدہ طور پر کوئی لائحہ عمل بنائیں اور جلتنی جلد ممکن ہو سکے اپنے سارے قومی اور جغرافیائی اختلافات کو مٹا کر ایک عظیم تر مقصد کی خاطر ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں یا کم از کم اپنی ایک مشترکہ یونین قائم کر لیں۔ اگر مسلم ممالک کے موجودہ اختلافات اسی طرح باقی رہے تو سب کے سب آپس ہی میں دست بگریبان ہو کر اپنی توانائی ختم کر لیں گے اور ایک ایک کر کے سب مٹ جائیں گے۔ لہٰذا اسلام کی دوبارہ سربلندی کا یہ مقصد عظیم کسی بھی حال میں نظروں سے اوجھل نہ ہونا چاہیئے۔ یہ اسلام کے لئے بہت نازک اور کٹھن وقت ہے جو باہم دست و گریباں ہونے کا نہیں بلکہ باہم شیر و شکر ہونے کا ہے۔

دین اسلام کو صحیح معنی میں غالب اور پوری دنیائے اسلام کو صحیح اور حقیقی معنی میں متحد کرنے کے لئے ضروری ہے کہ "خلافت اسلامیہ" کے فراموش شدہ تصوّر کو پھر سے زندہ کیا جائے جس کے باعث بے شمار فوائد حاصل ہونے کی توقع ہے۔ لہٰذا آیندہ سطور میں اس کے متعلق چند گزارشات پیش کی جا رہی ہیں۔

خلافت اسلامیہ اور عالمِ اسلام کا اتحاد

علامہ ابن خلدون (۷۳۲ - ۸۰۸ھ مطابق ۱۳۳۱ - ۱۴۰۶ء) نے اپنی تاریخ کے مقدمے میں عربوں کے مزاج کا تجزیہ کرتے ہوئے بڑی گہری حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے اور اس کا علاج بھی بتا دیا ہے۔ جو اُن کے کمالِ بصیرت اور دُور بینی کا آئینہ دار ہے۔

"عربوں کو سلطنت و حکومت یا تو دینی چھاپ کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے یا نبوت و ولایت یا دین کے کسی بہت بڑے اثر کی بدولت۔ کیونکہ ان کی فطرت ایسی سخت، غیور اور خوددار قسم کی واقع ہوئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی اطاعت سے دیگر قوموں کی بہ نسبت سخت متوحش ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی خواہشات کا (کسی ایک پلیٹ فارم پر) جمع ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا دین جب نبوت یا ولایت (دینی سیادت) کے ذریعہ ان کے لئے مانع بن جائے تو ان میں (اپنی ذاتی) بڑائی اور برتری کے جذبات سرد پڑ جائیں گے، اطاعت شعاری اور باہمی ملاپ اُن کے لئے آسان ہو جائے گا۔"[۲۲]

اسلام کے خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (شہادت ۲۳ھ مطابق ۶۴۴ء) نے بڑی سچی بات بیان فرمائی ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کو اپنی گرہ میں باندھ لینی چاہیئے: "نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام، وان ابتغینا العزۃ بغیرہ اذلنا اللہ" یعنی ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کو اللہ نے اسلام کے ذریعہ عزت بخشی ہے۔ اگر ہم نے عزت و بڑائی کو اسلام کے علاوہ کسی اور چیز میں تلاش کیا تو اللہ ہم کو ذلیل کر دے گا۔[۲۳]

اس حقیقتِ واقعہ کی صداقت موجودہ دور میں خصوصیت کے ساتھ عرب اسرائیل جنگوں کی شکل میں ہمارے سامنے آچکی ہے۔ جب کہ بعض عرب ممالک نے

---

[۲۲] مقدمہ ابن خلدون، ص ۸۳، المطبعۃ الخیریۃ، مصر ۱۳۲۲ھ

[۲۳] البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر۔

مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر (۱۹۱۸ ۔ ۱۹۷۰ء) کی سرکردگی میں عرب قومیت کا صور پھونکتے ہوئے عالم عرب کو عالم اسلام سے کاٹ کر بالکل الگ کر دینا چاہا تو نہ صرف خود ذلیل و رسوا ہوئے بلکہ پورے عالم اسلام کو بھی ذلیل و رسوا کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو متحد کرنے اور انہیں ایک لڑی میں پرو کر ہر قسم کے ذہنی و فکری اور قومی و علاقائی انتشار اور عصبیتوں سے محفوظ رکھنے کا واحد ذریعہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اسلام ہی میں وہ حیرت انگیز کشش اور جاذبیت ہے جو دنیا بھر کی تمام قوموں اور فرقوں کو حقیقی اور پائیدار بنیادوں پر ایک جھنڈے تلے جمع کر سکتی ہے۔ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا نعرہ انہیں ہرگز متاثر نہیں کر سکتا۔ اور ہرگز ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں کر سکتا۔

جیسا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ اس وقت پورے عالم اسلام کی قیادت ــ اپنے چند ذاتی خصائص کی بنا پر ــ عالم عربی ہی کر سکتا ہے، جس طرح کہ اس نے اب سے چودہ سو سال پہلے کی تھی، بشرطیکہ وہ اپنی اصل قدر و قیمت پہچان لے۔

"چھٹی صدی عیسوی میں دنیا ایک دوراہے پر کھڑی تھی اس وقت دو ہی راستے تھے: یا تو عرب کے لوگ اپنے جان و مال کو خطرہ میں ڈال کر آگے بڑھ جاتے اور دنیا کی ترغیبات سے کنارہ کش ہو کر اجتماعی مصلحت کی راہ میں اپنا سارا سرمایہ قربان کر دیتے۔ جب دنیا کو سعادت نصیب ہوتی یا پھر وہ اپنی خواہشات اور مرغوبات کو انسانیت کی سعادت و فلاح پر ترجیح دیتے تو ایسی صورت میں دنیا گمراہی و بدبختی کے دلدل میں پھنسی رہ جاتی لیکن اللہ تعالیٰ کو انسانیت کی بھلائی منظور تھی اس لئے عربوں میں اس نے ولولہ پیدا کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اندر ایمان و ایثار کی روح پھونک دی تو انہوں نے اپنے آپ کو انسانیت پر قربان کرنے کے لئے پیش کر دیا۔

آج دنیا ہٹ ہٹا کر پھر اس نقطے پر پہنچ گئی ہے جس پر وہ چھٹی صدی مسیحی

یں تھی۔ یہ عالم پھر اسی دوراہے پر نظر آرہا ہے جس دوراہے پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تھا۔ آج اس کی ضرورت ہے کہ عرب قوم (جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق خاص ہے) میدان میں نکل آئے۔ اور پھر دنیا کی قسمت بدلنے کے لئے جان کی بازی لگائے اور اپنی تمام آسائش و ثروت اور سامانِ راحت کو خطرے میں ڈال دے۔ تاکہ دنیا اس مصیبت سے نجات پائے جس میں وہ مبتلا ہے۔ اور زمین کا نقشہ بدل جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عرب بدستور اپنے حقیر اغراض اور ذاتی سربلندی کی فکر میں رہیں اور سامان عیش کی فراہمی میں مشغول رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا اسی زہریلے تالاب میں غوطہ زن رہے گی جس میں وہ صدیوں سے ہلاک ہورہی ہے[۲۴]

اس طرح آج عربوں پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اُن کا کوئی بھی غلط قدم سنگین اور تباہ کن نتائج پیدا کرسکتا ہے۔ کیونکہ اس وقت نہ صرف عالمِ اسلام بلکہ پورا عالمِ انسانی سخت جانکنی اور نزع کے عالم میں ہے لہذا ہماری ملت کے ناخداؤں کا فرض عین ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر سمجھیں پھر ان کو صحیح طور پر ادا کرنے کی کوشش کریں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس قیادت کو عملاً بروئے کار لانے کی کیا شکل ہو اور عالمِ اسلام کس طرح اور کن خطوط پر منتج ہوسکے گا۔ یہ بڑے اہم اور نازک سوالات ہیں۔ جو ہمارے قائدین اور اربابِ دانش کے لئے ایک لمحۂ فکریہ فراہم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مسائل کے حل کے بعد ہی کوئی مناسب قدم اُٹھایا جاسکے گا۔

راقم سطور کے ناقص خیال میں اس مسئلے کا بہترین حل یہ ہے کہ

۲۴؎ ملخص از انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص ۴۴۶ ـ ۴۴۷ کراچی ۱۹۶۹ء

"خلافت اسلامیہ" کے فراموش کردہ تصور کو دوبارہ زندہ کیا جائے جس کو دنیا کے تمام مسلمانوں کی نظر میں دینی اعتبار سے ایک تقدس کا درجہ حاصل تھا۔ پوری دُنیائے اسلام کا ایک "خلیفۃ المسلمین" ہو جس کے جھنڈے تلے تمام مسلم ممالک وفاقی (federal) حیثیت سے جمع ہو جائیں یا پھر ایک ڈھیلی ڈھالی یونین اور ایک متحدہ سکریٹریٹ قائم کر کے عالم اسلام کو ایک مرکزیت عطا کی جائے کیونکہ وہ آج بے مرکز اور بے منبر و محراب ہے۔ یہ وہ صدا ہے جس کے لئے ساری اسلامی دنیا کا دل دھڑک رہا ہے۔ اور سب کی نگاہیں قدرتی طور پر عالم عرب پر مرکوز ہیں۔ یہ عالم عرب کے لئے ایک بہت بڑا امتحان اور آزمائش ہے اور خدا کرے کہ وہ اپنی اس آزمائش میں پورا اترے۔

"خلافت اسلامیہ" کا یہ اصطلاحی مفہوم اور اس کا تصور بھی دراصل وسیع تر "خلافت ارض" ہی کا ایک جزو اور اس کا ایک حصہ ہے۔ اگر ہم "خلافت اسلامیہ" قائم نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم وسیع تر خلافت ارض کے لئے بھی نااہل ہیں جو خدا کے نزدیک مطلوب و مقصود ہے۔ خلافت ارض کے قیام کے لئے سب سے پہلے خلافت اسلامیہ کا قیام ضروری ہے۔ اور یہ خداوند کریم کی جانب سے ہمارا بہت بڑا ابتلائ ہے لہٰذا ہمیں اس راہ میں ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

یہ ملت اسلامیہ کی بڑی محرومی اور بدنصیبی تھی کہ ترکی کے مصطفےٰ کمال پاشا (۱۸۸۰-۱۹۳۸ء) نے (یورپ کے) اتحادیوں اور خاص کر انگریزوں کے اشارے پر[25] خلافت اسلامیہ کو (۳ / مارچ ۱۹۲۴ء میں[26]) ختم کر کے وحدت اسلامی کو پارہ پارہ

---

۳۵ ملاحظہ ہو ماہنامہ "جامعہ" کے مولانا محمد علی نمبر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مضمون ص ۳۶، اپریل ۱۹۷۹ء نیز مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "پرانے چراغ" حصہ دوم ص ۱۷، مجلس نشریات اسلام کراچی ۱۹۸۱ء

۳۶ انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم، مترجمہ غلام رسول مہر ۱/۳۷۱، لاہور ۱۹۶۸ء

کر دیا۔ اور اپنی سادہ لوحی کے باعث استعماریت (colonialism) کی خدمت کی اور اسلام کو ایسا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا کہ ملت اسلامیہ اب تک اپنے زخموں کو چاٹ رہی ہے۔ حکیم مشرقِ علامہ اقبال نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے ؎

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا   سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

حقیقت یہ ہے کہ ایک مرکزی خلافت کے قیام کے باعث دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس سے ایک جذباتی تعلق پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ ۱۹۲۴ء سے قبل کے واقعات شاہد ہیں کہ جب انگریزوں نے ترکی خلافت کو ختم کر کے اس کے حصے بخرے کرنے کا منصوبہ بنایا تو ہندوستانی مسلمانوں پر اس کا شدید ردِ عمل ہوا اور ترکی کی خلافت کو (جو اس وقت پورے عالم اسلام کی مرکزی خلافت سمجھی جاتی ہے اور اس کو ایک طرح کے مذہبی تقدس کا درجہ حاصل تھا) بچانے کے لئے مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ - ۱۹۳۱ء) کی قیادت میں جو زبردست تحریک چلی وہ تاریخ میں "تحریک خلافت" کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں نے سے اپنے غلام ہونے کے باوجود جس اسلامی جذبہ اور جوش کا مظاہرہ کیا وہ دنیا والوں کے لئے باعث حیرت و استعجاب اور ایک مثالی نمونہ تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی نے ان کے سینوں میں آگ لگا دی ہے۔ اور ان کے جذبات و احساسات اور ان کے شدید ردِ عمل سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ انگریز ترکی سے نہیں بلکہ ہندوستانی مسلمانوں سے لڑ رہے ہیں۔ اس موقع پر ہندوستانی مسلمانوں نے جو قربانیاں دی ہیں وہ تاریخ کے صفحات میں زندہ اور یادگار رہیں۔ آج بھی برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں بلکہ سارے جہاں کے اہل ایمان میں یہی جذبات موجزن ہیں اور وقت پڑنے پر وہ ہر قسم کی قربانیاں دے سکتے ہیں۔

غرض "خلافت اسلامیہ" مسلمانوں کے دل کی آواز اور ایک اور سب مسلمانوں کے دل کی دھڑکن بن سکتی ہے بشرطیکہ صحیح خطوط پر کام کیا جائے

اور صحیح طریقے پر انہیں منظم کیا جائے جو اس وقت بے قاعدہ اور بے پرواہے کی بکریوں کی طرح ادھر ادھر منتشر اور بکھرے ہوئے ہیں۔

"خلیفۃ المسلمین" جس کو بنایا جائے وہ خدا کے احکام کو نافذ کرنے اور دنیا کے تمام مسلمانوں کی بہبودی کو مدنظر رکھنے والا ہونا چاہیئے۔ اس لحاظ سے اس کے تمام احکام — اسلامی قانون کے حدود میں — سب کے لئے واجب الاطاعت ہوں گے۔

ابھی ماضی قریب میں عالم اسلام کو متفق و متحد کرنے کی ایک بہت بڑی کوشش شروع ہو چکی تھی جس کے داعی اور محرک ملیشیا کے سابق وزیر اعظم ٹنکو عبدالرحمٰن تھے۔ افسوس کہ یہ کوشش بارآور نہ ہو سکی اور جذبات پھر سرد پڑ گئے۔ یہ کوشش از سر نو شروع ہونی چاہیئے اور اس کو ہر قیمت پر پایۂ تکمیل کو پہنچایا جائے۔ اگر اس راہ میں پچیس پچاس سال بھی صرف ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ضرورت صرف مستقل مزاجی اور فولادی عزم کے ساتھ کام کرنے کی ہے۔ اس راہ میں چند مخلص اور بے لوث آدمیوں کو اپنی زندگیاں وقف کر دینی چاہیئے۔ کیونکہ اس قسم کے نتائج راتوں رات برآمد نہیں ہو سکتے۔ ذہن سازی اور قوموں کی تعمیر بہت مشکل، صبر آزما اور پتہ ماری کا کام ہے مگر ناممکن اور محال نہیں ہے جیسا کہ تاریخ کے مطالعے سے ہوتا ہے منظم منصوبہ اور مسلسل عمل یہ دو چیزیں کامیابی کی ضمانت بن سکتی ہیں۔

وسیع تر کار خلافت کے پیش نظر ابتداءً اگر صرف چند ہم خیال ممالک بھی متحد ہو کر محدود پیمانے پر خلافت اسلامیہ کا تجربہ کریں تو اس عمل کے ذریعہ جن حیرت انگیز نتائج کے نکلنے کی توقع ہے ان کے ظہور کے بعد مزید ممالک کو بھی اس بلاک میں شامل ہونے کی ترغیب مل سکے گی۔ پھر اس کے بعد دیگر ممالک بھی بتدریج برضا و رغبت اس میں شامل ہو سکیں گے۔ صحیح خطوط پر کام شروع کرنے کے لئے یہ ایک صحیح نقطہ آغاز ہے۔

دنیائے اسلام میں رونما ہونے والے چند جدید ترین واقعات اور خصوصاً مسلم افغانستان پر روس کی فوج کشی اور یلغار نے مسلم ممالک کی آنکھیں کھول

دینے اور اپنے تمام باہمی اختلافات کو فراموش کر کے متحد ہو جانے کا ایک نادر موقع فراہم کر دیا ہے۔ اگر اب بھی تمام مسلم ممالک ایک نہیں ہو جاتے تو پھر اغیار کی ہوسناکیوں کی بھینٹ چڑھنے اور ان کا لقمۂ تر بننے کے لیے انہیں تیار رہنا چاہیے۔

اگر تمام مسلم ممالک ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں تو پھر پوری دنیا اور اس کی تمام قوتیں مل کر ان کا ایک بال بھی بیکا نہیں کر سکیں گی۔ بلکہ اس سے درحقیقت عالمی سیاست میں ایک انقلاب آ جائے گا۔ اور ان کا ایک وزن قائم ہو جائے گا۔ ان کی حیثیت موجودہ متعدد بلاکوں کے درمیان ایک "بیلنسنگ پاور" کی سی ہو جائے گی۔ یعنی وہ جس بلاک کی طرف ہو جائیں گے اس کا پلڑا جھک جائے گا۔ یہ بھی گویا کہ ایک نمونہ ہوگا ان کے "امت وسط" ہونے کا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ:

اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔ (بقرہ: ۱۴۳)

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝

اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں۔ لہذا تم مجھ سے ہی ڈرتے رہو۔ (مومنون: ۵۲)

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ لا

اور تم سب مل کر اللہ کی رسی (کتاب الٰہی یا دین الٰہی) کو مضبوط پکڑے رہو

اور متفرق مت ہو جاؤ اور تم پر اللہ کی نعمت (اس کے احسان) کو یاد کرو جب تم (باہم ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی جس کی وجہ سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ حالانکہ تم (اس وقت اپنی باہمی عداوت کی بنا پر) آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ گئے تھے پس اس نے تمہیں اس آگ سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم راہ یاب ہو سکو۔

اور چاہیئے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ضرور (برپا) ہو جو (تمام قوموں اور ملتوں کو) خیر کی طرف بلائے اور (انہیں) معروف کا حکم کرے۔ اور منکر سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح یاب ہوں گے۔

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو تفریق باہمی اور اختلاف باہمی کا شکار ہو گئے باوجودیکہ ان کے پاس واضح احکام پہنچ چکے تھے۔ ایسے لوگوں کے لئے بہت بڑا عذاب ہو گا۔ (آل عمران : ۱۰۳-۱۰۵)

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ اور اللہ اور اس کے رسول کی (ہر حالت میں) فرماں برداری کرو۔ اور آپس میں جھگڑا مت کرو ورنہ تم پست ہمت ہو جاؤ گے۔ اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور (اپنے دین و ایمان پر ہر حال میں) ثابت قدم رہو۔ بلاشبہ اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔ (انفال:۴۶)

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ

اور اگر تم نے روگردانی کی تو وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا پھر وہ لوگ تم جیسے نہ ہوں گے۔ (محمد : ۳۸)

خلافتِ ارض اور جہاد فی سبیل اللہ

اوپر کے مباحث سے واضح ہو گیا کہ جب تک دینی و اسلامی بنیادوں

ہر عالم اسلام کو متحد کر کے ایک مضبوط اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار قائم نہیں کی جائیگی ہمارے اجتماعی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اور مادی حیثیت سے قوت و شوکت حاصل نہیں ہو سکتی اور ہمارے ملک و ملت کا دفاع مکمل نہیں ہو سکتا۔ نیز اس کے علاوہ اسلام کی موثر انداز میں تبلیغ، عالم انسانی کے درمیان صحیح معنی میں محاکمہ، سیاسی و بین الاقوامی تنازعات کی روک تھام، روئے زمین پر ہر قسم کے ظلم و زیادتی کا استیصال اور عدل و انصاف کا قیام وغیرہ اغراض و مقاصد کی تکمیل بھی مادی قوت و شوکت کے حصول پر موقوف ہے۔ اور یہ تمام اغراض و مقاصد "خلافت ارض" ہی کی بنیادی غرض و غایت کو ظاہر کر رہے ہیں۔

کار خلافت کیا ہے اس پر حسب ذیل آیت کریمہ بخوبی روشنی ڈال رہی ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کو ــ جو پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ بادشاہ بھی تھے اور اسی اعتبار سے مادی قوت و شوکت سے بھی آراستہ تھے ــ مخاطب کر کے خصوصیت کے ساتھ کہا گیا:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ:

اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا تم لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا کرو (ص: ۲۶)

اس لحاظ سے خلیفہ ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس دھرتی پر عدل و انصاف قائم کیا جائے اور ظلم و زیادتی کو مٹایا جائے اور یہ معلوم ہے کہ کوئی کمزور شخص یا کمزور قوم زمین پر عدل و انصاف قائم نہیں کر سکتی۔ عدل و انصاف کے قیام کے لئے بھی قوت و طاقت کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ کمزور قوموں کو ظالموں سے ان کا حق چھین کر دلایا جا سکے۔ اور دنیا میں امن و امان بحال کیا جا سکے۔ یہ اصول نہ صرف معاشرتی و اجتماعی لحاظ سے صحیح ہے بلکہ بین الملکی اور بین الاقوامی حیثیت سے بھی صحیح ہے کیونکہ "ظالم" انسان اور ناحق کوش قوم صرف "طاقت" کے آگے ہی سر جھکا سکتی ہے۔ اخلاقی وعظ و نصیحت اس کے لئے کارگر نہیں ہوتی جیسا کہ

آج ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ محض ذرا ذرا سی بات پر "لا اینڈ آرڈر" کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) تحریر فرماتے ہیں: انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک عظیم مقصد لوگوں کے درمیان مظالم کی روک تھام کرنا بھی ہے۔ کیونکہ ان کی باہمی ظلم و زیادتی ان کے حال کو بگاڑ دیتی ہے اور ان پر زندگی تنگ کر دیتی ہے۔"[۲۷]

ان تمام مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے امت مسلمہ کو جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ جن میں سب سے زیادہ مقدم دین و ملت کی حفاظت اور ان کا دفاع ہے۔ جہاد کوئی وقتی اور عارضی فریضہ نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے جاری رہنے والا ایک مستقل فریضہ ہے جو عمومی حالات میں فرض کفایہ اور خصوصی حالات میں فرض عین بن جاتا ہے۔ (جیسا کہ تفصیل آگے آ رہی ہے) اسی بنا پر خلافت ارض کا جہاد کے ساتھ بہت گہرا ربط و تعلق ہے لہذا خلافت ارض اور جہاد کے صحیح تعلق اور اس کے فلسفے کو سمجھنے کے لئے شریعت میں جہاد کے موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کا اِس موقع پر خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔

"بدائع الصنائع" میں مذکور ہے کہ: "جہاد کے لغوی معنی طاقت لگانے یا کسی کام میں انتہائی جدوجہد کرنے کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں اس سے مراد اللہ کی راہ میں اپنی وسعت و طاقت کے مطابق نفس، مال اور زبان کے ذریعے جنگ کرنا یا اُس میں مبالغہ کرنا ہے"[۲۸]

۲۷؎ حجۃ اللہ البالغۃ، مبحث فی المظالم ۲/۱۵۱ ارشیدیہ دہلی ۱۳۵۵ھ

۲۸؎ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، از علامہ کاسانی، ۷/۹۷

مطبوعہ کراچی، ۱۴۰۰ھ

قاضی ابن رشد مالکی اندلسی (۵۲۰ - ۵۹۵ ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ حسب ذیل آیت کریمہ کی رُو سے جمہور علماء کے نزدیک جہاد فرض ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ[۲۹] قتال (جنگ) تم پر فرض کی گئی ہے حالانکہ وہ (طبعاً) تمہارے لئے گراں ہے۔ (البقرہ: ۲۱۶)

فرضیت جہاد کے بارے میں دیگر آیات یہ ہیں:-

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ط إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ اور تم اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر (اس معاملے میں) زیادتی نہ کرو۔ کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا[۳۰]۔ (البقرہ: ۱۹۰)

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ط اور تم ان سے یہاں تک لڑو فتنہ (فساد عقیدہ) باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔ (البقرہ: ۱۹۳)

فرضیت جہاد کی دوامیت پر ایک حدیث شریف میں اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

---

[۲۹] بدایۃ المجتہد، ابن رشد ۱/۳۲۵، مصر، ۱۳۳۹ھ

[۳۰] علامہ جصاص رازی اس آیت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ بقول ربیع بن انس یہ پہلی آیت ہے جو ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جہاد کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلعم کا یہ معمول رہا کہ آپ صرف ان مشرکین سے مقابلہ فرماتے جو آپ سے برسر پیکار ہوتا اور اس سے رُک جاتے جو آپ کے درپے نہ ہوتا یہاں تک کہ (جزیرۃ العرب کے) تمام مشرکین سے (اُن کی مسلسل سرکشی اور ایذا رسانی کی وجہ سے) قتال کا حکم آگیا (احکام القرآن: ۱/۲۵۷)

ایک قول یہ بھی ہے کہ ہجرت کے بعد جہاد کی پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ یہ ہے: "أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا" (اُن لوگوں کو اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے) یہ اور دیگر آیات جہاد اس بات کی بخوبی نشاندہی کر رہی ہیں کہ جہاد کوئی جارحانہ فعل یا مسلمانوں کی طرف سے زیادتی کے طور پر نہیں تھا بلکہ وہ مدافعانہ اور تمام تر دفاعی تھا جیسا کہ تاریخی طور پر ثابت ہوتا ہے۔

" والجهاد ماض منذ بعثني الله الى أن يقاتل آخر أمتي الدجال لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل : جہاد، جب سے کہ اللہ تعالیٰ نے میری بعثت فرمائی ہے اس وقت سے لے کر جب تک کہ میری امت کا آخری فرد دجال سے قتال نہ کر لے برابر (ہر دور میں) جاری رہے گا، جس کو نہ تو کسی زیادتی کرنے والے (امیر) کی زیادتی باطل کر سکے گی۔ اور نہ کسی عادل کی عدل گستری [۳۱] (یعنی وہ ہر حال میں فرض رہے گا۔ اور کسی صورت میں اور کسی حیلے سے ساقط نہ ہو سکے گا)۔

ایک دوسری حدیث میں مذکور ہے:

الخيل معقود في نواصيها الخير الى يوم القيمة الأجر والمغنم: خیر قیامت تک گھوڑوں کی پیشانیوں سے بندھا ہوا ہے یعنی اجر اور مال غنیمت [۳۲]۔

حافظ ابن حجرؒ (۷۷۲ — ۸۵۲ھ) اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ یہاں پر "خیر" سے مراد جہاد کا اجر و ثواب اور مال غنیمت ہے جو گھوڑوں سے جہاد کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ خواہ امام عادل ہو یا جائر۔ اس حدیث میں جہاد کی ترغیب ہے۔ اور قیامت تک اسلام اور اہل اسلام کے لئے بشارت بھی موجود ہے۔ کیونکہ بقائے جہاد کے لزوم سے مجاہدین کی بقا کا سامان ہوتا ہے جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں مذکور ہے: "لا تزال طائفة من أمتي يقاتلون على الحق" [۳۳] (میری امت کا ایک طبقہ ہمیشہ حق کی مدافعت میں لڑتا رہے گا۔)

۳۱ھ ابوداؤد، کتاب الجہاد ۳/۴۰ مطبوعہ حمص ۱۹۷۱ء

۳۲ھ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر ۳/۲۱۶ مطبوعہ استنبول، ۱۹۷۹ء
اس موقع پر گھوڑوں کے لفظ کو استعمال کئے جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قیامت تک اس سے مراد گھوڑے ہی ہوں گے بلکہ جو بھی ذریعہ یا وسیلہ استعمال کیا جائے۔ یہ چیز جہاد کی روح کو ظاہر کر رہی ہے۔

۳۳ھ فتح الباری ۶/۳۶۔ مطبوعہ مصر

جہاد کی تعریف۔ اور اس کے فلسفے کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاد نام ہی اس بات کا ہے کہ دشمنانِ اسلام کو اپنے ملکوں میں در آنے سے روکا جائے اور اپنے دین و ملت کا بحد استطاعت دفاع کیا جائے۔ مگر دیگر قوموں میں اس کا مفہوم محض "جنگ" سمجھا جاتا ہے جو ان کی اپنی غلط فہمی ہے اور مخالفین اسلام خصوصاً مستشرقین نے اس نظریہ کو خوب اچھالا کو یا کہ اسلام بھی ایک "خونی" مذہب ہے اور اس کو "خون آشامی" کی چاٹ پڑ گئی ہے۔ مگر اوپر جو آیتیں نقل کی گئی ہیں وہ سب اس قسم کے مہمل نظریات کی تردید کر رہی ہیں۔

مکی دور میں مسلمان کس مپرسی کے عالم میں تھے۔ اس لئے اس وقت جہاد فرض نہیں تھا۔ مگر جب مدنی دور میں انہیں قوت و طاقت حاصل ہو گئی اور اسلام جغرافیائی اعتبار سے ایک قطعۂ ارض کا مالک بن گیا تو اس وقت اسلامی سلطنت کو ہر قیمت پر بچانا اور دشمنوں کی حرص و آز سے اس کو محفوظ رکھنا ضروری ہو گیا، تاکہ اسلام اپنی باطنی خوبیوں اور اخلاقی محاسن کی بنا پر قدرتی طور پر نشوونما پاتا رہے اور اس راہ میں سدِ راہ اور مزاحم بننے والی ہر طاغوتی قوت و طاقت کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اور پوری قوت کے ساتھ ایسی تمام کوششوں کو ناکام بنایا جا سکے۔ لہذا ایسے نازک موقع پر اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور انہیں اپنے دین و ملت کی مدافعت کرنے اور برابر کا بدلہ لینے کی تاکید کی گئی۔ تاکہ بین الاقوامی اعتبار سے فتنوں کا سدِ باب ہو جائے۔ مگر یہ اخلاقی اصول بھی بیان کر دیا گیا کہ کسی قوم کے خلاف ظلم و زیادتی نہ کی جائے۔ جیسا کہ حسب ذیل آیات سے اس مسئلے پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ برابر کا بدلہ لیتے ہیں۔ (شوریٰ : ۳۹)

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی

اس پر زیادتی کرو جیسی کہ اس نے تم پر کی ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین مانو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (البقرہ: ۱۹۴)

یہ اسلام کا وہ بیش قیمت اصولِ جنگ ہے جو دنیا کی دیگر قوموں اور ان کے ظالمانہ قوانین کے مقابلے میں ایک مثالی اہمیت و نوعیت کا مالک ہے جیسا کہ تاریخ عالم شاہد ہے غیر اسلامی قوموں کے پاس جنگ کے موقع پر اخلاقیات کا کوئی خانہ ہی نہیں تھا۔ اور یہی حال موجودہ دور کا بھی ہے۔ اسلامی اور غیر اسلامی جنگوں میں اصل فرق بنیادی مقصد اور آئیڈیالوجی کا ہے مسلم قوم جب جنگ کرتی ہے تو اس کے سامنے دین کی سربلندی اور اعلائے کلمۃ اللہ مقصد ہوتا ہے لہٰذا وہ احکامِ الٰہی کی ہر حال میں پابند رہتی ہے اور دیگر قوموں پر بے جا ظلم و زیادتی کو وہ نہ صرف ایک اخلاقی گناہ سمجھتی ہے بلکہ وہ اس کو خدا کی نافرمانی بھی تصور کرتی ہے اس کے برعکس دیگر قوموں کے پاس اس قسم کا کوئی اعلیٰ و ارفع تصور ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ محض اپنی شان و شوکت اور قومی و نسلی تفاخر کے اظہار کے طور پر تلوار اٹھاتے ہیں۔ اس بنیادی فرق کی وضاحت قرآن نے اس طرح کی ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا

جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں۔ اور جو منکرِ خدا ہیں وہ طاغوت[1] کی راہ میں لڑتے ہیں۔ لہٰذا تم شیطان کے (ایسے) ساتھیوں سے لڑو (اور جان رکھو کہ

---

[1] طاغوت کے اصل معنی حد سے تجاوز کرنے والے کے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے ساحر، کاہن اور سرکش جن کو بھی طاغوت کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد ہے حد سے آگے بڑھ جانے والا اور وہ جس کو خدا کے سوا معبود بنا لیا جائے۔ (المفردات، ص ۳۰۵) معبود بنا لینے کا مفہوم موجودہ اصطلاح کے مطابق کوئی ایسا نظریۂ حیات ہو سکتا ہے جو خدا بیزار قسم کا ہو۔ جیسے کمیونزم اور نیشنلزم وغیرہ۔

شیطان کی تدبیر بلاشبہ کمزور ہوتی ہے۔[۳۵] (النساء: ۷۶)

اس اصول کی وضاحت حدیث شریف میں اس طرح کی گئی ہے:

"ایک شخص نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دریافت کیا: بتایئے ایک شخص مال غنیمت حاصل کرنے کے لیئے لڑتا ہے۔ دوسرا شخص نام ونمود کے لیئے لڑتا ہے اور کوئی شخص اپنے مرتبے کو بلند کرنے کے لیئے لڑتا ہے، تو ان میں سے کون اللہ کی راہ میں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ صرف وہ شخص اللہ کی راہ میں ہوگا جس نے اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیئے جنگ کی ہو۔"[۳۶]

"اللہ کے کلمے کو بلند کرنا" (اعلائے کلمۃ اللہ) ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں پوری شریعت اسلامیہ کا نفاذ داخل ہے۔ اس اعتبار سے اس میں تمام اخلاقی مفاسد کی روک تھام اور ہر قسم کے ظلم وعدوان کا استیصال بھی شامل ہے تاکہ یہ دھرتی صحیح معنی میں امن وسلامتی کا گہوارہ بن جائے اور پوری مخلوق الٰہی (الخلق عیال اللہ کے مطابق) ایک وسیع کنبے کی شکل میں چین اور سکون کا سانس لے اور کسی کو بھی مراسم عبودیت کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ

---

۳۵ دشمن کے مقابلے کے لئے نفسیاتی اعتبار سے سپاہیوں کے حوصلوں کو بلند رکھنے کے لئے جدید فلسفہ جنگ کے مطابق مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ اور اس بات کی سرتوڑ کوشش کی جاتی ہے کہ اپنی فوج دشمن کے مقابلے میں حوصلہ نہ ہارے کیونکہ یاس اور ناامیدی ہمیشہ شکست کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس نکتے کو قرآن نے چودہ سو سال پہلے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر اس حقیقت پر بھی روشنی ڈال دی کہ جہاد کی صورت میں دو ہی نتیجے برآمد ہو سکتے ہیں: یا تو فتح وکامرانی حاصل ہوگی یا پھر جام شہادت نوش کرنے کے باعث حیات جاودانی۔ اور دونوں ہی صورتوں میں گویا کہ گوہر مقصود حاصل رہے گا: قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ (کہہ دو کہ تم تو ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے کسی ایک ہی کے منتظر رہتے ہو: توبہ ۵۲)۔

۳۶ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر ۳/ ۲۰۶

محسوس نہ ہو۔ یہ جہاد کا صحیح فلسفہ اور اس کی اصل روح ہے، جیسا کہ حسب ذیل آیت کریمہ سے مستفاد ہوتا ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ط اور تم ان سے یہاں تک لڑو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ ہی کا ہو جائے۔ (انفال: ۳۹)

لفظ "فتنہ" سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں امام راغب اصفہانی (المتوفی: ۵۰۲ھ) نے بہت بہترین تحقیق کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"فتنے کی اصل سونے کو آگ میں تپانا ہے تاکہ اس کا کھوٹ زائل ہو اور اس کی چمک دمک ظاہر ہو جائے۔ اور اس طرح یہ انسان کو آگ میں داخل کرنے کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے: (يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ)[۳۷] اس اعتبار سے اس کے دو محمل ہیں: کبھی تو اس سے عذاب مراد ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ (أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا)[۳۸] اور کبھی اس سے آزمائش مراد ہوتی جیسے فرمایا گیا (وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا)[۳۹]

اور لفظ فتنہ "بلاء" کی طرح شدت اور آسائش دونوں حالتوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر یہ شدت کے معنی میں زیادہ ظاہر اور بکثرت مستعمل ہے ان دونوں حالتوں کے بارے میں ارشاد باری ہے (وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً)[۴۰] چنانچہ شدت وسختی کے بارے میں ارشاد ہے (إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ)[۴۱] نیز

---

[۳۷] ترجمہ: جس دن کہ وہ آگ پر رکھے جائیں گے۔ (ذاریات: ۱۳)

[۳۸] خوب سمجھ لو کہ یہ (منافقین) خرابی میں پڑ چکے ہیں۔ (یعنی نتیجہ کے اعتبار سے۔ توبہ: ۴۹)

[۳۹] اور (اے موسیٰ) ہم نے تجھ کو خوب آزمایا۔ (طہٰ: ۴۰)

[۴۰] اور ہم تم کو اچھی اور بُری دونوں حالتوں میں بطور امتحان آزماتے ہیں (انبیاء: ۳۵)

[۴۱] ہم تو ذریعہ آزمائش ہیں۔ (البقرہ: ۱۰۲)

(وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ)[42] نیز (وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ)[43]

لفظ فتنہ ان افعال میں سے ہے جن کا صدور اللہ کی طرف سے بھی ہوتا ہے۔ اور بندے کی طرف سے بھی۔ جیسے بلا، مصیبت، قتل اور عذاب وغیرہ ناپسندیدہ افعال۔ مگر یہ افعال جب اللہ کی جانب سے ہوں تو وہ بتقاضائے حکمت ہوں گے۔ لیکن اگر ان کا صدور انسان کی جانب سے اور بغیر حکمِ الٰہی ہو تو پھر وہ اس کے خلاف ہوں گے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ طرح طرح کے فتنوں کی وجہ سے انسان کی مذمت کی ہے: (وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ)[44] نیز (إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ)[45]

بہر حال اسی بنیادی غرض و غایت کی بنا پر جہاد فرض کیا گیا ہے اور تمام علمائے اسلام اس پر متفق ہیں کہ جہاد امتِ مسلمہ پر فرض ہے مگر بقول حافظ ابن حجرؒ مذہب شافعی میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ جہاد فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟ یعنی یہ فریضہ ہر ہر شخص کے ذمے ہر حال میں ضروری ہے یا بعض افراد اس فریضے کو ادا کر دیں تو بقیہ افراد کے ذمے سے ساقط ہو جائے گا؟

فرماتے ہیں: "تحقیقی بات یہ ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[42] اور فتنہ جوئی قتل سے بھی سخت ہے۔ (البقرہ: ۱۹۰)

[43] ان کفار و مشرکین سے جہاد کرو یہاں تک کہ فتنہ و فساد باقی نہ رہے۔ (البقرہ: ۱۹۳)

[44] اور فتنہ جوئی قتل سے بھی سخت ہے۔ (البقرہ: ۱۹۰)

[45] جن لوگوں نے اہلِ ایمان کو فتنے میں مبتلا کیا۔ (بروج: ۱۰)

(ملخص از المفردات فی غریب القرآن ص ۳۷۱-۳۷۲)

عام تفسیروں میں زیر بحث آیت کریمہ میں فتنے سے مُراد خاص کر شرک و کفر بتایا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر، تفسیر کشاف اور احکام القرآن از جصاص وغیرہ)۔ یہ اصل میں دورِ نزولِ قرآن کے حالات و واقعات کے انطباق کی وجہ سے تھا۔ جب اس کے الفاظ عام ہیں تو پھر اس کو عام ہی رکھنا چاہیئے تاکہ وہ ہر دور کی آزمائشوں کا مصداق بن سکیں۔

کے دور میں ان لوگوں پر فرض عین تھا جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کے لئے متعین فرمادیا تھا۔ مگر آپ کی وفات کے بعد یہ مشہور قول کے مطابق فرض کفایہ ہے، الا یہ کہ کوئی (ہنگامی) ضرورت پیش آجائے اور دشمن اچانک آپڑے۔ تو اس وقت امام وقت جس کو (اس کام کے لئے) متعین کردے اس کے ذمے یہ (فرض) عین بن جائے گا۔"[۴۶]

احناف کے نزدیک جہاد اس وقت تک فرض کفایہ ہے جب تک کہ "نفیر عام" (ہنگامی حالات کا اعلان) نہ ہوجائے جب نفیر عام ہوجائے گی تو پھر یہ (ان تمام افراد پر جو اس کے اہل ہوں) فرض عین بن جائے گا۔ جیسا کہ حسب ذیل آیت سے ثابت ہوتا ہے:۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝[۴۸] نکل پڑو ہلکے یا بھاری سامان (اسلحہ) کے ساتھ اور جہاد کرو اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھ سکو۔ (توبہ: ۴۱)

اور جہاد کے عمومی حالات میں فرض کفایہ ہونے کی دلیل ابن رشد نے یہ دی ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝[۴۹] اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ تمام اہل ایمان (جہاد کے لئے) نکل کھڑے ہوجائیں! اس لئے ان کے ہر ہر فرقے میں سے

---

[۴۶] فتح الباری، ۶/ ۲۴

[۴۸] ہدایہ اولین، ص ۵۳۸-۵۳۹، مجتبائی دہلی

[۴۹] بدایۃ المجتہد، ابن رشد، ۱/ ۳۲۵

سے ایک (خاص) جماعت کیوں نہیں نکلی تاکہ وہ دین کی سمجھ (علم دین) حاصل کرتے اور جب وہ (علم دین حاصل کرکے) لوٹیں تو اپنی قوم کو متنبہ کرسکیں تاکہ وہ (پورے دین پر عامل ہو کر عذاب الٰہی سے) بچ سکیں۔ (توبہ: ۱۲۲)

اس آیت کریمہ کی تصریح کے مطابق اہل ایمان کی دو جماعتیں ہونی چاہئیں۔ ایک جماعت جہاد میں مصروف رہ کر ملک و ملت کا دفاع کرتی رہے اور دوسری علم دین حاصل کرکے اپنی قوم اور ملت کی دینی اعتبار سے قیادت کرے اور اس کو خصوصیت کے ساتھ "ایام اللہ" سے آگاہ اور متنبہ کرتی رہے۔[50]

علامہ ابن قیمؒ (۶۹۱ - ۷۵۱ھ) نے اس سلسلے میں بہت فکر انگیز بات تحریر فرمائی ہے:

"اور تحقیق یہ ہے کہ جنس جہاد فرض عین ہے خواہ وہ قلب کے ذریعہ ہو یا لسان کے ذریعہ یا مال کے ذریعہ۔ لہٰذا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان اقسام میں سے کسی ایک کے ساتھ جہاد کرے۔ اب رہا معاملہ جہاد بالنفس کا تو یہ فرض کفایہ ہے۔"[51]

ایک دوسرے موقع پر علامہ موصوف نے مراتب جہاد کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ جو یہ ہیں: (۱) نفس کے ساتھ جہاد (۲) شیطان کے ساتھ جہاد (۳) کفار کے ساتھ جہاد (۴) منافقین کے ساتھ جہاد۔[52] پھر ان میں سے ہر ایک قسم کی متعدد شکلیں بیان کی ہیں، جن کی تفصیل یہاں پر غیر ضروری ہے۔ مگر جہاد کے

---

[50] اس کو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے "التذکیر بایام اللہ" کا عنوان دیا ہے جو قرآن کے علوم خمسہ میں سے ایک مستقل علم ہے اور اس موضوع پر قرآن میں سینکڑوں، ہزاروں آیتیں بکھری ہوئی ہیں۔

[51] زاد المعاد ۳/۵۸، مطبوعہ دار الافتاء ریاض۔

[52] ایضاً ۳/۹

فلسفے پر اس بحث کی ابتدا میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہاں پر درج کرنے کے قابل ہے۔

"چونکہ جہاد اسلام کی اونچی چوٹی ہے۔ اور جنت میں مجاہدین کی منزلیں سب سے اعلیٰ ہوں گی اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے سب سے اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے۔ اور جہاد کی تمام قسموں نے قلبی جہاد، دعوتی جہاد اور تلوار کے ذریعہ جہاد ــ کو ادا کیا۔ آپ کے تمام اوقات (پوری زندگی) اسی کام کے لئے وقف تھی۔ اور اسی بنا پر اللہ کے نزدیک آپ کا مرتبہ سب سے اونچا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بعثت کے ساتھ ہی آپ کو جہاد کا حکم دے دیا تھا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيرًا ۝ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ۝ اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک تنبیہ کرنے والا بھیج دیتے (مگر ہم نے ایسا کرنے کی بجائے ایک جامع کتاب آتاری جو سب کے لئے کافی ہو جائے) لہٰذا تم منکرین کے کہے میں مت آؤ اور اس (قرآن) کے ذریعہ زور و شور سے ان کا مقابلہ کرو۔ (فرقان : ۵۱-۵۲)

یہ مکی سورت ہے جس میں حجت و بیان اور تبلیغ قرآن کے ذریعہ کفار سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے ــ اور چونکہ افضل ترین جہاد شدید رکاوٹوں کے باوجود حق بات کہنا ہے جو انبیاء علیہم السلام ہی کا کام اور انہی کا دل گردہ تھا مثلاً ایسے آدمی کے سامنے بات کرنا جس کی ہیبت چھائی ہوئی ہو یا جس سے ایذا رسانی کا خوف ہو، اس لئے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس باب میں کامل اور مکمل جہاد (کا نمونہ) موجود ہے[۵۳]"

ایک حدیث میں آتا ہے کہ "رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم۔ جس کے قبضے میں میری جان ہے میں شدید خواہش رکھتا ہوں اس بات کی کہ میں

---

۵۳ زاد المعاد، ۲ / ۳۸

راہِ الٰہی میں مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور مارا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں اور مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور مارا جاؤں"[۵۴]

اس سے جہاں ایک طرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف جہاد کی فضیلت اور اس کی اہمیت بھی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جہاد ملّتِ اسلامیہ کے لئے سراپا زندگی اور سراپا حیات ہے۔ جب کہ ترکِ جہاد اس کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے آج عالمِ اسلام میں جتنے بھی مفاسد اور رخنے پیدا ہو گئے ہیں وہ سب ترک جہاد اور رُوحِ جہاد سے اعراض و رُوگردانی اور لاپرواہی کا نتیجہ ہیں۔ جہاد سے مُنہ موڑنے کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی اور دوسروں کی غلامی کے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اگر تم (جہاد کے لئے) نہ نکلو گے تو اللہ تم کو دردناک عذاب (دنیوی) میں مُبتلا کردے گا۔ اور وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا۔ اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ اور اللہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔ (توبہ: ۳۹)

ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا کہ اسلام دشمن قوتیں ہمیشہ اہلِ اسلام سے برسرِ پیکار رہتی ہیں اور ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ موقع ملتے ہی تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں۔ لہٰذا ایسے چالاک دشمنوں سے ہمیشہ چوکنّا رہنا چاہیئے۔ جو مسلسل گھات میں رہتے ہیں (جیسا کہ آج دُنیا کے بہت سے اسلامی ملکوں کو اغیار نے اپنے نرغے میں لے رکھا ہے)۔ یہ بھی ایک صداقت ہے کلام ربانی کی کہ اس کی پیش خبریاں ہر دور میں برابر پوری ہوتی رہی ہیں۔

---

۵۴ بخاری، کتاب الجہاد والسیر، ۳/ ۲۰۳، استنبول

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ط اور یہ (منکرین حق) تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں اگر وہ (تم پر) قابو پا جائیں۔ (البقرہ : ۲۱۷)

جغرافیائی اعتبار سے مختلف خطہ ہائے ارض میں بسنے والے دینی بھائی جب کسی اعتبار سے مشکل حالات سے دوچار ہو جائیں اور وہ ایک دوسرے کی مدد کے طالب ہوں تو پھر اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی مدد کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور ایسے مواقع پر اپنے کلمہ گو بھائیوں کی مدد نہ کرنے کو بہت بڑا فتنہ و فساد کہا گیا ہے :

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِى الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ط اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بہت بڑا فساد ہو جائے گا۔ (انفال : ۷۳)

ایک دوسرے مقام پر بطور ایک عمومی اصول بیان کیا گیا :

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ : اور اگر اللہ (اپنی سنت جاریہ کے مطابق) انسانی (گروہوں میں سے) ایک دوسرے کی مدافعت نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ (البقرہ : ۲۵۱)

یہی وجہ ہے کہ جہاد ہر حال میں فرض قرار دیا گیا ہے اور اس کی اس قدر شدید تاکید کی گئی ہے۔ جہاد کی اہمیت و فضیلت اور اس کی حکمتوں اور مصلحتوں سے قرآن اور حدیث کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ ایک موقع پر بڑی صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ جہاد سے منہ موڑنا منافقین کی علامت اور جہاد کی خاطر اپنا مال و متاع اور اپنی جانیں سب کچھ لٹا دینا ایمان والوں کی صفت ہے۔

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ٥ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ٥ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

اور جب (اس مضمون کی) کوئی سورت نازل کی جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ہمراہ جہاد کرو تو (ایسے موقع پر) مالدار لوگ تجھ سے رخصت مانگنے لگ جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم کو بیٹھنے والوں (جنگ میں حصہ نہ لینے والوں) کے ساتھ رہنے دیجئے۔ وہ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ رہنے پر راضی ہو گئے اور ان کے دلوں پر مہر لگ گئی۔ اس لئے وہ (قانون خداوندی کو) نہیں سمجھتے لیکن رسول اور اس کے ساتھ جو ایمان والے لوگ ہیں انہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا انہیں کے لئے ہیں تمام بھلائیاں۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (توبہ: ۸۶ : ۸۸)

جہاد کی اسی اہمیت کے پیش نظر یہاں پر ایمان باللہ کے فوراً بعد جہاد کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ گویا کہ ایمان باللہ کا تقاضا یہ ہے کہ جہاد کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دوسرے موقع پر جہاد کو ایمان ویقین کی نشانی قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ وہ کسی بھی شخص یا قوم کے دعوائے صدق وسچائی کا معیار ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○

پورے مومن وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر انہوں نے (کسی بھی معاملے میں) شک نہیں کیا اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرتے رہے۔ یہی لوگ سچے ہیں۔ (حجرات : ۱۵)

جہاد کی اس قدر اہمیت ومنزلت کیوں ہے؟ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ نے بڑی حکیمانہ بات تحریر فرمائی ہے:

" جان کو شریعتوں میں سب سے زیادہ مکمل شریعت وہی ہو سکتی ہے جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو امر ونہی کا مکلف ٹھہرانا ایسے ہی ہے جیسے کسی صاحب کے نوکر چاکر بیمار ہو گئے

ہوں اور وہ اپنے کسی خاص آدمی سے کہے کہ وہ ان بیماروں کو دوا پلا دے۔ لہٰذا اگر وہ شخص ان کو زبردستی دوا پلائے تو اس کو اس کا حق حاصل رہے گا لیکن شفقت اس کی مقتضی ہے کہ وہ ان کے سامنے دوا کے فوائد بیان کر دے تاکہ وہ اس کو برضا و رغبت پی سکیں اور یہ بھی بہتر ہے کہ وہ اس دوا میں تھوڑی سی شہد ملا دے تاکہ اس میں طبیعی اور عقلی دونوں رغبتیں باہم مل جائیں۔

نوع انسانی کے تعلق سے (اللہ تعالیٰ کی) رحمت کاملہ کا تقاضا ہے کہ وہ اس کو حسنِ عمل کی طرف لے جائے۔ ظالم کو اس کے ظلم سے روکے اور انسان کے تمام عائلی و اجتماعی معاملات کو درست کرے۔ اس اعتبار سے وہ تمام شہر جو (تہذیبی و تمدنی اعتبار سے) فاسد ہو چکے ہوں اور جن پر درندہ صفت افراد غالب آ گئے ہوں اور نیز ان کو نہایت درجہ قوت حاصل ہو چکی ہو وہ جسم انسانی کے ایک ناسور کی طرح ہیں جس کو کاٹ کر پھینکے بغیر انسانی جسم درست نہیں ہو سکتا۔ اور جب تھوڑی سی برائی سے بہت بڑا خیر حاصل ہو سکتا ہو تو یہ فعل واجب العمل ہوگا۔[۵۵]

پھر آگے فرماتے ہیں: "جان لو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت خلافت عامہ کے ساتھ ہوئی ہے دیگر ادیان پر آپ کے دین کا غلبہ صرف جہاد اور آلات کی تیاری ہی کے ذریعہ برپا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اگر اہل اسلام جہاد کو ترک کر کے بیلوں کے دُموں کے پیچھے پڑ جائیں تو ان کو رُسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا اور دیگر اہل مذاہب اُن پر چڑھ دوڑیں گے۔"[۵۶]

حاصل بحث اور مرکزی نکتہ

یہ اس کتاب کا حاصل بحث اور مرکزی نکتہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی

---

۵۵ حجۃ اللہ البالغہ، ملخص از مبحث فی الجہاد ۲/ ۱۷۰ رشیدیہ دہلی۔

۵۶ ایضاً ۲/ ۱۷۳۔

زندگی کا دار و مدار جہاد اور صرف جہاد ہے۔ جہاد ہی ہمارے تمام دکھوں کا مداوا اور ہمارے تمام اجتماعی اور بین الاقوامی مسائل کا واحد حل ہے۔ یہ ہماری تمام ملی سرگرمیوں کا محور اور ہماری تمام فوجی و عسکری اور سائنسی و صنعتی تیاریوں کا مقصود اصلی ہے۔ اور اسی بنا پر حضرت آدم علیہ السلام کو "علم اسماء" عطا کیا گیا تھا کہ وارثین علم آدم اس علم کو حاصل کریں اور ہر دور میں اس کے تقاضوں کے مطابق صحیح طور پر جہاد کی تیاریوں میں مصروف رہیں۔ اور یہ کہ اپنے ملک و ملت کا دفاع کر کے صحیح معنی میں اپنے آپ کو خلافت ارض کا مستحق ثابت کریں۔ تمام صنعتی اور سائنسی علوم و فنون میں مہارت، صنعتی ساز و سامان اور جدید اسلحہ کی تیاری نیز قوم و ملت کو ترقی یافتہ اقوام کے شانہ بشانہ لا کر کھڑا کرنا وغیرہ سب اسی مقصد اور بنیادی ہدف کی خاطر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد عظیم کی خاطر مذکورہ بالا آیات میں جانوں اور مالوں کی قربانی مانگی گئی ہے اور اس راہ میں جد و جہد کرنے والوں نیز اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر اللہ کی راہ میں کام کرنے والوں کو ایمان سے متصف ہونے کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

موجودہ دور میں جہاد کی تیاری اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم جدید سے جدید تر تمام صنعتوں میں برتری حاصل کرنے کی غرض سے مختلف مصنوعات اور مختلف دھاتوں کا صحیح علم حاصل نہ کر لیں اور پھر ان دھاتوں کے صحیح استعمال کے لئے علم کیمیا اور علم طبیعیات میں مہارت پیدا نہ کر لیں۔

فلسفۂ تاریخ کے نقطۂ نظر سے قوموں کو سرگرم عمل رکھنے کے لئے جہاد ایک بہترین نظریہ اور دین و ملت کی حفاظت و بقا اور خلافت ارض کی تکمیل کے نقطۂ نظر سے بھی ایک بہترین حل ہے بلکہ درحقیقت خلافت ارض کی کامیابی کا سارا راز جہاد میں پوشیدہ ہے۔ اسی بنا پر جہاد کو ایمان کی علامت اور اس سے جی چرانے کو منافقت کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

جس قوم میں جہاد کا صحیح مقصد اور اس کا جذبہ اور اسپرٹ کام کر رہے ہوں اور اس کے مطابق اس کی قومی زندگی ڈھل رہی ہو وہ قوم کبھی مغلوب نہیں ہوسکتی۔ اور دنیا کی کوئی طاقت اسے زیر نہیں کرسکتی۔ قوموں کے زوال اور اُن کے تنزّل کا باعث سُستی و کاہلی اور عیش و عشرت میں پڑ کر اپنے ملکوں اور سرحدوں کے دفاع سے غفلت کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جیساکہ صحیفۂ تاریخ ہمیں بتاتا ہے۔

اس حیثیت سے جہاد حقیقتاً دین کی روح اور خلافت ارض کا جوہر اور اس کی بنیادی اینٹ ہے جس کے تقاضوں سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا اور اس سلسلے کی قربانیوں سے منہ نہیں موڑا جاسکتا۔ یہ چیز بغیر قربانیوں کے حاصل نہیں ہوسکتی اور اسی کے لئے ساری تیاریاں اور سارے جتن کرنے پڑتے ہیں کہ وقت پڑنے پر پنجہ آزمائی کی جاسکے اور حالات کے رُخ اور ان کے دھارے کو موڑا جاسکے۔

جو قوم جہاد کی صحیح حقیقت اور اس کی صحیح اسپرٹ کو جان لے وہ دُنیا میں کبھی ناکام نہیں ہوسکتی۔ موجودہ بین الاقوامی صورت حال کے لحاظ سے آج جہاد کی تیاری صحیح طور پر کرنے کے لئے علم اسماء، علم تسخیر اور علم مقادیر (علوم آدم[۵]) سے واقفیت اور ان میں دسترس حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر آج ہم اپنی ملت اور اپنے ملکوں کا دفاع نہیں کرسکتے۔ یہ ہے خلافتِ ارض کے ساتھ علم اسمار کے تعلق کی صحیح نوعیت وحقیقت جن کا بیان سورۂ بقرہ میں خلافت آدم (اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً) اور تعلیم اسمار (وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا) میں کیا گیا ہے۔ مفسّر کی نظر میں لفظی جزئیات کی ورزش کے بجائے زیادہ تر حقائق اور ان کے باہمی ربط وتعلق پر ہونا چاہیے، ورنہ گتھیاں سلجھ نہیں سکیں گی اور مسائل حل نہیں ہوسکتے۔

---

[۵] موجودہ دور کی اصطلاح میں سائنس اور ٹکنالوجی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے پہلا اور دوسرا باب۔

ان آیات بینات کی رُو سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل ہی میں یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ ظہورِ اسلام کے بعد اور عہدِ علوم و فنون میں دُنیا میں وہی ملت، کامیاب اور سرخرو ہو سکتی ہے اور وہی ملت خلافتِ ارض کا خواب دیکھ سکتی ہے جو علمِ آدم یا علمِ اسماء کے مطابق جہاد کی پوری تیاریوں میں مصروف و منہمک ہو اور اپنی پوری قوم و ملت کو اس کے تقاضوں کے مطابق ڈھال رہی ہو۔ اب اس سلسلے میں اب تک ہم سے جو کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں وہ قابلِ معافی تو ہو سکتی ہیں مگر ان واضح اور بیّن آیاتِ محکمات کے بعد جو کوتاہیاں اور لغزشیں ہوں گی وہ ناقابلِ معافی جرم ہوں گی۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝

ہم نے آپ کے پاس واضح و روشن دلائل بھیج دئے ہیں۔ جن کا انکار وہی لوگ کر سکتے ہیں جو بدکردار ہوں۔ (البقرہ : ۹۹)

یعنی ان واضح دلائل و براہین کو وہی نظر انداز کر سکتا ہے جو کسی قسم کے عناد یا ذاتی تکبّر اور بے جا گھمنڈ میں مبتلا ہو۔ اور وہ خیر و شر میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہو۔ یا اس کو خدائی ہدایت پر عمل درآمد کرنے میں اپنے ذاتی مفاد اور ذاتی اغراض و خواہشات کو خطرہ محسوس ہوتا ہو بہر حال جب تک ان واضح احکام پر عمل درآمد نہیں ہو گا صبح نمودار نہیں ہو سکتی اور اسلام کا سورج دوبارہ طلوع نہیں ہو سکتا۔

انفاق اور قوموں کا عروج و زوال

واضح ہو گیا کہ جہاد ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور جہاد کی کامیابی کے بغیر ہماری کامیابی مخدوش ہے۔ اور جہاد کی تیاری کے لئے فوجی و عسکری اعتبار سے تیاری کرنی پڑے گی۔ اور متعلقہ صنعتوں کو قائم کرنا پڑے گا اسی میں ہمارے دینی و دنیوی تمام مسائل کا حل پوشیدہ ہے اور ہمارے معاش و

معاد کی تمام خوبیاں اسی منصوبے کی تکمیل میں پوشیدہ ہیں۔

مگر کوئی بھی منصوبہ بذات خود خواہ کتنا ہی اچھا اور مفید و انقلاب انگیز کیوں نہ ہو لیکن ظاہر ہے کہ جب تک پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اس پر عمل نہ کیا جائے وہ نتائج ہرگز برآمد نہیں ہو سکتے جو مطلوب ہیں کسی بھی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مال یا قوتِ نافذہ کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور ان دونوں میں چولی دامن جیسا ساتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسب ذیل آیت کریمہ میں ملی اُمور میں استصواب رائے (شوریٰ) اور انفاق کا بیان ساتھ ساتھ آیا ہے:

وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ ص وَ مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ ۚ اور ان کا (اہل اسلام کا) باہمی معاملہ آپس کے مشورے سے ہو اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس کو وہ (اپنے باہمی فیصلے کے مطابق خرچ کریں۔ (شوریٰ: ۳۸)

اس آیت کریمہ میں مشورہ — اہل الرائے سے مختلف قومی اور ملکی معاملات میں استصواب — اور انفاق کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عقل و نقل کے مطابق جو معاملہ باہمی بحث و مباحثہ کے بعد طے ہو جائے اس پر پوری ایمانداری کے ساتھ عمل ہونا چاہیئے۔ اور اجماعی رائے و منصوبے کے مطابق مال خرچ کرنا چاہیئے۔ ورنہ اس سے بڑی خرابیاں لازم آئیں گی اور نتیجہ انتشار اور عدم استحکام ہو گا۔ ملک و ملت کو متحد رکھنے اور معیشت و دفاع کو مستحکم کرنے کے لئے قومی معیشت سے ہر ایک کو مستفید ہونے کے مواقع فراہم ہونے چاہئیں۔

اس سلسلے میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ مال و دولت کسی کی ذاتی ملکیت نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک عنایت و مہربانی اور اس کی ایک بہت بڑی امانت ہے۔ مال و دولت کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے اور انسان خلیفہ ہونے کی حیثیت سے محض اس کا امین و محافظ اور خزانچی ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ "وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ" (ہم نے جو کچھ انہیں دے رکھا ہے) کے الفاظ ظاہر کر رہے ہیں۔ یہی بات

قرآن حکیم کے دیگر مقامات میں بھی کہی گئی ہے۔ ایک جگہ تو انفاق فی سبیل اللہ پر ابھارتے ہوئے یہاں تک کہا گیا ہے کہ انسان کو تو مال و دولت، اور ملک وغیرہ سب کچھ چھوڑ کر رخصت ہونا پڑے گا۔ اور اس طرح یہ اسباب مآل کار اللہ کا ہی ہو جائے گا۔

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط

اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ حالانکہ زمین و آسمانوں کی سب میراث اللہ ہی کی ہو جائے گی۔ (حدید : ۱۰)

مال ایک ابتلا و آزمائش اور بہت بڑی ذمہ داری کی چیز ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ وہ ہماری ذاتی محنت اور ذاتی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے اس لئے ہم کو ہر حیثیت سے اس کے تصرف پر پورا پورا اختیار رہے گا۔ مگر یہ نظریہ اسلامی اور قرآنی نظریہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم میں انفاق اور حقوق العباد پر جتنا زور دیا گیا ہے وہ نماز کے سوا کسی دوسرے حکم پر نہیں دیا گیا۔ بلکہ ایک موقع پر تو ایمان کے بعد دوسرا جو فوری حکم دیا گیا ہے وہ انفاق ہی کا ہے۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ ط فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِیْرٌ ○

(اے مسلمانو) اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس مال میں اس نے تم کو قائم مقام بنایا ہے اس میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرو۔ اس طرح تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور خرچ کریں ان کے لئے بڑا اجر ہے (حدید : ۷)

یہاں بھی وہی بات فرمائی گئی ہے کہ انسان اپنے مال کا اصل مالک نہیں بلکہ صرف اس میں خلیفہ یا قائم مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں پر ایمان اور انفاق میں تعلق یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب کہ ایمان کو بچانا سب سے مشکل کام اور سب سے بڑا جہاد بن جاتا ہے۔ ایسے مشکل اور نازک مراحل میں انفاق فی سبیل اللہ یعنی ایمان و اسلام کے دفاع کے

راستے میں اپنے خزانوں کو لٹا دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ جیسا کہ آج دنیائے اسلام کے حالات وکوائف خصوصیت کے ساتھ اس کے متقاضی نظر آرہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ زندہ کتاب کی زندہ آیات ہیں جو ہر دور میں ہماری پوری پوری رہنمائی و رہبری کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

آج خلافتِ ارض کی تکمیل اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مالی مسئلہ زندگی اور موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ہمارے دین وملت کی سربلندی، ہمارے ملکوں کا دفاع اور ہمارے قومی ومعاشی مسائل سب کے سب اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے مال و دولت ہی کے محتاج ہیں۔ بغیر سرمائے کے کوئی بھی کام چل نہیں چل سکتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جن کو اسباب و وسائل کی فراوانی سے سرفراز کیا ہے ان کا فرض ہے کہ وہ آگے بڑھ کر ان قومی و ملی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ قوموں اور ملتوں کی ترقی اور ان کے عروج کا راز حقیقتاً انفاق میں پوشیدہ ہے۔ جو قومیں انفاق سے جی چراتی ہیں وہ در اصل قومی و ملی ترقیوں سے منہ موڑتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی قومیں قانون فطرت کے مطابق دنیا سے بہت جلد رخصت ہو جاتی ہیں۔ حسب ذیل آیت کریمہ میں صحیفۂ تاریخ کی اس عظیم صداقت کو پوری طرح بے نقاب کردیا گیا ہے:

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝

ہاں دیکھو تم ہی وہ لوگ ہو کہ (جب) تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ بخل کرنے لگ جاتے ہیں (تو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ جو بخل سے کام لیتے ہیں وہ اپنی ہی ذات سے بخل کرتے ہیں۔ اور اللہ کسی کا محتاج نہیں (بلکہ) تم سب (اس کے) محتاج ہو۔ اور (خوب سن لو کہ) تم اگر (انفاق سے)

رُوگردانی کرو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔(محمد : ۳۸)

اس عظیم آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کا تعلق قوموں کے عروج وزوال سے دکھایا گیا ہے۔ فلسفۂ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو قومیں اپنے قومی اور بین الاقوامی حالات اور تقاضوں سے غافل ہو کر اپنے ملّی امور کی تکمیل اور جنگی تیاریوں میں بُخل سے کام لیتی ہیں اور عیش وعشرت کی زندگی کو ترجیح دیتے ہوئے قومی وملکی فرائض سے غفلت برتنے لگ جاتی ہیں ان کو قانون الٰہی کے مطابق دُنیا کے اسٹیج سے اُتار کران کی جگہ پر دوسری قوموں کو لایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دوسری آیت کریمہ میں عدم انفاق یا عدم جہاد کو قومی وملّی ہلاکت کا سبب بتایا گیا ہے:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚ وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو[۵۸] (بلکہ اس باب میں) حسنِ عمل اختیار کرو۔ یقیناً حسنِ عمل کا مظاہرہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (البقرہ : ۱۹۵)

یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمت ومصلحت اور اس کی بڑی مہربانی ہے کہ وہ انسان کو مال ودولت کا اصل مالک نہ قرار دیتے ہوئے محض اس کی ہمت افزائی کرنے اور اس کا دل رکھنے کی خاطر ایک درجے میں اس کی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے انفاق پر اس کو مختلف طریقوں سے اُبھارتا ہے مثلاً:

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ اور

---

[۵۸] حضرت ابوایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جس وقت اللہ نے اپنے نبی کی نصرت فرمادی اور دین اسلام کو غالب کر دیا تو ہم کو خیال پیدا ہوا کہ اب جہاد کے لئے مال خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (احکام القرآن، جصاص رازی ۲۶۲/۱ دار الکتاب العربی بیروت)

جو کچھ بھی تم بھلائی کی چیز (مال وغیرہ) خرچ کروگے اس کا پورا پورا اجر تم کو دیا جائے گا۔ اور اس میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے گی (بقرہ : ۲۷۲)

مال و دولت پاکر بہت سے لوگ حقوق اللہ کو نظر انداز کرتے ہوئے محض ذاتی اغراض و خواہشات کے تحت اسراف و تبذیر کرنے لگ جاتے ہیں۔ لہذا اس بے اعتدالی سے روکنے کے لئے کہا گیا :

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ٥ رحمان کے بندے وہ ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی اور تنگی نہیں کرتے۔ بلکہ ان کا خرچ (افراط و تفریط سے پاک) معتدل ہوتا ہے (فرقان : ۶۷)

قارون کا عبرت انگیز واقعہ

اس موقع پر قارون کا واقعہ ذہنوں میں تازہ رہنا چاہیے، جس کو قرآن مجید نے ایک عجیب و غریب انداز میں بیان کرکے چند عبرتوں کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ص وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ ق اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ٥ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ٥ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ ط اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ط وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ٥

قارون موسیٰؑ کی قوم سے تھا۔ پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا۔ اور ہم نے اس کو اس قدر خزانے دے رکھے تھے کہ اس کی کنجیاں زور آور آدمیوں کی ایک جماعت بھی مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔ جب اس کی برادری والوں نے (سمجھانے کے طور پر) اس سے کہا کہ تو (اپنے مال و دولت پر) اترا مت۔ کیونکہ اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ تجھ کو خدا نے جتنا کچھ دے رکھا ہے اس میں (سے بندوں کا بھی حق ادا کر کے) عالم آخرت کی جستجو کیا کر۔ اور (اپنا دُنیا کا حصہ بھی فراموش نہ کر۔ اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (اسی طرح اس کے بندوں کے ساتھ) احسان کر اور دُنیا میں فساد کا خواہاں مت ہو۔ کیونکہ اللہ فساد مچانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ قارون نے کہا کہ مجھے تو یہ سب میری ذاتی ہنرمندی سے ملا ہے (یہ ایک سرکشانہ جواب تھا جس پر قانونِ ربانی یوں گویا ہوا:) کیا وہ اس حقیقت سے بے خبر رہ گیا تھا کہ اللہ اس سے پہلے ایسے بہت سے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمعیت رکھتے تھے۔ اور مجرموں سے ان کے گناہوں کا حال نہ پوچھا جائے گا (بلکہ خدا چونکہ سب کچھ جانتا ہے اس لئے وہ ہر ایک کو اس کے گناہوں کے مطابق سزا دے گا۔ (قصص: ۷۶-۷۸)

ان آیات میں جو اسباق و بصائر ہمارے لئے ودیعت کر دئے گئے ہیں ان کا استنباط مختصر طور پر اس طرح کیا جا سکتا ہے۔

۱- انسان مال و دولت پا کر مغرور اور سرکش بن جاتا ہے اور یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ یہ سب میرے علم اور ذاتی صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ اسی بناء پر وہ انفاق یا حقوق العباد سے دست کش ہو جاتا ہے جو زمین میں فساد کا پیش خیمہ اور اس کی بنیاد ہے۔ یعنی اس کے نتیجے میں معاشرے میں معاشی حیثیت سے بڑی ناہمواریاں اور بے چینیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو فساد کا موجب بنتی ہیں۔

۲- لہذا اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اس قسم کے موجبات فساد کو دُور کرنے کے

لئے اللہ کے بندوں کے ساتھ احسان کیا جائے۔ یعنی معاشی جدوجہد کے میدان میں جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں یا جو لوگ اس میدان میں خود کفیل نہیں ہیں ان کی مدد کی جائے۔ اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کیا جائے۔ ،، وَاَحۡسِنۡ كَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ ،، (جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی اسی طرح اس کے بندوں کے ساتھ احسان کر) ایک بہت بلیغ جملہ ہے جو دولت مندوں اور مرفہ الحال لوگوں کو ان کی فرض شناسی کی طرف توجہ دلا رہا ہے۔

۳۔ اس حکم الٰہی سے سرتابی گناہ اور جرم ہے، جس کے ارتکاب کے باعث عذاب الٰہی کا کوڑا حرکت میں آجاتا ہے اور ایسے لوگوں کو باغی اور نافرمان قرار دیکر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ آخری آیت میں اسی حقیقتِ عظمیٰ کا اظہار کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مال و دولت اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت بھی ہے اور ایک بہت بڑی آزمائش بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اسباب و علل ہی کے روپ میں پیدا کیا ہے۔ تاکہ منشائے الٰہی کے مطابق مناسب طریقے سے دولت کی تقسیم بھی عمل میں آئے اور اس کے ابدی مصالح بھی پورے ہوں۔ اس لحاظ سے وہ مال و دولت کے ذریعہ دراصل اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے کہ دیکھیں کون بندہ میرے حکموں اور مصلحتوں کو سمجھ کر اس کے مطابق اپنی دولت صرف کرتا ہے۔ مگر جب دولت مند اور متمول لوگ مرضیٔ الٰہی کو نظر انداز کر کے اپنی من مانی کرنے اور مغرور و متکبر بن کر زمین میں فساد برپا کرنے لگ جاتے ہیں تو چونکہ وہ اس امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں اس لئے انہیں معزول قرار دے کر ان سے نہ صرف مال و متاع چھین لیا جاتا ہے بلکہ ان کو عبرت ناک سزا بھی دی جاتی ہے۔ چنانچہ قارون کا مذکورہ بالا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا:

فَخَسَفۡنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الۡاَرۡضَ تف فَمَا كَانَ لَهٗ مِنۡ فِئَةٍ يَّـنۡصُرُوۡنَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ تز وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُنۡتَصِرِيۡنَ ۝ آخر کار ہم نے قارون اور اس کے محل سرا کو (اس کی شرارت کے بڑھ جانے کی وجہ سے) زمین میں دھنسا دیا۔ پھر اس

کے حامیوں کی ایسی کوئی جماعت نہ ہوئی جو اس کو اللہ سے بچا لیتی۔ اور نہ وہ اپنی مدد آپ کر سکا۔ (قصص : ۸۱)

پھر اس کے بعد ایک عمومی قانون کے طور پر فرمایا گیا کہ آخرت کا حصہ صرف انہی لوگوں کے لئے ہے جو زمین میں (دولت پا کر) اپنی بڑائی کا اظہار نہ کریں اور (معاشی ناہمواریاں پیدا کر کے) فساد نہ برپا کریں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ؀ یہ آخرت کا گھر ہم انہی لوگوں کے لئے مخصوص کرتے ہیں جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں اور اچھا نتیجہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے ہے۔ (قصص : ۸۳)

قارون کا یہ واقعہ رہتی دنیا تک سارے جہاں کے لئے عبرتوں اور نصیحتوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یوں تو تاریخ عالم میں اس سے ملتے جلتے بہت سے عبرت انگیز واقعات موجود ہوں گے مگر ایران جدید کے قارون (شاہ ایران) کا واقعہ سب سے زیادہ عبرت ناک ہے۔ جس کے لئے زمین کی وسعتیں تنگ تنگ ہو کر رہ گئیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

حقیقت یہ ہے کہ جب "فساد فی الارض" برپا ہو جاتا ہے تو اس کی لپیٹ میں چھوٹے بڑے سب آجاتے ہیں۔ اور اچھے اچھے شاطروں کی بساط بھی لپیٹ دی جاتی ہے۔ جو قلعہ بند ہو کر خود کو ہر طرح سے محفوظ اور ناقابلِ تسخیر سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ پھر اس کے بعد مال و دولت، ملک و سلطنت اور جاہ جلال سب کا سب دھرا رہ جاتا ہے اور کوئی بھی چیز کام نہیں آتی۔

اسلام اور کمیونزم

قرآنی آیات کی خوبی یہ ہے کہ ان میں غور و فکر کر کے قیامت تک پیش آنے والے مشکل سے مشکل تر دینی و دنیوی اور تمدنی و اجتماعی تمام مسائل کا حل

نکالا جاسکتا ہے۔ اس کی ابدی آیات میں ایسے اسرار و نکات پوشیدہ ہیں۔ جو بوقت ضرورت ہماری ہر حیثیت سے رہنمائی کر سکتے ہیں۔

غرض اوپر جو نکات واضح کئے گئے ہیں ان میں ضمناً کمیونزم (communism) کا بھی رد ہے۔ اسلام اور کمیونزم میں بنیادی فرق یہی ہے کہ کمیونزم کسی قسم کی ذاتی اور نجی ملکیت (personal property) کے حق کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ تمام ذرائع پیداوار (production) کا مالک حکومت (state) کو قرار دے کر ہر قسم کا مال و املاک بحق سرکار ضبط کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام ذاتی ملکیت اور نجی جائداد کے حق کو جائز تسلیم کر کے انہیں مختلف طریقوں سے انفاق کی ترغیب دیتا اور حقوق العباد کی ادائیگی پر ــــ زکوٰۃ و صدقات کے ذریعہ ـ ابھارتا ہے۔ دولت کی پیداوار اور اس کی تقسیم کا یہ ایک فطری طریقہ ہے، جو اگر صحیح اور منظم طریقے پر جاری و نافذ ہو جائے تو پھر بڑے مفید اور مثبت نتائج نکل سکتے ہیں اور کمیونزم کا مصنوعی اور غیر فطری طریقۂ کار اور اس کا سارا پروپگنڈہ بے اثر ہو سکتا ہے۔

کمیونزم کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ اپنے پروپگنڈے کا جادو ان لوگوں پر چلاتا ہے جو معاشی جدوجہد کے میدان میں پیچھے اور فروتر ہوں۔ یعنی نچلا اور متوسط طبقہ۔ پھر وہ اس طبقے میں اپنے نظریات کا پرچار کر کے بے چینی پھیلاتا ہے۔ پھر اس کو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے محض آلۂ کار بنا کر نہایت عیاری کے ساتھ حکومتوں کا تختہ الٹ دیتا ہے۔ اس پرفریب سیاست کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نچلے عوامی طبقات کا کوئی بھلا نہیں ہوتا کیونکہ ان کی حیثیت محض آلہ کار کی سی ہوتی ہے اور سارا فائدہ کمیونزم اور اس کے نیتاؤں (کامریڈوں) کو پہنچتا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں اور ملکوں میں کمیونزم کو برسر اقتدار لانے کے لئے اسی قسم کی منظم کوششیں اور سازشیں ہو رہی ہیں اور کمیونزم پوری دنیا پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔

لہٰذا کمیونزم کے اس فتنے اور اس کی روک تھام کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ نچلے عوامی طبقات کی پوری طرح خبر گیری کی جائے۔ ان کے مسائل میں دلچسپی لی جائے اور ان کے مسائل کا حل نکالا جائے۔ اور انہیں کسی بھی قیمت پر کمیونزم کی گود میں جانے سے روکا جائے۔ اس مسئلے کا حل صرف ایک خدائی فقرے اور اس کے ابدی پیغام (وَاَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ) میں پوشیدہ ہے۔ اگر ہماری ملّت کے متمول اور مالدار لوگ اور ہمارے قائدین اور سربراہانِ مملکت اس پیغام کی روح اور اس کی حقیقی اسپرٹ کو سمجھ لیں اور اس کے مطابق "حُسنِ عمل کا مظاہرہ" کریں تو پھر جہاں ایک طرف دُنیائے اسلام میں نئے گل و گلزار پیدا ہو سکتے ہیں تو دوسری طرف کمیونزم کے بظاہر خوشنما اور دلفریب مگر کھوکھلے نعروں کو اسلامی دنیا کی سرحدوں کے اندر درآنے سے روکا جاسکتا ہے۔ یہ "دیوار کا لکھا" اور اس کی تحریر ہے جس کو اگر ہمارے قائدین نے نظرانداز کر دیا تو پھر خدائی فیصلے کے مطابق "فساد فی الارض" کو روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوگی اور کوئی قوت اس کا سدّباب نہیں کر سکے گی۔ کمیونزم کو محض علمی و نظریاتی محاذ ہی پر شکست دینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ عملاً ان تمام ذرائع اور اسباب و محرکات کا — ہر ممکن حد تک — خاتمہ کرنا بھی ضروری ہے جن کی بنا پر وہ کسی قوم یا ملک کے درمیان نشو و نما پاتا ہے۔ کمیونزم کے انقلاب کو اگر روکنا ہے تو اس کے لئے کچھ "انقلابی اقدامات" بھی کرنے ضروری ہیں اور کچھ قربانیاں بھی دینا اور اس کے سامنے بند ھ باندھنا ہے۔ اس کے بغیر اس کی یلغار کو روکنا مشکل ہو گا۔

اس پیامِ ربّانی پر صحیح عمل درآمد اور موجودہ فتنوں کی روک تھام کے لئے محض اتنا کافی نہیں ہے کہ زکوٰۃ یا خیرات کے نام سے وقتاً فوقتاً تھوڑی تھوڑی رقمیں چند لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ بلکہ صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ بیکار افراد کو برسرِ روزگار بنایا جائے جن لوگوں کی آمدنی ناکافی اور اخراجات

زیادہ ہوں ان کی مدد کی جائے۔ ہر قسم کی دینی و دنیوی اور خصوصاً سائنسی و صنعتی تعلیم کا حصول تمام افراد کے لئے آسان اور ممکن بنایا جائے۔ اور صنعت و حرفت کی ترقی پر خصوصی توجہ کر کے معاشرے کے مختلف افراد کو ان میں کھپایا جائے جس کے باعث عوام کی بیکاری اور محتاجی دور ہو جائے گی اور تمام راحت و سکون محسوس کریں گے۔

لہذا اسلامی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ دنیائے اسلام کے احوال و کوائف کا گہری نظر سے جائزہ لے کر پورے عالم اسلام کو ایک قوم و ملّت، ایک معاشرہ اور ایک یونٹ تصور کر کے اس کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ لیں۔ نیز جیسا کہ پچھلے صفحات میں تحریر کیا جا چکا مختلف مسلم ممالک میں صنعتی مراکز اور کارخانے وغیرہ قائم کر کے انہیں مختلف میدانوں میں آگے بڑھایا جائے۔ ان اقدامات کے ذریعہ نہ صرف بے شمار دینی، ملّی، فوجی، سیاسی اور بین الاقوامی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں بلکہ یہ کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کا بھی ذریعہ بن سکتے ہیں۔

طبقۂ اولی الامر کی ذمہ داری

یہ تھا مال و دولت کے بارے میں قرآن حکیم کا نظریہ اور تکمیل خلافت کی راہ میں اس کی اہمیت و افادیت کا بیان۔ ہر دور کے حالات و مقتضیات مختلف ہوتے ہیں، جن سے صرف نظر کرنا اپنی موت و ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ قوموں کے عروج و زوال میں دو قسم کے افراد کا بڑا عمل دخل ہے۔ ایک تو اس قوم یا ملت کے علماء و صلحاء اور دوسرے اس کے زعماء اور ارباب اقتدار۔ اگرچہ یہ دونوں طبقے درست ہو جائیں اور صحیح راہ عمل اختیار کر لیں تو پھر وہ قوم یا ملت کامیاب اور فائز المرام ہوگی ورنہ بصورت دیگر اپنے انجام بد کو ضرور پہنچے گی۔ طبقۂ اول کا کام قوم و ملت کو صحیح راہ دکھانا ہے۔ اور طبقۂ ثانی کا کام قوم و ملت کو صحیح راہ پر چلانا ہے۔ لہذا قوموں کی صلاح و فلاح کے لئے ان دونوں طبقوں کا وجود نہ صرف ضروری ہے بلکہ خود ان کی اپنی صلاح و فلاح بھی ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک

قائدین اور زعمار صالح، صحیح الفکر اور تمام حالات دکوائف سے باخبر نہ ہوں گے وہ ملک وملت کی صحیح قیادت نہیں کرسکیں گے۔ اور ملک وملت کا بیڑا پار نہیں ہوسکے گا۔

کسی قوم کے اقبال وادبار میں طبقہ "اولی الامر" کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اور پوری قوم کی اقبال مندیوں یا اس کی تباہیوں کی اصل ذمہ داری اسی پر آپڑتی ہے۔ کیونکہ عوام تو "العوام کالانعام" کے بمصداق چوپایوں کی طرح ہوتے ہیں ان کو جدھر چاہے ہانکا جاسکتا ہے اس لئے علمار اور ارباب اقتدار کو اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔

دُنیا میں اس وقت مسلمان کروڑوں کی تعداد میں آباد ہونے اور بہت سے ملکوں کے مالک ہونے کے باوجود پریشان اور کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرح منتشر و پراگندہ کیوں ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ سب قیادت کی کمزوریاں ہیں۔ اس سلسلے میں قومی اور جغرافیائی حدبندیوں کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے مگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو خلوص وللہیت، صحیح حکمت عملی اور تنظیم و منصوبہ بندی کا فقدان نظر آتا ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ اتنی زبردست افرادی قوت رکھنے والی اور زبردست قدرتی وسائل سے مالا مال عظیم ترین ملت دُنیا کی کایا نہ پلٹ سکتی۔ اور اغیار کے مقابلے میں بالکل بے بس اور مجبور اور لاچار ہو جاتی! جب کہ جاپان۔ جرمنی وغیرہ دنیا کی چھوٹی چھوٹی قومیں افرادی حیثیت سے قلیل ہونے کے باوجود زبردست طاقتوں کے روپ میں نمودار ہوئی ہیں اصل چیز خلوص، تنظیم، منصوبہ بندی، اتحاد، بیدار مغزی اور سخت محنت وجفاکشی ہے۔ جو اس راہ میں کامیابی وکامرانی کے لئے بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مقصد سے لگن بلکہ عشق اور کام کرنے کا صحیح جذبہ ہونا چاہیئے۔ تب کہیں کوئی ٹھوس اور پائیدار نتیجہ برآمد ہوگا۔ ورنہ محض تقریروں اور لکچروں سے قوموں کی کایا پلٹی نہیں جا سکتی۔

خلافت کا منصب علمی اور منصب مادی

اس لحاظ سے تکمیل خلافت کے لئے دو چیزوں کی ضرورت نظر آتی ہے:

۱۔ علمی حیثیت سے عالم انسانی کی عموماً اور امت مسلمہ کی خصوصاً رہنمائی اور اس کی تنظیم و منصوبہ بندی۔

۲۔ ظاہری و مادی حیثیت سے اس تنظیم و منصوبہ بندی پر عمل درآمد۔

پہلی چیز کو ہم علمی خلافت یا خلافتِ ارض کا علمی منصب اور دوسری چیز کو مادی خلافت یا خلافت ارض کا مادی منصب اور اس کی تکمیل کا ضروری جزو کہہ سکتے ہیں جس کے بغیر کوئی بھی منصوبہ عمل میں نہیں آسکتا۔[۹۵] علمی خلافت کے اصل وارث چونکہ علماء ہیں اس لئے اس تنظیم و منصوبہ بندی کے اصل ذمہ دار وہی ہیں۔[۹۶] مادی خلافت کی زمام کار چونکہ حکام وقت کے قبضے میں رہتی ہے اس لئے علماء کی جانب سے پیش کردہ منظم منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا مسلم ممالک کے سربراہوں اور حکامِ وقت کا کام ہے۔ چونکہ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے اس لئے ملت اسلامیہ کا مفاد اور اس کی نجات اسی میں ہے کہ ملت کے یہ دونوں طبقے جن کو اسلام "اولی الامر" کہتا ہے پورے خلوص اور ذمہ داری کے ساتھ کام کریں اور ان کے درمیان باہمی تال میل رہے۔

یہ بات ان ممالک کے لئے ہے جہاں کی باگ ڈور خود اہل اسلام کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے برعکس وہ ممالک جن میں وہ دوسروں کے ماتحت بحیثیت عددی

---

[۹۵] قانون فطرت کے مطابق اس عالمِ رنگ و بو کی ہر چیز زوج زوج ہوتی ہے "زوجیت" قدرت کا ایک ہمہ گیر قانون اور عظیم کلیہ ہے۔ اس کلیے سے خلافت بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے بھی دو اجزا ہیں: علم اور مادی قوت۔ اور ان دونوں کے تعامل کے بغیر خلافت مکمل نہیں ہو سکتی۔

[۹۶] دنیا میں علما کا یہ صحیح منصب اور صحیح مقام ہے کہ وہ محض مدرسوں اور خانقاہوں کی چاردیواری میں محصور نہ ہوں بلکہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے پر ان کی رہنمائی محیط ہو۔ علماء اس زمین کا نمک ہیں مگر جب نمک سے اس کی نمکینی زائل ہو جائے تو پھر لوگ کس چیز سے نمک حاصل کر سکیں گے!

اقلیتوں کے زندگی گزار رہے ہیں وہاں پر وہ اپنے قومی و ملکی حالات کے اعتبار سے اپنی دینی، ثقافتی، تعلیمی، اصلاحی اور معاشی وغیرہ قسم کی تنظیمیں قائم کر کے اس میدان میں جدوجہد کر سکتے ہیں اور اپنے آپ کو "امت وسط" بنانے نیز اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کے لیے عزم و حوصلہ ہارے بغیر ہر ممکن طریقے سے انہیں جدوجہد کرنا پڑے گا۔ اور انہیں یقین رکھنا چاہیے کہ خلوص، حسن نیت اور حسن عمل اپنے پھل اور ثمرات پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ○ اللہ حسن عمل کا مظاہرہ کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتا۔ (توبہ : ۱۲۰)

اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ○ اللہ کی رحمت خلوص کاروں سے بہت قریب ہے۔ (اعراف : ۵۶)

وَالَّذِیۡنَ جَاھَدُوۡا فِیۡنَا لَنَھۡدِیَنَّھُمۡ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ○ اور جنہوں نے ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کیں انہیں ہم ضرور اپنے راستے دکھا دیں گے۔ اور یقیناً اللہ حسن عمل کا مظاہرہ کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (عنکبوت : ۶۹)

بہرحال اس وقت ہم کو مختلف میدانوں میں بیک وقت کام کرنا ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ فطری طریقۂ تقسیم کے مطابق ایک بڑی مشین کے کَل پُرزوں کی طرح اپنے مرکز سے جڑے رہ کر، ہم مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں اور "وَتَعَاوَنُوۡا عَلَی الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰی" (اور تم نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو) کے اصول اور بنیادی اسپرٹ کے مطابق تمام شعبے اور تمام جماعتیں ایک دوسرے کے ساتھ مکمل اور بھرپور تعاون کریں۔

منصوبہ بندی کی اہمیت

موجودہ دَور منصوبہ بندی (planning) کا دور ہے۔ بغیر

منصوبہ بندی اور پلاننگ کے صحیح سمتوں اور صحیح لائنوں میں کوئی کام نہیں ہو سکتا اور ہمہ گیر نتائج نہیں نکل سکتے۔ یہ منصوبہ بندی بھی دراصل قرآن حکیم ہی کا ایک بھولا بسرا سبق ہے جس کو امتِ مسلمہ نے تو فراموش کر دیا مگر اغیار اس سے زندگی کے ہر شعبے میں بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ آج ترقی یافتہ قوموں اور معاشروں میں جو کام اور جو امور انجام پا رہے ہیں ان کے نقشے اور منصوبے پچھلے دہوں اور پچھلی ربع صدی میں ذہن و دماغ سے نکل کر صفحہ قرطاس پر منتقل ہو چکے تھے۔ قرآن حکیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کاموں (تمام طبیعی و شرعی امور) کے منصوبے مختلف اسباب و علل کے روپ میں بناتا ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا[61] ۝ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ایک متعین ضابطہ (منصوبہ) بنایا۔ (فرقان : ۲)

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ۝ اور ہر چیز اس کے ہاں ایک خاص انداز سے ہے (رعد : ۸)

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ ۝ اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے موجود ہیں۔ مگر ہم اس کو ایک متعین مقدار کے ساتھ اتارتے ہیں (حجر : ۲۱)

اور حسب ذیل فقرہ مختلف مظاہرِ کائنات اور ان کے نظاموں کا تذکرہ کرنے کے بعد بطور تاکید تین تین مرتبہ بیان کیا گیا ہے:

ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ یہ ہے اندازہ و منصوبہ ایک زبردست اور ہمہ دان ہستی کا۔ (انعام : ۹۶، یٰس : ۳۸، حم سجدہ : ۱۲)

یہ تو زیادہ تر فطری و طبیعی ضوابط کا بیان ہے۔ اب رہے شرعی امور اور دیگر عام علل و اسباب تو اس کے بارے میں بھی ارشاد باری ہے:

---

[61] لفظ قدر اور تقدیر کی تشریح و تفسیر کے لئے دیکھئے تیسرا باب۔

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ۝ اور اللہ کا معاملہ (پہلے سے) تجویز کیا ہوا ہے۔ (احزاب: ۳۸)

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ۝ یقیناً ہم نے ہر چیز کو ایک خاص انداز سے پیدا کیا ہے اور ہمارا حکم تو صرف ایک (بات) ہے جیسے آنکھ کا جھپکا۔ (قمر: ۴۹-۵۰)

ہمارے منصوبوں اور خدائی منصوبوں میں فرق یہ ہے کہ ہم کو اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں بہت زیادہ دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے، مختلف مادی وسائل کا سہارا لینا پڑتا ہے اور سخت مشقت اور جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ مگر پھر بھی بعض اوقات چند خامیوں کی وجہ سے نتیجہ خراب ہو جاتا ہے اس کے برعکس خدائی منصوبوں میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی بلکہ اس کے ارادے کے ساتھ ہی وہ چیز واقع ہو جاتی ہے۔ آخری آیت کریمہ میں اسی ازلی حقیقت کا انکشاف فرمایا گیا ہے۔

بہر حال قرآن حکیم میں اس قسم کی منصوبہ بندیوں کا تذکرہ کرنے کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُمتِ مسلمہ بھی اپنے تمام کاموں اور تمام قومی و ملی مسائل کے بہت پہلے ہی سے منصوبے بنایا کرے۔ ظاہر ہے کہ جب خداوند کریم ہی بغیر منصوبوں کے کوئی کام نہیں کرتا (حالانکہ اسے اس قسم کے منصوبوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی) تو آخر ہم کیوں اس قسم کی منصوبہ بندیوں کو نظر انداز کر دیں؟ انسان میں خدا کی تمام صفات کا نمونہ اور اس کا عکس موجود ہے، جس کی بنا پر وہ اس کے کاموں کی "نقل" اتارتا رہتا ہے۔ تو ہم کیوں اپنے اجتماعی معاملات میں اس عظیم خدائی صفت کی نقل اتارنے میں پیچھے رہ گئے؟ کیا یہ بات ہماری ملی زندگی کے لیے نقصان دہ نہیں ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہماری موجودہ ملی واجتماعی زندگی کے تمام مسائل و معاملات دراصل اسی وجہ سے فیل اور ناکام ہو رہے ہیں کہ ان کے پیچھے کوئی صحیح سوجھ

بوجھ اور صحیح منصوبہ نہیں ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمارے "بہترین دماغ" ایک جگہ اکٹھا ہوں اور پورے باہمی تال میل کے بعد ہماری ملت کے سامنے ہر کام کا ایک مکمل منصوبہ اور اسکیم پیش کریں اور پھر سب مل کر پورے اخلاص اور سرگرمی کے ساتھ جدوجہد کریں اور وہ منصوبہ تکمیل ہو جائے۔ الا ماشاء اللہ

اس طرح ہماری ملی واجتماعی زندگی میں کامیابی کی دو بنیادیں ہیں: ایک منصوبہ بندی اور دوسرے اس منصوبہ بندی کے مطابق عملی جدوجہد۔ یہ دونوں ہی چیزیں ضروری اور بنیادی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی منصوبہ اور کوئی بھی اسکیم، خواہ وہ کتنی ہی بہتر اور جامع ہو، اُس وقت تک کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ جبتک کہ پوری سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ اُس پر عمل نہ کیا جائے۔ جس قوم کے سامنے کام کرنے کا کوئی نقشہ اور آئیڈیل موجود نہ ہو اور وہ بالکل "بے فکری" کی زندگی گذار رہی ہو وہ دُنیا کے اسٹیج پر نہ کوئی کارنامہ دکھا سکتی ہے اور نہ اسٹیج پر زیادہ عرصے تک باقی و برقرار رہ سکتی ہے۔ یہ قرآن حکیم اور صحیفۂ تاریخ دونوں کا متفقہ فیصلہ ہے جس میں چوں و چرا کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔

منصوبہ بندی کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اس سے ہماری ملی واجتماعی زندگی میں افراط وتفریط اور انتشار کا دور دورہ ختم ہو کر یکسانیت اور یک رنگی آجائے گی جیساکہ ہم کو نظام کائنات میں خدائی منصوبوں کے باعث یکسانیت اور عدم انتشار نظر آرہا ہے۔ اس طرح فطرت و شریعت کا ساز و آہنگ بھی متحد ہو جائے گا۔

یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ آج زندگی کے میدان میں وہی ملت ایک دوراہے پر کھڑی ہوئی انتشار ذہنی میں مُبتلا بلکہ ہر حیثیت سے "بے فکری" کا مظاہرہ کر رہی ہے جس کے سامنے قرآن عظیم جیسا ابدی و سرمدی مکمل دستور العمل موجود ہے، جس میں انفرادی واجتماعی زندگی کے سارے "منصوبے" اور "اسکیمیں" مفصل طور پر اور پوری وضاحت کے ساتھ مذکور ہیں۔ اب ہماری اس سے بڑھ کر بدقسمتی اور محرومی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اس سرچشمۂ ہدایت سے محض اپنی بے حسی

اور کوتاہ بینی کی وجہ سے غافل غیروں کے آستانوں کی طرف لپک رہے ہیں اور غیروں سے اصول و نظریات مستعار لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اگر دنیا میں ہم کو باعزت زندگی گزارنی ہے، ملی و اجتماعی حیثیت سے اپنا درجہ بلند کرنا ہے اور سب سے بڑھ کر اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہم کو عزیز ہے تو پھر ہم کو کاہلی و بے فکری، ذہنی انتشار اور پراگندگی، بدعملی اور بے راہ روی کو ترک کر کے سچی محنت اور لگن کے ساتھ مسلسل جدوجہد کرنی پڑے گی تب کہیں جا کر گوہر مراد حاصل ہوگا۔ اور نصرتِ الٰہی شامل حال ہوگی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کاہلوں اور بدعملوں کی کوئی مدد نہیں کرتا اور حالات کو نہیں بدلتا۔ انقلاب لانے کے لئے انقلابی تبدیلیاں بھی کرنی پڑیں گی۔ آج تک دنیا میں کوئی بھی انقلاب نرم بستروں اور مسہریوں پر رونما نہیں ہوا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ط اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت آپ نہ بدل لے۔ (رعد: ۱۱)

مسلمانوں کے سوچنے کے انداز میں روحانیت یا غیر مادیت کا اتنا غلبہ ہو گیا ہے کہ وہ عملاً مادی دنیا، مادی قوانین اور اسباب و علل کی اہمیت ہی کو نظر انداز کر چکے ہیں۔ ان کے موجودہ ذہنی و نفسیاتی احوال و کوائف کو دیکھا جائے تو ایک عجیب و غریب قسم کا عدم توازن اور انتشار نظر آتا ہے۔ بلکہ اس کی کوئی توجیہ کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ آج مسلم اقوام اپنی عملی زندگیوں میں دوہرے معیار یا ثنویت کا شکار دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اپنی انفرادی زندگیوں اور انفرادی معاملات میں تو ظاہری اسباب و علل سے خوب آشنا اور خوب کام لیتی ہیں مگر جیسے ہی کوئی ملی یا اجتماعی معاملہ سامنے آتا ہے تو فوراً اسباب و علل کو معطل کر دیا جاتا ہے

اور باطنی اسباب یا معجزات کے ظہور کا انتظار کیا جانے لگتا ہے۔ یا پھر اتنی خودغرضی اور بے حسی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ گویا ہمیں ملی و اجتماعی زندگی اور اجتماعی مسائل سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن اور حدیث کی تمام تعلیمات اجتماعی زندگی سے بھری پڑی ہیں۔ اور امتِ مسلمہ سے قرآن مجید کے تمام خطابات اجتماعی نوعیت کے ہیں۔ ان احکامات اور صریح بیانات کا تقاضا ہے کہ اسلامی معاشرہ حقیقی بنیادوں پر قائم ہو اور ہمارے تمام مظاہر میں یکسانیت اور حقیقت پسندی ہو تضاد یا دوغلاپن نہ ہو یا ایسا کبھی نہ ہو کہ ہم اپنی مرضی سے بعض امور کو جماعتی اور بعض امور کو غیر جماعتی خانوں میں بانٹنے لگ جائیں۔ بلکہ ہمارے جتنے بھی اجتماعی مسائل و معاملات ہیں سب میں جماعتی نظم و نسق ہونا چاہیے ورنہ مثبت نتائج کی توقع فضول ہوگی۔ اور ہمارے تمام ملی معاملات میں اجتماعیت اور منصوبہ بندی کو بنیادی اہمیت دینی چاہیے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو۔ کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے (البقرہ: ۲۰۸)

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهْلِهَا اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم تمام امانتوں (بندوں سے متعلق ہر قسم کے حقوق) کو ان کے مستحقین تک پہنچا دیا کرو۔ (النساء: ۵۸)

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ٥ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ٥ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ٥ اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اور اس سے روگردانی نہ کرو (سب کچھ) سن چکنے کے باوجود۔ اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا درحالیکہ انہوں نے سنا ہی نہیں۔ بدترین خلائق اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں

جو بہرے گونگے ہیں۔ وہ کسی بات کو سمجھتے ہی نہیں۔ (انفال: ۲۰ - ۲۲)

ایک مغضوب و معتوب قوم کی مثال

اس سلسلے میں ہمیں ایک مغضوب و معتوب مگر محنتی و جفاکش اور سخت جان قوم (یہود) سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ جو عددی اعتبار سے دنیا کی ایک چھوٹی اور حقیر سی قوم ہے۔ مگر اس کے باوجود آج دنیا کے بڑے بڑے حتیٰ کہ امریکہ جیسے عظیم ممالک تک اس کے قبضے اور مٹھی میں ہیں۔ ان کے اشاروں پر دنیا ناچتی ہے۔ اور آج وہی کچھ ہو رہا ہے جو وہ چاہتی ہے۔ یہ معجزہ آخر کس طرح ظہور میں آیا؟ تو یہ صرف دو بنیادی عناصر منصوبہ بندی اور جہدِ مسلسل کا کرشمہ اور ان کی کارستانی ہے۔ یہود اپنے خفیہ منصوبے کے تحت اور پورے عزم و حوصلے کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہیں۔ وہ اعلیٰ درجے کے سائنس دان ہیں[۶۳]۔ وہ اعلیٰ درجے کے ڈاکٹر ہیں۔ وہ اعلیٰ درجے کے انجینئر ہیں۔ وہ اعلیٰ درجے کے منتظم، ایڈمنسٹریٹر، ماہرینِ تعلیم، ماہرینِ معاشیات و سیاسیات اور صحافی ہیں۔ وہ زندگی کے مختلف فلسفوں کو ترتیب دے رہے ہیں۔ مختلف علوم و فنون کی تدوین کر رہے ہیں اور مختلف شعبوں میں فنی مشیر ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ خواہ سائنسی ادارے ہوں یا تعلیمی ادارے، انتظامی ادارے ہوں یا نشر و اشاعت کے مراکز، شفاخانے ہوں یا تجربہ گاہیں، علمی مراکز ہوں یا اکیڈمیاں، بینک یا سودی کاروبار کے ادارے ہوں یا دیگر ثقافتی مراکز

---

۶۳ نوبل انعامات کی گذشتہ اسّی سالہ تاریخ میں صرف ایک مسلم نما قادیانی نے نوبل انعام حاصل کیا ہے جب کہ یہودی قوم باوجود اپنی قلیل ترین اقلیت کے ۲۸ فی صد سے زیادہ انعامات حاصل کر چکی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بچوں کو گھروں اور مدرسوں میں مسلسل یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں اقلیت میں ہیں اور اعلیٰ سائنس اور دیگر علوم کی تحصیل کے بغیر وہ ترقی نہیں کر سکتے۔ اور اسی اعتبار سے اس راہ میں مختلف تنظیمیں ان کی مدد کرتی ہیں۔

اخبارات و رسائل ہوں یا خبر رساں ایجنسیاں، سب پر دنیا کی اس چھوٹی سی قوم کا قبضہ ہو چکا ہے اور اب حال یہ ہے کہ ان کے قومی یا ملی مسائل کے خلاف دنیا کے کسی بھی حصّے سے کوئی آواز بلند ہوتی ہے یا ان کے قومی مفاد کے خلاف کوئی چھوٹا سا واقعہ بھی پیش آجاتا ہے تو ان کی پوری مشنری حرکت میں آجاتی ہے اور دنیا کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک ایک آگ سی لگ جاتی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ ہو یا فرانس اور جرمنی کوئی بھی ملک اس قوم سے دشمنی مول لینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسطین کا قضیہ آج تک حل نہ ہو سکا۔ اگرچہ یہ سب ممالک ظاہری اعتبار سے عرب ممالک سے ہمدردی کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جینے کا حق اور اس کا سلیقہ اسی قسم کی محنتی اور جفاکش قوموں کو حاصل ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور میں ہمہ گیر اور عالمگیر کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آج جن شعبوں میں ترقی یافتہ قومیں کام کر رہی ہیں انہی شعبوں میں کام کر کے ہم اتنی ترقی حاصل کر لیں کہ ایک حیثیت سے ہم ان کی برابری کر کے ان کو نیچا دکھا سکیں تو دوسری حیثیت سے ان شعبوں میں جو "شر" کار فرما ہے اس کو خارج کر کے اس کی جگہ "خیر" کو داخل کر سکیں۔ مگر اس کے لئے کم از کم ان کی برابری ضروری ہوگی۔ کیونکہ لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے الحدید بالحدید یُفلح۔

خلافتِ ارض اور سنّتِ الٰہی

کارِ خلافت ایک بہت بڑی امانت اور گراں بار شئے ہے۔ اور اس کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں۔ یہ وہ بارِ گراں ہے جس کو اٹھانے کے خوف سے ارض وسما اور جبال تک تھرا گئے۔ اور سب نے انکار کر دیا۔ مگر قرعۂ فال انسان کے نام نکل گیا اور وہ اس کو بے سوچے سمجھے اٹھا بیٹھا۔ مگر اب اس کو یہ

یہ ذمہ داری ہر حال میں سنبھالنی پڑے گی۔ یہ معاملہ مشکل بھی ہے اور نازک و پُرپیچ بھی مگر ناخنِ تدبیر سے کام لے کر تمام معاملات کو سلجھانا اور مشکلات و موانع کو دُور کرنا ہے۔

خلافت کا بارِ گراں کیا ہے اس پر حسب ذیل آیت کریمہ روشنی ڈال رہی ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ٥ ہم نے یہ امانت[۶۴] آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تو ان سب نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے۔ مگر انسان نے اس کو اُٹھا لیا۔ کیونکہ وہ (اپنے حق میں) بے ترس اور نادان ہے۔ (احزاب: ۷۲)

خلافت کا یہ بارِ گراں آفرینش آدم سے لے کر موجودہ دور تک نوع انسانی کے مختلف طبقات اور مختلف اقوام کو مختلف ادوار میں برابر سونپا جاتا رہا اور اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر انہیں ہمیشہ تنبیہہ کی جاتی رہی۔ چنانچہ قوم نوحؑ کی تباہی کے بعد ھود علیہ السلام کی زبان سے قوم عاد کو متنبہ کرتے ہوئے کہا گیا:

وَاذْكُرُوْا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْا اٰلَاءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ اور یاد کرو جب کہ اس نے تم کو قوم نوح کے بعد خلیفہ بنایا اور تمہارے جسموں کو ڈیل ڈول والے کر دیا۔ لہٰذا تم اللہ کی نوازشات کو یاد رکھو تاکہ تم فلاح پاسکو۔ (اعراف: ۶۹)

قوم ثمود کو خبردار کرتے ہوئے صالح علیہ السلام کی زبانی یوں کہلوایا گیا:

وَاذْكُرُوْا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْا اٰلَاءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ٥ اور یاد کرو کہ جب اس نے

---

[۶۴] جمہور مفسرین کے نزدیک امانت سے مراد دین کے تمام وظائف و اعمال ہیں۔ (تفسیر قرطبی، بحوالہ تفسیر معارف القرآن مفتی محمد شفیع، ۲۴۴/۷)

تم کو قومِ عاد کے بعد خلیفہ بنایا اور زمین میں تم کو ٹھکانہ دیا کہ تم نرم زمین میں محل بناتے ہو اور پہاڑوں میں گھر تراشتے ہو۔ لہٰذا تم اللہ کے احسانات کو یاد رکھو اور زمین میں فساد برپا مت کرو۔ (اعراف: ۷۴)

بنی اسرائیل کو جب موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ خلافت ارض کی خوشخبری دی گئی تو اس کے ساتھ چند شرائط کی بھی تصریح کی گئی اور چند اصول وضوابط بھی بیان کر دیے گئے:

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْا ج اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ تف لا یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ ط وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ o قَالُوْٓا اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ط قَالَ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّھْلِکَ عَدُوَّکُمْ وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ع o

موسیٰ ؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم اللہ سے مدد طلب کرو اور ثابت قدم رہو۔ یقیناً زمین اللہ ہی کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور اخیر کامیابی انہی کو ہوگی جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں گے۔ قوم کے لوگ کہنے لگے کہ ہم تو ہمیشہ مصیبت ہی میں رہے آپ کی تشریف آوری سے پہلے بھی اور آپ کی تشریف آوری کے بعد بھی۔ موسیٰ ؑ نے کہا کہ اللہ بہت جلد تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ پھر وہ دیکھے گا کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔ (اعراف: ۱۲۸-۱۲۹)

ان آیات کریمہ میں مشروط طور پر صاف صاف بتا دیا گیا کہ خلافت ارض کی بنیاد حُسنِ عمل پر ہے۔ اگر کسی قوم میں یہ خوبی موجود ہو تو وہ ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہوگی۔ اور زمین کی وارث و حاکم بنے گی۔ (والعاقبۃ للمتقین) اس کے لئے دین حق پر ثابت قدمی اور استعانت باللہ ضروری شرائط ہیں۔ اس کے برعکس جو قوم ان صفات (دین حق پر ثابت قدمی اور استعانت باللہ) سے عاری ہوگی یا دوسرے لفظوں میں دین بیزار اور خدا بیزار ہوگی وہ تباہ و برباد کر دی جائے گی، خواہ تمدنی اعتبار سے وہ کتنی ہی عظیم الشان کیوں نہ

ہو۔ جیسے عاد وثمود جو اپنے دور میں شاندار تمدن کی مالک تھیں چہ بہ خدائی قانون اور خدائی فیصلہ ہے کہ بداعمالیوں اور اخلاقی بگاڑ کے باعث تو میں تہس نہس کردی جاتی ہیں اور خلافت کی چابیاں پھر کسی نئی قوم کو عطا کی جاتی ہیں۔ ازل سے یہی دستور چلا آرہا ہے اور ابد تک یہی دستور وقانون جاری رہیگا۔

کسی قوم کی معزولی یا تباہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اگر تھوڑی سی ڈھیل دے رکھی ہے تو اس کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ عذاب الٰہی اور اس کی پکڑ سے بچی ہوئی ہے۔ بلکہ یہ بات دراصل خداوند کریم کی جانب سے ایک مہلت ہے اور اس کو موقع دیا جارہا ہے کہ اگر وہ سنبھلنا چاہے تو سنبھل جائے اور پھر اس کے لئے اللہ کے پاس کسی قسم کا عذر باقی نہ رہے۔

وَمَا اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتٰبٌ مَّعْلُوْمٌ ٥ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ٥ اور ہم نے جس بستی کو بھی تباہ کیا اس کے لئے ایک معیّن نوشتہ (مقررہ وقت) رکھ دیا تھا۔ (چنانچہ) کوئی قوم نہ اپنے وقت معین سے آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے (حج: ۴۔۵)

خود امتِ محمدیہ (پوری امت دعوت واستجابت[۶۵]) سے خطاب کرتے ہوئے یہ ابدی فیصلہ اس طرح سنایا گیا ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ٥ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ٥ اور ہم نے تم سے پہلے بہت سی قوموں کو ان کے ظلم کی پاداش میں ہلاک کردیا ہے۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کر آچکے تھے۔ مگر وہ (اپنے عناد قلبی کے باعث) ایمان لانے والے نہیں تھے مجرم لوگوں کو ہم

---

۶۵ امت دعوت سے مراد قیامت تک پوری نوع انسانی ہے اور امت استجابت سے مراد امت مسلمہ ہے۔

اسی طرح سزا دیتے ہیں پھر اُن کے بعد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو۔ (یونس : ۱۳-۱۴)

خلاصہ یہ کہ خدائی فیصلے اور دستور کے مطابق ابتدائے آفرینش سے یکے بعد دیگرے مختلف قوموں کو مشروط طور پر منصب خلافت پر فائز کیا گیا۔ پھر بہت جلد ان کی بداعمالیوں کی پاداش میں ان سے یہ منصب عظیم چھین لیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی سُنّت ہمیشہ سے اسی طرح چلی آرہی ہے اور اس میں کسی قسم کا استثناء نہیں ہے۔

خلافتِ ارض کی شرائط

صحیفۂ ربانی میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک ایسی زبردست بشارت موجود ہے جو آج اُمّتِ محمّدیہ کے لئے پیامِ حیات اور صوتِ سرمدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ یہ ابدی فیصلہ اور عظیم الشّان ربانی بشارت اس طرح سُنائی گئی ہے :

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ط وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور صالح عمل کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں ضرور خلیفہ بنائے گا۔ جیسا کہ ان سے پہلے والوں کو بنایا تھا۔ اور ان کے دین کو وہ مضبوطی سے جما دے گا، جس کو اس نے ان کے حق میں پسند کر لیا ہے۔ اور ان کے خوف کو وہ امن سے بدل دے گا۔ (شرط یہ ہے کہ) وہ میری عبادت اس طرح کریں

رہیں کہ کسی کو میرا شریک نہ بنائیں[۶۶]۔ (۳) واضح حکم) کے بعد جو انکار کریں گے وہ بدکردار ہوں گے۔ (نور: ۵۵)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ ۝ اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ زمین کے وارث (آخر کار) میرے صالح بندے ہوں گے۔ اس میں عبادت گذاروں کے لئے ایک بڑا پیغام ہے[۶۷] (انبیاء: ۱۰۵-۱۰۶)

یہ دونوں آیتیں ایک دوسرے کی بخوبی تشریح و تفسیر کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ اگرچہ خلافت راشدہ (۱۱-۴۰ھ مطابق ۶۳۲-۶۶۰ء) اور بعد کے ادوار میں بخوبی پورا ہو چکا ہے مگر یہ پیام حق ایک مژدۂ جاوید ہے جو ہر دور کے لئے مشروط طور

---

[۶۶] اللہ کی عبادت اس طرح ہو کہ اس میں کسی قسم کے شرک کا شائبہ تک نہ ہو، نہ انفرادی زندگی میں نہ اجتماعی زندگی میں۔ شرک کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں سے ایک قسم غیر اللہ کی مطلق اطاعت بھی ہے۔ اہل ایمان سے شرک نہ کرنے کا مطالبہ یہاں پر بین الاقوامی سیاق میں شاید یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خصوصی معاملات میں غیر قوموں کو حکم نہ بنائیں اور بے چوں و چرا ان کے احکامات کی تعمیل نہ کریں۔ اسی کو بعض دیگر مواقع پر طاغوت کی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔ اللہ پر ایمان کامل ہونے کی اولین شرط یہ ہے کہ عملاً طاغوت کا سب سے پہلے انکار کیا جائے۔ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ ج جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لے آیا اس نے مضبوط حلقہ تھام لیا (البقرہ: ۲۵۶)

[۶۷] اس آیت کریمہ میں بعض مفسرین نے ارض سے مراد "ارض جنت" لیا ہے۔ یعنی ارض جنت کے وارث آخر کار صالح بندے ہی ہوں گے۔ مگر جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے تحریر فرمایا ہے

(باقی آئندہ صفحہ پر)

پر عام ہے۔[٦٧]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۸ کا) اس سے مراد دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کی وراثت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حتمی فیصلہ کر دیا ہے اور اس نظریئے کی تائید اور ثبوت میں سورۂ نور کی مذکورہ بالا آیت کے علاوہ حسب ذیل دو آیتیں بھی پیش کی ہیں۔

۱۔ إِنَّ الْأَرْضَ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ

(اعراف: ۱۲۸)

۲۔ إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ (مؤمن: ۵۱)

(تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۰۱ دار احیاء الکتب العربیۃ مصر)

نیز سورۂ انبیاء کی ان آیات کے بعد جو عظیم آیت کریمہ مذکور ہے اس کا بھی تقاضا ہے کہ یہ آیات اور ان کا حکم عام اور اس زمین یا عالم ناسوت سے متعلق ہو۔ " وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ " (اور ہم نے آپ کو سارے جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ انبیاء: ۱۰۷) رسول اکرم صلعم کا رحمت عالم ہونا جو علمی و نظریاتی حیثیت سے بالکل ظاہر اور مسلم ہے مگر عملاً آپ کی رحمت عامہ اور رحمت کاملہ کا محسوس و مشہود نظارہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ سارے جہان میں اسلام کی حکمرانی ہو اور زمین کے ایک ایک چپہ پر رحمت عالم کے عدل و انصاف کا سکہ قائم ہو جائے۔ امت مسلمہ کے سامنے خلافت ارض کا یہ اہم اور بنیادی پہلو ہمیشہ بطور ایک آئیڈیل پیش نظر رہنا چاہیے۔

[٦٨] جیسا کہ ابن کثیر نے خلافت راشدہ اور دیگر فتوحات اسلامیہ کو اس میں شامل کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ صحیحین کی حدیث کے مطابق یہ بات قیامت تک ہر دور میں پیش آسکتی ہے۔ لا تزال طائفۃ من امتی ظاهرين على الحق لا يضرهم من خذلهم ولا من خالفهم الى يوم القيامة: میری امت میں ایک جماعت قیامت تک برحق پر قائم رہے گی جس کو نہ تو وہ لوگ نقصان پہنچا سکتے ہیں جو ان کا ساتھ چھوڑ دیں اور نہ وہ لوگ جو اس کی مخالفت کریں۔ (تفسیر ابن کثیر، ۳/۳۰۲)

پہلی آیت کریمہ میں زمین میں خلیفہ بنائے جانے" (استخلاف فی الارض) کے لئے بنیادی شرط ایمان اور عمل صالح قرار دی گئی ہے۔ پھر اسی کو مختصر طور پر "عبادت" (یعبدوننی) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں بھی "صالحین" ہی کو "عابدین" کہا گیا ہے۔ اس لحاظ سے عبادت سے مراد عمل صالح ہوا۔ اور عمل صالح قرآن کریم کی ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں تمام شرعی و اخلاقی احکام و اوامر داخل ہیں۔ یہی وہ "بار امانت" یا کارِ خلافت ہے جس کو قبول کرنے سے ارض و سماوات اور تمام موجوداتِ عالم نے انکار کر دیا اور قرعۂ فال انسان کے نام نکل آیا۔ غرض اس عملِ صالح میں جہاں داری اور جہاں بانی بھی داخل و شامل اور اس کا ایک ضروری حصہ ہے۔ اس کے بغیر نہ تو مسلم معاشرہ وجود میں آسکتا ہے اور نہ "عمل صالح" کو قرار و ثبات حاصل ہو سکتا ہے۔ مسلم معاشرے کو وجود میں لانے اور اس کی حفاظت کرنے کے لئے بھی جہاں داری اور جہاں بانی کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ دَورِ رسالت مآب صلعم اور دورِ خلافت راشدہ کے حالات و واقعات، کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ معرکہ آرائیاں شاہد ہیں۔ کسی کمزور قوم یا کمزور معاشرے میں "عمل صالح" یا "احکام الٰہی" کا مکمل ظہور و نفاذ بہت مشکل دکھائی دیتا ہے جیسا کہ آج خصوصیت کے ساتھ ان مسلم ممالک کے حالات شاہد ہیں جہاں پر اسلامی حکومتوں کے قیام اور نظامِ شریعت کے نفاذ کی باتیں ہو رہی ہیں ؏ جن کو دنیا کی دیگر قومیں اور طاغوتی طاقتیں سازشوں کے ذریعے ختم کرنے اور ان کے اندرونی معاملات میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر مداخلت کر کے اسلامی تحریکوں کو ختم کرنے اور ان کے اثرات کو توڑنے کے درپے نظر آرہی ہیں در اصل میں اسلام کی نئی اٹھان اور اس کی تشکیل نو یا نشأۃ ثانیہ کے دُور رس عواقب و نتائج سے اقوامِ عالم اور خصوصیت کے ساتھ مغربی قومیں لرزاں و ترساں دکھائی دیتی ہیں۔ کیونکہ انہیں خوف ہے کہ مسلمان از سرِ نو قوت د

؏ مثلاً پاکستان اور ایران وغیرہ

طاقت اور دین کا صحیح شعور حاصل کر کے ہم پر پھر سے غالب نہ آ جائیں۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں (اور اُن کے مستشرقین کا مطالعہ ہم سے زیادہ وسیع ہے) کہ یہ سوئی ہوئی اُمت ایک بار پھر بیدار ہو جائے تو ہم پر قیامت آ جائے گی۔ کیونکہ ماضی میں اسلامی اور صلیبی جنگوں کے ذریعہ ان کو اس کا بخوبی اندازہ اور احساس ہے کہ اس امت پر جب ایمان کا نشہ طاری ہو جاتا ہے تو پھر وہ دنیا کی کسی بھی بڑی سے بڑی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتی اور اُس سے ٹکرا کر اس کو پاش پاش کرنے تک چین نہیں لیتی۔

غرض اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ زیر بحث آیات میں "عمل صالح" سے مراد محض چند رسوم و عبادات نہیں بلکہ ایک مکمل اور مثالی عمل کا نمونہ مطلوب و مقصود ہے جو ہر اعتبار سے "صالح" ہو۔ یعنی شرعی اُمور کی پابندی کے ساتھ ساتھ دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم و دائم رکھنے کی تمام تدبیروں پر عمل پیرائی جس کے باعث بیرونی خطرات کا سدِّ باب ہو سکتا ہو۔ اور پوری طرح امن و امان اور چین و سکون حاصل ہو سکتا ہو اسی کا نام "ازالۂ خوف" ہے جس کا یہاں پر تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس مثالی عمل سے مزّین و آراستہ افراد ہی کو سورۂ انبیا والی آیت میں "الصالحون" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو زمین کے انجام کار وارث ہوں گے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایسی ہی صالح اور مثالی قومیں کشور کشا ہو سکتی ہیں۔ اور اپنے ملکوں کو اغیار کی دستبرد سے بچا سکتی ہیں۔

ایمان کا تقاضہ ہے کہ ایمان کی حفاظت کی جائے جس پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے۔ عبادت کا تقاضا ہے کہ عبادت گاہوں کی حفاظت کی جائے۔ اسی طرح دین کا تقاضا ہے کہ احکام دین کی حفاظت کی جائے۔ مُلک کا تقاضہ ہے کہ ملک کی سرحدوں کو محفوظ رکھا جائے اور ملّت کا تقاضہ ہے کہ ملی شعائر کا تحفظ کیا جائے۔ ورنہ سررشتۂ حیات

گم ہو جائے گا۔ اور دین وملت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

بہرحال ان آیات میں اہل ایمان سے تین چیزوں کا وعدہ کیا گیا ہے:

۱۔ ان کو زمین کی خلافت سونپی جائے گی۔ (استخلاف فی الارض)

۲۔ ان کے دین کو مضبوط و مستحکم کیا جائے گا۔ (تمکین دین)

۳۔ خوف و دہشت کی فضا دور کر کے امن و سلامتی عطا کی جائے گی۔ (تبدیل الخوف من الامن)

یہی تین چیزیں ہیں جن کو آج دنیائے اسلام کو شدید ضرورت ہے۔ ان تینوں امور میں غور فرمائیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ موخرالذکر دو چیزوں کا حصول ہی اصل میں خلافت (پہلی چیز) کی بنیاد ہے۔ یعنی وہی "عمل صالح" کا مکمل اور بے خوف و خطر ظہور و نفاذ، جس کو "دین کی مضبوطی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے جب تک یہ دونوں چیزیں (دین کی مضبوطی یا عمل صالح کا بے روک ٹوک نفاذ اور دنیا کی معاصر قوموں سے پوری پوری بے خوفی) حاصل نہ ہو جائیں "خلافتِ ارض" ایک بے معنی لفظ رہے گا، چاہے روئے زمین پر چالیس کے بجائے چار سو مسلم حکومتیں وجود میں آجائیں۔

حاصل یہ کہ یہ تینوں چیزیں اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتیں جب تک کہ ہم عصرِ جدید کے تقاضوں کے مطابق خود کو کیل کانٹوں سے پوری طرح لیس نہ کر لیں اور اقوامِ عالم کے مقابلے کے لئے دفاعی حیثیت سے اپنے آپ کو پوری طرح تیار نہ کر لیں۔ جب تک یہ شرائط پوری نہیں کی جائیں امتِ مسلمہ صحیح معنوں میں خلیفہ نہیں بن سکتی۔

لوہا اور قوموں کا عروج وزوال

یہاں پر یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مادی ذرائع و وسائل پر کلی اعتماد کرنا اصولاً غلط اور نقصان دہ ہے جیسا کہ تاریخ اسلام کے مختلف واقعات اور خصوصاً غزوۂ حنین کے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے مگر

مادی اسباب وعلل کو کلیتاً نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے ہر دور میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ اور جہاد کی تیاری کے لئے ہر قسم کے اسباب و وسائل سے لیس ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ مگر اصل بھروسہ اسباب کے بجائے خدا کی ذات والا صفات پر ہونا چاہیئے۔ جو لبسا اوقات تھوڑے سے وسائل کے باوجود کامیابی سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اس طرح دونوں ہی چیزیں ضروری ہیں کسی ایک چیز کا بھی استخفاف نہیں کیا جاسکتا۔ ہم کو ان دونوں میں افراط و تفریط کے بغیر ایک توازن اور تناسب قائم رکھنا چاہیئے۔ مگر ہم کو مادی وسائل کی فراہمی میں ہر ممکن کوشش ضرور کرنی چاہیئے جیسا کہ " وَاَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ " (اور تم ان کے مقابلے کے لئے اتنی قوت تیار کرو جتنی کہ تم کر سکتے ہو) کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔

نیز اسی طرح ایک دوسری عظیم الشان آیت کریمہ میں غور فرمائیے جس میں پوری وضاحت کے ساتھ اور صاف صاف جتلا دیا گیا ہے کہ امت مسلمہ جب تک لوہے کا صحیح صحیح استعمال سیکھ نہیں لیتی ــ بالفاظِ دیگر سائنس اور ٹکنالوجی میں دسترس حاصل نہیں کر لیتی ــ اس وقت تک اس کا خلیفہ یا سربلند ہونا مشکل ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل کے ساتھ بھیجا ہے۔ اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان[۶۹] اُتار دی ہے تاکہ لوگ عدل و درستی پر قائم ہو جائیں۔

---

[۶۹] یہاں پر میزان سے مُراد خصوصیت کے ساتھ انبیائے کرام کی سنّت ہے جو اپنی اصل ماہیت کے اعتبار سے گویا کہ "میزان" یعنی ترازو کا نمونہ اور معیار انسانیت ہے۔

اور ہم نے لوہے کو اتارا جس میں سخت ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے فوائد بھی۔ اور تاکہ (اس لوہے کو اتارنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ) اللہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی پیٹھ پیچھے نصرت کرتا ہے۔ یقیناً اللہ قوی اور زبردست ہے۔ (حدید: ۲۵)

اس آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنے رسولوں کے ذریعہ دینِ حق (کتاب وسنّت کی شکل میں) کھلے کھلے دلائل وبیّنات کے ساتھ بندوں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اور اور اس دین حق کے بھیجنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پوری نوع انسانی کی درستی اور اس کی اصلاح عمل میں آئے۔ (لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ) اور لوہے کے نزول یا اس کی تکوین کا مقصد اس سیاق میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے دراصل دینِ حق کی حمایت ونصرت اور اس کا دفاع مقصود ہے۔ اگرچہ اس میں لوگوں کے لئے دیگر بہت سے تمدنی فوائد بھی موجود ہیں۔ "وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ" (تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی پیٹھ پیچھے مدد کرتا ہے) کا یہی مطلب ہے۔ یعنی دین برحق کی نصرت وحمایت اور اس کے دفاع میں لوہے کا استعمال کرنا چاہیئے خواہ وہ تلوار اور نیزے کی شکل میں ہو یا توپ اور مشین گنوں کی شکل میں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی شکل میں ہو یا راکٹوں اور میزائیلوں کی شکل میں[1]۔ لہذا جب تک اہل اسلام لوہے کا صحیح صحیح استعمال سیکھ نہیں لیتے وہ دینِ الٰہی کی نصرت وحمایت اور اس کا دفاع صحیح طور پر نہیں کرسکتے اور موجودہ دور میں لوہے کا

---

[1] اس سے ایک ضمنی مسئلہ یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ "انکار سنت" کی بنا پر "لوہے" کو حرکت میں آجانا چاہیئے۔ بالفاظ دیگر منکرینِ حدیث کی گردن مارنی چاہیئے۔

صحیح استعمال اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مہارت اور دسترس نہ حاصل ہو جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی کوئی بھی قوم جب تک لوہے کے صحیح استعمال سے واقف رہی دیگر قوموں پر اس کی برتری قائم رہی۔ مگر جیسے ہی اس نے لوہے سے منہ موڑا اور جام و سبو کو گلے لگایا وہ صفحۂ ہستی سے مٹ دی گئی۔ شاعرِ مشرق نے بالکل صحیح فرمایا ہے ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

پھر اس آیتِ کریمہ میں "اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ" کی منطق پر غور کیجئے کہ اس کا تقاضہ کیا ہے؟ قوی کے معنی ہیں: قوت والا اور عزیز کے معنی ہیں: ایسی بالاتر ہستی جو کسی سے مغلوب نہ ہو سکے۔ اس حیثیت سے اس آیت کریمہ کا تقاضہ اور صاف مطلب یہ ہوا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ قوت و عزت اور سربلندی والا ہے اس لئے اس کے دین متین کو بھی ہمیشہ عزت و سربلندی کا مقام حاصل ہونا چاہیئے اور یہ عزت و سربلندی اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ خود مسلمان قوی اور سربلند نہ ہو جائیں اور مسلمانوں کو یہ قوت و غلبہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ لوہے کا استعمال اچھی طرح سیکھ نہ لیں۔

حاصل یہ کہ آج نہ صرف دین کی سربلندی اور نظامِ عدل کے قیام کے لئے بلکہ خود مسلمانوں کی کھوئی ہوئی شوکت اور اقبال مندی کے حصول اور بازیافت کے لئے بھی سائنس اور ٹیکنالوجی سے واقفیت لازمی اور اس میں مہارت حاصل کرنا فرض ہے۔ جس سے غفلت اور چشم پوشی ایک المیہ ہی نہیں بلکہ ہماری ملی و اجتماعی موت کے مترادف ہے۔ بالفاظ دیگر لوہے کے استعمال سے غافل اور بے پرواہ ہو کر مسلمان نہ صرف اپنے آپ کو ذلیل و رسوا کریں گے بلکہ وہ دینِ الٰہی کی بھی ذلت و رسوائی کا سبب بنیں گے۔ جس کے نتیجے میں معاصر قومیں نہ صرف مسلمانوں کا

مذاق اُڑائیں گی بلکہ خود ان کے دین و ایمان پر بھی پھبتیاں کسیں گی۔ جیساکہ آج ہمارے روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔

موجودہ ناگفتہ بہ حالات سے بددل اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اپنے تمام ممکنہ وسائل کا جائزہ لے کر مثبت بنیادوں پر دنیائے اسلام کی تعمیرِ نو میں لگ جانے اور عہدِ نو کا زرّین باب کھولنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ یقیناً سچا ہے۔ وہ ضرور اپنا وعدہ پورا کر کے رہے گا۔ بشرطیکہ ہم نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ کام کرنے لگ جائیں۔

هُوَ الَّذِىٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُۥ بِٱلْهُدَىٰ وَدِينِ ٱلْحَقِّ لِيُظْهِرَهُۥ عَلَى ٱلدِّينِ كُلِّهِۦ ۚ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ شَهِيدًا ۝ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ وہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔ اور اللہ (جو کہ علام الغیوب ہے) شہادت کے لئے کافی ہے۔ (فتح : ۲۸)

یہ ہے دینِ حق کی وہ سربلندی جو اصل مطلوب و مقصود ہے۔ اسی کے لئے جہاد فرض قرار دیا گیا ہے۔ اسی کے لئے ساری تیاریاں مطلوب ہیں اور اسی مقصدِ عظیم کی خاطر ہماری جانوں اور مالوں کی قربانیاں طلب کی گئی ہیں۔ (اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ) اسی مقصدِ وحید کے لئے جینا اور اسی کے لئے مرنا ہے۔ ورنہ نہ تو سائنس اور ٹکنالوجی کی کوئی اہمیت ہے اور نہ صنعت و حرفت کی کوئی وقعت۔ نہ قومی معیشت کی کوئی حیثیت ہے اور نہ کام و دہن کی آسودگی اور خوشحالی مطلوب۔ یہ سب چیزیں ضمنی اہمیت رکھتی ہیں بنیادی مقصد نہیں۔ بنیادی مقصد ہمیشہ ایک ہی ہے اور ایک ہی رہے گا۔ جس کے مطابق ہماری ملی و اجتماعی زندگی کو ڈھالنا ہے اور جدید سے جدید تر سائنسی اور پیمانوں کو کام میں لانا ہے۔

واضح رہے کہ اس آیت کریمہ میں علمی و استدلالی اور مادّی و ظاہری

دونوں قسم کا غلبہ واستیلار مطلوب ومقصود ہے۔ جس کا اظہار ہر دور میں ہوتے رہنا چاہیئے۔ اور ان دونوں میدانوں میں غلبہ واستیلار کے بعد ہی موجودہ دور کی مکمل قیادت ہمارے ہاتھ آسکتی ہے جس کا خواب صدیوں سے مسلم مفکرین دیکھ رہے ہیں۔

کیا سائنسی وصنعتی علوم کی تحصیل فرض ہے؟

امام غزالیؒ (۴۵۰ - ۵۰۵ ھ) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب احیاء العلوم میں ان تمام علوم وفنون کی تحصیل کو فرض کفایہ قرار دیا ہے جس کے عدم وجود کے باعث اجتماعی حیثیت سے کوئی خرابی لازم آسکتی ہو۔ چنانچہ موصوف " بیان العلم الذی ھو فرض کفایہ " (اس علم کا بیان جو فرض کفایہ ہے) کے عنوان کے تحت اصولی اعتبار سے تمام علوم کو علوم شرعی اور علوم غیر شرعی میں تقسیم کرکے تحریر فرماتے ہیں:

" وہ علم جو شرعی نہیں ہے اس کی چند قسمیں ہیں: وہ علم یا تو محمود و مستحسن ہوگا یا مذموم وغیر محمود ہوگا۔ یا جائز ومباح ہوگا۔ اور محمود وہ علم ہے جس سے دنیوی امور کی مصلحتیں وابستہ ہوں۔ جیسے طب اور حساب۔ اور یہ علم محمود بھی منقسم ہے: وہ یا تو فرض کفایہ ہوگا یا صرف فضیلت والا ہوگا، فرض نہ ہوگا۔ تو فرض کفایہ وہ علم ہے جس سے دنیوی اُمور کی صلاح ودُرستی میں صرف نظر نہ کیا جاسکتا ہو۔ جیسے طب۔ کیونکہ علم طب جسمانی صحت اور اس کی بقا کے لئے ناگزیر ہے، اور جیسے علم حساب جو وصیت اور وراثت وغیرہ کے معاملات میں بہت ضروری ہے[1] اور یہ وہ علوم ہیں جن

---

[1] آج کل دُنیا کا کوئی کاروبار، کوئی کارخانہ، کوئی صنعت، کوئی بینک اور کوئی بھی دفتر وغیرہ وغیرہ بغیر حساب کے ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ بلکہ اب تو سہولت کے لئے کمپیوٹروں کا نظام جاری ہوگیا ہے جو لمبے لمبے اور پیچیدہ حساب آن کی آن میں حل کرکے رکھ دیتے ہیں۔

سے اگر کوئی شہر خالی ہو جائے تو اہل شہر نقصان میں پڑ جائیں۔ اب اگر کوئی ایک شخص بھی ان علوم کو قائم و جاری کر دے تو کافی ہو جائے گا اور بقیہ لوگوں کی طرف سے فرض ساقط ہو جائے گا۔ اس لحاظ سے ہمارے اس قول سے کہ "طب اور حساب فرض کفایہ میں سے ہیں"، کسی کو تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ) مختلف قسم کی صنعتیں مثلاً کاشتکاری، کپڑے کی صنعت اور سیاست بلکہ نشترزنی اور درزی کا کام بھی فرض کفایہ میں داخل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شہر سے نشترزنی کرنے والے (علاج کی غرض سے نشتر لگا کر فصد کھولنے والے) ہی ناپید ہو جائیں تو پھر اس شہر والوں کی خرابی آجائے اور وہ ہلاکت کے قریب ہو جائیں۔ جس ہستی نے بیماری پیدا کی ہے اسی نے دوائی بھی پیدا کی ہے اور اس کا استعمال بھی سکھایا ہے۔ نیز اس کے اسباب بھی گنا دیئے ہیں۔ لہذا کسی معاملے کو مہمل قرار دے کر اس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

اب رہا وہ علم جو فضیلت میں تو شمار ہوتا ہے مگر فرض نہیں ہوتا، تو وہ ہے جو حساب اور طب کے امور میں بہت زیادہ خوض اور گہرائی کے بعد حاصل کیا گیا ہو۔ یہ علم اگرچہ ضروری تو نہیں مگر فائدے سے خالی بھی نہیں ہے۔

اب رہا وہ علم جو مذموم ہے تو وہ جادو، طلسمات اور شعبدہ بازی وغیرہ کا علم ہے۔ اور مباح وہ علم ہے جو اشعار یا تاریخ وغیرہ سے متعلق ہو۔[۴۲]

امام صاحب اگر آج زندہ ہوتے تو عجب نہیں کہ موجودہ دور کے ان سائنسی اور صنعتی علوم کو جن سے آج اقوام عالم کا عروج و زوال وابستہ ہو گیا ہے ہماری ملت کی جانکنی اور زبوں حالی کے پیش نظر، فرض کفایہ ہی نہیں بلکہ فرض عین قرار دے دیتے!

---

[۴۲] احیاء العلوم ۱۰/۱۶، دار المعرفہ، بیروت۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا یہ تمام علوم اور کل صنعتیں اصلاً جہاد کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ اور جہاد چونکہ بعض حالات میں فرض کفایہ اور بعض حالات میں فرض عین بن جاتا ہے۔ اسی اعتبار اور اسی نسبت سے یہ علوم اور یہ سب صنعتیں بھی بعض حالات میں فرض کفایہ اور بعض حالات میں فرض عین قرار پا سکتی ہیں۔

کون سی جماعت غلبہ پائے گی؟

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالےٰ نے دین برحق کی مضبوطی اور استحکام کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ مشروط ہے۔ دین کا استحکام ہی اصل میں خلافت ارض کا نام ہے۔ جو علم اسمار اور تسخیر اشیار یا سائنس اور ٹکنالوجی میں برتری حاصل کئے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ علمائے اسلام کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اس بنیادی مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے فکری و نظریاتی اور مثبت طور پر قوم و ملت کو تیار کریں اور مختلف طریقوں سے انہیں اس پر اُبھاریں۔ اور مسلم حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ عملی میدان میں ملکی و ملی مصالح کو پورا کرنے کی غرض سے ہر ممکن سہولتیں فراہم کرے۔ نیز دین برحق کی حفاظت اور ملک کے دفاع کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کرے۔ ظاہر ہے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اس لئے علمار اور حکام دونوں کو اپنے فرائض بخوبی ادا کرنا چاہیئے۔ علمار کی حیثیت درحقیقت ملتِ اسلامیہ کے ذہن اور معاشرے کی آنکھ کی طرح ہے۔ ان کے افکار و آرار ہمیشہ متوازن اور افراط و تفریط سے پاک ہونے چاہئیں۔ دین و ملت کے فائدے کا کوئی بھی پہلو ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہونا چاہیئے۔ ملت کے تن مردہ میں زندگی کی نئی رُوح پھونکنا اُن ہی کا کام ہے۔

اُمتِ مسلمہ کی حالت اس وقت ایک "مرد بیمار" کی سی ہے، جس کو

"مردِ میدان"، بنانے کے لئے سخت جدو جہد کرنی پڑے گی۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ محض امیدوں اور آرزوؤں یا صرف دعاؤں کے سہارے برپا نہیں ہوسکتی۔ لہذا امت مسلمہ کو اب پوری طرح بیدار اور ہوش میں آجانا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے کام بتادیا اور کام کرنے کا طریقہ بھی سمجھا دیا۔ اب اُسے مزید کس چیز کا انتظار ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ دُنیا اسباب و وسائل کی دنیا ہے۔ مادّی اسباب پر اگرچہ اُصولاً تکیہ نہیں کیا جاسکتا مگر ان کی اہمیت کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن مجید میں کسی ایک مقام پر بھی یہ نہیں فرمایا کہ تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے محض وظائف اور دعاؤں میں مشغول ہوجاؤ ہم تمہیں فاتح اور کامران بنادیں گے اور تمہارے دشمنوں کو نیست و نابود کردیں گے۔ خود دورِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے حالات و واقعات شاہد ہیں کہ دین برحق کی سربلندی اور اسلامی مملکت کے قیام کے لئے کتنے مجاہدے کرنے پڑے، کتنے معرکے سر کرنے کی ضرورت پیش آئی اور کتنی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا!

یہ راہ پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ اس میدان میں عملاً سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے تب کہیں جاکر گوہرِ مراد ہاتھ آتا ہے۔ جو قوم مہدیٔ موعود یا معجزات و کرامات کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جائے وہ زندگی کے میدان میں ہمیشہ مار کھاتی اور ذلّت و مسکنت کی چکّی میں پستی رہے گی۔ مادّی اسباب و وسائل کو نظر انداز کرجانے والی کسی بھی قوم کے لئے موجودہ دنیا اور اس کے مظاہر ایک طلسم سے کسی بھی طرح کم نہیں ہیں اور وہ اس طلسمی جال سے کبھی باہر نہیں نکل سکتی۔

اللہ تعالیٰ کے تمام وعدے مشروط ہیں۔ جب تک ہنگامہ ہائے حیات کو اپنے سوزِ جگر سے گرم نہ کیا جائے چمن میں گُل و گلزار پیدا نہیں ہوسکتے۔ امت مسلمہ سے اللہ تعالیٰ کا پیغام یہی ہے کہ تائید غیبی اور نصرت الٰہی صرف

اُسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب کہ وہ کارزارِ حیات میں کچھ کرنے کے لئے "حرکت" میں آجائے اور پورے دین پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اس کی سربلندی کی خاطر سربکف ہوجائے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ط اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔ (رعد: ۱۱)

ایک موقع پر اس سلسلے میں بنی اسرائیل سے صراحتاً جو بات کہی گئی تھی وہ خود ہمارے لئے بھی حجت ہے۔ وَاَوْفُوْا بِعَہْدِیْٓ اُوْفِ بِعَہْدِکُمْ۔ اور تم میرا عہد پورا کرو۔ میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ (البقرہ: ۴۰)

نیز اسی طرح ارشاد باری ہے:

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ ○ اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا۔ (محمد: ۷)

ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِہِمْ لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ○ پھر ہم نے ان کے بعد تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو۔ (یونس: ۱۴)

منافقین کو جو اپنے ایمان و اسلام کا ہمیشہ دم بھرتے تھے کہا گیا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو عمل کا نمونہ پیش کرو۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُہٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط کہہ دو کہ عمل کئے جاؤ اللہ ابھی دیکھ لے گا تمہارا کام اور (اسی طرح) اس کا رسول اور اہلِ ایمان بھی۔ (توبہ: ۱۰۵)

بہر حال اللہ کا مؤکد وعدہ ہے کہ اس دنیا میں آخری کامیابی "اللہ والوں" یا "حزب اللہ" کو ہوگی۔ یعنی اللہ صرف انہی لوگوں کی مدد کرے گا جو صاحبِ

ایمان ہوں اور جہادِ زندگانی میں پورے عزم ویقین اور پختہ شعور کے ساتھ عمل کرنے والے اور دین کے تمام احکامات اور اس کے سارے لوازمات کو بحسن وخوبی ادا کرنے والے ہوں۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ٥ اور اہلِ ایمان کی نصرت ہم پر واجب ہے۔ (روم: ۴۷)

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ: غلبہ وسربلندی اللہ کے لئے، اس کے رسول کے لئے اور اہلِ ایمان کے لئے ہے۔ (منافقون: ۸)

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ٥ بلاشبہ اللہ ہی کی جماعت غالب رہے گی۔ (مائدہ: ۵۶)

وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ: یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ (ہرگز) وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ (روم: ۶)

چمن میں رختِ گل شبنم سے تر ہے
سمن ہے سبزہ ہے بادِ سحر ہے
مگر ہنگامہ ہو سکتا نہیں گرم
یہاں کا لالہ بے سوزِ جگر ہے

ساتواں باب

خلافت کی تکمیل یا اسلام کی نشأۃ ثانیہ

- عصرِ جدید کا اہم ترین مسئلہ
- قرآن اور جدید علم و تمدّن
- اسلام اور اُصولِ تمدّن
- اسلامی تہذیب اور مغربی تمدّن
- تہذیب و تمدن کا اجتماع مفکّرین کی نظر میں
- تمدن و ثقافت کو مذہب سے کس طرح ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے
- اسلامی تہذیب کی صلاحیت و کاملیت
- اسلامی تمدن کے عناصر
- خیرِ اُمت کا سب سے بڑا وصف

ساتواں باب

خلافت کی تکمیل
یا
اسلام کی نشأۃ ثانیہ

عصر جدید کا اہم ترین مسئلہ

اس وقت دُنیا ایک عجیب و غریب قسم کے فکری انتشار اور ذہنی پراگندگی میں مُبتلا ہے۔ ایک طرف مُسلمان ہیں جو ایک برتر دین اور مکمل تہذیب کے مالک ہونے کے باوجود آج خود انہیں اس بات کا کوئی صحیح احساس و شعور نہیں ہے کہ وہ کتنی عظیم الشّان نعمت اور کتنی اہم اور گرانمایہ شے سے متصف ہیں، جو اقوام عالم کی صحیح رہنمائی کر کے ان کی کایا پلٹ سکتی ہے! اُن کی مثال اس وقت بالکل ایسی ہی ہے جیسے کسی کی جھولی میں لعل و یاقوت اور ہیرے جواہرات بھرے ہوئے ہوں، مگر وہ انہیں خزف ریزے سمجھ کر گدائی میں اپنی زندگی بسر کر رہا ہو۔ یا اگرچہ کچھ اللہ کے بندوں کو اپنی دینی و تہذیبی قدر و قیمت کا احساس ہے بھی تو یہ مسئلہ ان کی سمجھ سے باہر کا دکھائی دیتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے تہذیبی بحران کو کس طرح حل کریں اور اپنی تباہی و بربادی کی آخری سرحد تک پہنچے ہوئے تمدن اور ہلاکت خیزیوں کو کس طرح روکیں!؟ اور دوسری طرف غیر مسلم

قومیں ہیں جن کے پاس دنیوی آسائش اور سامان تمدّن کی فراوانی کے باوجود ذہنی و اخلاقی اعتبار سے تہی مایہ ہیں اور کسی برتر تہذیبی نظریے کے نہ ہونے کی وجہ سے کشاں کشاں موت کی وادی سے دن بدن قریب ہوتی جارہی ہیں۔ عقلاء اور دانشور حیران ہیں کہ ان خرابیوں کا حل آخر کیا ہو سکتا ہے۔ جن سے سابقہ اس سے قبل گزشتہ کسی بھی دَور میں اتنی ہمہ گیریت کے ساتھ کبھی پیش نہیں آیا!

یہ کارِ خلافت کا وہ اہم ترین مسئلہ ہے جس کے حل کے بعد ہی کوئی قوم یا ملّت صحیح معنی میں اپنے خلیفہ ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ مسلم دانشوروں نے بھی اس سلسلے میں کچھ خامہ فرسائی کی ہے اور ان کے بعض نظریات اگلے صفحات میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ جن کا حاصل یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کو اپنے دین و ایمان پہ ثابت قدم رہتے ہوئے محض اپنی تمدّنی و اجتماعی ضروریات کی تکمیل کے لئے جدید علوم اور جدید تمدن کے تمام صالح عناصر کو قبول کر لینا چاہیئے۔ اسی میں ہمارے موجودہ تمام مشکلات کا حل موجود ہے۔

مگر یہ مسئلہ بہت زیادہ نازک، پیچیدہ اور تفصیلی دلائل کا محتاج ہے۔ اور جب تک اس سلسلے میں شرعی و عقلی دلائل پیش نہ کئے جائیں خواہ مخواہ بدگمانیاں پیدا ہوں گی۔ لہٰذا سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ خود قرآن حکیم اس سلسلے میں ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے۔

قرآن اور جدید علم و تمدّن

اس مسئلے کے حل کے لئے سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ "علم جدید" اور "تمدن جدید" بذات خود ہیں کیا اور وہ کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟ جب تک یہ اہم اور بنیادی مسئلہ حل نہیں ہوگا اُلجھی ہوئی ڈور کا سرا نہیں ملے گا

اور گم شدہ چابی ہاتھ نہیں آسکے گی۔ پھر اس کے بعد دیگر تمام مسائل آپ سے آپ آسانی سے حل ہو جائیں گے۔

اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ "علم جدید" مظاہر کائنات اور اس کی مشنری میں غور و فکر سے پیدا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر مادی اشیاء میں تحقیقات و تجربات کی بدولت ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور "تمدن جدید" اور اس کے تمام نقش و نگار دراصل علم جدید ہی کے منطقی نتائج اور اس کے آثار و مظاہر ہیں۔ ہر نیا علم یا ہر نیا انکشاف واکتشاف ایک نئے تمدن کو جنم دیتا ہے، نئے نقوش پیدا کرتا ہے اور ایک نئے ماحول کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے حسب ذیل مثالوں پر غور فرمایئے۔

اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ "اس مکان کی چھت پر چڑھ جاؤ"، تو آپ اس پر کس طرح چڑھ سکیں گے جب کہ اوپر جانے کا کوئی راستہ ہی موجود نہ ہو؟ ظاہر ہے کہ اس صورت میں آپ اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے پہلے ایک سیڑھی تیار کریں گے پھر اس کے سہارے اوپر پہنچ جائیں گے۔ اسی طرح اگر آپ کسی جزیرے میں رہتے ہوں اور آپ سے کہا جائے کہ تم اس جزیرے کو چھوڑ کر فلاں جزیرے کو چلے جاؤ، مگر دوسرے جزیرے تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ موجود نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں عقل و تدبیر سے کام لے کر پہلے ایک کشتی تیار کریں گے پھر اپنے مقصود کو پائیں گے۔

اب اگر آپ اس حکم کی تعمیل اور اس کی بجا آوری کا تجزیہ فرمائیں تو آپ کو دو چیزیں نظر آئیں گی:

۱- ایک نئے ذریعے یا سہارے کی تلاش و جستجو میں آپ کی سرگردانی اور دماغ کو متحرک کرنے کا عمل۔ اس کو آپ چاہے اپنا غور و فکر کہہ لیجئے یا اپنے تجربات و مشاہدات کو یکجا کر کے کوئی راہِ عمل تلاش کرنا اور اس کا خاکہ بنانا۔

۲- آپ کی قوتِ فکر اور قوت دماغی کے مطابق عملاً ظہور پذیر ہونے والے نتائج۔ یا ذہنی خاکے کے محسوس مادی آثار و مظاہر۔

آسان الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ پہلی چیز جو فکر و نظر سے تعلق رکھتی ہے علم کہلاتی ہے اور دوسری چیز جو عملی مظہر ہوتی ہے وہ صنعت یا تمدن۔ اس طرح مختلف مسائل و مشکلات کے حل کی راہ میں نئے نئے علوم اور نئے نئے تمدن جنم لیتے ہیں۔

پھر جیسے جیسے تحقیقات و تجربات بڑھتے جائیں گے مختلف آلات و اوزار، ذرائع و وسائل اور نئے نئے کل پرزوں کا سلسلہ چل پڑے گا۔ اس طرح نئی نئی اور بہتر سے بہتر صنعتیں جنم لیتی رہیں گی اور تمدن بھی آہستہ آہستہ ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف رواں دواں نظر آئے گا۔ اس لحاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ تمدن جدید اصل میں علم جدید ہی کی پیداوار ہے۔

اس اصول کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب چند قرآنی آیات میں غور فرمایئے تو یہ حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آجائیگی کہ علم جدید اور تمدن جدید کا داعی اوّل قرآن مجید ہے جس نے ایک حیثیت سے مظاہر کائنات میں غور و فکر کر کے وجود باری تعالیٰ کے دلائل اخذ کرنے پر زور دیا تو دوسری طرف مختلف علوم اور مسائل میں خوض کر کے مختلف صنعتوں (industries) کو وجود میں لانے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ چنانچہ وہ پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے:

هُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا: وہی ہے جس نے سمندر کو تمہارے لئے مسخر کر دیا تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور زیور (موتیوں کی شکل میں) نکالو، جس کو تم پہنتے ہو۔ (نحل: ۱۴)

سمندر کو مسخّر کرنے کا مطلب اُس میں ودیعت شدہ فوائد سے استفادے کے لئے اس کو پوری طرح رام کر دینا ہے۔ اور یہ مقصد بغیر کشتی سازی اور کشتیوں میں سفر کے حل نہیں ہو سکتا۔ سمندر سے تازہ گوشت یعنی مچھلیاں حاصل کرنا بھی اس پر موقوف ہے کہ سفر کے لئے کشتیاں بھی تیار کی جائیں اور مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال اور دیگر اوزار بھی بنائے جائیں۔ اسی طرح سمندر سے موتی نکالنے کے لئے غوطہ خوری کی تربیت اور اس کے آلات و اوزار کی تیاری ضروری ہے۔ اس طرح محض ان دو فوائد کے حصول کے لئے کئی صنعتوں کا آغاز ہوتا ہے اور بہت سے فنّی (technical) معلومات و تجربات کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی فنی معلومات فنی علوم یعنی صنعتی علوم کی بھی بنیاد ہیں۔

حسب ذیل عظیم الشّان آیت کریمہ میں غور فرمایئے تو آپ کو اس قسم کے بے شمار علوم اور بہت سی صنعتوں کی طرف رہنمائی ملے گی۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ص وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝

زمین اور آسمانوں کی تخلیق میں، دن رات کے ہیر پھیر میں، اور اُن کشتیوں (اور جہازوں) میں جو سمندر میں لوگوں کے نفع بخش سامان کو لے کر چلتے ہیں۔ اور اس پانی میں جس کو اللہ نے بلندی سے اُتارا اور اس کے ذریعے زمین کو زندگی بخشی جب کہ وہ مُردہ سی تھی، پھر اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلا دیئے، اور ہواؤں کے ادل بدل میں، اور اس بادل میں جو زمین اور آسمان کے درمیان مسخّر رہتا ہے (ان تمام مظاہر میں)، عقل مندوں کے لئے

یقیناً (بہت سی) نشانیاں موجود ہیں۔ (بقرہ : ۱۶۴)

ان آیات کریمہ کا اولین مقصد جیسا کہ پہلی نظر ہی سے واضح ہو رہا ہے وجود باری اور اس کی صفات عالیہ کا اثبات نیز اثبات قیامت کے سلسلے میں سائنٹفک شواہد پیش کرنا اور شرک و مادیت اور دیگر فکری لغزشوں کی تردید کرنا ہے۔ اس کو ہم علم نظری کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہاں پر ضمناً اس علم سے اس کے عملی فوائد بھی مقصود ہیں۔ اور جیسا کہ شیخ طنطاوی جوہری نے لکھا ہے۔ اس موقع پر بہت سے تمدنی فوائد کا اثبات ہو رہا ہے۔

"لقوم یعقلون" (وہ لوگ جو عقل سے کام لیتے ہیں) کی سند اُن لوگوں کو عطا کی گئی ہے جو زمین اور آسمانوں (اجرام سماوی) کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں، رات دن کے ہیر پھیر کے اسرار معلوم کرتے ہیں، سمندری کشتیوں، جہازوں اور سامان تجارت کے فوائد پر نظر ڈالتے ہیں، بارش کے عجائبات، نباتات کے مظاہر، چوپاؤں کی خلقت اور ان کے اسرار و عجائب معلوم کرتے ہیں، ہواؤں کے ضوابط اور ان کی قسموں (جیسے پُروا ہوائیں، پچھوا ہوائیں، سمندری ہوائیں اور تجارتی ہوائیں وغیرہ) کا علم حاصل کرتے ہیں، اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ بادل آسمان میں کس طرح جمع ہوتا ہے (اور وہ کہاں سے آتا ہے) اور بارش کیسے اور کس طرح ہوتی ہے؟ اور اس میں سورج کی کارفرمائی کیا ہے؟ اور بارش پر کیا کیا اثرات ڈالتی ہے؟ غرض ان تمام چیزوں کی حقیقت و ماہیت اور ان کے اسرار و فوائد کے جاننے اور ان میں غور و فکر کرنے والوں کو اس موقع پر "صاحب عقل" قرار دیا گیا ہے۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ فلکیات، بارش، ہوا، بادل، ندی نہریں، معدنیات اور دیگر تمام طبیعی و صنعتی علوم کی تحصیل ضروری ہے۔ غور فرمائیے تو پتہ چلے گا کہ یہاں پر جن کشتیوں (اور ان میں ہر قسم

کے جہاز بھی شامل ہو سکتے ہیں) کا ذکر کیا گیا ہے (وہ زمانۂ قدیم میں جس طرح لوہا اور لکڑی وغیرہ کے محتاج تھے اسی طرح آج وہ) لوہا، کوئلہ اور بجلی کے محتاج ہیں۔ اسی طرح جہازوں کے لئے سامان کی ضرورت ہے، جس کو وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائیں۔ (اور یہی چیز علم تجارت (commerce) کی بھی بنیاد ہے۔) غرض اس آیت کریمہ میں تمام علوم وفنون کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے[1]

اس آیت کریمہ میں ان کے علاوہ بھی دیگر بہت سے علوم وفنون کا اثبات ہو سکتا ہے۔ مثلاً اجرام سماوی کے مشاہدوں کے لئے رصد گاہوں (observatories) اور اُن کے سازوسامان کی تیاری، جن میں دُوربینیں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ جہاز سازی کے کارخانے اور ان کے سازوسامان کی تیاری، نیز ان صنعتوں میں استعمال ہونے والے خام مال کی فراہمی، کان کنی کا علم اور اس سے متعلق صنعتیں، جن کے ذریعہ لوہا، کوئلہ اور پٹرول وغیرہ کی فراہمی عمل میں آتی ہے، جہاز رانی کا علم اور اس کی تربیت، برق و بھاپ کا علم اور ان کی صنعتیں جن کے ذریعہ موجودہ جہاز چلتے ہیں۔ (بلکہ اب تو ایٹمی جہاز بھی چلنے لگے ہیں۔) اسی طرح عالم حیوانات و نباتات اور دیگر مظاہرِ فطرت کے تفصیلی مطالعے کے لئے بہت سے سازوسامان اور آلات واوزار کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس طرح یہ آیت کریمہ علاوہ بے شمار صنعتی اور ٹکنالوجیکل علوم وفنون کے حسب ذیل خالص سائنسی علوم کی بھی بنیاد اور ان کا ماخذ ہے۔

۱۔ علم تخلیق کائنات ———— cosmology

۲۔ فلکیات ———— astronomy

---

[1] ماخوذ از کتاب "القرآن والعلوم العصریۃ" ص ۲۵-۲۶، مصر، ۱۳۷۱ھ

۳۔ فلکی طبیعیات ______ astrophysics
۴۔ موسمیات ______ meteorology
۵۔ ارضیات ______ geology
۶۔ ارضی طبیعیات ______ geophysics
۷۔ علم جغرافیہ ______ geography
۸۔ علم معدنیات ______ mineralogy
۹۔ طبیعیات ______ physics
۱۰۔ کیمیا ______ chemistry
۱۱۔ حیاتیات ______ biology

یہ استنباط میرے ناقص علم کے مطابق ہے۔ ورنہ اس عظیم الشان اور جامع آیت کریمہ سے اور بھی بہت سے علوم کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔ اس آیت کریمہ کی صحیح عظمت بیان کرنا اور اس کے تمام علوم و معارف کا احاطہ کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ مگر جتنے بھی علوم و مسائل اور اسباق و بصائر مستنبط کئے جائیں گے وہ سب علم اسماء ہی کے دائرے میں ہوں گے[۲]

اور یہ آیت کریمہ ایک حیثیت سے نظری سائنس کی بھی بنیاد ہے۔ اور عملی سائنس کی طرف رہنمائی حسب ذیل آیات کے ذریعے کی گئی ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ

۲؎ قرآن حکیم ایک حد درجہ جامع اور حیرت انگیز کلام ہے، جس کی کوئی مثال ہیں انسانی کلام میں نہیں ملتی۔ اس کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ سے علوم و معارف کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ آپ شروع کے دو ابواب میں "الاسماء" کی تشریح و تفسیر میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کلام برحق اسی لازوال ہستی کی جانب سے بھیجا ہوا ہے جس نے اس جہان آب و گل کی تعمیر کی ہے۔ ورنہ ان دونوں میں اس قدر حیرت انگیز مطابقت پائی نہ جاتی۔

بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اور بلندی سے پانی برسایا۔ پھر اس پانی سے تمہاری روزی کی خاطر (طرح طرح کے) میوے نکالے۔ اور کشتیوں کو تمہارے قابو میں کیا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلتی رہیں (تاکہ تم جہاں چاہو بآسانی سفر کرسکو) اور دریاؤں کو تمہارے لئے مسخّر کیا (کہ حسب منشا ان پر بند ھ باندھو اور ان کا رُخ موڑ لو)۔ اور تمہارے لئے آفتاب و ماہتاب کو مسخر کیا (کہ ان کی توانائیوں سے تم حسب خاطر مستفید ہوسکو) اور تمہارے لئے دن اور رات کو کام میں لگایا (تاکہ تمہارے کام کرنے اور راحت پانے کے اوقات متعین ہوسکیں۔) اور اس نے (اس طرح) تمہارے (تمام فطری) مطالبات پورے کر دئے[۵۳] اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار بھی کرنا چاہو تو نہ کرسکو گے[۵۴] انسان بڑا ہی ستم گار اور ناشکرا ہے (جو ان نعمتوں سے مستفید ہونے کے باوجود خدا کا انکار کر بیٹھتا ہے۔

(ابراہیم: ۳۲ — ۳۴)

---

[۵۳] اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت اور اس کے تقاضوں کے مطابق اس کائنات ارضی میں اس کی ضروریات کا سارا سامان رکھ دیا ہے اور اس کی راحتوں اور آسائشوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نوع انسانی پر بہت زیادہ مہربان اور مشفق ہے۔ وہ ظالم یا جابر یا انسان کی فطرت اور اس کے تقاضوں کو کچلنے والا نہیں۔

[۵۴] ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے ہی کا نام علم جدید اور تمدن جدید کی ترقی کہلاتا ہے لہٰذا خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا غیر فطری یا غیر عقلی یا غیر اسلامی (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

اوپر کی آیات (سورۂ نحل اور سورۂ بقرہ والی) میں جو باتیں علمی اور نظری حیثیت سے بیان کی گئی تھیں ان کو یہاں پر اسلوب بدل کر عملی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے، ان کی افادیت بیان کی جا رہی ہے اور نوع انسانی پر بطور احسان جتایا جا رہا ہے کہ یہ سارے مظاہر اور ان کے یہ سارے فوائد اللہ کی ربوبیت کے اظہار اور اس کی رحمانیت کے مظہر کے طور پر ہیں۔[۵]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا کی تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ نے انسان ہی کے لئے پیدا کی ہیں۔ ہاں البتہ انسان کا خدا سے بغاوت کرنا اور اس کے خلاف سرکشانہ رویہ اختیار کرنا مزید غیر اسلامی اور اللہ کے نزدیک قابل تعزیر جرم ہے جس کی وہ قیامت کے دن سزا دے گا ـــــ انسان کو چونکہ ان مظاہر سے مستفید ہونے کی راہ میں سخت محنت اور جدوجہد کرنی پڑتی ہے اس لئے وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ سب کچھ محض اس کے زور بازو کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری نعمتیں انسان کے لئے پہلے ہی سے ان مظاہر کے باطن میں ودیعت کر دی تھیں اور یہ ضابطہ بھی بنا دیا تھا کہ جو کوئی اس راہ میں جدوجہد کرے گا وہ ان نعمتوں کو پائے گا۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ لہذا انسان کو اپنی کسی کامیابی پر مغرور و متکبر نہیں ہو جانا چاہیئے بلکہ اُسے خدائے رحمان کا شکر گزار ہونا چاہیئے جس نے اس کائنات میں منظم و منضبط اصول و ضوابط قائم کر کے اس کے لئے ان نعمتوں کے حصول کو ممکن بنایا۔

۵ ان آیات کریمہ میں خصوصیت کے ساتھ بار بار "لکم" کے ذریعے جو عمومی خطاب ہے اس میں اہل اسلام بھی حقیقی خلیفہ ہونے کی حیثیت سے داخل و شامل ہیں۔ بلکہ ایک حیثیت سے یہ خطاب دراصل انہی سے ہے۔ بہرحال اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے پیدا کی ہیں لہذا ہم ان سے ایک "شجر ممنوعہ" کی طرح محروم کیوں رہیں؟ غور فرمایئے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی ہمارے لئے برسایا ہے، زمین سے اناج ہمارے لئے اُگایا ہے۔ سمندروں میں کشتیوں اور جہازوں کو ہمارے لئے مسخر کیا ہے، نہروں اور دریاؤں کو ہمارے لئے کام میں لگایا ہے، آفتاب و ماہتاب ہمارے لئے (باقی آئندہ صفحہ پر)

ان آیات میں بنیادی اور اصولی طور پر تین قسم کی نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے:
(۱) بری (۲) بحری (۳) سماواتی۔ ان تینوں کی مختصر سی تشریح حسب ذیل ہے:

۱۔ بری نعمتوں میں خصوصیت کے ساتھ زمین کی پیداوار کے لئے نہروں اور دریاؤں کے ذریعہ آب پاشی کا طریقہ سمجھایا گیا ہے کہ اس طریقے کو اپنا کر نیز اپنی عقل و تجربے کے ذریعہ اور نئے نئے آلات و وسائل کا استعمال کر کے زرعی پیداوار میں ترقی کی جاسکتی ہے اور اس طرح زمین کی نعمتوں سے تمتع کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس کے لئے علم جغرافیہ، علم زراعت اور آب رسانی کے طریقوں سے واقفیت ضروری ہے۔ (ان موضوعات پر بکثرت لٹریچر وجود میں آچکا ہے)۔

۲۔ بحری فوائد اور نعمتیں: یہ زرعی پیداوار اور دیگر سامان تمدن کو دُنیا کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچا کر حاصل کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ اور اس راہ میں سمندری سفر، سمندری راستوں اور سمندری تجارت کے اصولوں سے واقفیت ضروری ہے، جو کسی قوم یا ملت کی ترقی و خوشحالی اور اس کی سربلندی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بغیر کوئی قوم ترقی یافتہ قوم نہیں بن سکتی اور زندگی کی حقیقی لذتوں سے کبھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مسخر ہیں اور دن رات ہمارے ہی مفاد کی غرض سے محوِ سفر ہیں۔ غرض ساری کائنات ہمارے ہی لئے رام کر دی گئی ہے تو پھر ہم کس خطا اور کس جرم میں ان خدائی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے سے محروم رہ جائیں؟ ان آیات کا منشا و مقصد یہ ہے کہ اہلِ اسلام صحیح معنی میں خدا کے بندے بن کر ان تمام لذتوں اور آسائشوں سے ضرور مستفید ہوں۔ مگر اس کے لئے خود آگے بڑھ کر انہیں اس میدان میں محنت کرنی پڑے گی اور ان تمام علوم و فنون میں (جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے) دسترس حاصل کر کے انہیں ایک غیور، محنتی، خوددار، عزت مند اور شاہی ملت کی طرح زندگی کے میدان میں آگے بڑھنا پڑے گا۔ دوسروں کے دست نگر اور غلام بن کر زندگی کی لذتوں کا خواب دیکھنے والوں سے بڑھ کر نادان اور کون ہو سکتا ہے۔ یہی ان آیات کریمہ کا تقاضا اور منشائے خداوندی ہے۔

آشنا نہیں ہو سکتی۔ آج تمدن کی ترقی کا سارا دار و مدار سمندری تجارت اور جہازوں کی نقل و حرکت پر موقوف ہے۔ اور کسی قوم کے ترقی یافتہ ہونے کی دلیل یہ سمجھی جاتی ہے کہ دنیا کے سمندروں اور پانیوں پر اس قوم کا کتنا قبضہ ہو چکا ہے! محض تجارتی نقطۂ نظر ہی سے نہیں بلکہ آج کل تو سمندروں میں جنگی اور عسکری جہاز ۔۔ برق و بھاپ اور ایٹمی طاقت سے چلنے والے ۔۔ نہایت درجہ ہیبت ناک انداز میں دندناتے اور غیر ترقی یافتہ قوموں پر اپنے غلبے و استیلاء کی دھاک بٹھاتے پھر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ سمندری تسخیر کے لیے جہاز سازی اور دیگر متعلقہ سائنسی و صنعتی علوم و فنون میں کمال حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور یہ چیز آج "سمندری نعمتوں" کے حصول سے زیادہ خود اپنی حفاظت و مدافعت کے لیے بھی ضروری ہے۔ ورنہ کوئی قوم اُن بیرونی خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکے گی جو سمندر کی راہ سے آنے والی ہوں۔

۳۔ سماواتی فوائد اور نعمتیں: ویسے زمین کی پیداوار میں سماواتی اثرات کا اگرچہ براہِ راست اور بالواسطہ تعلق ضرور پایا جاتا ہے، مثلاً بارش اور نباتات کے نشوونما میں سورج اور اس کے اثرات کی کارفرمائی۔ مگر اس موقع پر براست فائدہ اٹھانے کی ایک مثال "شمسی توانائی" (solar energy) کا استعمال ہے۔ جو سائنس کی ترقی کی بدولت موجودہ دور ہی میں ممکن ہو سکا ہے۔ اس طرح زمانۂ مستقبل میں ان سماواتی کروں سے جتنے بھی فوائد حاصل کیے جائیں گے وہ سب اس کُلیے میں داخل ہو جائیں گے[۶]۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے

---

[۶] لیکن اس موقع پر ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ان سماواتی کروں سے استفادے کے لیے سماوات یا اجرام سماوی کا سفر کرنا ضروری نہیں ہے اور اس سے موجودہ خلائی پروازوں کی صحت یا استحباب پر دو وجوہات کی بنا پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو یہ کہ انسان صرف ہماری زمین پر خلیفہ ہے اور اس کو (باقی آئندہ صفحے پر)

بھی جدید علوم سے واقفیت اور ان میں دسترس ضروری ہے۔

اس بحث سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو علوم جدیدہ اور تمدن جدید کی داغ بیل ڈالنے والا اور نوعِ انسانی کو صحیح نظریۂ علم اور صحیح نظریۂ کائنات عطا کرنے والا ہے جس طرح یہ حقیقت بھی پوری طرح عیاں ہو گئی کہ قرآن عظیم ہی دنیا کا وہ پہلا اور آخری صحیفہ ہے جس نے سب سے پہلے نظری (theoretical) اور عملی (practical) دونوں سائنسوں کی طرف توجہ دلا کر نوع انسانی کو مظاہر فطرت کی تسخیر پر آمادہ کیا۔ اس کی اس انوکھی اور حیرت انگیز دعوت کے باعث قرون وسطیٰ میں علوم و فنون کی ترقی ہوئی جس کے نتیجے میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ عمل میں آئی اور آج یہ ترقی اپنی انتہائی منزلیں طے کر رہی ہے۔

جیسا کہ صفحات گذشتہ سے اس حقیقت پر روشنی پڑ گئی، تمدن جدید دراصل علوم جدیدہ ہی کے اثرات اور ثمرات کا نام اور ان کی ترقیوں کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہوتا ہے، جو ہر دور میں بدلتا اور تغیرات سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا تمدن یا تمدن جدید بذات خود کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ بلکہ اصل میں اس کے غیر صالح اور خدا سے باغیانہ رُجحانات بُرے اور مُضر ہیں۔ مگر اس سے اتنی بات تو صاف ہو جانی چاہیئے کہ اسلام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اجرام سماوی کی خلافت سونپی نہیں گئی۔ جیسا کہ "انی جاعل فی الارض خلیفہ" کے الفاظ صراحت کر رہے ہیں۔ اور دیگر مقامات میں بھی یہی بات کہی گئی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ آج خلا کا سفر نوعِ انسانی کے مفاد کی خاطر نہیں بلکہ جنگی و عسکری اغراض و مقاصد کے تحت عمل میں آ رہا ہے جو عالمِ انسانی کے خلاف ایک گھناؤنی سازش ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث مدلل طور پر میں نے اپنی ایک دوسری کتاب میں کی ہے اور بد قسمتی سے اس کی اشاعت کی اب تک نوبت نہیں آ سکی۔ یہ کتاب اب سے دس سال قبل لکھی جا چکی ہے۔

علوم جدیدہ یا تمدن جدید کو مطلق طور پر بری نظروں سے نہیں دیکھتا۔ کیونکہ یہ سب کچھ اُسی کے بالواسطہ یا بلاواسطہ پیدا کیے ہوئے آثار و مظاہر ہیں۔ لہذا علم جدید اور تمدن جدید کے نام سے گھبرانے اور خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اصولی اعتبار سے اپنے گھر کی چیزیں ہیں۔ نیز اس بحث سے اس غلط نظریے کا بھی خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے کہ اسلام انسان کو تمدنی ترقیوں سے روکتا اور اس پر پابندیاں عائد کرتا ہے، یا وہ تمدن کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، یا وہ تمدن کو خلاف مذہب سمجھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اسلام اور اصول تمدن

عصر جدید میں وہی مذہب کامیاب ہو سکتا ہے جو تمدن کے بارے میں صحیح اور حقیقت پسندانہ نظریات رکھتا ہو اور اس کے دامن میں موجودہ تمام تہذیبی و اخلاقی مفاسد کو دور کرنے کا تشفی بخش سامان موجود ہو۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس وقت زندگی کے میدان میں اسلام ہی ایک ایسا مکمل اور عالمگیر مذہب نظر آتا ہے جو ان مسائل کو حل کر کے نوع انسانی کی کامل رہنمائی کر سکتا ہے۔ اور اس سلسلے میں بنیادی مسائل صرف دو ہیں:

۱۔ تمدن کے بارے میں اسلام کا نظریہ کیا ہے؟

۲۔ اسلام موجودہ تہذیبی بحران کا علاج کیا تجویز کرتا ہے؟

گزشتہ مباحث سے تمدن کے بارے میں اسلام کا نظریہ بخوبی واضح ہو گیا اور یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہو گئی کہ اسلام نوع انسانی کو تمدنی ترقیوں سے روکتا نہیں بلکہ مختلف طریقوں سے اس کی ہمت افزائی کرتا ہے اور اس میدان میں اس کو آگے بڑھاتا ہے۔ وہ اس پوری کائنات اور اس کے تمام مظاہر کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور اُس کی نعمت ہونے کا تصور دلاتے ہوئے اسے خالق ارض و سما کی شکر گذاری اور احسان شناسی پر اُبھارتا ہے۔ وہ جس چیز کو

معیوب اور قابل مذمت سمجھتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے احسانات کو فراموش اور اس کے خالق و مالک اور ربّ و رازق ہونے کا انکار کر کے اپنی من مانی اور لاقانونیت کا مظاہرہ کیا جائے۔ کیونکہ انسان اس دُنیا میں بالکل آزاد نہیں ہے۔ بلکہ وہ شہنشاہ عالم (جل جلالہ) کی فرماں روائی اور اس کی حدود مملکت میں رہنے والا ایک تابع فرمان فرد ہے۔ اور اس پر ان تمام قوانین کی پابندی لازمی ہے۔ جو اس پر اس کے خالق و مالک نے عائد کر رکھی ہیں، جس طرح کہ اس کو کسی ملک کا ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اُس ملک کے قوانین کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ مگر انسانی قوانین اور خدائی قوانین میں کافی فرق ہے۔ انسانی قوانین عموماً ظالمانہ اور خود غرضانہ ہوتے ہیں جو ایک طبقے کی دوسرے طبقے کو لوٹ کھسوٹ کرنے کی خاطر بنائے جاتے ہیں۔ اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسانی قانون میں۔ خواہ وہ بظاہر کتنا ہی عادلانہ کیوں نہ نظر آئے ۔ خود غرضی کی جھلکیاں نہ پائی جائیں۔ کیونکہ انسانی فطرت بذات خود خود غرضانہ قسم کی واقع ہوئی ہے۔ لہذا وہ سب کے ساتھ عدل و مساوات کا برتاؤ اور یکساں سلوک کر ہی نہیں سکتا[۱۶]

اس کے برعکس چونکہ اللہ تعالیٰ طبیعی عوارض نہیں رکھتا اس لئے وہ ہر قسم کی خود غرضی اور خود غرضانہ جذبات و خواہشات سے یکسر پاک ہے (سبحانہٗ وتعالیٰ) اور اسی بنا پر اس کو کسی قسم کی دینوی غرض و غایت یا دینوی چیزوں کی حاجت ہی نہیں ہے (غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ) لہذا اس کے تمام قوانین سراسر مشفقانہ،

---

[۱۶] اس کا نظارہ ہمیں موجودہ مختلف ممالک کے قوانین میں نظر آتا ہے کہ وہ اپنی ماتحت قوموں اور اقلیتوں کو دبانے اور ان پر زیادتی کرنے کی خاطر طرح طرح کے " دستوری شوشے " نکال کر کس طرح ان پر مظالم ڈھاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کسی ملک میں گوروں کے لئے الگ قانون بنتا ہے تو کالوں کے لئے الگ، گویا وہ دوسری دنیا کی مخلوق ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رُجحانات انسانی تمدن و اجتماع کے لئے سخت مُضر اور خطرناک ہیں۔

متوازن، عادلانہ اور تمام بنی آدم کے لئے یکساں طور پر قابل عمل ہیں ۔ بلکہ خدائی قوانین ۔۔ جو ابدی، دائمی اور غیر متغیر ہوتے ہیں ۔۔۔ اسی بنا پر ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے انسانی خود غرضی، جبر و استحصال اور لوٹ کھسوٹ کو روکا جا سکے اور انسانی معاشرے میں ظلم و زیادتی کا خاتمہ اور عدل و مساوات کا دور دورہ ہو، تاکہ تمام بنی آدم آپس میں بھائی بھائی کی طرح پُرامن طریقے باہم کے اصول کے مطابق زندگی گزار سکیں۔

لہٰذا اسلام جہاں ایک طرف تمدنی و اجتماعی نقطۂ نظر سے آزادی دیتا ہے تاکہ لوگوں کی اُمنگیں اور ان کے ولولے ٹھنڈے نہ پڑ جائیں تو دوسری طرف چند شرعی و اخلاقی حدود و قیود بھی عائد کرتا ہے تاکہ معاشرتی و اجتماعی زندگی پُرامن رہے اور تمام افراد انسانی ایک دوسرے کے حقوق کا پاس و لحاظ کریں۔

اس لحاظ سے اسلام اونچ نیچ سے عاری ایک متوازن مذہب ہے جو دین و دنیا کا ایک جامع اور بہترین تصور رکھتا ہے ۔ دیگر مذاہب کی طرح وہ ترک دنیا اور عزلت و گوشہ نشینی کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ کارزار حیات کو گرم کرنے اور تمدنی ہنگامہ آرائیوں میں کود پڑنے کی دعوت دیتا ہے ۔ یہ وہ مثبت اندازِ فکر اور متوازن طریقۂ تعلیم ہے جس کا تصور ہمیں دنیا کے کسی بھی دوسرے مذہب میں نہیں ملتا۔

چنانچہ علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ ۔ ۱۹۱۴) نے اپنی کتاب "الکلام" میں "ترقی تمدن کے وہ اُصول جو دین اسلام میں پائے جاتے ہیں" کے زیر عنوان جن نکات سے بحث کر کے انہیں قرآنی دلائل سے مزین کیا ہے، ان میں سے پہلے دو نکات کا خلاصہ یہاں پر پیش کیا جاتا ہے جن کا تعلق زیرِ بحث موضوع سے ہے۔

"ہمارا دعویٰ صرف یہ نہیں ہے کہ اسلام تمدن کے موافق ہے، بلکہ ہمارا یہ

بھی دعویٰ ہے کہ وہ تمدن کو ترقی دینے والا ہے اور اس حد تک پہنچانے والا ہے جو تمدن کا آخری درجہ ہے۔

انسان کی تمام ترقیوں کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ وہ یہ خیال کرے کہ وہ اعلیٰ ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات ہیں جو کچھ ہے وہ اسی لئے ہے کہ انسان اس سے تمتع اُٹھائے۔ سب سے پہلے قرآن مجید نے اس اصول کی تعلیم کی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ : ہم نے انسان کی بناوٹ بہتر سے بہتر بنائی ہے[7]

وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا : تمام آسمان وزمین کی چیزوں کو تمہارا مسخر کیا۔[8]

انسان کی تمام ترقیوں کی بنیاد یہ ہے کہ اس کو یہ یقین ہو کہ اس کے خیر و شر، ترقی اور تنزل، عروج اور زوال کا مدار تمام تر اس کی سعی و کوشش پر ہے۔ اور دنیا اور دین کی تمام کامیابیاں محض اسکی کوششوں پر موقوف ہیں۔ قرآن مجید نے اس اصول کو نہایت توضیح اور تاکید کے ساتھ بیان کیا۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی : انسان کے لئے اتنا ہی ہے جتنی اس کی کوشش ہے[9]

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ : انسان کے نفس کو جو فائدہ پہنچتا ہے اس کی کمائی کی بدولت ہے اور جو نقصان پہنچتا ہے اُس کی کرتوت کی بدولت۔ (بقرہ)[10]

---

[7] سورۃ تین : ۴

[8] سورۃ جاثیہ : ۱۳ یہاں پر آخر میں "منہ" کا لفظ چھوٹ گیا ہے۔ یعنی "جَمِیْعًا مِّنْهُ"

[9] نجم : ۳۹ یہاں پر شروع میں "وَاَنْ" چھوٹ گیا ہے اور کتاب میں اسی طرح درج ہے۔

[10] بقرہ : ۲۸۶

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا: اور جو کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر پڑتا ہے۔ (انعام[۱۱])۔

اَوَلَمَّا اَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ: کیا جب جب ایسا ہوگا کہ تم پر کوئی مصیبت پڑے کہ جس کے دو چند تم پہلے پہنچا چکے ہو تو تم کہو گے کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی۔ اے محمدؐ کہہ دے کہ یہ خود تمہاری اپنی ذات کی وجہ سے ہے۔ (آل عمران[۱۲])۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ: یہ اس لئے کہ خدا جب کسی قوم کو نعمت دیتا ہے تو اس کو بدلتا نہیں۔ جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدلیں۔ (انفال[۱۳])

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ: لوگوں کے کرتوت کی بدولت تمام خشکی و تری میں فساد پھیل گیا۔ (روم[۱۴])۔

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ: جب تم پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو خود تمہارے کرتوت کی بدولت۔ (حمعسق[۱۵])۔

---

[۱۱] انعام : ۱۶۴

[۱۲] آل عمران : ۱۶۵

[۱۳] انفال : ۵۳

[۱۴] روم : ۴۱

[۱۵] شوریٰ : ۳۰ — الکلام، ص ۱۸۰ — ۱۸۱، شبلی بکڈپو لکھنؤ، ۱۳۴۰ھ۔

اسلامی تہذیب اور مغربی تمدن[16]

اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اسلام موجودہ تہذیبی بحران اور اس کی اصلاح کے لئے کیا علاج تجویز کرتا ہے؟ تو اگرچہ یہ مسئلہ بہت زیادہ تفصیل طلب ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے، لہٰذا یہاں پر محض چند اُصول و کلیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کتاب کے پچھلے تمام مباحث کا جو منطقی تقاضہ ہے وہ کھل کر

---

[16] اس موقع پر یہ حقیقت خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ تہذیب و تمدن کے الفاظ وسیع معنی و مفہوم رکھتے ہیں۔ اور ان دونوں میں کافی فرق بھی پایا جاتا ہے۔ مگر عام طور پر بلا تکلف ایک کی جگہ پر دوسرا لفظ بول دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے حدود اور مفہوم کے تعین میں سخت دشواری پیش آتی ہے اور مختلف ماہرین ان کی تشریح مختلف انداز سے کرتے ہیں۔ مگر جیسا کہ پچھلے مباحث سے ظاہر ہو گیا تمدن سے میری مُراد کوئی "مکمل نظامِ تمدن" نہیں بلکہ صرف اس کا وہ حصّہ مُراد ہے جو جدید علوم و فنون کے تعلق سے ظاہر ہوا ہو۔ اسی طرح تہذیب سے مُراد میرے نزدیک کسی دین یا مذہب کا پورا سلسلۂ ایمانیات، نظام اخلاق و معاشرت اور اس کا پورا فکر و فلسفہ ہے۔ اسلامی تہذیب سے میری مُراد اسی قسم کی مکمل تہذیب ہے جو ایک مکمل نظامِ زندگی پر مشتمل ہے اور میں نے جہاں کہیں بھی اپنی عبارت میں "اسلامی تہذیب" کا نام لیا ہے وہ اسی معنی و مفہوم میں ہے۔

اب اسلامی تہذیب اور تمدن جدید میں عقلی و منطقی حیثیت سے تعلق یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اصل اور ہر حال میں برتر و فائق تر اور مطلوب و مقصود رہے گی۔ لیکن اس کے برعکس تمدن جدید اگرچہ اصلاً مطلوب و مقصود تو نہیں ہے مگر اسلامی تہذیب کے تحفّظ اور اس کے استحکام کے لئے ایک ضمیمہ و وسیلہ اور آلۂ کار کی حیثیت سے اس کی بے انتہا اہمیت ہے اور کسی بھی دور میں اُس کی اِس اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سامنے آجائے اور یہ بحث مکمل ہو جائے۔

اس سلسلے میں عصر جدید کے بہت سے مفکرین اور دانشور طبقے کی سنجیدہ رائے یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور جدید تمدن کے صالح عناصر کی یکجائی اور ان کے اجتماع ہی میں اہل اسلام اور عالم انسانی کا بھلا ہو سکتا ہے۔ یعنی ہم کسی قوم یا ملت سے اس کے تہذیبی نظریات مستعار لئے بغیر محض اس کے صالح تمدنی عناصر کو ــ جدید علوم و فنون وغیرہ کے روپ میں ــ لے لیں اور خود اپنی برتر تہذیب ــ شرعی و اخلاقی سرمایہ ــ اور اس کے ابدی و عالمگیر نظریات اس کے حوالے کر دیں۔

جیسا کہ پچھلے ابواب کے تمام مباحث سے ظاہر ہو گیا اس وقت ہمارے سامنے دو ہی اہم ترین مسائل ہیں جنہیں حل کئے بغیر ہم خلافت ارض کے میدان کو سر نہیں کر سکتے۔ پہلا یہ کہ ہمیں مادی میدان میں قوت و طاقت حاصل کرنا اور اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کی کوشش کرنی ہے۔ اور دوسرا مسئلہ یہ کہ نوع انسانی کی صحیح رہنمائی کر کے اس کو موجودہ تباہی و بربادی کے غار سے نکالنا ہے اس کے نظریات اور مادی فلسفوں کی اصلاح کرنی ہے، اس کے دماغ سے خدا بیزاری کے جراثیم نکال کر خدا پرستی کے صالح عناصر داخل کرنے ہیں اور اس کے تمام تہذیبی دکھوں کا مداوا کرنا ہے۔

اب یہ دونوں مقاصد اس طرح حل ہو سکتے ہیں کہ پہلے مسئلے کو حل کرنے کے باب میں اس وقت ہم خود مغرب کے محتاج ہیں۔ لہذا ہم کو وہ تمام علوم و فنون اور وہ سارے تمدنی لوازم لینے ضروری ہیں جن میں خیر کا پہلو غالب ہو اور جن کے بغیر موجودہ اجتماعی زندگی مشکل نظر آتی ہو۔ اور دوسرے مسئلے میں مغرب خود ہمارا محتاج ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس ایک اعلیٰ و ارفع خدائی ہدایت (اپنی محفوظ ترین شکل میں) اور کامل ترین تہذیب موجود ہے۔ لہذا تبادلے کے اصول کے مطابق ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی تہذیب

-اپنا دینی و اخلاقی سرمایہ — اس کے حوالے کر کے اس کے تمدنی علوم و فنون کے سرمائے کو خود لے لیں۔ اس میں نہ صرف دونوں کا بھلا ہے بلکہ اسی میں فلاحِ انسانیت بھی مضمر ہے۔ (مگر پہل ہم ہی کو کرنی چاہیئے)۔ یہ علوم و فنون بھی دراصل اس کے اپنے اور ذاتی نہیں بلکہ ہمارے ہی آباء و اجداد کی وراثت ہیں جن کو موجودہ مغربی قوموں نے قرونِ وسطیٰ میں ہم ہی سے لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے ان علوم و فنون کو بے انتہا ترقی دے دی ہے۔ مگر نیو اور بنیاد ہماری ہی ڈالی ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارا موجودہ مغربی علوم و فنون کو اپنانا گویا کہ مغربی اقوام کا زیر بار احسان ہونا نہیں بلکہ درحقیقت ہماری ہی ملّی و آبائی امانت کو واپس لینا ہے۔

ایک دوسری حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ بھی ایک حقیقت ہوگی کہ ہمارے آباء و اجداد نے قرونِ وسطیٰ میں مغربی قوموں کو علوم و فنون سے روشناس کرا کے ان پر ایک بہت بڑا احسان کیا تھا۔ اور اب تہذیبی اعتبار سے بھی ان کی رہنمائی کر کے ہم پھر دوبارہ ان پر احسان کرنے والے ہوں گے۔ اگر قرونِ وسطیٰ ہی میں اقوامِ مغرب ہمارے علوم و فنون کے ساتھ ہی ساتھ ہمارا تہذیبی سرمایہ بھی لے چکی ہوتیں تو موجودہ مغربی تہذیب کی گراوٹ، انارکی اور خدا فراموشی کا وہ حال نہ ہوتا جو آج نظر آرہا ہے۔ بہرحال اسلامی تہذیب ہی ایک برتر تہذیب اور عالمِ انسانی کے لئے خیر و برکت کا باعث ہوگی، جو ہر حیثیت سے اونچ نیچ سے عاری اور صالح و متوازن ہے۔ جب تک اس تہذیب کا بول بالا نہیں ہوتا دنیا سے سیاست و حیثیت کی ہوستاکی و خود غرضی اور معاشرتی و اجتماعی مفاسد کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا اسلام کی نظر میں اس مسئلے کا سب سے بہترین حل یہ ہے کہ اہلِ اسلام اپنے "خیرِ امت" ہونے کی حیثیت سے عالمِ انسانی کو "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کے اسباق پھر سے پڑھائیں اور اُس

کے سامنے اسلام کی دعوت اور اس کی خوبیوں کو واضح اور مثبت انداز میں پیش کریں۔ یہ ان کے ذمہ ایک دینی و شرعی فریضہ ہے جو ایک فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے زندگی کے ــــ ملی و انسانی ہونے کی حیثیت سے۔ دو ہی راستے ہیں: ایک یہ کہ ہم فوجی و عسکری طاقت میں مغربی ممالک کی برابری کر کے طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے، موجودہ تمام تہذیبی و تمدنی خرابیوں کو دور کرنے اور جدید معاشرے کو پوری طرح قابو میں رکھنے کی کوشش کریں۔ یا پھر ان قوموں کو حلقہ بگوشِ اسلام کر لیں جس کے باعث بہ غلط اور مُضر تمدنی و اجتماعی رُجحانات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اصلاح کی کوئی تیسری شکل ممکن نہیں ہے۔ مگر ہماری پیش رفت ان دونوں میدانوں میں بیک وقت ہونی چاہیئے۔ ہم کسی ایک چیز کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے ورنہ کامیابی مشکل ہو گی۔

تہذیب و تمدن کا اجتماع مفکرین کی نظر میں

یہ گویا کہ پیش پا افتادہ تمام مسائل و مشکلات کا حل ہے اور اس سلسلے میں جو بھی سمجھدار آدمی کھلے ذہن و دماغ کے ساتھ غور کرے گا تو عقلی و منطقی حیثیت سے اس کی راہ یابی اسی نتیجے اور اسی بنیادی نقطے کی طرف ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم دانشوروں کا طبقہ پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ ان دونوں چیزوں ــــ اسلامی تہذیب اور تمدن جدید یا جدید تمدنی علوم و فنون ــــ کو ملانے اور ان کے اجتماع سے نئے برگ و بار پیدا کرنے کا قائل اور اس کو وقت کی ناگزیر ضرورت سمجھتے ہوئے اس کا پُرزور داعی و نقیب ہے۔ مثلاً مشہور صاحبِ فکر یورو پین مسلم محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس) جن کا علمی حلقوں میں بہت احترام پایا جاتا ہے، تحریر کرتے ہیں:

"علم نہ مغربی ہے نہ مشرقی، علمی انکشافات و تحقیقات ایک ایسے سلسلے کی کڑی ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں، اور جس میں تمام بنی نوع انسان برابر کے شریک ہیں۔ ہر عالم اور سائنٹسٹ ان ہی بنیادوں پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھتا ہے جو اس کے پیشرووں نے قائم کی تھیں، خواہ وہ اس کی قوم سے تعلق رکھتے ہوں یا کسی اور قوم سے۔ اسی طرح ایک انسان سے دوسرے انسان، ایک نسل سے دوسری نسل، ایک تہذیب سے دوسری تہذیب تک تعمیر و اصلاح و ترقی کا کام برابر جاری رہتا ہے۔ اس لئے اگر کسی خاص زمانے یا خاص تمدن میں یہ کام انجام پائیں تو یہ قطعاً نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس زمانے یا تہذیب کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اور زمانے میں کوئی دوسری قوم جو زیادہ باہمت اور حوصلہ مند ہو میدان عمل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ لیکن بہر حال سب اس کام میں برابر کے حصہ دار ہیں۔

ایک دور ایسا بھی آیا تھا جب مسلمانوں کا تہذیب و تمدن یورپ کے تہذیب و تمدن سے زیادہ شاندار تھا۔ اس نے یورپ کو بہت سی انقلابی قسم کی صنعتی و فنی ایجادات عطا کیں۔ اس سے بڑھکر یہ کہ اس نے یورپ کو عملی طریقے کے اصول و مبادی دئیے جس پر علم جدید اور تہذیب جدید کی بنیاد ہے۔ لیکن اس کے باوجود جابر بن حیان کا کیمسٹری کا علم عربی نہیں کہلایا۔ اسی طرح الجبرا اور علم مثلثات کو اسلامی علوم نہیں کہا گیا، حالانکہ اول الذکر کا موجد خوارزمی ہے۔ موخر الذکر کا بتانی۔ اور یہ دونوں ہی مسلمان تھے۔ ٹھیک اسی طرح نظریہ کشش کو کوئی انگریزی علم نہیں کہہ سکتا۔ اگرچہ اس کا موجد انگریز تھا۔[۱]

---

[۱] نظریہ کشش یا قانون تجاذب (gravitation) کے اصل موجد مسلمان تھے۔ حتٰی کہ وہ عالمگیر قانونِ تجاذب سے بھی واقف تھے، جیسا کہ مثنوی مولانائے روم کے حسب ذیل اشعار دلالت کرتے ہیں: (باقی صفحہ آئندہ پر ملاحظہ کیجیے)

یہ بڑے بڑے علمی کام نوع انسانی کی مشترک میراث ہیں۔
اسی طرح اگر مسلمان (جیسا کہ ان کے اوپر واجب ہے) صنعتی علوم و فنون کے نئے ذرائع اپناتے ہیں تو وہ ایسا صرف ارتقار و ترقی کی فطری خواہش اور جذبے سے کرتے ہیں، دوسروں کے تجربات اور معلومات سے فائدہ اٹھانے کی فطری خواہش اور جذبہ۔ لیکن اگر وہ (اور ان کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہے[۱۸]) مغربی زندگی کی اشکال، آداب، عادات اور مغرب کے اجتماعی تصورات کو اپناتے ہیں تو اس سے ان کو ذرّہ برابر بھی فائدہ نہ ہوگا۔ اس لئے کہ یورپ ان کو اس میدان میں جو دے سکے گا وہ اس سے بہتر نہیں ہوگا جو خود ان کی ثقافت اور ان کے دین نے ان کو عطا کیا ہے۔
اگر مسلمان ذرا ہمت بلند کریں اور حوصلے سے کام لیں اور ترقی کو ایک ذریعے اور وسیلے کی حیثیت سے اپنائیں تو وہ اس طرح نہ صرف اپنی باطنی حریت کی حفاظت کرسکیں گے بلکہ شاید یورپ کے انسانوں کو زندگی کے گم شدہ لطف کا راز بھی بتا سکیں گے۔"[۱۹]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

جملہ اجزائے جہاں زاں حکم بیش
جفت جفت و عاشقان جفت خویش
ہست ہر جزوے بہ عالم جفت خواہ
راست ہم چو کہربا و برگ کاہ
آسماں گوید زمیں را مرحبا
باتو ام چوں آہن آہن ربا

یعنی اس کائنات کا ہر ذرہ دوسرے ذرّے کو اس طرح کھینچتا ہے جس طرح کہربا گھاس اور تنکوں کو کھینچتا ہے۔ آسمان اور زمین ایک دوسرے کو لوہے اور مقناطیس کی طرح کھینچتے ہیں۔

(جدید معلومات سائنس، حصہ اوّل، از آفتاب حسن، ص ۳۷)

[۱۸] قوسین کی یہ عبارتیں کتاب کے اردو ترجمے میں اسی طرح مذکور ہیں جو شاید مترجم کا اضافہ ہے۔

[۱۹] The Road to Mecca کا اردو ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" از محمد الحسنی، ص ۱۸۷ - ۱۸۹، کراچی، ۱۹۶۱ء

حکیم مشرق علامہ اقبال اپنے خطبات میں تحریر فرماتے ہیں:

"علوم و فنون، فلسفہ اور سائنس میں مسلمان مغرب سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ یہ محض مادی ترقی ہے اور مسلمانوں کی روحانیت کا تفوق ابھی تک قائم ہے۔ قرآن مادی اور غیر مادی کی تقسیم کا قائل نہیں۔ تسخیر فطرت آدم کی صنعت، اس کا وظیفۂ حیات اور اس کا مقصود زندگی ہے۔ تسخیرِ فطرت سے مغرب نے غیر معمولی ترقی حاصل کر لی ہے۔ جن قوموں نے ان میں حصہ نہیں لیا وہ مغلوب اور کمزور ہو گئی ہیں۔ علوم و فنون کی ترقی اور تسخیر فطرت نے نئے زوایائے نگاہ پیدا کر دیے ہیں۔ مسائل حیات کی صورت بدل گئی۔ قدیم تصورات کو نئے سانچوں میں ڈھالنا ضروری ہو گیا ہے۔"[۲۰]

نیز وہ فرماتے ہیں:

"قرآن حکیم کا مقصد خدا اور کائنات سے انسان کے رابطے کا ایک گہرا شعور پیدا کرنا ہے۔ قرآن کا نظریۂ حیات حکمائے مغرب کے لیے بھی کوئی فرسودہ چیز نہیں۔ گوئٹے جیسا حکیم بالغ نظر اپنے ندیم ایکرمن سے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ تعلیم کبھی ناکام نہیں رہ سکتی۔ کوئی نظام فکر اور کوئی انسان اس سے آگے نہیں نکل سکتا۔ اسلام کا اصل مسئلہ دین اور دنیا، مذہبی عقائد اور تہذیب و تمدن کا رابطہ واضح کرنا تھا۔"[۲۱]

آگے وہ مزید تحریر فرماتے ہیں:

"قرآن کریم کہتا ہے کہ آدم کو جو اشیاء کا علم عطا کیا گیا تھا اس کی بدولت اس کو ملائکہ پر فوقیت حاصل ہوئی۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ کائنات کی ناظم قوتیں علم اشیاء سے مطیع ہوتی اور انسان کے سامنے سربسجود

۲۰؎ فکر اقبال، از خلیفہ عبدالحکیم، ص ۴۵۸-۴۵۹، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء

۲۱؎ ایضاً ص ۴۵۹

ہوتی ہیں .... تمام قرآن مطالعۂ فطرت اور مشاہدۂ موجودات کی ترغیب سے لبریز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اور طبیعی علوم میں کبھی تصادم نہیں ہو سکتا.. نہ یونانی حکماء کے ہاں مادی عالم کوئی قابل غور چیز تھا اور نہ رہبان مذاہب اس کو قابل اعتنا سمجھتے تھے۔ اسلام اس قدیم فلسفے اور ان قدیم ادیان کے خلاف ایک کامیاب بغاوت تھا.... اکثر غیر اسلامی فلسفوں میں یہ عقیدہ مسلّم ہو گیا تھا کہ متغیر عالم غیر حقیقی عالم ہے۔ قرآن نے کہا ہرگز نہیں۔ تغیرات کا عالم بھی حقیقی عالم ہے اور باطل نہیں۔ یہ بھی حق ہی کا پہلو ہے۔ جو اس کی بصیرت پیدا نہ کرے گا وہ عالم روحانی میں بے بصر رہے گا۔ قدیم مذاہب اور تہذیبیں اسی لئے ناکام رہیں اور تکمیلِ انسانیت میں حارج ہوئیں کہ انہوں نے باطن کو ظاہر سے الگ کر کے تمام تر توجہ باطن پر مبذول کر دی۔ جن فلسفوں میں یہ نظریۂ حیات تھا وہ بھی یکطرفہ ہونے کی وجہ سے زندگی کی کوئی تشفی بخش تعبیر نہ کر سکے۔ ایسے ادیان اور فلسفوں پر کوئی پائیدار تہذیب نہیں ہو سکتی .... مادی قوتوں پر غلبہ حاصل کرنا فی نفسہ مقصود نہیں۔ اس کی غرض یہ ہے کہ انسان روحانی زندگی کے مقصد اشرف کے حصول میں ترقی کا قدم اٹھا سکے "[۲۲]

اور حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں :

"مغرب کے ناقابل انکار علمی و صنعتی تفوق کو سامنے رکھ کر جس سے آنکھیں بند کر لینا نہ عقل کا تقاضہ ہے نہ مذہب کی تعلیم اور نہ عملاً ممکن، عالم اسلام کے سامنے صرف دو راستے رہ جاتے ہیں، ایک تو یہ کہ اس سے مسحور ہو کر اس کے پورے فلسفۂ زندگی، اس کے تصورِ کائنات، اس کے مابعد الطبیعاتی عقائد و تصوّرات، اس کے عمرانی و اجتماعی نظریات، اس کے اخلاقی

---

[۲۲] ایضاً ص ۴۶۱ - ۴۶۲ (ملخص)

نقطۂ نظر اور اس کے مسلکِ زندگی کو جوں کا توں قبول کر لیا جائے اور اپنی ہستی کو اس کے سانچے میں یکسر ڈھال دینے کی کوشش کی جائے۔ یہ اس حقیقت سے قطع نظر کہ یہ ایک مکمل اور ہمہ گیر ارتداد اور روحانی و ذہنی خودکشی کے مترادف ہوگا اور اس انسانیت کے ساتھ غدّاری اور بے وفائی جس کی آخری آس نبی خاتم کی اسی اُمت سے لگی ہوئی تھی، ایک ایسی غیر ضروری محنت اور سعی لاحاصل ہے، جس کا نتیجہ طویل دخوں ریز ذہنی کشمکش، روحانی بے چینی، انسانی طاقتوں کے ضیاع اور اضاعت وقت کے سوا کچھ نہیں، یہ ایک ایسی بنی بنائی مستحکم عمارت کی تخریب ہے جس کے ملبے پر دوسری عمارت تعمیر کرنے کے لئے نہ مواد خام موجود ہے، نہ تعمیری صلاحیتیں، نہ آب و ہوا اور ماحول سے مناسبت، نہ ماضی سے ارتباط۔ عالم اسلام کے جن جن گوشوں اور جن اسلامی ملکوں میں یہ کوشش کی گئی ناکام رہی، اور جب بھی اس مصنوعی اور غیر طبیعی اقتدار کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور عوام کو اپنی پسند اور ناپسند کے اظہار کا موقع ملا، انہوں نے فوراً اس جھول کو اتار پھینکا، جو نہ ان کے جسم پر قطع ہوئی تھی اور نہ ان کے مزاج کے مطابق تھی۔ آج ترکی میں یہی نظر آرہا ہے اور مصر و شام میں بھی عنقریب یہی پیش آنے والا ہے۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ مغرب سے علم و صنعت، ٹکنالوجی اور سائنس اور ان علوم و تحقیقات میں جن کا تعلق تجربے، حقائق و واقعات اور انسانی محنت و کاوش پر ہے، فراخ دلی کے ساتھ استفادہ کیا جائے، پھر ان کو ان مقاصد کے لئے اپنی خداداد ذہانت اور اجتہاد کے ساتھ ان اعلیٰ مقاصد کا تابع اور خادم بنایا جائے جو آخری نبوت اور آخری صحیفے نے ان کو عطا کئے اور جن کی وجہ سے ان کو خیر امت اور آخری امت کا لقب ملا ہے۔ وسائل اور مقاصد کا یہ خوش گوار امتزاج جس سے سردست مغرب بھی محروم ہے اور مشرق بھی کہ مغرب تنہا قاہر وسائل کا سرمایہ دار ہے اور صالح مقاصد میں محض تہی دامن۔

اور مشرق (اسلامی) صالح مقاصد کا واحد اجارہ دار ہے اور مؤثر وسائل سے یکسر محروم۔ مغرب کر سب کچھ سکتا ہے لیکن کرنا نہیں چاہتا اور صحیح الفاظ کرنا نہیں جانتا۔ اسلامی مشرق کرنا سب کچھ چاہتا ہے لیکن کر کچھ نہیں سکتا۔ یہ صحت مند اور صالح امتزاج دنیا کی قسمت بدل سکتا ہے اور اس کو خودکشی و خودسوزی کے راستے سے ہٹا کر فلاح دارین اور سعادت ابدی کے راستے پر ڈال سکتا ہے۔ یہ کارنامہ وہی امت انجام دے سکتی ہے جو آخری پیغمبر کی جانشین اور اُس کی تعلیمات کی حامل و امین ہے۔ اس بنا پر عالم اسلام کا حقیقی نعرہ جس سے اس کے دشت و جبل گونجنے چاہییں یہ ہے ؎

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ　　معمارِ حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز[۲۳]

پھر موصوف آگے مزید تحریر فرماتے ہیں:

"مغربی تہذیب کو پورے طور پر گھن لگ چکا ہے۔ وہ اب محض اپنی صلاحیت اور زندگی کے استحقاق کی بنا پر نہیں جی رہی ہے بلکہ اس لئے کہ بدقسمتی سے کوئی تہذیب اس کی جگہ لینے کے لئے تیار نہیں۔ اس وقت جتنی تہذیبیں یا قیادتیں ہیں یا مغربی تہذیب کی بکری فقیر اور اس کی ایک روکھی پھیکی تصویر ہیں یا اتنی کمزور اور شکست خوردہ ہیں کہ اس سے آنکھیں نہیں ملا سکتیں۔ اب اگر اسلامی ممالک اور عالم اسلام مجموعی طور پر اس خلا کو پُر کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے جو مغربی تہذیب کے خاتمے سے عالم انسانی میں پیدا ہو گا تو اس کو دنیا کی امامت کا دوبارہ منصب تفویض کیا جا سکتا ہے جو سُنۃ اللہ کے مطابق ایک جری و قوی اور تازہ دم ملت یا قیادت کے سپرد کیا جاتا رہا ہے۔"[۲۴]

---

۲۳ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص ۳۱۰-۳۱۲، کراچی ۱۹۸۱ء

۲۴ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص ۳۱۴

تمدّن و ثقافت کو مذہب سے کس طرح ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟

" دین ایک ابدی حقیقت ہے جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں لیکن علم ایک پھلنے پھولنے والا درخت ہے، جس کا نشو ونما برابر جاری رہے گا"[۲۵]

ہم کو دین اور اس کے بنیادی اصولوں پر پوری طرح ثابت قدم رہتے ہوئے صرف علم جدید سے استفادہ کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ جیسا کہ واضح کیا جا چکا تجرباتی علوم کسی مخصوص قوم کی میراث نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کا مشترکہ سرمایہ ہیں جن سے فائدہ نہ اٹھانا قوموں کی محرومی و بدنصیبی بلکہ ان کے ادبار کی علامت ہے۔ یعنی جو قومیں علم جدید سے آراستہ ہوتی ہیں، لازمی طور پر ان کا غلبہ و استیلا اس علم سے عاری یا غیر ترقی یافتہ قوموں پر قائم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ علم جدید لازمی طور پر تمدن جدید کو جنم دیتا ہے، جو تجرباتی علوم کی ترقی کا منطقی اور راست نتیجہ ہوتا ہے۔ لہذا جو قوم علم جدید میں پیچھے رہ جائے وہ گویا تمدن جدید میں بھی پیچھے ہو جائے گی اور جو قوم علم جدید میں ترقی یافتہ قوموں کی برابری کئے بغیر محض تمدن جدید میں ترقی یافتہ قوموں کی نقالی کرنے لگے وہ ذہنی اعتبار سے مرعوب اور ترقی یافتہ قوموں کی ذہنی غلامی اور اس کے سحر میں مبتلا رہے گی اور اس کے تمام تہذیبی و ثقافتی اقدار کو من و عن قبول کرلے گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آج خود ہماری قوم و ملت کے بہت سے اصحاب و نوجوان اس خطرناک قسم کے ذہنی ارتداد سے ــــ شعوری یا غیر شعوری طور پر ــــ دوچار ہیں، جن پر مغربی تہذیب پوری طرح حملہ آور ہو چکی ہے۔ اور آج ہمارا کوئی ملک، کوئی شہر اور کوئی قریہ تک مغربی تہذیب کے اس غلبے و استیلاء سے محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔ لہذا اس مسئلے کا بہترین حل یہ ہے کہ ہم کسی کے تمدّن و ثقافت کی محض نقّالی

---

۲۵ ایضاً ص ۹۱،

کرنے کے بجائے علم جدید سے آراستہ و پیراستہ ہو کر اپنی راہ خود بنائیں اور ایک بالکل نئے تمدن کو پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے دین و شریعت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو۔ ہم کو کسی سے تہذیب و ثقافت عاریتاً لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم خود ایک برتر اور ہمہ گیر تہذیب کے مالک ہیں، وہ تہذیب جو آغازِ اسلام کی دو عظیم الشان تہذیبوں۔ ایرانی تہذیب اور رومی تہذیب۔ سے متصادم ہو کر معرکہ جیت چکی ہے اور چنگیزیوں اور تاتاریوں جیسی اقوام تک کو اپنی تہذیبی آغوش میں لے کر اپنی عظمت کا لوہا منوا چکی ہے۔ چنانچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس سلسلے میں ایک بہترین مثال دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

" پہلا تجربہ وہ تھا جو پہلی اور دوسری صدی کے اسلامی معاشرے کو پیش آیا تھا۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ اسلامی معاشرہ طاقتور، تازہ دم اور زندگی اور ترقی کی صلاحیتوں سے بھرپور تھا۔ اس کی حیثیت فاتح اور غالب طاقت کی تھی۔ اس کے بالمقابل دنیا کی دو قدیم و عظیم تہذیبیں تھیں۔ ایک مغرب کی رومی و یونانی تہذیب، دوسری مشرق کی ایرانی تہذیب۔ دونوں تہذیبیں قدیم دنیا کے علوم و فنون، ثقافت و ادب، فلسفیانہ نظاموں کے ذخیرے اور تمدن و معاشرت کے ترقی یافتہ طریقوں سے مالا مال تھیں۔ اسلامی معاشرے نے جو ہر طرح کے احساس کمتری سے محفوظ اور خود شناسی و خود اعتمادی کی دولت سے بھرپور تھا بغیر کسی ذہنی غلامی اور مرعوبیت کے اپنی ضرورت اور اپنے حالات کے مطابق ان ذخیروں سے استفادہ کیا۔ جس چیز کو مناسب سمجھا اس کو بجنسہٖ اخذ کر لیا اور جس چیز کو نامناسب سمجھا اس کو پہلے اپنے سانچے میں ڈھالا پھر اس کو اپنی صحیح جگہ فٹ کر لیا۔ آزاد اور غالب ہونے کی بنا پر یہ استفادہ اور اقتباس اس معاشرے کی روح اور اس کے اخلاقی رجحان پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔

دوسرا تجربہ وہ تھا جو اس اسلامی معاشرے کو ساتویں صدی میں اس وقت پیش آیا جب تاتاریوں نے عالم اسلام کے مرکزی حصّے پر قبضہ کرلیا۔ اور مسلمان سیاسی طور پر ان کے مفتوح اور زیر نگیں ہو گئے۔ اس وقت اسلامی معاشرے کو جس فاتح سے سابقہ پڑا وہ تہذیب و تمدن، علم و فن، قانون و دستور میں بالکل فرومایہ اور تہی دست تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی تہذیب تھی، نہ زندگی کا کوئی فلسفہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفتوح اسلامی معاشرے کے سامنے فاتح کی تہذیب، معاشرت، فلسفۂ حیات اور افکار و اقدار سے متاثر و مستفید ہونے کا کوئی حقیقی سوال نہیں تھا۔ اس کے برخلاف فاتح قوم روز بروز اپنی مفتوح اقوام سے متاثر ہوتی چلی جارہی تھی۔ وہ بتدریج اپنی مفتوح اقوام کی تہذیب، معاشرت، علوم و فنون، اس کے ترقی یافتہ طریقۂ زندگی اور اس کے اعلیٰ دینی عقائد اور خیالات سے متاثر ہوتی چلی گئی۔ بالآخر اس نے اپنی مفتوح اقوام کا دین اور ان کی تہذیب پورے طور پر قبول کر لی اور ان کے سانچے میں ڈھل کر حرم کی پاسبان اور اسلام کی پُرجوش علمبردار اور محافظ بن گئی۔"[26]

اصل میں تہذیبی شکست یا خود سپردگی، اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ یا تو تاتاریوں کی طرح کوئی قوم وحشی یا تہذیبی اعتبار سے مفلس و قلاش ہو یا پھر خود اعتمادی و خود شناسی کے بجائے خواہ مخواہ مرعوبیت اور احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے۔ مگر اسلام جیسی عظیم الشان تہذیب اور اس کے اعلیٰ اقدار کو دیکھتے ہوئے ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی باہوش اور صحیح العقیدہ مسلمان اسلامی تہذیب کو استخفاف کی نظروں سے دیکھے گا اور محض ظاہری چمک دمک کی بنا پر اپنی تہذیب کو

---

[26] ایضاً ص ۵۵ ـ ۵۶

خیر باد کہہ کر مغربی تہذیب اختیار کر لے گا۔

غرض آج ہم کو اپنے تمام تمدنی و اجتماعی اُمور و مسائل میں وہی رویہ اور طرزِ فکر اختیار کرنا ہوگا جس کو پہلی اور دوسری صدی ہجری میں ہمارے آباء و اجداد نے رومی اور ایرانی تہذیب و تمدن کے بارے میں اپنا کر نہ صرف اپنے دینی و ملی شعائر اور اپنے اقدارِ حیات کی حفاظت کی بلکہ ایک عظیم الشان تمدن کی داغ بیل ڈال کر ہمارے لئے ایک نمونہ اور مثال بھی قائم کر دکھایا ہے۔ ہم کو ہر حال میں دین و شریعت کے حدود و ضوابط میں رہتے ہوئے "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے حکیمانہ اصول کے مطابق موجودہ تہذیبی معرکہ جیتنا ہے۔

• جیسا کہ عرض کیا جا چکا اسلام تمدن کی ترقی میں مانع نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ یہ ہماری اپنی لاعلمی اور کم ہمتی ہے جو اس میدان میں ہم پیچھے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے قصورِ فہم اور قصورِ عمل کا ذمہ دار اسلام یا اسلامی تہذیب کو قرار دینا صحیح کیسے ہو سکتا ہے؟

اصل میں دینِ ابدی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف انہی اُمور میں مفصل ہدایات دیتا ہے جن کو انسان اپنی عقل و تجربے سے معلوم نہیں کر سکتا۔ انہی کا نام شرعی احکام یا "اوامر و نواہی کا مجموعہ" ہے۔ ان اُمور میں ایک سرِ مو کی بھی کسی دور میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔[۲۷]

---

[۲۷] سوائے ان جدید مسائل کے جو معاشرت و تمدن کی ترقی کی بنا پر پیش آتے ہیں۔ ان نئے مسائل کو شرعی ضوابط کے تحت حل کرنے کی تفصیل اور ان کا طریقہ کار اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ ان شرعی ضوابط کے تحت قیامت تک پیش آنے والے تمام نئے نئے معاشرتی و اجتماعی مسائل کا حل نکالا جا سکتا۔ اسی کا نام اصطلاح میں "فقہ اسلامی" ہے۔

اس کے برعکس وہ اُمور جن کو انسان خود اپنی عقل اور تجربے سے معلوم کرسکتا ہے تو ان میں چند حدود و ضوابط کے اندر انسان کو مکمل آزادی ہوتی ہے۔ حدیث شریف "انتم اعلم بامور دنیاکم" (تم اپنے دنیوی معاملات کو خود جانتے ہو) میں اسی طرف اشارہ ہے۔ اور جدید سے جدید تر تمام علوم و فنون اس ذیل میں آسکتے ہیں۔

غرض دین اسلام میں ہر چیز کا بیان واضح، اس کے حدود معین اور ہر مسئلے سے متعلق تشفی بخش ہدایتیں مذکور ہیں اور کوئی بھی چیز مشتبہ یا مشکوک نہیں ہے۔

اسلامی تہذیب کی صلاحیت و کابلیت

بین الاقوامی شہرت کے مالک مغربی فاضل محمد اسد (لیوپولڈ ویس) اپنی مشہور کتاب "اسلام ایٹ دی کراس روڈس" میں اسلام اور اس کی تہذیبی صلاحیت و کابلیت اور موجودہ دور میں اس کے رہبرانہ کردار ادا کرنے کی استعداد نیز مسیحیت کی ناکامیوں اور موجودہ مغربی تمدن کے ارتقار کے اسباب اور اس کی غیر صالحیت وغیرہ بہت سے مسائل پر تبصرہ اور اظہار خیال کرتے ہوئے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ موصوف کے سلیم الطبع اور صائب الرائے ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ اس موقع پر کتاب مذکور سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

"اسلام مجھے ایک مکمل تعمیری ڈھانچہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے تمام حصے ایسی خوش اسلوبی سے مربوط ہیں کہ ایک دوسرے کے لاحقے اور مددگار معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی جزو بے کار نہیں ہے۔ کوئی خامی نہیں ہے۔ اور نتیجہ یہ کہ بالکل متوازن اور قطعی ٹھوس ترکیب ہے۔ غالباً اس احساس نے مجھ پر سب سے زیادہ اثر کیا کہ اسلام کی تعلیمات اور نظریات میں ہر چیز

اپنی جگہ پر موزوں ہے[۲۸]

"اس مطالعے اور مقابلے نے مجھ میں یہ اعتقاد راسخ کر دیا کہ اسلام بطور ایک روحانی اور سماجی مظہر کے، باوجود مسلمانوں کی خامیوں کی پیدا کی ہوئی کمزوریوں کے، آج بھی ایک ایسی محرک قوت ہے جیسی نوع انسانی نے کبھی حاصل نہیں کی۔"[۲۹]

"ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام جو دوسرے مذاہب کے برخلاف محض ایک روحانی ذہنیت نہیں ہے جو مختلف تہذیبی ماحول سے سمجھوتہ کر لے۔ بلکہ تمدن کا ایک خودکفیل محور ہے اور ایک ایسا سماجی نظام جس کے حدود اربعہ واضح ہیں۔ جب کوئی اجنبی تمدن اپنا سایہ ہم پر ڈالتا ہے اور ہمارے تہذیبی نظام میں کچھ تبدیلیاں پیدا کرتا ہے جیسا کہ آج ہو رہا ہے تو ہمیں لازمی طور پر اپنے ذہن میں یہ تمیز کر لینا ہوتا ہے کہ آیا یہ اجنبی اثر خود ہمارے تہذیبی امکانات کے ساتھ ساتھ چلتا ہے یا اس کے لئے تباہ کن ہے؟ آیا اسلامی تمدن کے جسم میں وہ طاقت پیدا کرنے والا ہے یا اس کے لئے زہر کا اثر رکھتا ہے؟"[۳۰]

"تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی اس کے امکان کی شکل ہے کہ انسان بغیر ایک لمحے کے بھی روحانی راستے سے الگ ہوئے دنیوی زندگی کو پوری مسرت کے ساتھ گزار سکتا ہے۔ مسیحی تصور سے یہ کتنا مختلف ہے! مسیحی عقیدے کے بموجب جب آدم و حوا سے جو گناہ ہوا اس کی پاداش کا ترکہ نسل انسانی کو ملا ہے جس سے وہ لڑکھڑاتی ہے اور کم از کم اس عقیدت

---

[۲۸] کتاب مذکور کا ترجمہ اردو "اسلام دوراہے پر" از رحم علی الہاشمی، ص ۸-۹، دہلی ۱۹۶۸ء

[۲۹] ایضاً ص ۹

[۳۰] ایضاً ص ۱۲ - ۱۳

کے نظریہ سے ساری زندگی ایک غموں کی تاریک گھاٹی ہے [۳۱]

"لیکن اگرچہ زندگی کی جو مغموم صورت مسیحیت میں بیان کی گئی ہے اس سے اسلام کو اتفاق نہیں ہے تاہم اس کی یہ تعلیم ضرور ہے کہ دنیاوی زندگی کو مبالغہ آمیز اہمیت نہ دے جیسا کہ آج کل مغربی تہذیب میں ہو رہا ہے۔ مسیحی نقطۂ نظر یہ ہے کہ "دنیاوی زندگی بُرا کاروبار ہے" [۳۲]

"موجودہ مغربی تمدن جن زبردست سائنسی اور مادی ترقیوں میں سب سے آگے بڑھا ہوا ہے اس میں مسیحیت کا بہت ہی کم دخل ہے۔ دراصل یہ ترقیاں اس بنا پر ہوئیں کہ مسیحی کلیسا اور اُن کے نقطۂ نظر کے خلاف مدت العمر جنگ جاری رہی — طویل صدیوں تک یورپ کی روح پر اس مذہبی نظام کا جابرانہ تسلط رہا جو زندگی اور فطرت کی تحقیر پر مبنی تھا۔ ترک دنیا کی تحریک جو اناجیل میں شروع سے آخر تک کارفرما ہے، ظلم کو خاموشی سے سہنا، جنسیت کا اس لئے انکار کہ جنّت سے آدم و حوا کے ہبوط پر مبنی ہے، گناہ کا ورثہ، مسیح کی صلیب سے اس کا کفارہ، ان سب تصورات سے حیات انسانی کی تعبیر ایک مثبت منزل کی حیثیت سے نہیں ہوتی، بلکہ ایک ناگزیر مصیبت کی حیثیت سے اور ایک ایسی تعلیمی رکاوٹ کی حیثیت سے جو روحانی ارتقا کی راہ میں حائل ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیاوی معلومات اور دنیوی زندگی کو فروغ دینے کی کوششوں کے یہ عقیدہ موافق نہیں ہے اور دراصل ایک طویل مدت تک یورپ کی ذہانت حیات انسانی کے متعلق اس منحوس تصور سے دبی رہی [۳۳]

---

[۳۱] ایضاً ص ۲۲

[۳۲] ایضاً ص ۲۴

[۳۳] ایضاً ص ۳۵

موصوف موجودہ مغربی تمدن کے بے دین اور خدا بیزار ہونے کے دو بنیادی اسباب کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "پہلا سبب تو رومن تہذیب کا ورثہ ہے جو انسانی زندگی اور اس کی اندرونی قدروں کے متعلق قطعاً مادیت کا ہے۔ اور دوسرا سبب مسیحت کی دنیا کی تحقیر اور انسان کی قدرتی خواہشوں اور جائز کوششوں کو دبانے کے خلاف انسانی فطرت کی بغاوت ہے"۔[۳۴]

موصوف مسلمانوں کی موجودہ پس ماندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ جہاں تک سائنسی تحقیق کا تعلق ہے ہماری مدت العمر کی غفلت اور لاپروائی نے ہمیں بالکل یورپ کے پیش کئے ہوئے علوم کا دست نگر بنا دیا ہے۔ اگر ہم اسلام کے اصول پر ہمیشہ قائم رہے ہوتے جو ہر مسلمان پر علم حاصل کرنے اور تحقیق کرنے کا فریضہ عائد کرتا ہے تو آج ہمیں جدید علوم کے لئے یورپ کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہ ہوتی، جیسے کسی صحرا میں کوئی پیاسا افق کی طرف سراب کو دیکھتا ہے لیکن چونکہ مسلمانوں نے مدتوں تک خود اپنے امکانات سے غفلت برتی اس لئے وہ جہالت اور مادی افلاس میں مبتلا ہو گئے اور یورپ نے آگے کی طرف لمبا قدم بڑھا دیا۔ اس خلیج کو پُر ہونے میں مدتیں لگ جائیں گی۔ اس وقت تک قدرتاً ہمیں جدید علوم کو یورپ کے تعلیمی وسیلے سے حاصل کرنا ہوگا۔ لیکن اس کا مطلب اتنا ہی ہے کہ ہمیں صرف سائنسی مواد اور طریقے لینے ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں"۔[۳۵]

پھر وہ اسلام کی تہذیبی برتری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۳۴؎ ایضاً ص، ۳۹

۳۵؎ ایضاً ص ۶۵

"ہمیں پختہ یقین ہے اور مغرب کے حالیہ واقعات سے اس کی توثیق ہوتی ہے کہ اسلامی اخلاقیات، اس کا سماجی اور شخصی اخلاق کا تصور، اس کا انصاف اور اس کی حرّیت پسندی اس کے مقابلے کے یوروپی تہذیب کے تصورات سے بہت زیادہ ارفع اور بہت زیادہ مکمل ہیں۔ اسلام نے نسلی امتیاز کو ختم کر دیا۔ اور انسانی مساوات و مواخات کا راستہ صاف کر دیا لیکن یوروپی تہذیب اب تک نسلی اور قومی عداوتوں کے تنگ دائرے کے باہر نظر ڈالنے سے قاصر ہے۔ اسلام نے کبھی اپنے سماج میں طبقاتی امتیازات اور طبقاتی جنگ کو روا نہیں رکھا۔ لیکن یورپ کی ساری تاریخ یونان اور روما کے زمانے سے لے کر آج تک طبقاتی کش مکش اور سماجی نفرت سے بھری پڑی ہے۔"[۳۶]

آگے وہ موجودہ دَور میں اسلامی نظامِ حیات کے احیاء کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ ہمیں غیروں کی تہذیب سے کچھ مستعار لینے یا ان میں جذب ہونے کے بجائے نہایت درجہ خود اعتمادی کے ساتھ دیگر تہذیبوں (یا تمدنوں) کے اثرات کو — جو ہماری تہذیب سے متصادم ہوں — ہماری تہذیب کے سانچے میں ڈھال لینا چاہیئے، اس طور پر کہ ہمارا اپنے ماضی سے رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔

"اسلام کے احیاء کا مقصد حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کو تمام اصلاحی تدابیر سے پہلے خود اپنے مذہب کے بارے میں معذرت خواہانہ رویّہ قطعاً ترک کر دینا چاہیئے۔ مسلمان کو اپنا سر بلند کر کے رہنا چاہیئے۔ اور اسے یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ دنیا میں سب سے الگ اور ممتاز ہے.... اپنی تہذیب کو مٹائے بغیر یہ ممکن ہے کہ ہم ہمیشہ کسی اجنبی تہذیب سے آنے والے جدید مثبت اثرات کو قبول کریں۔ اس قسم کی بہترین مثال یورپ

---

[۳۶] ایضاً ص ۶۹

کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ اس میں ہم نے دیکھ لیا کہ کس مستعدی کے ساتھ علوم اور حصول علم کے طریقوں میں عرب کا اثر قبول کر لیا گیا۔ لیکن اس نے کبھی عرب تہذیب کی اسپرٹ اور ظاہری شکل وصورت کی نقل نہیں کی۔ اور نہ ہی اپنی ذہنی اور جمالیاتی آزادی کو قربان کیا۔ اس نے عرب کے اثرات کو خود ہی اپنی زمین پر کھاد کے طور پر استعمال کیا، بالکل جیسے عربوں نے اپنے وقت میں یونانی اثرات سے کام لیا تھا۔ دونوں صورت میں ایک خود ان کی ملکی تہذیب کی طاقتور اور نئی تشکیل ظہور میں آئی جو خود اعتمادی اور افتخار سے معمور تھی۔ کوئی تہذیب جو اس افتخار کو ترک کر دے اور اپنے ماضی سے رشتہ توڑ لے نہ فروغ پا سکتی ہے اور نہ ہی زندہ رہ سکتی ہے[۳۷]

کتاب کے خاتمے میں وہ تحریر کرتے ہیں:

"تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی تمدن اور تہذیبیں (جانداروں کی طرح) نامیاتی اجسام ہیں۔ جو پیدا ہوتی ہیں، جوان ہوتی ہیں اور بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ تو کیا اسلام کی بھی یہی صورت ہے؟ پہلی سرسری نظر میں تو ایسا ہی معلوم ہوگا۔ مگر اسلام محض دیگر تہذیبوں کی طرح ایک تہذیب نہیں ہے بلکہ ایک خدائے برتر و اعلیٰ کا دیا ہوا قانون ہے، جس کی پابندی نوع انسان کو ہر جگہ اور ہر زمانے میں لازم ہے۔"[۳۸]

اسلامی تمدن کے عناصر

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اسلامی تمدن یا اس کی تہذیبی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے نیز انسان کی عقلیت و نفسیت اور اس کے اخلاق و

---

۳۷ ایضاً ص ۳، ۴۔

۳۸ ایضاً ص ۱۰۳-۱۰۴ (ملخص)

اجتماع پر پڑنے والے الہامی تمدّن کے انقلاب انگیز اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"سب سے پہلے وہ اس عالم کے متعلق یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ نہ کوئی بے بادشاہ کی سلطنت ہے، نہ چند بادشاہوں کی مشترک سلطنت ہے۔ بلکہ اس کا ایک ہی مالک ہے جو اس کا خالق و صانع بھی ہے اور اس کا منتظم و حاکم بھی۔ خلقت بھی اُس کی ہے، ملک بھی اُس کا ہے اور حکم بھی اُسی کا۔ (اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ) اس عالم میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کی قدرت سے ہوتا ہے۔ حقیقی علت اس کا ارادہ اور اس کی قدرت ہے۔ یہ ساری کائنات تکوینی طور پر (جس کا تعلق عالم کے نظم ونسق سے ہے) اس کے سامنے سرافگندہ اور اس کے احکام کی مطیع ہے (وَلَهُ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) پس وہ مخلوقات جو صاحب ارادہ و اختیار ہیں، ان کو بھی اس کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے۔ (اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ)

اس کا سب سے پہلا ذہنی اثر یہ پڑتا ہے کہ سارے عالم میں ایک مرکزیت و تنظیم (بظاہر) منتشر اجزائے عالم میں ایک ربط، اور قانون میں ایک وحدت نظر آنے لگتی ہے اور انسان زندگی کی مکمل توجیہہ کر سکتا ہے، اور اس کا فکر اور روّیہ اس کائنات کے بارے میں حکمت و بصیرت پر مبنی ہوتا ہے۔

اخلاق وعمل پر اس کا اثر اس سے زیادہ اہم اور انقلاب انگیز ہے۔ اس کے دل ودماغ سے اپنی خود مختاری اور اللہ کی اس سلطنت میں حکومت خود اختیاری کا جذبہ اور خیال (جو شرور و فسادات، نزاع وتصادم کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے) نکل جاتا ہے۔ وہ اس زمین کے باشندوں کو دولت کے خزانوں کو اور خود اپنی طاقتوں اور اپنے جسم واعضاء کو اپنی ملک نہیں سمجھتا ہے۔ بلکہ خدا کی امانت سمجھتا ہے۔ اور اس کی اجازت اور اس کے قانون کے خلاف ان کے استعمال اور ان میں تصرف کرنے سے ڈرتا ہے۔ وہ اپنے سے ایک بلند وبالا

طاقت کے مقابلے میں اپنے کو محکوم اور ایک بڑی عدالت کے سامنے اپنے کو جواب دہ سمجھتا ہے۔"[۳۸]

"عقلی تمدن و فلسفے کے دور میں اکثر قوم اور سوسائٹی پر سوفسطائیت طاری ہو جاتی ہے۔ حقائق اشیاء کا اور اخلاق و صفات کے باہمی فرق کا انکار کیا جانے لگتا ہے۔ خیر و شر کے قدیم معیاروں اور ان کی تعریفوں میں شک کیا جانے لگتا ہے۔ اخلاق و صفات، حسن و قبح محض اعتباری اور نسبی شے سمجھی جانے لگتی ہے، جو زمان و مکان کے اختلاف سے بدلتی رہتی ہے۔ یہ ذہنی کیفیت سخت اخلاقی انحلال اور اجتماعی اختلال پیدا کر دیتی ہے۔ اور جب کسی قوم کی زندگی میں یہ دور آجاتا ہے تو پھر اس کو تباہی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ یونان قدیم میں اس کی قومی بربادی کے وقت یہی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ایران قدیم میں اس نے اباحیت (ہر چیز کو جائز سمجھنا) کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور پورا نظامِ تمدن و معاشرت زیر و زبر کر دیا۔ روم کے مورخین اسی کا شکوہ کرتے ہیں۔ اور آج یورپ میں بعینہ یہی کیفیت موجود ہے۔ اور وہاں کے مفکرین اور اصلاح پسند اشخاص عرصے سے خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ مگر اس کا علاج کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس کی روک تھام صرف نبوت کی تعلیمات اور محفوظ مذاہب کر سکتے ہیں، جو اخلاق کا فیصلہ اور حسن و قبح کا معیار عقل و تجربے پر نہیں چھوڑتے بلکہ اُن کو خود طے کر دیتے ہیں، اور ان کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔"[۳۹]

---

۳۸ مذہب و تمدن، ص ۹۲ — ۹۴، مجلس نشریاتِ اسلام کراچی، ۱۹۸۰ء

۳۹ ایضاً ص ۱۰۹

خیر اُمت کا سب سے بڑا وصف اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ

یہ ہیں اس مسئلے کے کچھ مظاہر اور اس کی جھلکیاں اور یہ ہے اُس کے نشیب و فراز کا ایک جائزہ۔ ملّتِ اسلامیہ کی تشکیلِ نَو اور تعمیرِ جدید اس وقت زندگی اور موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم تر اصلاحِ عالم کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا اب ہم کو "کرو یا مرو"[1] کے مطابق یا تو کچھ کر کے دکھانا ہے یا پھر کسی دوسری قوم کے لئے راستہ خالی کر دینا ہے (وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ) گویا ہم میدانِ خلافت سے فرار ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہم اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔ اور ہمارا یہ منصب نہیں ہے کہ ہم اس قدر سہل انگاری سے کام لیتے ہوئے دین کے تقاضوں کو پس پُشت ڈال دیں اور اس کے فرائض کی ادائیگی سے غافل ہو جائیں۔ یہ گویا ہماری ملّی موت کے مترادف تو ہو گا ہی مگر خدا کے نزدیک بھی ہمارا یہ فعل ناقابلِ معافی جُرم ہو گا۔ لہٰذا دین و عقل کا تقاضا ہے کہ ہم زندہ اور بہادر قوموں کی طرح اس میدان میں آگے بڑھیں۔ خلافتِ ارض کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے۔ اس میں بہت سے خطرات ہیں اور بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ مگر یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس میں ذرا بھی غفلت نہیں برتی جا سکتی۔ اقوامِ عالم میں اس وقت اُمتِ مُسلمہ ہی وہ واحد ملّت ہے جو خلافتِ ارض کی حامل ہے۔ لہٰذا وہی موجودہ گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں اُمید اور روشنی کی کرن دکھائی پڑتی ہے۔ اور اسی کی تشکیلِ نو اور تنظیمِ نَو پر اقوامِ عالم کی صلاح و فلاح کا مدار ہے۔

---

[1] انگریزی کی ایک ضرب المثل do or die

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○
اور تم میں ایک ایسی جماعت (ضرور) ہونی چاہیئے جو (لوگوں کو) خیر کی طرف بلائے اور (انہیں) معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے ۔ اور یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔ (آل عمران ۱۰۴)

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ : تم بہترین امت ہو جو تمام لوگوں کے لئے برپا کی گئی ہے۔ (تمہارا منصب یہ ہے کہ) تم انہیں معروف کا حکم کرتے رہو اور منکر سے روکتے رہو۔ (آل عمران : ۱۱۰)

ان دونوں آیتوں کا مفہوم الگ الگ ہے۔ پہلی آیت ملت اسلامیہ کے ساتھ مخصوص ہے جب کی دوسری آیت پوری نوع انسانی سے متعلق ہے۔ اس لحاظ سے پہلی آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت ضرور ہونی ہونی چاہیئے جو ہر قسم کے دینی و شرعی معاملات میں تمہاری رہنمائی کرے[۳۱]۔ اور تمہارے تمام مِلّی و اجتماعی مسائل حل کرے۔ اس مخصوص جماعت کی حیثیت پوری مِلّت اسلامیہ کے درمیان ایک نگران اعلیٰ اور شاہد کی سی ہو گی جیسا کہ "ولتکن منکم" کے الفاظ تقاضہ کر رہے ہیں۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ اس کا عقلی و منطقی تقاضہ ہے کہ ایسی جماعت کو دینی و دنیوی تمام مسائل پر عبور ہونا چاہیئے تاکہ وہ مِلّت کی صحیح صحیح رہنمائی کر سکے۔ اس کی مزید تفصیل اگلے باب میں آئے گی۔

---

[۳۱] ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ "خیر سے مراد اتباع قرآن و سنّت ہے۔" (تفسیر ابن کثیرؒ ۱/۳۹۰) اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں کہ "خیر کی اس سے جامع اور مانع تعریف نہیں ہوسکتی۔ پورا دین شریعت اس میں آگیا"۔ (تفسیر معارف القرآن، ۲/۱۴۰)

اور دوسری آیت کریمہ کا تعلق خصوصیت کے ساتھ نوع انسانی سے ہے جیساکہ اس کے الفاظ اور اس کے سیاق وسباق سے ظاہر ہو رہا ہے[۴۲] اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے ہی یہ فیصلہ کردیا تھا کہ عالم انسانی کا "خیر" صرف دُنیائے اسلام ہی سے وابستہ ہوسکتا ہے اور وہی امت خیر ہونے کی حیثیت سے نوع انسانی کی صلاح و فلاح کی ذمہ دار ہے کہ دعوت وتبلیغ کے صحیح اصولوں سے کام لے کر اور ہر ممکن طریقے اپنا کر اپنا یہ فریضہ بحسن و خوبی انجام دے۔ جیساکہ ایک دوسری جگہ مذکور ہے:

اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت ودانائی اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاؤ اور ان کے ساتھ بہترین طریقے سے مباحثہ کرو۔ (نحل: ۱۲۵)

یہ بات ذہن نشین رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی امت مسلمہ کی دائمی صفت ہوگی۔ یہ کوئی وقتی اور موقت فریضہ نہیں ہے۔ جیساکہ "یامرون" اور "ینھون" کے الفاظ ظاہر کر رہے ہیں۔ یہاں پر یہ نہیں کہا جارہا ہے کہ تم یہ کام کرو۔ بلکہ یہ کہا جارہا ہے کہ خیر امت ہونے کی صفت ہی یہ ہے کہ وہ یہ سب کام کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا آج ہم پر جو بھی بلائیں اور مصیبتیں نازل ہوئی ہیں وہ اپنے اس وصف اور فریضے کو ترک

---

[۴۲] حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک قرآن کریم کے ارشادات وخطابات خاص خاص احوال وکوائف کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہوتے بلکہ ان کا خطاب عام ہوتا ہے، سوائے چند مقامات کے، لہٰذا ان خطابات کو وسیع احوال وکوائف پر منطبق کرنا چاہیئے۔ (مفہوم وملخص) شاہ صاحب کے خاص الفاظ یہ ہیں: والأخری أن لیعلمان أکثر أسباب النزول لا مدخل لھا فی فھم معانی الآیات، اللھم الا شئ قلیل من القصص۔

(الفوز الکبیر ص ۲۵، المکتبۃ السلفیہ، لاہور ۱۳۷۱ھ)

کرنے کی بدولت ہیں۔

معروف کے لغوی معنی ہیں " جانا پہچانا "، اور منکر کے لغوی معنی ہیں " غیر جانا پہچانا "۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں " معروف ہر وہ فعل ہے جس کو عقل یا شرع بہتر سمجھیں اور منکر وہ ہے جس کو یہ دونوں برا جانیں "۔[۴۳]

مفسرین کی تصریح کے مطابق معروف میں وہ تمام احکام آجاتے ہیں جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دے رکھا ہے۔ اور منکر میں وہ تمام " منہیات " داخل ہو جاتے ہیں جن سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس طرح معروف و منکر میں پورا دین اور پوری شریعت آجاتی ہے۔ اور تمدنی و اجتماعی امور و معاملات بھی دین و شریعت سے الگ نہیں ہیں بلکہ انہی کے ضمیمے اور لاحقے ہیں، جو دین و شریعت کے دائرے میں اور ان ہی کی حفاظت کی خاطر ہیں۔ اس طرح اسلام میں ہر چیز کے حدود و ضوابط واضح ہیں اور ہر چیز کا ایک مخصوص مقام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پورے دین اسلام کی روح معروف اور منکر میں سمیٹ دی گئی ہے اور سارا دین ان ہی دو امور کے گرد گھومتا نظر آرہا ہے۔ جس نے معروف و منکر کی صحیح حقیقت کو سمجھ لیا اس نے گویا کہ دین الٰہی کے رمز کو پا لیا۔ ہماری پوری زندگی ۔ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی ۔ معروف کے مطابق ڈھلتے رہنا چاہیئے اور اس میں خیر کا پہلو نمایاں ہونا چاہیئے۔ اس میں دین و شریعت، تہذیب و ثقافت اور تمدن و اجتماع سب کچھ آجاتے ہیں۔

اور جو تمدن معروف کے دائرے سے ہٹ کر منکر کے حدود میں داخل ہو جائے تو وہ مضر اور نقصان دہ ہوگا اور اس کا روکا جانا ضروری ہوگا۔ جصاص رازی فرماتے ہیں کہ دنیا میں جتنے بھی فتنے فسادات اور شرور و آفات پیدا ہوتے ہیں وہ سب منکر ہی کے باعث ہوتے ہیں۔[۴۴]

---

[۴۳] المفردات فی غریب القرآن، ص ۳۳۱

[۴۴] احکام القرآن، ۲/۳۴ (مفہوم و ماخوذ)

موجودہ دور میں معروف و منکر کی صحیح ادائیگی ہی کے باعث اسلامی اور انسانی معاشروں کی اصلاح عمل میں آسکتی ہے۔ اور اس سلسلے میں حکمت و دانش اور دعوت و تبلیغ کے تمام اصولوں کو کام میں لانا اور انسانی نفسیات کے مطابق ترغیب و ترہیب (رغبت اور خوف دلانے) کے تمام طریقوں کو آزمانا ضروری ہے۔ قرآن اور حدیث کے مطالعے سے یہ حقیقت ہم پر بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی نفسیات کے مطابق دین و شریعت میں ترغیب و ترہیب یا انذار و تبشیر کے دونوں طریقوں سے خوب کام لیا گیا ہے۔ لہذا ہمارے لئے بھی ضروری ہے کہ ہم دعوت و تبلیغ کی راہ میں ان اصولوں کو رہنما بنائیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو "معروف" جو کہ اوامر دین کا مجموعہ ہے پورے کا پورا ترغیب ہے۔ اور "منکر" جو کہ نواہی کے مجموعے کا نام ہے پورے کا پورا ترہیب ہے۔ اس طرح پورا دین و شریعت اور اس کا سارا تمدن و اجتماع ایک حیثیت سے معروف و منکر کے گرد گھوم رہا ہے تو دوسری حیثیت سے وہ ترغیب و ترہیب کے گرد گردش کر رہا ہے۔ انسان فطرتاً نفع کی طرف لپکتا اور نقصان سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہذا پورا اسلام انسان کی اس بنیادی فطرت کے مطابق محض دو لفظوں کے درمیان گھوم رہا ہے۔ یہ فطرت و شریعت کی مکمل ہم آہنگی کی بھی دلیل ہے۔ نیز اس بات کی بھی ناقابل تردید شہادت ہے کہ شریعت اسلامی کا مُرتّب و مُدوِّن اور قانون ساز اصلاً وہی ذات عالی ہے جس نے خود انسان کی تخلیق کی ہے، ورنہ قانون شریعت انسان کی فطرت کے مطابق ہرگز نہ ہوتا اور ہر دور میں اس کی قامت پر پورا نہ اُترتا۔

"حقوق العباد" کے سلسلے میں سوسائٹی کے افراد کے درمیان بعض اوقات جو زیادتیاں ہوتی ہیں ان کی روک تھام کے لئے کبھی ترغیب سے اور کبھی ترہیب سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ یعنی کبھی سمجھا بجھا کر اور راضی کر کے

اور کبھی ڈرا دھمکا کر۔ مگر کبھی کبھی امن قائم کرنے اور معاملے پر قابو پانے کے لئے قوت اور زور آزمائی کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ کیونکہ بعض جھگڑالو مزاج آدمی صلح صفائی کو آسانی سے تسلیم نہیں کرتے اور مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہی اصول بین الاقوامی حالات و معاملات میں بھی پیش آتا رہتا ہے۔ لہٰذا ملت اسلامیہ کے لئے۔ جس کا فریضہ منکرات کی روک تھام ہے — ضروری ہے کہ ایسے معاملات سے نمٹنے اور دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے قوت و شوکت حاصل کرے۔

ایک دوسری حیثیت سے غور فرمایئے تو موجودہ دور کی یہ سب سے بڑی نفسیاتی حقیقت بخوبی ظاہر ہو جائے گی کہ دنیا کی قومیں مادی علوم میں جس کو اپنا "امام" تسلیم کر لیتی ہیں وہ ذہنی و نفسیاتی اعتبار سے اپنے دیگر تمام تہذیبی و تمدنی معاملات میں بھی اُسی کو "امامت" کے منصب پر فائز سمجھنے لگ جاتی ہیں۔ جیسا کہ آج علمائے اسلام کے مقابلے میں علمی دُنیا پر مستشرقین کی دھاک بیٹھی ہوئی دکھاتی دیتی ہے اور ان "اولوا الالباب" کے "اقوال" کے مقابلے میں علمائے اسلام کی "باتوں" کو کوئی نہیں سنتا اور ان پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ یا زیادہ واضح الفاظ میں ان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ گویا کہ وہ بالکل بے وقعت اور بے وقار ہو چکے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے نزدیک اصل معیار مادی شان و شوکت کا ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے کسی چیز کے ظاہری پہلو کو دیکھتے ہیں۔ اگر ظاہر خراب ہے تو سمجھتے ہیں کہ اس کا باطن بھی خراب ہوگا۔

جو حال موجودہ ترقی یافتہ قوموں کا آج ہے وہی حال قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کا بھی رہ چکا ہے جب کہ اہل اسلام اپنے باطن کے ساتھ ساتھ ظاہری حیثیت سے بھی ممتاز تھے تو اس وقت دوسری قومیں ان کے "اقوال" کو سند کا درجہ دیتی تھیں۔ اور ان کے اقوال سے استدلال کرنے میں

فخر محسوس کرتی تھیں۔ یہ مقام جب تک پھر دوبارہ پیدا نہیں ہوتا اُمت مسلمہ صحیح معنی میں کوئی معزز مقام حاصل نہیں کر سکتی۔

غرض جب تک موجودہ صورتِ حال معکوس نہیں ہوتی ہم اقوامِ عالم کو معروف اور منکر کے اسباق ٹھیک ٹھیک نہیں پڑھا سکتے۔ اور معروف و منکر ہر دَور اور ہر معاشرے میں مختلف نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ موجودہ دور کے منکرات میں جوا، لاٹری، سٹہ بازی، سودی کاروبار، فحش فلمیں اور ٹیلی وژن[۴۵] فحش لٹریچر، ننگے کلب اور مختلف قسم کے انسانیت سوز اور مخربِ اخلاق رجحانات نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر دورِ جدید کا سب سے بڑا منکر اس کے مہلک اور تباہ کن سائنسی ایجادات اور خطرناک قسم کے تمدنی و اجتماعی رُجحانات ہیں جن میں خلائیات اور اجرام سماوی کی تسخیر بھی داخل ہے۔ یہ بے جا اسراف و تبذیر کے ذیل میں آتا ہے، جو محض چند جنگ باز انسانوں کی باہمی قومی و نسلی رقابت و کش مکش اور معرکہ آرائیوں کے نتیجے میں خلافتِ ارض کے تقاضوں سے گریز و فرار کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہ تمام خرابیاں موجودہ خودکشی کرتی ہوئی تہذیب کے تحفے اور مادیت و لادینیت اور خدا فراموشی کے عالمگیر نتائج ہیں۔

ان ہلاکت خیزیوں سے عالمِ انسانی کو بچانا بہت ضروری ہے اور یہ کارنامہ صرف عالمِ اسلام ہی انجام دے سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اتنا طاقت ور ہو جائے کہ منشائے الٰہی کو بوقت ضرورت بزور و قوت نافذ کر سکے۔

" تمکین " کے لغوی مفہوم اور اس کے تقاضے پر غور کیجیے تو معلوم

---

[۴۵] فلم اور ٹیلی وژن بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں ہیں، مگر ان کا استعمال بُرا ہے۔ یہی حال ریڈیو وغیرہ کا بھی ہے۔ اگر ان چیزوں کو گانے بجانے اور اخلاق سوز محرکات و رُجحانات سے پاک کر کے تعلیمی اور اصلاحی مقاصد میں استعمال کیا جائے تو اس سے اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔ تفریح کے نام پر انسانیت سوزی اور تخریبِ اخلاق باعثِ تعجب ہے۔

ہو گا کہ "روکنا یا باز رکھنا" محض باتوں اور زبانی جمع خرچ ہی کا نہیں بلکہ حسب ضرورت کچھ زور اور قوت کا بھی مقتضی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث شریف میں اس آیت کریمہ کی تشریح و تفصیل اس طرح ملتی ہے:

من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ، فان لم یکن یستطع فبلسانہ، فان لم یستطع فبقلبہ، وذلک أضعف الایمان: تم میں سے جو کوئی کسی بُری بات کو دیکھے تو چاہیئے کہ وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اگر اس کو اس کی طاقت نہ ہو تو پھر (کم از کم) زبان ہی سے اس فعل کی مذمت کرے۔ اور اگر (مخالفانہ احوال کی وجہ سے) اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پھر دل میں اس چیز کو بُرا جانے۔ اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔[۴۶]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایمان کا کامل ترین درجہ یا کمال ایمان امر اول کی ادائیگی میں ہے اور یہ ہر مسلمان کا آئیڈیل ہونا چاہیئے کہ معاشرے میں اس کی حیثیت ایک سپاہی یا خدائی فوج دار کی سی ہو۔ جصاص رازی نہی عن المنکر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ اور اس قسم کی دیگر آیتوں کا تقاضہ ہے کہ منکرات کی روک تھام میں جہاں تک ممکن ہو سکے ان کو اپنے ہاتھ (قوت و طاقت) سے بدل دینا چاہیئے"۔ اور اس کی تائید میں مذکورہ بالا حدیث پیش کی ہے۔[۴۷]

یہ اصول جس طرح ہماری قومی و ملی اور معاشرتی و اجتماعی زندگی میں صحیح ہے۔ اسی طرح وہ ہماری سیاسی اور بین الاقوامی زندگی میں بھی صحیح ہونا چاہیئے۔

اس حکم کی حکمت اور اس کی عقلی خوبیوں پر غور کیجئے کہ اس نے کس طرح

---

[۴۶] صحیح مسلم، کتاب الایمان، ۶۹/۱ دار الافتاء ریاض

[۴۷] احکام القرآن، ۳۰/۲، دار الکتاب العربی، بیروت

منکرات کی روک تھام کے لئے مختلف مدارج و مراتب قائم کر کے امت کے ہر ہر فرد کے ذمے اس فریضے کی ادائیگی کو ضروری قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تین مدارج میں قوی سے قوی اور ضعیف سے ضعیف تمام افراد داخل و شامل ہو جاتے ہیں اور کسی کے ذمہ سے یہ فرض یا عذر ساقط نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی صالح اور پاکیزہ تمدن و عمران اور ان کے صحت بخش رجحانات کے لئے ایک اصل الاصول یا بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جب تک اس اصول پر عمل نہ کیا جائے معاشرے کا سدھار نہیں ہو سکتا۔ اس عظیم اصول کی وضاحت ایک دوسرے اسلوب میں اس طرح کی گئی ہے۔

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ: تم میں سے ہر شخص ذمہ دار اور ہر شخص سے اس کی ذمہ داری کے متعلق پوچھا جائے گا۔

یعنی جو بھی آدمی جس شعبے یا حلقے میں رہتا ہو اس پر اس کی حیثیت کے مطابق معروف کی ترویج و اشاعت اور منکر کی روک تھام کی ذمہ داریاں عائد رہتی ہیں، جن کو اگر وہ ادا نہ کرے تو وہ گنہگار ہو گا۔ یہ اصول پوری اجتماعی زندگی میں لاگو ہونا چاہیئے۔ اور اس سے حکومت و سیاست بھی الگ نہیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو قوم ان سنہرے اصولوں پر صحیح معنی میں عامل و کاربند ہو جائے اس کے لئے محکمۂ پولیس کی حیثیت ایک عضو معطل کی سی رہے گی۔

"نہی عن المنکر" کا تعلق خصوصیت کے ساتھ "ظلم" سے ہے[۴۸]۔ یعنی جہاں کہیں کوئی ظلم و زیادتی ہو رہی ہو تو ضروری ہو جاتا ہے کہ حتی المقدور اس کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ دنیا میں کوئی تمدن، کوئی عمران، کوئی اجتماع پنپ نہیں سکتا اور یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ اگرچہ وہ بظاہر کتنا ہی خوشنما اور پائیدار

---

[۴۸] جیسا کہ مختلف حدیثوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے۔

کیوں نہ نظر آرہا ہو۔ سنت الہٰی" کے مطابق جب عذاب الہٰی کا کوئی جھونکا آتا ہے تو پھر پائیدار سے پائیدار تمدن و عمران کی جڑیں اکھڑ جاتی ہیں اور اس کے تنکے بکھر جاتے ہیں۔ اور ایسے موقع پر کسی عظیم سے عظیم تر تمدن کی بھی حیثیت شاخ نازک پر ایک آشیانے سے زیادہ نہیں رہتی۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے[۴۹] کہ جو قوم "ظالم" بن جاتی ہے وہ جلد یا بدیر تہس نہس کر دی جاتی ہے اور عذاب الہٰی بالکل دبے پاؤں آتا ہے۔ جس کا کسی کو احساس تک نہیں رہتا اور اس کے کوئی آثار بھی نہیں رہتے، بظاہر ہر طرح کا اطمینان رہتا ہے[۵۰]

یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں تاکید کی گئی ہے کہ سوسائٹی میں ظلم و عدوان کو ہر حال میں رد کیا جائے اور ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اس فعل سے باز رکھا جائے۔ ورنہ مسلسل ظلم و زیادتیوں کی بنا پر جب پاپ کا گھڑا بھر جائے گا تو اس کے نتیجے میں جو عمومی تباہی آئے گی اس کی لپیٹ میں اچھے بُرے سب ہی آجائیں گے اور کوئی بھی باقی نہیں بچے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنی زمین میں ظلم و عدوان سخت ناپسند ہے اور وہ کسی بھی طرح ظلم کو اپنے بندوں کے حق میں پسند نہیں کرتا۔ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝ اور اللہ بندوں کے لئے کسی طرح کا ظلم پسند نہیں کرتا۔ (مومن: ۳۱)

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ظلم سے بچو۔ کیونکہ ظلم قیامت کے دن تاریکیوں (کا باعث) ہوگا۔ اور اور حریصانہ بُخل (شُحّ) سے بچو۔ یہی حریصانہ بُخل یعنی خود غرضی) تم سے پہلے والوں کو بھی ہلاک کر چکی ہے، جس نے ان کو لوگوں کے قتل و خوں ریزی پر

---

[۴۹] اس موقع پر علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں "الظلم مؤذن بخراب العمران" کے عنوان سے تاریخ کا جو فلسفہ سمجھایا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

[۵۰] جیسا کہ قرآن مجید میں مختلف قوموں کی تباہی و بربادی کے ضمن میں مذکور ہے۔

اُبھارا تو انہوں نے لوگوں کی عزت و آبرو سے کھیلا۔[۵۱]

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا: قیامت کے دن حق والوں کو حق دلایا جائے گا یہاں تک کہ بے سینگ کی بکری کو سینگ والی بکری سے بھی حق دلایا جائے گا۔[۵۲]

یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں ظلم کو نہ روکنا اور ظالم کا ہاتھ نہ پکڑنا کسی قوم کی اجتماعی تباہی و بربادی کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

والذی نفسی بیدہ لتأمرن بالمعروف، ولتنھون عن المنکر او لیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عقاباً منہ، ثم تدعونہ فلا یستجاب لکم:

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یا تو تم معروف کا حکم کرتے رہو گے اور منکر سے روکتے رہو گے یا پھر قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر کوئی عذاب مسلط کر دے۔ پھر تم دعا کرو گے تو تمہاری دعائیں قبول نہیں کی جائیں گی۔[۵۳]

ایک دوسری حدیث میں ہے: جب لوگ کسی ظالم کو دیکھیں مگر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ سب کو کسی عذاب میں مبتلا کر دے۔[۵۴]

یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جہاد کی اصل غرض و غایت اور اس کی اسپرٹ کو بھی ظاہر کر رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب "معروف" کا وجود خطرے میں پڑ جائے اور "منکرات" کا ظہور اور ان کا دور دورہ ہو جائے تو پھر جہاد فرض و واجب ہو جاتا ہے اور ایسے مواقع پر جہاد نہ کرنا عند اللہ جرم اور گناہ کی بات متصور ہو گی۔ پچھلے باب میں جہاد

---

[۵۱] مسلم، باب تحریم الظلم، ۴/۱۹۹۶، مطبوعہ ریاض

[۵۲] ایضاً، ۴/۱۹۹۷

[۵۳] ترمذی، باب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر

[۵۴] ابوداؤد، باب الامر والنھی، ۴/۵۱۰

کے موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا لب لباب اور حاصل بھی یہی ہے۔
اور جیسا کہ تحریر کیا جا چکا جہاد فرقِ مراتب کے اعتبار سے ہر مسلمان پر فرض ہے، جیسے قلبی جہاد، لسانی جہاد، مالی جہاد وغیرہ۔ اور جہاد بالسیف کا نمبر تو سب سے آخر میں آتا ہے۔ لہٰذا منکرات و فواحش کی روک تھام حسب استطاعت ہر مسلمان کے ذمے ضروری ہے۔ اور اس کے لئے ہم کو سربکف ہو جانا چاہیئے۔
اسی مقصد کے لئے انبیائے کرام کی بعثت ہوئی تھی اور یہی دین اسلام کا خلاصہ اور اس کا جوہر ہے۔

آج دنیا میں قومیت، نسلیت اور وطنیت وغیرہ کی خاطر جھگڑے فسادات ہو رہے ہیں (جن کی حیثیت اسلام کے نزدیک معبودان باطل کی ہے) اور مختلف قومیں اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی خاطر لڑ رہی ہیں (جن میں دوسری قوموں کے جائز انسانی حقوق کا بھی پاس و لحاظ نہیں کرتیں) اور ہر ایک اپنے اچھے یا برے نظریات کی مدافعت میں لگا ہوا ہے۔
تو ایسے میں اگر کوئی قوم یا ملت ایسی برپا ہو جو محض حق کی خاطر اور ظلم و ستم کو ختم کرنے اور عدل و انصاف کو رائج کرنے کی خاطر جہاد کرنا چاہتی ہو اور دنیا سے فتنے فسادات اور منکرات و فواحش کا خاتمہ کرنا چاہتی ہو تو یہ کوشش کسی بھی حیثیت سے اور کسی بھی منطق سے غلط اور غیر معقول نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ضروری ہے کہ تمام حق پسند قومیں اس سلسلے میں حق کا ساتھ دے کر اپنی معقولیت کا ثبوت پیش کریں۔

یہ ہے خلافتِ ارض کا مقصد المقاصد یا آخری غایت جس کی خاطر انسان کو زمین پر خلیفہ بنایا گیا اور تاجِ خلافت اس کے سر پر رکھتے ہوئے اس کو علمِ اسمار سے نوازا گیا ہے اور اس وقت خلافتِ ارض دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے: اس کا مادّی حصہ غیروں کے پاس اور ان کے قبضے میں ہے۔ اور صرف اس کا

روحانی حصّہ اہلِ اسلام کے پاس ہے۔ جب تک یہ دونوں حصّے پھر سے یکجا نہیں ہو جاتے اسلام کی نشأۃ ثانیہ عمل میں نہیں آسکتی۔ اسی غرض کی خاطر انسان کو خلیفہ بنایا گیا اور اسی بناء پر اس کو علمِ اسماء عطا کیا گیا۔ (وعلم آدم الاسماء کلھا۔)

آٹھواں باب

اُمّتِ مُسلمہ کی ایک سُپریم کونسل کی تشکیل کی ضرورت

- فطرت و شریعت میں مشابہت
- علم فطرت قرآن کی نظر میں
- اولوالالباب کون ہیں ؟
- مطالعہٗ فطرت کی غرض و غایت
- مطالعہ فطرت اور خشیتِ الٰہی
- فطرت شریعت کی محافظ
- ایک مجلس اعلیٰ کی تشکیل کی ضرورت
- علم آدم اور فلسفۂ آدم

آٹھواں باب

اُمّتِ مُسلِمہ کی ایک مجلسِ اعلیٰ کی تشکیل کی ضرورت

فطرت و شریعت میں مشابہت

علم ایک مکمل وحدت ہے جس کے دو بازو ہیں: اس کا داہنا بازو شریعت ہے تو بایاں بازو فطرت (nature)۔ ان دونوں کے صحیح تعاون اور ہم نوائی ہی کی بدولت ایک دوسرے کا صحیح نشوونما ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں اس سلسلے میں مشہور فلسفی ہربرٹ اسپنسر وغیرہ کے نظریات بیان کئے جا چکے۔

علم ایک متغیر اور ارتقاء پذیر چیز ہے جو کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ اور اس حیثیت سے وہ قدیم و جدید کی تقسیم بھی قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ سورج کی ہر کرن اپنے جلو میں نئے معلومات اور نئے انکشافات ساتھ لاتی ہے۔ لہٰذا اگر اس کو قدیم و جدید کی اصطلاحوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر ڈوبنے والے سورج کے ساتھ ہی پورے علم کو قدیم کہنا پڑے گا، جس کے لئے شاید کوئی تیار نہ ہو۔

مگر علم کے ارتقاء پذیر ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم اس علم کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر ترک کر دیں۔ اور اس سے استفادہ کرنا ہی چھوڑ دیں۔ جیسا کہ پانچویں باب میں تفصیل سے عرض کیا جا چکا۔ تبدیلی عموماً جزئیات میں اور زیادہ تر نظری اُمور اور مفروضات میں ہوتی ہے، جو مظاہرِ کائنات اور ان کے نظاموں کے باہمی روابط کی توجیہہ و تعلیل یا ان کے درمیان کی کڑیوں کو باہمی طور پر ملانے کی

غرض سے علمائے فطرت اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ جس طرح کہ خود علمائے شریعت کسی شرعی یا فقہی مسئلے میں کسی نص قطعی کی عدم موجودگی کی وجہ سے مختلف قیاسی و استدلالی توجیہات اور عقلی تاویلات کا سہارا لیتے رہتے ہیں، جن میں اختلاف آراء اور ترمیم و اضافے کی خاصی گنجائش رہتی ہے، اگرچہ نصوص قطعیہ میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم و اضافے کی گنجائش نہ رہے۔ اس طرح ان دونوں علوم میں ــ اختلاف موضوع کے باوجود ــ بہت گہری مشابہت و مماثلت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ صحیفۂ فطرت سے جہاں پر ہمیں اس کے خالق و صانع کی صنعت و خلاقی اور اس کی کرشمہ سازیوں کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو نظام شریعت سے اُس کی مرضی و منشا اور نوع انسانی کے لئے اُس کے تجویز کردہ ضوابط زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ دونوں ہی اس کی صفات عالیہ و صفات کمالیہ اور خصوصیت کے ساتھ اس کے علم ازلی کے پَرتو اور عکس ہیں۔ لہٰذا ان دونوں میں مشابہت و مماثلت کا پایا جانا ضروری اور ناگزیر ہے۔ چونکہ خود علمائے اسلام کی تصریح کے مطابق اللہ تعالیٰ کی صفات بے پایاں اور بے نہایت ہیں اس لئے انسان اپنے رب کی کارگزاریوں یا اُس کی ربوبیت کی مکمل حقیقت کو کبھی نہیں پا سکتا۔ اور اسی اعتبار سے اس کا علم طبیعی و مظہری بھی کبھی کامل نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ علم کسی بھی طرح علم شریعت کے خلاف اور اس سے متصادم نہیں ہے۔

علم فطرت قرآن کی نظر میں

علم فطرت کی اہمیت اور اس کے قابلِ استدلال ہونے کے لئے محض اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن حکیم اس کو بھی "علم" میں شمار کرتا ہے اور اس علم کے حاملین کو "علما" کے معزز خطاب سے سرفراز کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علم کے ذریعہ ایک طرف خداوند کریم کی صنعت و خلاقی کا حال ظاہر ہوتا ہے اور اس کی ربوبیت کی حقیقت بے نقاب ہوتی ہے ــ جو اس کے

کاموں کے ذریعہ اس کی معرفت حاصل کرنے کا ایک اہم اور بہت بڑا ذریعہ ہے تو دوسری طرف کائنات اور نظام کائنات سے متعلق ہر نیا انکشاف اور ہر نیا راز سربستہ شریعت ہی کی ہمنوائی کرنے والا اور قرآن عظیم کے مضامین اور اُس کے بیانات ہی کی تصدیق و تائید کرنے والا ہے۔ نئے نئے انکشافات سے اس کی صداقت اور اس کا اعجاز اور زیادہ کُھل کر سامنے آجاتا ہے اور اس کے مبہم اشارات وکنایات اور مجازات واستعارات کی حقیقت اور زیادہ نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس طرح قرآن حکیم کی سائنٹفک نقطۂ نظر سے بہتر سے بہتر تفسیر ہوتی جائے گی۔

خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مطابقت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس باب میں اہل ایمان کے لئے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔ (عنکبوت : ۴۴)

واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم جس طرح دینی و شرعی اُمور سے متعلق "معلومات" کو علم سے تعبیر کرتا ہے اسی طرح وہ کائنات اور مظاہر کائنات سے متعلق معلومات کو بھی "علم" ہی کا نام دیتا ہے۔ چنانچہ بالترتیب ان دونوں "علوم" کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

دینی و شرعی اُمور سے متعلق ارشاد ہے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝

اگر یہ لوگ (اپنے کفر سے) باز آجائیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہو جائیں گے۔ اور ہم علم رکھنے والوں کے لئے (دینی) احکام خوب تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ (توبہ : ۱۱)

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّکَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

تمہارے پاس (ہمارا) علم آجانے کے بعد بھی اگر تم نے ان کے نفسانی خواہشات (وخیالات) کو اختیار کیا تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہو جائے گا۔ (البقرہ : ۱۴۵)

وَاٰتَیْنٰهُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ اور ہم نے (بنی اسرائیل کو) دین کے بارے میں کھلے کھلے دلائل دیئے تھے۔ مگر انہوں نے محض آپس کی ضدا ضدی کی وجہ سے اختلافِ باہمی کا ارتکاب کیا حالانکہ علم (صحیح) ان کے پاس آچکا تھا۔ (جاثیہ : ۱۷)

اب مظاہر کائنات اور علم فطرت سے متعلق چند آیات ملاحظہ ہوں :

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّیْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝

یقیناً اللہ دانے اور گٹھلی کو (زمین میں روئیدگی کے وقت) پھاڑنے والا ہے۔ وہ مردہ چیز (عناصر اور خشک بیجوں) سے زندہ چیز (پروٹوپلازم) نکالتا ہے۔ اور وہی زندہ چیز سے (پھر دوبارہ) مردہ چیز (بیج وغیرہ) نکالنے والا ہے۔ یہی (انوکھی صفات والی ذات گرامی) اللہ ہے۔ لہٰذا تم کہاں بہکے جارہے ہو! وہ صبح کا نکالنے والا ہے۔ اور اُسی نے رات کو راحت کی چیز بنائی اور آفتاب و ماہتاب کو حساب سے رکھا۔ یہ ہے منصوبہ ایک زبردست اور ہمہ داں ہستی کا۔ اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کو بنایا تاکہ تم بر و بحر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرسکو۔ ہم نے یہ سب دلائل علم والوں کے لئے کھول کھول کر بیان کردئے ہیں۔ (انعام : ۹۵ — ۹۷)

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ

لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ط مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ج يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وہی ہے جس نے سورج کو چمکدار اور چاند کو نورانی بنایا اور اس کی اچال کے لئے منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرلیا کرو۔ اللہ نے ان چیزوں کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا ہے — وہ ان نشانات کو اہل علم کے لئے تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ (یونس: ۵)

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہارے لب ولہجے کا اختلاف۔ اِس میں علم والوں کے لئے بہت سے دلائل ہیں۔ (روم: ۲۲)

مکڑی اور اس کے کمزور گھروندے کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ج وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝ اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے (سمجھنے کے لئے) بیان کرتے ہیں۔ مگر ان مثالوں کو علماء ہی سمجھ سکتے ہیں۔ (عنکبوت: ۴۳)

اسی طرح قدرت و ربوبیت کے بعض مظاہر کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط اللہ سے صرف علماء ہی ڈر سکتے ہیں (جو اس کے عظمت وجلال کا صحیح علم رکھنے والے ہوں۔ (فاطر: ۲۸)

ان آیات کے ملاحظے سے یہ بے غبار حقیقت اچھی طرح روشنی میں آگئی کہ جس طرح علمِ شریعت کو علم سے موسوم کیا گیا ہے اسی طرح نظام فطرت کی ساخت و پرداخت اور ان کے اصول وضوابط پر بھی علم ہی کا اطلاق کیا گیا ہے۔ بلکہ آخری دو آیتیں تو علم فطرت کی فضیلت بھی ظاہر کر رہی ہیں۔ اسی طرح صحیفۂ فطرت کا علم رکھنے والے ان ”علماء“ کو دیگر مواقع پر ”قوم یعقلون“ اور ”قوم یتقون“ وغیرہ بھی کہا گیا ہے۔ بلکہ ایک مقام

پر تو انہیں "اولوا الالباب" (پختہ عقل والوں) کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ۚ

آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات دن کے ہیر پھیر میں یقیناً پختہ عقل والوں کے لئے بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ (آل عمران : ۱۹۰)

لہذا علم فطرت یا سائنسی علوم کا استخفاف کرنا یا ان علوم کو غیر اہم سمجھ کر نظرانداز کرنا صحیح نہیں ہے۔ علم شریعت اور علم فطرت دونوں کا علم رکھنے والے ہی "مکمل علم" کے حامل ہو سکتے ہیں۔ یہ علم مظاہر یا علم جدید (اپنے اصطلاحی معنی کے اعتبار سے) کیا ہے سوائے علم اسماء کے، جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی تخلیق کے فوراً بعد دے دی تھی۔ اس سے اس علم کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، جس کی تعلیم علم شریعت پر بھی مقدم سمجھی گئی۔ بلکہ درحقیقت حضرت آدمؑ اسی علم فطرت کی تحصیل ہی کے باعث مسجودِ ملائکہ بنائے گئے۔ اتنے بڑے اور اہم علم کی قدر و منزلت آخر کس بنیاد پر گھٹائی جا سکتی ہے؟ اس علم کو نظر انداز کرنا درحقیقت آدھے علم کو نظر انداز کرنا ہے۔ علم شریعت اور علم فطرت ہماری دو آنکھیں ہیں۔ اگر ہم نے کسی ایک کو بھی نظر انداز کیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے اپنی ایک آنکھ پھوڑ لی اور ایک آنکھ کے اندھے بن گئے۔

اولوا الالباب کون ہیں

مگر اس موقع پر ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی مطلوب ہے۔ وہ یہ کہ قرآن حکیم نے مجرد علم فطرت یا محض مظاہر کائنات سے متعلق تفصیلی علم رکھنے والوں کی تعریف و توصیف نہیں کر رہا ہے۔ جیسا کہ بظاہر مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ یہاں پر دراصل وہ جامع الکمالات ہستیاں مراد ہیں جو علم شریعت کے ساتھ ساتھ علم فطرت سے بھی مزین و آراستہ ہوں۔ ورنہ مجرد علم فطرت یا علوم سائنس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جس آیت کریمہ میں

"اولوا الالباب" کا تذکرہ کیا گیا ہے وہی اس حقیقت عظمیٰ کی بھی پردہ دری کر رہی ہے کہ محض نظام کائنات کے علم سے آراستہ لوگ "اولوا الالباب" نہیں ہو سکتے۔ بلکہ فطرت و شریعت دونوں علوم کی جامع ہستیوں کو یہ خطاب دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس آیت کریمہ کے بعد کی آیتوں میں جو صفات مذکور ہیں وہ علمائے فطرت پر نہیں بلکہ علمائے شریعت پر صادق آتی ہیں جیسا کہ ارشاد باری ہے:

اَلَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

(یہ پختہ عقل والے لوگ) وہ ہیں جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے (ہر حالت میں) یاد کرتے اور زمین و آسمانوں کی تخلیق میں غور کرتے رہتے ہیں۔ (اور نتیجے کے طور پر وہ پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے رب تو نے اس (کائنات) کو (جو حکمتوں اور مصلحتوں سے لبریز ہے) بے کار اور بے فائدہ نہیں پیدا کیا ہے۔ تو پاک ہے (اس قسم کے کار عبث سے) لہٰذا ہم کو آگ کے عذاب سے بچا لے (جو تیری تعلیمات کے مطابق اس نظام کائنات میں غور و فکر سے ہم کو یقینی معلوم ہو رہا ہے۔ (آل عمران: ۱۹۱)

اس کے بالمقابل ایک دوسرے مقام پر پوری وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ مظاہر کائنات اور نظام کائنات میں غور و فکر کی دعوت دینے کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ خدا کی قدرت اور اس کی عظمت و جلال کا اعتراف کریں اور اس سے ڈریں۔ ورنہ خدا کی نشانیوں سے غافل رہ کر دنیوی زندگی میں بدمست ہو جانا بہت بری بات ہے۔

اِنَّ فِی اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَّقُوۡنَ ○ اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ اطۡمَاَنُّوۡا بِہَا وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ○ اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمُ النَّارُ

بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

دن رات کے اختلاف میں اور ان تمام مظاہر میں جن کو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کر رکھا ہے، ڈرنے والوں کے لئے نشانات و دلائل موجود ہیں۔ جو لوگ ہم سے ملاقی ہونے کی اُمید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی اور اسی میں مگن ہو گئے اور جو لوگ ہمارے آیات و نشانات سے غافل ہیں تو ایسے لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے ان کے اعمال کی پاداش میں۔ (یونس : ۶ - ۸)

مطالعۂ فطرت کی غرض و غایت

یہ نظامِ فطرت کے مطالعے اور اس میں غور و فکر کا مقصد ہے کہ اس بنیادی نتیجے تک پہنچا جائے اور یہ بنیادی غرض و غایت حاصل تحقیق کے طور پر منظرِ عام پر آئے۔ ورنہ جو لوگ بڑے سے بڑے سائنس داں اور عالمِ فطرت تو ہوں مگر ان کی رہنمائی اس نظامِ کائنات کے ذریعے ایک با اختیار اور قادرِ مطلق ہستی کی طرف نہیں ہوتی اور وہ اس سے خوف و خشیت محسوس نہ کرتے ہوئے آخرت کی زندگی پر یقین نہ کرتے ہوں (بلکہ سرے سے مذہب ہی کو ایک دھوکا اور فراڈ سمجھتے ہوں) تو گویا کہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور دُنیا کے مشاغل اور سامانِ زندگی نے اُنہیں خدا سے بالکل غافل کر دیا ہے۔

اس اعتبار سے مجرد فطرت (نیچر) کا علم نہ مقصود ہے اور نہ محمود۔ بلکہ قرآن کریم دراصل ایسے ہی تمام بے خبر لوگوں اور ان کے ہمنواؤں کو جھنجھوڑتے ہوئے انہیں نظامِ کائنات سے صحیح نتائج حاصل کرنے اور صحیح رُجحانات اختیار کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس مقصدِ عظیم کی طرف جس انداز میں اور جس اہتمام کے ساتھ ـــ مختلف اسالیب اور بے شمار آیات کے

ذریعہ — توجہ دلائی گئی ہے وہ صحف سماوی میں صرف قرآن عظیم ہی کا حصہ ہے۔ چنانچہ وہ کسی مقام پر مختلف مظاہر کائنات اور اُن کے نظاموں کا تذکرہ کر کے کہتا ہے کہ "اس میں عقل والوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں (..... لآیٰت لقوم یعقلون: بقرہ ۱۶۴، رعد ۴، نحل ۱۲، روم ۲۴) کہیں پر کہتا ہے کہ غور و فکر کرنے والوں کے لئے ان چیزوں میں دلائل رکھے گئے ہیں۔ (کذلک نفصل الاٰیٰت لقوم یتفکرون: یونس ۲۴، رعد ۳، نحل ۱۱، جاثیہ ۱۳۔) کسی جگہ کہتا ہے کہ چونکنے والوں کے لئے مظاہر فطرت میں نشانات باری ودیعت کر دئے گئے ہیں۔ (... لاٰیٰت لقوم یذکرون: انعام ۱۲۶، نحل ۱۳) کسی جگہ ان مظاہر کو صحیح طریقے سے سمجھنے اور ان کا جائزہ لینے کی دعوت دیتا ہے۔ (لقوم یفقھون: انعام ۹۸) تو کسی مقام پر علم کا صحیح استعمال کرنے پر اُبھارتا ہے (لقوم یعلمون: انعام ۹۷، نحل ۵۲، نحل ۸۶، یونس ۵)۔

اصل میں مختلف مقامات پر یہ سب مختلف الفاظ لاکر مختلف طریقوں سے گویا کہ نوعِ انسانی کو عقل، مشاہدہ، علم، غور و فکر، سمجھ بوجھ، جائزہ لینے اور علم کا صحیح استعمال کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور اس سلسلے میں جتنے بھی ممکن طریقے ہو سکتے تھے وہ سب کے سب استعمال کئے گئے اور آزمائے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن عظیم سراپا عقل و فطرت، سراپا علم و حکمت اور سراپا دلیل و استدلال ہے۔ اور وہ ان چیزوں کو اپنے آخری درجے تک پہنچا دیتا ہے، جس سے زیادہ کا انسان تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔

غرض نظامِ کائنات میں ان آیات و نشانات اور دلائل و شواہد کے رکھے جانے کا مقصد اور اس کی غرض و غایت کیا ہے اور قرآن حکیم ان چیزوں کے مطالعے کے ذریعے کس چیز کی دعوت دیتا ہے تو اس کو بھی وہ پوری صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے تاکہ راہ راست سے ہٹے ہوئے لوگ خداوند کریم کی نعمتوں کو پہچانیں اور اس کی شکر گذاری کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے

اپنی احسان شناسی کا ثبوت پیش کریں (لقوم یشکرون : اعراف ۵۸) اور احسان شناسی یا شکر گذاری کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ اس ذات گرامی پر ایمان لاکر اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالے کر دیں (لقوم یؤمنون : انعام ۹۹، نحل ۷۹، عنکبوت ۲۴، روم ۳۷، زمر ۵۲)۔

مطالعۂ فطرت اور خشیتِ الٰہی

یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عجیب و غریب حکمت اور اس کی حیرت انگیز منصوبہ بندی (تقدیر) ہے کہ اس نے اس کائنات اور ان کے نظاموں کو پوری منصوبہ بندی اور مکمل اسکیم کے تحت پیدا کیا ہے۔ یہ نہیں کہ یہ سب کچھ یوں ہی الل ٹپ وجود میں آ گئے ہوں۔ یہاں کا ایک تنکا اور ایک ادنیٰ سے ادنیٰ شے حتیٰ کہ ایک معمولی درجے کا ایٹم بھی بغیر کسی نظام اور منصوبے کے آپ سے آپ وجود میں نہیں آگیا۔ اور اس کا نظام یوں ہی الل ٹپ پوری کائنات کی عظیم الشان مشنری سے ہم آہنگ نہیں ہو گیا۔ بلکہ اس مشنری کے پیچھے ایک عظیم اور بے مثال ذات گرامی — جلّ جلالہٗ — کا دماغ اور اس کا ہمہ گیر و حکیمانہ منصوبہ کارفرما ہے۔ ورنہ اس قدر حیرت انگیز مطابقت کی کوئی دوسری علمی و عقلی تاویل ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔

غرض کائنات کی اس ساخت و پرداخت اور اس کی مشنری میں جیسے جیسے مطالعہ اور غور و فکر بڑھتا جائے گا ایک عظیم اور بے مثال ہستی کی طرف رہنمائی بتدریج واضح سے واضح تر ہوتی چلی جائے گی، جو تمام مختلف و متضاد نظاموں کو ایک وحدت (unity) میں پروئے ہوئے ہے اور ان تمام نظاموں کی دیکھ بھال حیرت انگیز سوجھ بوجھ اور حکمت و دانائی سے کر رہا ہے۔ (جیسا کہ ہمیں مختلف سائنسی علوم کے نہایت درجہ گہرے مطالعے سے منکشف ہوتا ہے)۔

اس مطالعے و مشاہدے کی آخری منزل "خشیتِ الٰہی" ہے جس کا تذکرہ اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے :

اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا ط اللہ سے صرف اہلِ علم ہی ڈر سکتے ہیں۔ (فاطر: ۲۸)

جب تک یہ منزل نہ آجائے سمجھنا چاہیئے کہ مطالعہ و مشاہدہ ابھی کچّا اور خام ہے اور وہ حقیقت کی سرحد تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ یہ گویا کہ ایک معیار ہے کائنات اور اس کے نظاموں کے مطالعے و مشاہدے اور اس کے صحیح منشا و مقصد کا۔ اصل بات یہ ہے کہ مطالعہ کائنات کے ذریعہ "خشیتِ الٰہی" کا ٹمپریچر بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ کائنات کے صحیح مطالعے سے الحاد و مادیت اور اس کے بے بنیاد نظریات اور مختلف فلسفوں سے متعلق ہر قسم کی غلط فہمیاں دُور ہو جاتی ہیں، شکوک و شبہات کا خاتمہ اور نظامِ ربوبیت کی تنقیح ہو جاتی ہے' جس کے نتیجے میں صفاتِ الٰہی اور اسمائے حُسنیٰ کا اثبات ہوتا ہے' جو توحید شہودی کی بنیاد اور اس کی منزل ہے۔

فطرت شریعت کی محافظ

اس بحث سے بخوبی واضح ہو گیا کہ فطرت اور شریعت اگرچہ دونوں ضروری اور ناگزیر ہیں اور ان دونوں کا ساتھ ساتھ چلنا ضروری ہے۔ کیونکہ فطرت شریعت کا "دفاعی" شعبہ ہے، جس کے بغیر نہ تو شریعت آزادانہ طور پر باقی رہ سکتی ہے اور نہ علمی و مادی میدانوں میں مقابلہ آرائی کی تاب لاسکتی ہے۔ مگر اصل مقصود و مطلوب ہر حال میں شریعت یا دینِ الٰہی ہے۔ بالفاظِ صریح شریعت ہر حال میں مطلوب ہے اور وہ کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت میں انسان سے جدا نہیں ہو سکتی، بلکہ قانونِ الٰہی کی پابندی ہر چھوٹے بڑے اور ہر ادنیٰ و اعلیٰ پر فرض ہے۔ اس کے برعکس فطرت کا مطالعہ اور اس میں انہماک نہ تو سب کے لئے ضروری ہے اور نہ ممکن۔ اس طرح فطرت محض شریعت کی معاون و مددگار ہے، اصل مطلوب و مقصود نہیں۔ مگر چونکہ دفاعی

نقطۂ نظر سے فطرت کی حیثیت ایک محافظ اور سپاہی کی طرح ہے۔ جس کے بغیر شریعت زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے شریعت کی نگہبانی کے لئے اس کا وجود ناگزیر ہے اور وہ کسی بھی طرح فطرت کی معاونت سے آزاد اور مستغنی نہیں ہو سکتی، خواہ علمی و استدلالی حیثیت سے ہو یا مادی و سیاسی حیثیت سے۔ اسی لئے ان دونوں کا ملاپ اور تال میل نہایت درجہ ضروری ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی ضرورت اور اہمیت پر اس قدر زور دیا ہے اور فطرت کو ہمیشہ کے لئے اپنے آخری دین متین سے وابستہ کر کے اپنے پیروؤں کو دفاعی میدانوں میں اس سے خوب کام لینے اور ایک خادم اور حاشیہ بردار کی حیثیت سے اس کو مصروف رکھنے کی تاکید کی ہے۔ ان تشریحات و توجیہات کے پیش نظر قرآن حکیم کے تمام مقامات حل ہو جاتے ہیں اور کہیں بھی کوئی رخنہ یا پیچیدگی باقی نہیں رہتی۔

حاصل یہ کہ علم فطرت اور علم شریعت دونوں ضروری ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی بھی قدر و قیمت گھٹائی نہیں جا سکتی۔ قرآن حکیم میں دونوں ہی کی تحصیل پر ابھارا گیا ہے اور دونوں کو "علم" قرار دیتے ہوئے ہر ایک کو ضروری بتایا ہے۔ دین و دنیا کے تمام فوائد ان دونوں کی تحصیل پر موقوف ہیں۔ اور ان دونوں کو جدا کرنے کے باعث معاشرے میں بڑی ناہمواریاں اور بعض اوقات بڑے خوفناک نتائج پیدا ہوتے ہیں، جیسا کہ کلیسا اور مادیت کی کشمکش کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔ فطرت و شریعت کے ان دونوں دھاروں کے الگ الگ بہتے رہنے کا مطلب دوئی اور ثنویت ہے، جس کی نہ تو اسلام جیسے دائمی اور عالمگیر مذہب میں گنجائش ہے اور نہ وہ اس کی اجازت دیتا ہے۔ لہٰذا مسلم معاشرے کی تمام بھلائیاں اور عالم انسانی کے امن و امان کا سارا دار و مدار اس پر ہے کہ یہ دونوں دھارے الگ الگ نہیں، بلکہ باہم متحد ہو کر بہنے لگیں اور ان دونوں کے اجتماع سے

ایسی ذہنی و فکری قوتیں بیدار ہوں جو دین و اخلاق کے تقاضوں کے مطابق نئے گل و گلزار پیدا کر سکیں، تاکہ ان کے ظہور کے باعث موجودہ تمام مفاسد کا خاتمہ ہو سکے اور اولادِ آدم چین و سکون کا سانس لے سکیں۔

ایک مجلسِ اعلیٰ کی تشکیل ضروری

پچھلے صفحات میں سورۂ آل عمران کی ایک آیت کے تحت "اولوالالباب" کی تشریح کی جا چکی ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ قرآن حکیم کی اصطلاح کے مطابق اولوالالباب وہی لوگ ہیں جو علوم فطرت و علوم شریعت دونوں سے متصف ہوں۔ اب یہاں پر یہ بتانا مقصود ہے کہ ایسے ہی جامع صفات لوگ "آئیڈیل لوگ" یا "مثالی افراد" کہلائیں گے۔ اور ان کا کام یہ ہوگا کہ وہ ہمیشہ نظام کائنات میں غور و فکر کرتے یعنی جدید علوم و مسائل کا جائزہ لیتے رہیں اور فطرت و شریعت میں تطبیق دیتے رہیں تاکہ امت مسلمہ کی صحیح رہنمائی عمل میں آسکے۔ جیسا کہ "اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ" ..... وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ " سے واضح ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام اہل اسلام اور تمام مسلمان ان عظیم صفات سے یکساں طور پر متصف نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ضروری ہے (اور اس آیت کریمہ کا تقاضہ ہے) کہ اہل اسلام کے درمیان ایک مخصوص جماعت ہر دور اور ہر زمانے میں ان صفات سے متصف رہنی چاہیئے، جو نہ صرف مسلم معاشرے کی بلکہ پورے انسانی معاشرے کی "آنکھ" اور اس کا "مکھن" ہوگی۔ اُمت مسلمہ کی خصوصاً اور عالم انسانی کی عموماً صلاح و فلاح اسی عظیم گروہ اور عظیم جماعت سے وابستہ ہے جس کو قرآن "اولوالالباب" کہتا ہے۔ اور حسب ذیل آیت کریمہ میں بھی صراحت کے ساتھ اسی قسم کی جماعت کی تشکیل کی دعوت دی گئی ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ

بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ اور چاہیئے کہ تم میں ایک ایسی جماعت (ضرور) ہو جو خیر کی دعوت دے اور معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح پائیں گے (آل عمران: ۱۰۴)

یہ جماعت پوری امت مسلمہ نہیں ہے بلکہ امت مسلمہ کے اندر ایک مخصوص جماعت ہے اور ہونی چاہیئے، جیسا کہ "ولتکن منکم" کے الفاظ تقاضہ کر رہے ہیں۔

آج فکری و نظریاتی اعتبار سے دنیا میں جو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے اگر اس کی اصلاح ہوسکتی ہے تو ایسے ہی جامع صفات گروہ اور جماعت ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔ اور اس جماعت کی تشکیل عصر حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ جو عالم انسانی کی عموماً اور ملت اسلامیہ کی خصوصاً صحیح معنی میں قیادت کرے۔ اگر تمام مسلمانوں نے مل کر ایک ایسی جماعت پیدا نہیں کی تو وہ عنداللہ سب کے سب گنہگار ہوں گے۔ یہ ایک فرض کفایہ ہے جو اہل اسلام کے ذمے فرض ہے۔ جب تک یہ فرض ادا نہ کیا جائے فرض ساقط نہیں ہوگا۔

آج ہم دینی و ملی اور قومی و اجتماعی جن مسائل و مشکلات سے دوچار ہیں اور جس افراط و تفریط اور انتشار ذہنی و فکری کا شکار ہیں، ان تمام پیچیدہ اور ناگفتہ بہ مسائل و مشکلات کا واحد حل اس قسم کی ایک جماعت پیدا کرنا ہے، جو ہمارے تمام مسائل کو حل کر کے ہماری کشتی کو ـــ جو طوفانوں میں پھنسی ہوئی ہے ـــ پار لگا سکے۔ اور اس قسم کی جماعت کو ہر قسم کے قومی، گروہی، لسانی اور جغرافیائی تعصبات اور سیاسی عصبیتوں ـــ سے بالاتر ہو کر پوری امت کے مفاد کے لئے کام کرنا چاہیئے۔ ورنہ پھر اس کی تشکیل سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا اور مثبت و پائیدار نتائج برآمد نہیں ہوسکیں گے۔

وما علینا الا البلاغ۔

علمِ آدمؑ اور فلسفۂ آدمؑ

آخر میں خلاصۂ بحث کے طور پر "علم اسمار" کے سبق اور اس کے فلسفے کو پھر سے تازہ کر لیجئے اور غور فرمایئے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو علم اسمار دیئے جانے کا مقصد آخر کیا تھا، جب کہ ان کے لئے وہ چیز عملی اعتبار سے۔ آغاز تمدن کے ابتدائی دَور میں ــــ اتنی اہم نہیں تھی؛ اور ظاہر ہے کہ حضرت آدمؑ کو اس علم سے سرفراز کئے جانے کا حقیقی مقصد یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ محض اس کے ذریعہ حضرت آدم کی برتری فرشتوں پر ثابت کر دی جائے اور بس! بلکہ اس کا اصل مقصد اور اس میں جو بنیادی روح کار فرما نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مختلف ادوار اور خصوصاً موجودہ دَور کے بے بصیرت مسلمانوں کی اصلاح عمل میں آئے اور ان کے فکر و نظر کی گرہیں کھلیں۔ وہ ملّت جو صدیوں سے علم و تمدن کے میدان میں پچھڑی ہوئی، اپنے آبار و اجداد کے کارناموں سے ناواقف اور جدید علوم کو علم غیر یا ایک شجر ممنوعہ سمجھ کر نظر انداز کئے ہوئے ہو، اس کی ذہنی و نفسیاتی کیفیت کے پیش نظر اس کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ وہ ان علوم کو جو ــــ علم غیر ہونے کے غلط تصوّر کی وجہ سے ان سے وہ کنارہ کشی اختیار کئے ہوئے ہیں ــ اسلامی علوم بنا کر پیش کیا جاتا۔ چنانچہ قرآن حکیم یہی کارنامہ انجام دے کر عصر جدید میں ان کی تمدنی و اجتماعی حیثیت سے بھی اُن کی رہنمائی کر رہا ہے[1]۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت آدمؑ کو "تمام چیزوں کے نام

---

[1] یہ بات موجودہ دَور کی ذہن سازی کے نقطۂ نظر سے اور محض افہام و تفہیم کے ایک طریقے کے طور پر کہی جا رہی ہے۔ ورنہ یہ تمام علوم شروع ہی سے قرآن کی نظر میں محمود و مستحسن ہیں اور غیریت یا اجنبیت کی بات کسی بھی دَور میں پیدا نہیں ہو سکتی، سوائے اس کے کہ قرآن ہی سے بیگانگی عمل میں آجائے۔ (باقی آئندہ صفحے پر دیکھئے)

بتادئے جانے" کی داستان ایک اعجازی رنگ میں بیان کی گئی ہے، تاکہ مسلمان کبھی تو چونکیں اور کبھی تو ان بھولے بسرے علوم کی طرف پھر سے توجہ کریں، جس سے اقوام عالم کا عروج وزوال وابستہ کردیا گیا ہے۔ غور فرمایئے کوئی ٹھکانہ ہے اس کتاب حکمت کی حکمتوں اور دانائیوں کا! چودہ سو سال قبل اس سے زیادہ واضح اور صریح اندازِ بیان وہ آخر کیا اور کس طرح اختیار کرسکتا تھا، جب کہ اس کا مفہوم ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ کسی بھی دور میں ناقابل فہم اور معمہ د چیستاں نہ بن سکے! پھر بھی خود مسلمانوں ہی کا ایک بڑا طبقہ اُس کے اِن معجزانہ بیانات اور اعجازی رہنمائی سے غافل ہو کر اس کو عملاً ایک داستان پارینہ قرار دئے ہوئے ہے۔ جب کہ دنیا کی اکثر قومیں اس کو ماضی کی نشانی اور فرسودگی کی علامت سمجھے بیٹھی ہیں۔

اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج ہم جس علم کو "علم جدید" کہتے ہیں وہ حقیقتاً "علم قدیم" ہے۔ کیونکہ یہ وہی علم ہے جو حضرت آدم کو ان کی تخلیق کے فوراً بعد عنایت کردیا گیا تھا، جو قرآن کی اصطلاح کے مطابق "علم اسماء" کہلاتا ہے۔ وہ جدید صرف ہماری اپنی تحصیل کے اعتبار سے اور نسبتاً ہے، حقیقتاً نہیں۔ یہ علم ہمارے باپ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی میراث ہے۔ جس کا حاصل کرنا ہمارے لئے بہت ضروری اور اہم ہے۔ اور موجودہ دور میں مسلمانوں کے دینی و دنیوی تمام فوائد اسی علم سے وابستہ ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بہرحال قرآنی منشا و مقصد کے مطابق ضروری ہے کہ ہم تمام ضروری اور مفید علوم کو حتی الامکان قرآنی اور اسلامی اصطلاحوں میں پیش کریں تاکہ صدیوں سے علوم و فنون سے بیگانہ ملّت ان علوم کو اپنا سمجھ کر ان کی تحصیل کی طرف پوری رغبت کے ساتھ متوجہ ہوسکے۔ کیونکہ اس مقصد کے لئے دین سے بڑھ کر دوسرا کوئی محرک نہیں ہوسکتا۔

دورِ جدید میں انسان مادیات سے متعلق جتنی بھی تحقیقات وانکشافات کر رہا ہے اور جتنے بھی رموز واسرار کھول رہا ہے اور جن جن علوم وفنون کی تدوین کر رہا ہے وہ سب کے سب اس اعتبار سے "پرانے" ہیں حقیقت میں انسان ایک تنکے برابر بھی اضافہ نہیں کر رہا ہے اور کوئی نئی چیز اپنی طرف سے نہیں پیش کر رہا ہے۔

بہر حال امت مسلمہ کی "مجلس اعلیٰ" یا "سپریم کونسل" کا فریضہ ہے کہ وہ ملت کے تمام معاملات اور اس کے تمام مسائل ومشکلات کا جائزہ لے کر امت مسلمہ کی صحیح اور بروقت رہنمائی کرے۔ ھٰذا بصائر للناس۔

فہرست مآخذ و مراجع

۱- عربی کتابیں

۱- قرآن مجید

۲- تفسیر ابن کثیر، حافظ عماد الدین ابن کثیر، دار احیاء الکتب العربیۃ، مصر۔

۳- تفسیر کبیر، امام محمد فخر الدین رازی، مطبع حسینیہ و مطبع عامرہ، مصر۔

۴- تفسیر کشاف، جار اللہ محمود زمخشری، انتشارات آفتاب، تہران۔

۵- تفسیر روح المعانی، علامہ شہاب الدین محمود آلوسی، بیروت۔

۶- تفسیر المنار، علامہ سید رشید رضا، دار المعرفۃ، بیروت۔

۷- تفسیر ابو سعود، ابو سعود عمادی، برحاشیہ تفسیر کبیر، مصر۔

۸- تفسیر بیضاوی، عبد اللہ بن عمر بیضاوی، کتب خانہ رحیمیہ، دیوبند۔

۹- تفسیر قرطبی، ابو عبد اللہ قرطبی (بحوالہ تفسیر معارف القرآن)

۱۰- تفسیر جلالین، جلال الدین محلی و جلال الدین سیوطی، مصر۔

۱۱- تفسیر مجاہد، مرتبہ عبد الرحمان طاہر سورتی، مطبوعہ قطر، ۱۳۹۶ھ

۱۲- تفسیر تیسیر الکریم، شیخ عبد الرحمٰن بن ناصر السعدی، مکہ مکرمہ، ۱۳۹۸ھ

۱۳- تفسیر الجواہر، شیخ طنطاوی جوہری، مصر، ۱۳۵۰ھ

۱۴- المعجم المفہرس لألفاظ القرآن الکریم، مرتبہ محمد فواد عبد الباقی، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

۱۵- الفوز الکبیر فی أصول التفسیر، شاہ ولی اللہ دہلوی، لاہور، ۱۳۷۱ھ

۱۶۔ المفردات فی غریب القرآن، ابو القاسم حسین بن محمود راغب اصفہانی، دار المعرفۃ، بیروت

۱۷۔ لسان العرب، ابن منظور، بیروت، ۱۹۶۸ء۔

۱۸۔ القاموس المحیط، مجد الدین فیروز آبادی، مصر۔

۱۹۔ صحیح بخاری، امام محمد بن اسماعیل بخاری، بترتیب جدید، استانبول، ترکی، ۱۹۷۹ء

۲۰۔ صحیح مسلم، امام مسلم بن حجاج نیشاپوری، مُرتّبہ محمد فؤاد عبد الباقی، دار الافتاء ریاض۔

۲۱۔ صحیح مسلم، امام مسلم بن حجاج نیشاپوری، مع شرح الکامل للنووی، رشیدیہ دھلی، ۱۳۷۶ھ۔

۲۲۔ سنن ابو داؤد، سلیمان بن اشعث ابو داؤد السجستانی، بترتیب جدید، حمص (سوریہ) ۱۹۷۳ء

۲۳۔ سنن ترمذی، ابو عیسی محمد بن عیسی ترمذی، مصر۔

۲۴۔ مسند احمد بن حنبل، بحوالہ مشکوٰۃ و تفسیر ابن کثیر۔

۲۵۔ مشکوٰۃ المصابیح، ابو محمد حسین بغوی، مطبع مجیدی کانپور۔

۲۶۔ فتح الباری، حافظ ابن حجر، مصر۔

۲۷۔ مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، علی بن سلطان قاری (ملا علی قاری) بمبئی

۲۸۔ مجمع بحار الانوار، محمد طاہر پٹنی، مطبع دائرۃ المعارف حیدرآباد، ۱۹۷۰ء

۲۹۔ احکام القرآن، ابوبکر احمد بن علی جصاص رازی، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۳۳۵ھ

۳۰۔ ھدایہ اولین، برھان الدین مرغینانی، مجتبائی دھلی۔

۳۱۔ بدایۃ المجتہد، قاضی ابن رشد مالکی، مصطفی البابی الحلبی، مصر۔

۳۲۔ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، علاء الدین کاسانی، کراچی، ۱۴۰۰ھ

۳۳۔ الجہاد طریق النصر، عبد اللہ غوشہ عمان (اردن)، ۱۹۷۶ء۔

۳۴- زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، حافظ شمس الدین ابن قیّم جوزی، دار الافتاء ریاض

۳۵- حجۃ اللہ البالغہ، امام شاہ ولی اللہ دھلوی، رشیدیہ دھلی۔

۳۶- فتاویٰ ابن تیمیہ، جلد دوم، امام تقی الدین احمد ابن تیمیہ دمشقی۔

۳۷- موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول، امام ابن تیمیہ، برحاشیہ منہاج السنۃ، دار الافتاء، ریاض۔

۳۸- الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطٰن، ابن تیمیہ

۳۹- الفتوحات المکیۃ، ابن عربی، (بحوالہ تفسیر المنار)

۴۰- طریق الھجرتین و باب السعادتین، علامہ ابن قیّم، مُرتّبَہ عبد الرحمٰن بن ابراھیم انصاری، قطر۔

۴۱- مدارج السالکین شرح منازل السائرین، شمس الدین ابن قیّم۔

۴۲- الوابل الصیب ورافع الکلم الطیب " " دار الافتاء ریاض۔

۴۳- الطب النبوی لابن القیّم الجوزیۃ، مرتبہ عبد الغنی عبد الخالق، مکتبۃ النھضۃ الحدیثۃ، مکہ مکرمہ۔

۴۴- احیاء علوم الدین، ابو حامد محمد بن محمد غزالی، دار المعرفۃ، بیروت۔

۴۵- مقدمہ ابن خلدون، عبد الرحمٰن بن محمد بن خلدون، مطبعہ خیریہ، مصر، ۱۳۲۲ھ

۴۶- البدایہ والنھایۃ، حافظ ابن کثیر

۴۷- شرح عقائد النسفی، ملا سعد الدین تفتازانی، نولکشور لکھنؤ۔

۴۸- شرح فقہ اکبر، ملا علی قاری، مطبع مجیدی کانپور، ۱۳۴۵ھ

۴۹- ھدایۃ الحکمۃ، اثیر الدین مفضل مطبع مجیدی کانپور، ۱۳۴۵ھ

۵۰- میبذی، حسین بن معین الدین میبذی، رحیمیہ دیوبند، ۱۳۷۱ھ

۵۱- التصریح فی شرح التشریح، امام الدین بن لطف اللہ، رحیمیہ دیوبند، ۱۳۸۶ھ

۵۲ - چغمینی (مع شرح)، محمود بن محمد چغمینی، رحیمیہ دیوبند، ۱۳۸۷ھ
۵۳ - ضحی الاسلام، أحمد امین، دسواں ایڈیشن، دار الکتاب العربی، بیروت -
۵۴ - صور الکواکب الثمانی والاربعین، عبد الرحمن الصوفی، دائرۃ المعارف ۱۳۷۳ھ
۵۵ - تاریخ آداب العربیۃ، بروکلمان، (بحوالہ صور الکواکب الثمانی والاربعین)
۵۶ - القرآن والعلوم العصریۃ، شیخ طنطاوی جوہری، مصر، ۱۳۷۱ھ
۵۷ - علوم العرب، جرجی زیدان
۵۸ - تہافت الفلاسفۃ، ابو حامد غزالی
۵۹ - مقاصد الفلاسفۃ، " "
۶۰ - ابو ریحان البیرونی، علی احمد شحات، دار المعارف مصر -
۶۱ - ابن الہیثم، زہیر الکتبی، وزارۃ الثقافۃ، دمشق، ۱۹۷۲ء -
۶۲ - حیوٰۃ الحیوان الکبریٰ، کمال الدین دمیری، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر، ۱۹۵۸ء
۶۳ - عجائب المخلوقات و غرائب الموجودات، زکریا بن محمد قزوینی، برحاشیہ حیوٰۃ الحیوان -
۶۴ - المنجد فی الأدب والعلوم (المنجد کا ضمیمہ)، فردینان توتل، بیروت ۱۹۵۶ء
۶۵ - کتاب الحاوی فی الطب، ابوبکر محمد بن زکریا رازی، دائرۃ المعارف حیدرآباد -
۶۶ - تنقیح المناظر لذوی الأبصار والبصائر، کمال الدین فارسی، دائرۃ المعارف ۱۹۲۸ء
۶۷ - القانون المسعودی، ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی، دائرۃ المعارف ۱۳۷۳ھ
۶۸ - صراع مع الملاحدۃ، عبد الرحمٰن حسن حبنکہ میدانی، دمشق، ۱۹۷۴ء
۶۹ - الشیوعیۃ ولیدۃ الصہیونیۃ، احمد عبد الغفور عطار، صیدا (بیروت)
۷۰ - مؤامرۃ الصہیونیۃ علی العالم، " مکہ مکرمہ
۷۱ - بروتوکولات صہیون، مترجمہ " " " "
۷۲ - الیہود والجریمۃ، عبد المنصف محمود، المجلس الاعلیٰ للشؤن الاسلامیۃ مصر
۷۳ - حقیقۃ الماسونیۃ، محمد علی زغبی، دار العربیۃ بیروت -

۲ - اُردو کتابیں

۷۴ - تفسیر معارف القرآن، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، دیوبند
۷۵ - تفسیر ماجدی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، طبع دوم، لکھنؤ۔
۷۶ - مولانا اشرف علی تھانوی کے ترجمہ قرآن سے خصوصی استفادہ کیا گیا ہے۔
۷۷ - سیرت النبیؐ، جلد سوم و چہارم، مولانا سید سلیمان ندوی، اعظم گڈھ۔
۷۸ - علم الکلام، مولانا شبلی نعمانی، مطبع مفید عام، آگرہ۔
۷۹ - الکلام " " " ، شبلی بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۳۴۰ھ
۸۰ - مذہب و عقلیات، مولانا عبدالباری ندوی، مطبع انسٹی ٹیوٹ علیگڑھ کالج ۱۳۳۸ھ
۸۱ - مذہب اور سائنس، " " مجلس تحقیقات و نشریات اسلام
۸۲ - عقلیات ابن تیمیہ، مولانا محمد حنیف ندوی، لاہور
۸۳ - مذہب و تمدن، مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ کراچی، ۱۹۸۰ء
۸۴ - تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، علامہ اقبال، مترجمہ سید نذیر نیازی، لاہور، ۱۹۵۸ء
۸۵ - فکر اقبال، خلیفہ عبدالحکیم، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء
۸۶ - مقالات شبلی، حصہ ہفتم، شبلی نعمانی، اعظم گڈھ، ۱۹۶۵ء
۸۷ - اسلام دوراہے پر، محمد اسد، مترجمہ رحم علی الہاشمی، دہلی، ۱۹۶۸ء
۸۸ - طوفان سے ساحل تک، " مترجمہ محمد الحسنی، لکھنؤ، ۱۹۷۰ء
۸۹ - انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مولینا ابوالحسن علی ندوی، کراچی ۱۹۷۹ء
۹۰ - مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، " " کراچی، ۱۹۸۱ء
۹۱ - قرآن اور علم جدید، ڈاکٹر رفیع الدین، لاہور، ۱۹۵۹ء
۹۲ - نامعلوم انسان، الکسس کیرل، مترجمہ محمد یوسف کوکن ایم اے، مدراس یونیورسٹی ۱۹۵۳ء
۹۳ - خدا موجود ہے، مترجمہ عبدالحمید صدیقی، لاہور
۹۴ - چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں، محمد شہاب الدین ندوی، فرقانیہ اکیڈمی بنگلور، ۱۹۷۰ء
۹۵ - اسرارِ نبوت، محمد شہاب الدین ندوی، " " ۱۹۷۲ء

۹۶ - انسانی زندگی میں جمود و ارتقاء، مترجمہ ساجد الرحمٰن، لاہور، ۱۹۷۶ء
۹۷ - مذہب اور سائنس، مولوی عبد الحق، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء
۹۸ - تاریخ فلسفۂ جدید، ڈاکٹر ہوفڈنگ، مترجمہ خلیفہ عبد الحکیم، دار الترجمہ حیدرآباد، ۱۹۳۱ء
۹۹ - تاریخ فلسفہ، کلیمنٹ سی جے ویب، مترجمہ مولوی احسان احمد، کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۹ء
۱۰۰ - تنقید عقل محض، امانوئل کانٹ، مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۴۱ء
۱۰۱ - حکمائے اسلام، مولانا عبد السلام ندوی، اعظم گڈھ، ۱۹۵۳ء
۱۰۲ - مسلمانوں کا عروج و زوال، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، دہلی، ۱۹۶۳ء
۱۰۳ - انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم، مترجمہ غلام رسول مہر، لاہور، ۱۹۶۸ء
۱۰۴ - تمدنِ ہند، ڈاکٹر گستاولی بان، مترجمہ سید علی بلگرامی، کتب خانہ نذیریہ، دہلی۔
۱۰۵ - پرانے چراغ، حصہ دوم، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریاتِ اسلام کراچی ۱۹۸۱ء
۱۰۶ - مثنوی مولانائے روم (بحوالہ جدید معلومات سائنس، حصہ اوّل)۔
۱۰۷ - وحدت الوجود، عبد العلی انصاری، مترجمہ شاہ زید ابوالحسن، دہلی، ۱۳۹۱ھ
۱۰۸ - الحکمۃ فی مخلوقات اللہ، امام غزالی، اردو ترجمہ، کراچی، ۱۹۶۰ء
۱۰۹ - قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات، عبد الرحمان خاں، دہلی، ۱۳۶۹ھ
۱۱۰ - اسلامی کتب خانے، محمد زبیر، مکتبۂ برہان دہلی۔
۱۱۱ - خیام، علامہ سید سلیمان ندوی، طبع دوم، اعظم گڈھ، ۱۹۷۹ء
۱۱۲ - البیرونی، سید حسن برنی، انجمن ترقیٔ اردو (ہند)۔
۱۱۳ - طبیعیات کی داستان، محمد نصیر احمد عثمانی، انجمن ترقیٔ اردو (پاکستان) ۱۹۵۱ء
۱۱۴ - سائنس کی دنیا، ولیم کراؤز، مترجمہ ایم ایم بیگ۔ نئی دہلی، ۱۹۵۶ء
۱۱۵ - دنیا کے مشہور سائنس داں، مترجمہ محمود جالندھری، " ، ۱۹۵۸ء
۱۱۶ - ایٹم آپ کا خادم، مترجمہ سلیمان صابر، " ، ۱۹۵۷ء
۱۱۷ - زمین اور خلا کی کھوج، مترجمہ ایم ایم بیگ، " ، ۱۹۵۹ء
۱۱۸ - ہماری غذا، رابرٹ میکرسین، مترجمہ مبارز الدین رفعت، انجمن ترقیٔ اردو ہند، ۱۹۴۱ء

۱۱۹ــ دیہاتی معالج، مطبوعات ہمدرد دواخانہ دہلی، حصہ اول، ۱۹۵۹ء
۱۲۰ــ علم کیمیا، ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۴ء
۱۲۱ــ ایٹم کی کہانی، مترجمہ راج نرائن راز، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء
۱۲۲ــ سورج کی پیدائش اور موت، جارج گیمو، مترجمہ فاروق احمد، لاہور، ۱۹۶۲ء
۱۲۳ــ جدید معلومات سائنس، آفتاب حسن، انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔
۱۲۴ــ طبیعیات کے بنیادی تصورات، آرتھر بیزر، مترجمہ احمد وکیل، ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی۔

۳۔ اُردو ماہنامے

۱۲۵ــ ماہنامہ جامعہ، مولانا محمد علی نمبر، اپریل ۱۹۷۹ء۔
۱۲۶ــ سہ ماہی کاروانِ سائنس کراچی، جلد ۴ شمارہ ۳ و ۴۔
۱۲۷ــ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۷۵ء۔
۱۲۸ــ اُردو ڈائجسٹ لاہور، اگست ۱۹۶۳ء۔

۴ ــ انگریزی کتابیں

129—History of the Arabs, by Phillip K. Hitty, Tenth Edition, London, 1977.

130—Asimov's Guid to Science, Vol. 1, Pelican Books, England, 1979.

131—Asimov's Guid to Science, Vol. 2, Pelican Books, England, 1978.

132—Outlines of Zoology, by M. E. Ayyar, Madras, 1976

133—Botany for Degree Students, by A. C. Dutta, Oxford Univeraity Press, Calcutta, 1979.

134—A Class Book of Botany, A. C. Dutta, Oxford University Press, Calcutta,1978.

135—The Key to the Universe (A Report on the New Physics), by Nigel Calder, British Broadcasting Corporation, London, 1977.

136—The Chemistry of Life, by Steven Rose, Pelican Books, Middlesex, England, 1977.

137—A text Book of Inorganic Chemistty, by . P. B. Janardhan, Oxford and IBH Publishing Co., New Delhi, 1978.

138—Modern Inorganic Chemistry, by R. C. Aggarwal, Allahabad, 1971.

139—Organic Chemistry, by Brewster & McEwen, New Delhi, 1977. (Indian Edition)

140—Modern Principles of Organic Chemistry, by Kice and Marvell, New Delhi, 1966 (Indlan Edition)

141—New Frontiers in Astronomy, (Readings from Scientific American), W. H. Freeman and Company San Francisco, 1975

142—A Snort History of Astronomy, by Arthur Berry, Dover Publications, New York 1961.

143—A Dictionary of Science, Penguin Boo London, 1977.

144—The Penguin Dictionary of Physics, Middlesex, England, 1977.

145—The Penguin Dictionary of Biology, Middlesex, England, 1979.

146—A Short History of Science, W.C.Dampiers,

147—The Penguin Medical Encyclopedia, Peter Wingate, Middlesex, England, 1978.

148—Encyclopedia of Medicinal Foods, Joseph M. Kadans, Thorsons Publishers Limited, Northampton Shire, Great Britain, 1979.

149—Encyclopedia of Medicinal Herbs, by Joseph M. Kadans.

150—The Encyclopedia of Ignorance, Edited by Ronald Duncan and Miranda Weston—Smith, Pergamon Press, Oxford 1978.

فہرستِ مضامین

مع خلاصۂ مباحث و افکار